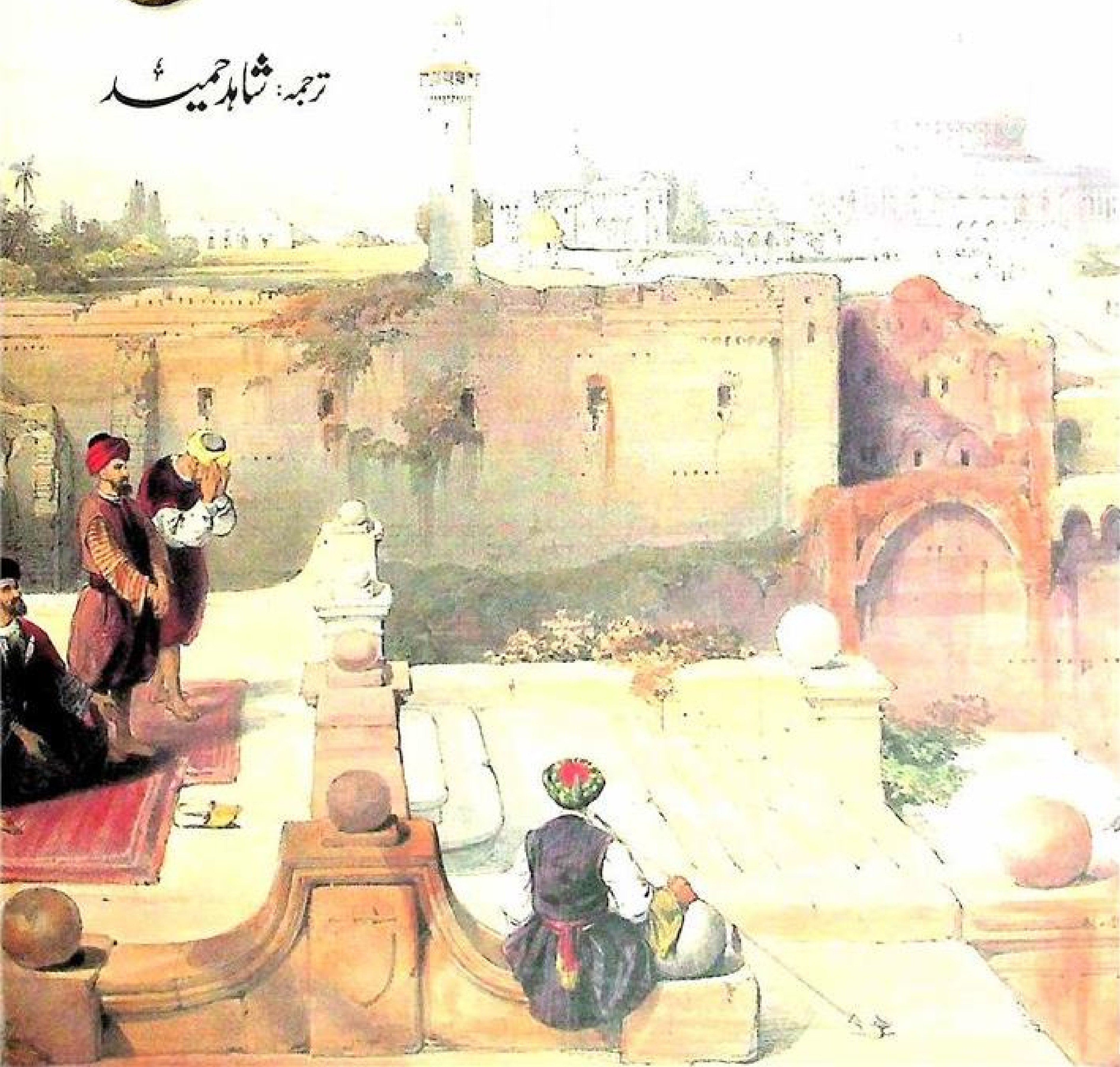
THE QUESTION OF PALESTINE

وہ کتاب جسے صیہونیوں نے بک سٹورز سے غائب کرا دیا، اب تو یہ کسی خوش نصیب کو ہی دستیاب ہوتی ہے (مترجم)

ایڈورڈ سعید

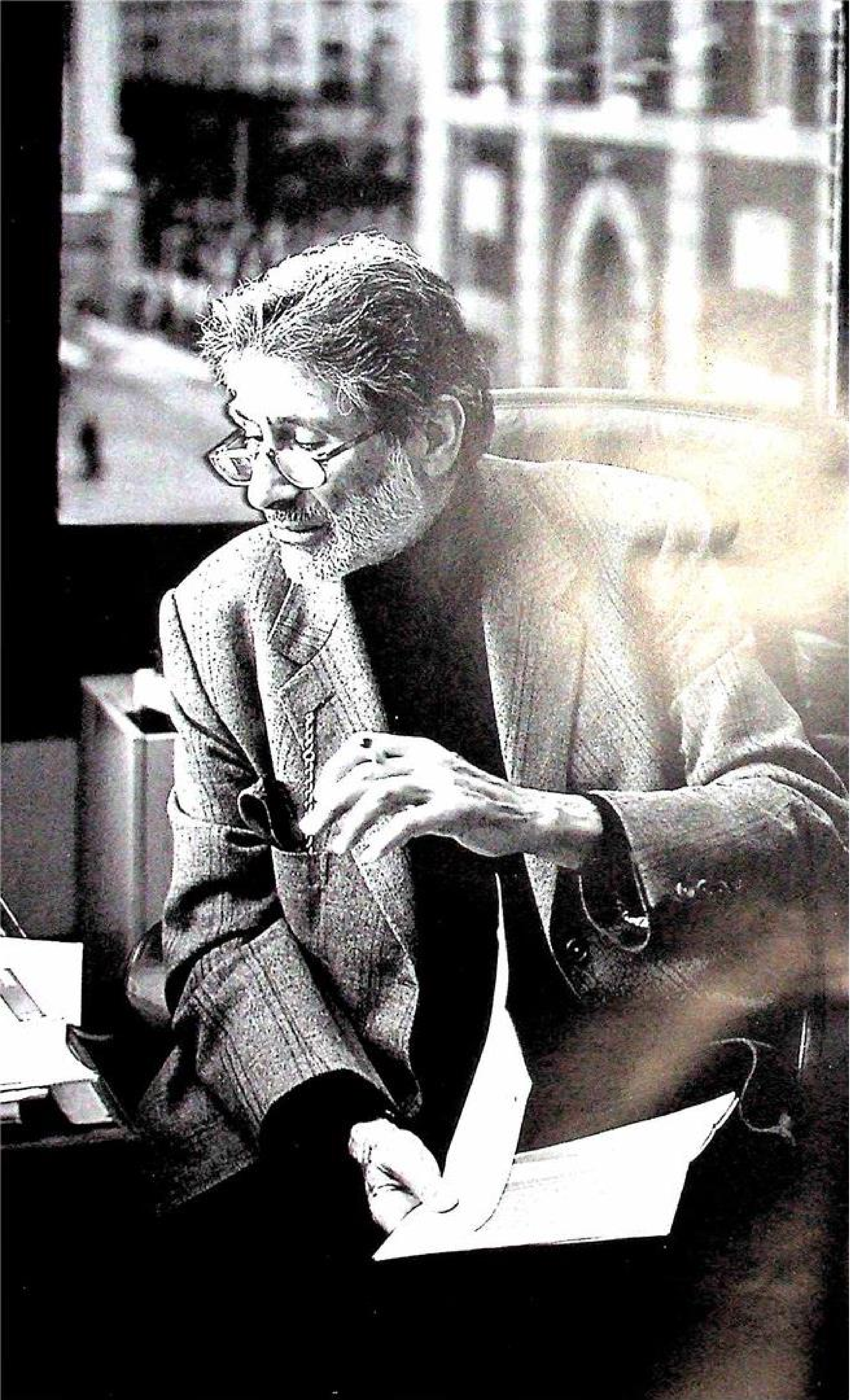
مسئلہ فلسطین

ترجمہ: شاہد حمید





ایڈورڈ سعید یروشلم میں پیدا ہوئے۔ اُنھوں نے ابتدائی اور ثانوی تعلیم بیت المقدس اور مصر کے سکولوں میں حاصل کی، پھر وہ امریکا چلے آئے۔ بی اے انھوں نے پرنسٹن یونیورسٹی میں کیا۔ ایڈورڈ سعید نے ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں اسی یونیورسٹی سے حاصل کیں۔ یہاں انھوں نے Bowdoin انعام بھی حاصل کیا۔ 1974ء میں ایڈورڈ سعید ہارورڈ یونیورسٹی میں تقابلی ادب کے مہمان پروفیسر تھے۔ 1975-76ء میں انھوں نے سٹین فورڈ یونیورسٹی کے نفسیات اور کرداری علوم کی اعلیٰ تعلیم کے شعبے میں فیلو کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں۔ 1977ء میں انھوں نے پرنسٹن یونیورسٹی میں ادبی تنقید پر لیکچر دیے۔ 1979ء میں وہ ایک اور مشہور امریکی یونیورسٹی جان ہاپکنز کے شعبہ انسانیات میں مہمان پروفیسر تھے۔ بعدازاں وہ نیویارک کی کولمبیا یونیورسٹی میں انگریزی اور تقابلی ادب کے پروفیسر رہے۔ انھیں مشہور ناول نگار کونریڈ پر سند تسلیم کیا جاتا ہے۔ ایڈورڈ سعید کی کتب آٹھ زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں اور یورپ، افریقہ، ایشیا اور آسٹریلیا میں چھپ چکی ہیں۔ کولمبیا یونیورسٹی نے اپنا پہلا سالانہ ٹریلنگ (Trilling) انعام انھیں ان کی کتاب ''Beginnings: Intention & Method'' پر دیا۔ 1978ء میں امریکا کے نیشنل بک کرٹکس سرکل ایوارڈ کے شعبۂ تنقید کے مقابلے میں ان کی کتاب ''Orientalism'' دوسرے نمبر پر آئی۔ ان کی دیگر کتب میں ''Literature and Society'' اور ''Conrad and the Fiction of Autobiography'' شامل ہیں۔ محمد حسن عسکری اور فیض احمد فیض نے ایڈورڈ سعید کا ذکر اچھے الفاظ میں کیا ہے۔ خود ایڈورڈ سعید نے بیروت میں فیض احمد فیض سے اپنی ملاقات کا ذکر بڑے پیار سے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے۔ یہ مضمون انگلستان کے ایک رسالے ''گرانٹا'' میں شائع ہوا تھا۔ فلسطینیوں کا پُرزور طریقے سے موقف پیش کرنے کی پاداش میں صیہونی ان پر زبانی ہی نہیں بلکہ جسمانی حملے بھی کر چکے ہیں۔ ایڈورڈ سعید فلسطینی قومی کونسل کے رُکن بھی رہے۔ اُن کی وفات 25 ستمبر 2003ء کو نیویارک شہر میں ہوئی۔



ایڈورڈ سعید

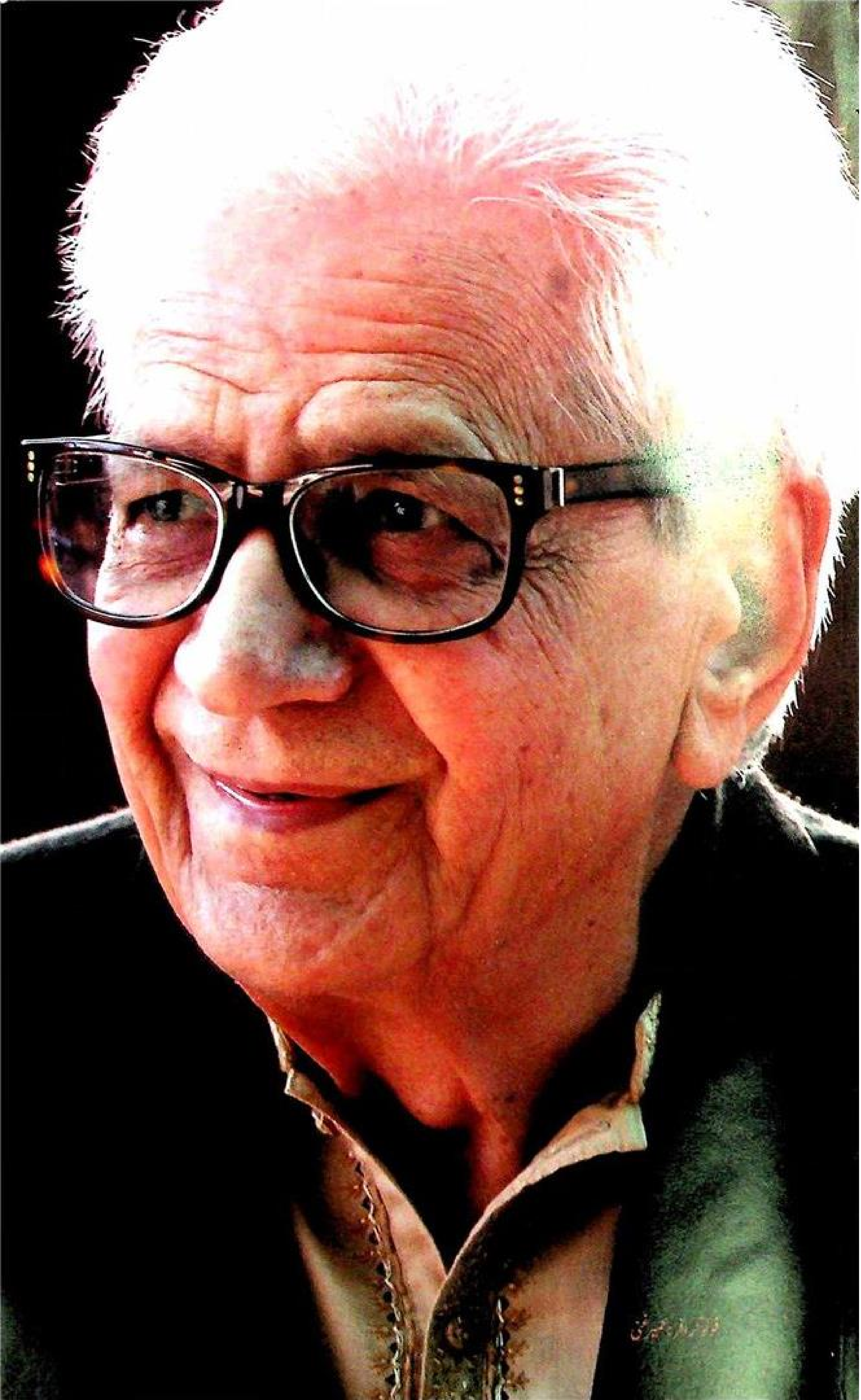
(2003-1935ء)

Works:

- Joseph Conrad and the Fiction of Autobiography (1966)
- Beginnings: Intention and Method (1975)
- Orientalism (1978)
- The Question of Palestine (1979)
- Literature and Society (editor) (1980)
- Covering Islam (1981)
- The World, the Text, and the Critic (1983)
- After the Last Sky: Palestinian Lives (1986)
- Nationalism, Colonialism, and Literature (1988)
- Blaming the Victims (editor) (1988)
- Musical Elaborations (1991)
- Culture and Imperialism (1993)
- The Politics of Dispossession (1994)
- Representations of the Intellectual (1994)
- Peace and Its Discontents (1995)
- Out of Place: A Memoir (1999)
- The End of the Peace Process (2000)
- Parallels and Paradoxes (with Daniel Barenboim) (2002)
- Freud and the Non-European (2003)
- Humanism and Democratic Criticism (2004)
- From Oslo to Iraq and the Road Map (2004)
- On Late Style (2006)
- Music at the Limits (2007)

Honors and awards:

- The "Bowdoin Prize" by Harvard University.
- He twice received the "Lionel Trilling Book Award"; the first occasion was the inaugural bestowing of said literary award in 1976, for Beginnings: Intention and Method (1974).
- "Wellek Prize" of the American Comparative Literature Association
- The inaugural Spinoza Lens Prize.
- Lannan Literary Award for Lifetime Achievement in 2001
- Prince of Asturias Award for Concord in 2002 (shared with Daniel Barenboim).
- First U.S. citizen to receive the Sultan Owais Prize (for Cultural & Scientific Achievements, 1996–1997).
- The autobiography Out of Place (1999) was bestowed three awards, the 1999 New Yorker Book Award for Non-Fiction; the 2000 Anisfield-Wolf Book Award for Non-Fiction; and the Morton Dauwen Zabel Award in Literature.



شاہد حمید

(1928ء-2018ء)

تراجم:

جنگ اور امن (لیو طالسطائی)

کرامازوف برادران (فیودور دستوئیفسکی)

سوفی کی دُنیا (جوسٹین گارڈر)

تکبّر اور تعصب (جین آسٹن)

بوڑھا اور سمندر (ارنسٹ ہیمنگوے)

مسئلۂ فلسطین (ایڈورڈ سعید)

اِلزام اُن پر، قصور اپنا (پیٹر ہانڈکے)

دُھوپ میں لوگ (غسان کنفانی)

بڑا آئینہ اور دوسری کہانیاں (محمد مرابط)

پریشان ہونا چھوڑیے، جینا سیکھیے (ڈیل کارنیگی)

جدید جاپانی افسانے (جاپان کے ممتاز افسانہ نگاروں کی منتخب کہانیاں)

خودنوشت:

گئے دِن کی مسافت (یادیں)

زیرِ طبع:

انگریزی اُردو لغت (دو ہزار سے زائد صفحات)

''شناخت اور انصاف کے لیے ایک ناگزیر آواز۔''

اینتھونی لُوئیس؛ معروف امریکی صحافی و دانشور

''ایڈورڈ سعید کی اِس تصنیف جیسی کتابیں لکھی اور پڑھی جانی چاہئیں، اِس اُمید کے ساتھ کہ جاننے اور سمجھنے سے، بقا کا امکان زیادہ ہوجاتا ہے۔''

نِکولیس بیتھل؛ نیویارک ٹائمز میں تبصرہ

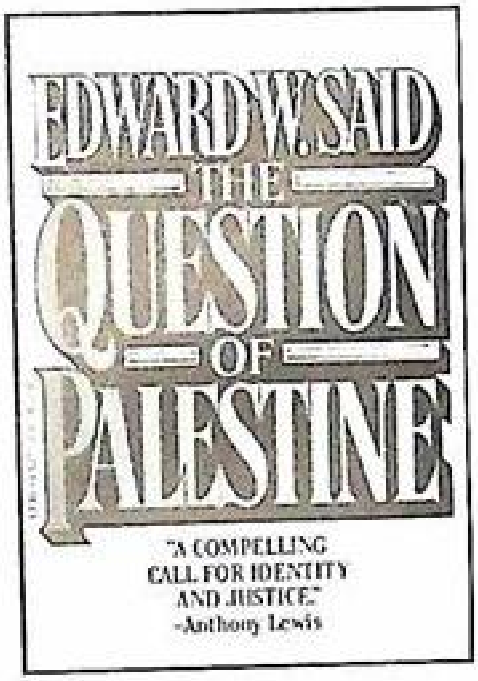
''ایڈورڈ سعید اُن مابعد جدید دانش مندوں میں نہیں تھے جو ہر دَم الفاظ کی طاقت، معنویت اور ریڈیکل اسٹریٹجیز گڑھتے رہتے ہیں، لیکن حقیقی سیاست، عوامی زندگی اور ان کے دُکھ سے کچھ اپنا دامن میلا نہیں ہونے دیتے۔''

زاہدہ حنا؛ مضمون 'وہ فلسطین کا عاشق تھا'

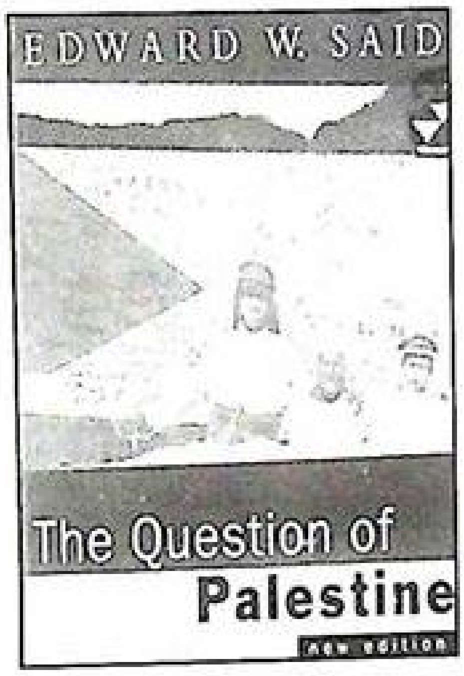
''عظیم ادیبوں کے ساتھ بھی اکثر یہ ہوتا ہے کہ وہ بہت سی کتابیں لکھتے ہیں لیکن انھیں شہرت عام طور پر ان کی کسی ایک ایسی تصنیف سے حاصل ہوتی ہے جو مثالی ہوتی ہے اور پھر ان کی تمام تر پہچان ان کی وہی ایک کتاب بن جاتی ہے۔ ایڈورڈ سعید جو امریکا میں آباد ایک فلسطینی دانشور تھے اور اُس ملک میں ہمارے زمانے کے ایک صاحبِ ادراک شخصیت ان کے اور ان کی تصنیف ''اوریئنٹلزم'' کے درمیان یہی رشتہ ہے۔ ایڈورڈ سعید نے ''اوریئنٹلزم'' کے علاوہ اور بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ معروف ان کی کتاب ''کلچر اینڈ امپیریلزم'' ہے جبکہ دوسری قابلِ ذکر کتابوں میں ''ریفلیکشنز آن ایکزائل'' اور ''دی کوئیسچن آف پیلسٹائن (مسئلہ فلسطین)'' کے نام لیے جاسکتے ہیں۔''

ہربنس مکھیا؛ ہندوستانی تاریخ داں

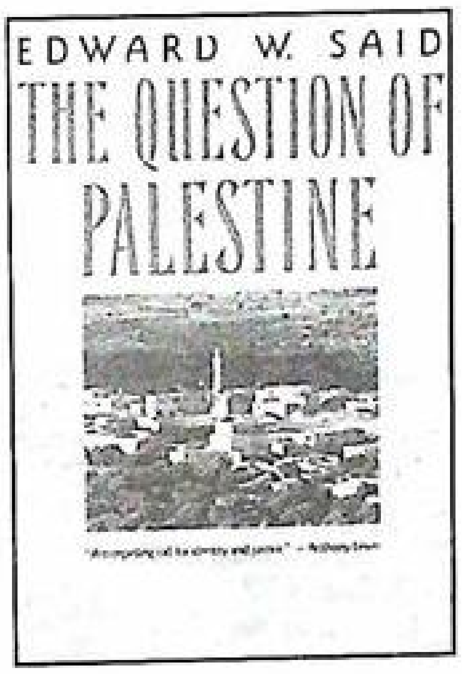
The Question of Palestine
Some Other Editions



English



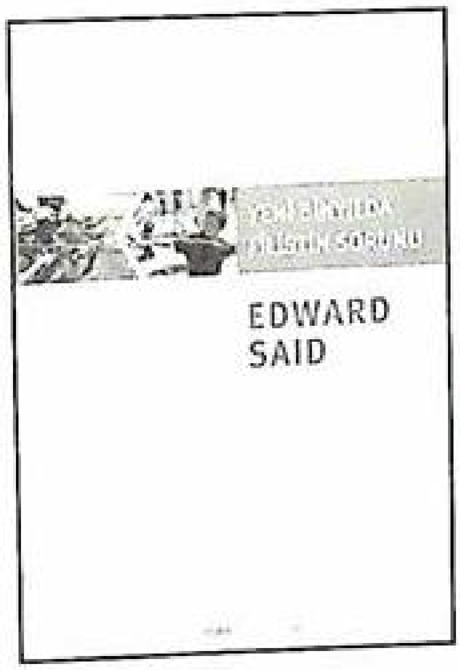
English



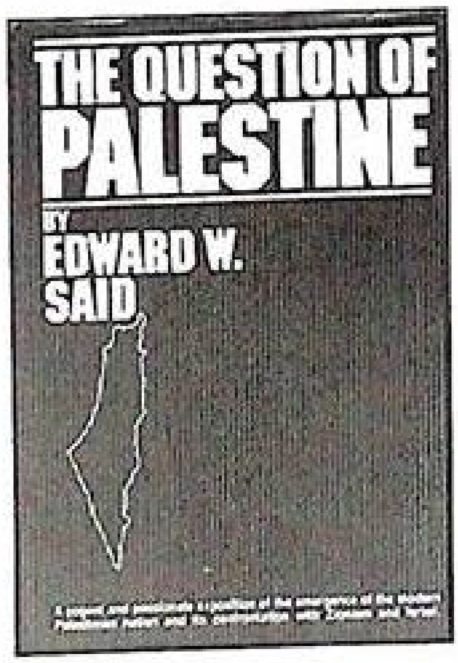
English



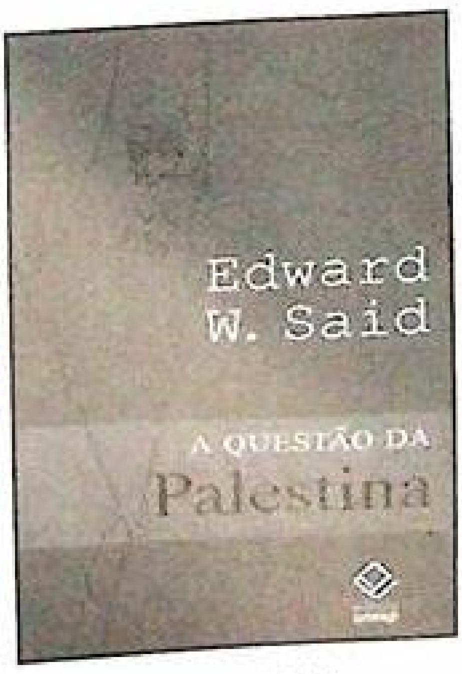
Arabic



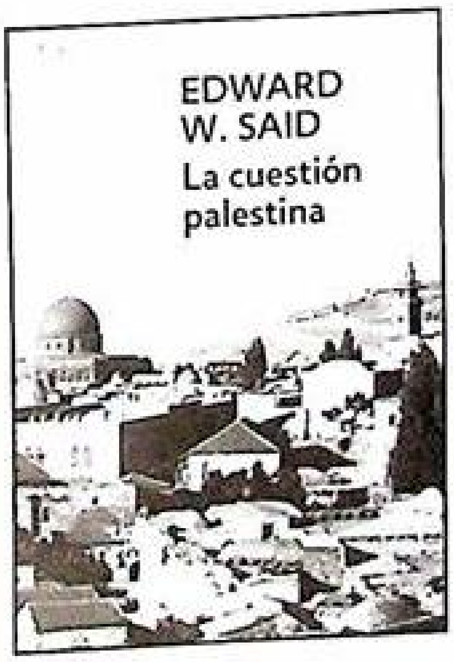
Turkish



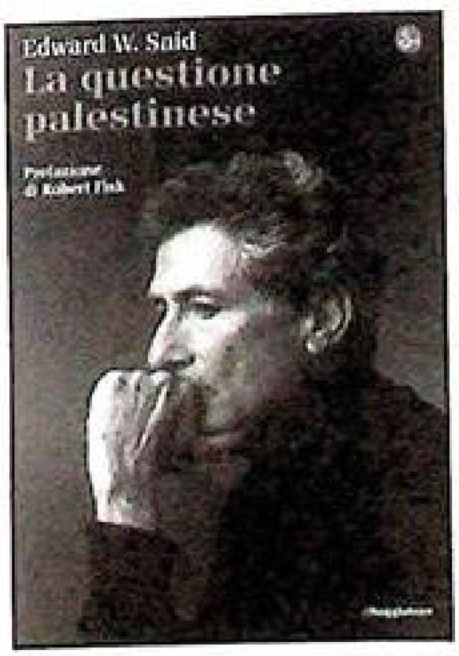
English



Portuguese



Spanish



Italian

THE QUESTION OF PALESTINE

مسئلہ فلسطین

ایڈورڈ سعید

ترجمہ:

شاہد حمید

بُک کارنر

جہلم، پاکستان

Masla-e-Falasteen
by Edward Said
Trans. Shahid Hameed
Jhelum: Book Corner. 2021
400p.
1. History - Politics - Translations
ISBN: 978-969-662-347-2

1979ء۔ پہلی مرتبہ یہ کتاب نیو یارک، امریکا سے ''ٹائمز بکس'' (نیو یارک ٹائمز کا ذیلی ادارہ) نے شائع کی۔
1991ء۔ اس کتاب کو شاہد حمید نے اُردو زبان میں منتقل کیا اور اسے لاہور سے شائع کروایا۔
2021ء۔ جہلم (پاکستان) سے ''بک کارنر'' نے نستعلیق کمپوزنگ کروا کر جدید طباعت کے ساتھ شائع کیا۔

مہتمم اعلیٰ: شاہد حمید

ناشرین: گگن شاہد * اَمر شاہد

کتاب: مسئلۂ فلسطین
مصنف: ایڈورڈ سعید
مترجم: شاہد حمید
لفظ خواں: پروفیسر سید امیر کھوکھر
سرورق ڈیزائن: ابو امامہ
سرورق مصور: ڈیوڈ رابرٹس (سکاٹ لینڈ)
سرورق خطاط: محمد علی زاہد
تزئین و زیبائش: اُم ہادیہ
کمپوزنگ وصفحہ سازی: عمر فاروق
کتابت: نُوری نستعلیق، علوی نستعلیق
مطبع: مکتبہ جدید پریس، لاہور
ناشر: بک کارنر
ویب سائٹ: www.bookcorner.com.pk

بک سٹور: بک کارنر شوروم، بالمقابل اقبال لائبریری، اقبال لائبریری روڈ، جہلم، پاکستان 49600
00 92 544 278051, 00 92 544 614977 00 92 314 4440882, 00 92 321 5440882
bookcornerjlm /bookcornershowroom /bookcorner
bookcornerjhelum info@bookcorner.com.pk

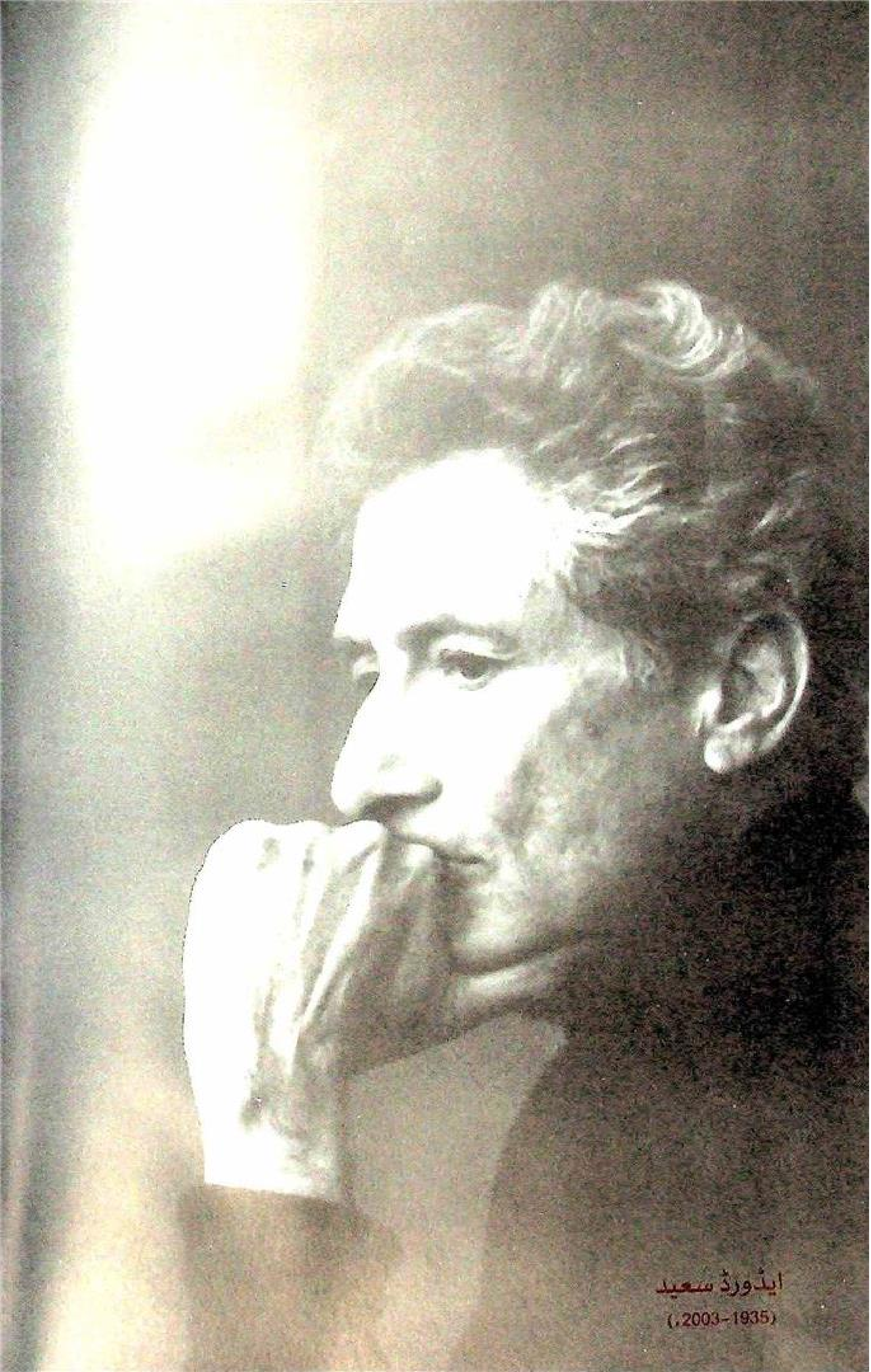
فرید حدّاد

اور

راشد حسین

کی یاد میں

ایڈورڈ سعید



ایڈورڈ سعید
(1935-2003ء)

ترتیب

پہلا باب

مسئلۂ فلسطین

دوسرا باب

صیہونیت

اس کے ستم رسیدگان کے نقطۂ نظر سے

تیسرا باب

فلسطینیوں کے حق خود ارادیت کی طرف

چوتھا باب

کیمپ ڈیوڈ کے بعد مسئلۂ فلسطین

عرضِ مترجم

ایڈورڈ سعید نے اپنی کتاب ''فلسطین کا مسئلہ'' کیمپ ڈیوڈ کے معاہدے کے کچھ ہی عرصے بعد تحریر کی تھی۔ اس دوران میں پُلوں کے نیچے بہتیرا پانی بہہ چکا ہے۔ خود مشرقِ وسطیٰ کا منظر وہ نہیں رہا جو 1985ء کے عشرے کے اوائل میں تھا۔ ایران اور عراق ایک طویل اور خوں ریز جنگ لڑ چکے ہیں۔ لبنان ابھی تک خانہ جنگی کی لپیٹ میں ہے، لیکن وہاں کی صورتِ حال وہ نہیں رہی جو پہلے تھی۔ ''لندن ٹائمز'' کے ایک نامہ نگار کے مطابق بعض مغربی طاقتوں کا یہ خیال ہے کہ لبنان کی عیسائی اقلیت کا تحفظ اسی صورت ممکن ہے کہ اسے وہاں سے نکال لیا جائے اور قبرص میں آباد کر دیا جائے۔ (قبرص کے ترکوں کے لیے لمحۂ فکریہ)

1967ء کی چھ روزہ جنگ عمومی طور پر عربوں کے لیے تباہ کن ثابت ہوئی۔ مصر، شام اور اُردن کی فوجیں ذلت آمیز شکست سے دوچار ہوئیں لیکن اس جنگ کے بطن سے فلسطینی تحریکِ مزاحمت نے ایک نیا موڑ لیا۔ یاسر عرفات تحریکِ آزادئ فلسطین (پی ایل او) کے نئے رہنما منتخب ہوئے اور ان کی قیادت میں فلسطینیوں نے اسرائیل کے خلاف چھاپہ مار کارروائیوں کا آغاز کیا۔ اُردن اور لبنان ان کارروائیوں کے مرکز قرار پائے۔ اُردن کے شاہ حسین نے اسرائیل کی جوابی کارروائیوں کا آغاز کیا۔ اُردن اور لبنان ان کارروائیوں سے اتنے لرزہ براندام ہوئے کہ خود انھوں نے فلسطینیوں کے خلاف بزن بول دیا اور خاصے کشت و خون کے بعد انھیں اپنے ملک سے باہر نکال دیا۔ لبنان میں البتہ فلسطینی اپنے قدم جمانے میں کامیاب ہو گئے۔ وہاں ان کے پناہ گزینوں کے کیمپ ہی نہیں تھے بلکہ چھاپہ مار کارروائیوں کے بڑے اڈے بھی وہیں قائم ہو گئے۔ اسرائیل ان کارروائیوں سے اتنا زچ ہوا کہ 1987ء میں وہ براہِ راست لبنان پر حملہ آور ہو گیا۔ اس حملے کے تین مقاصد تھے۔

اوّل: لبنان میں فلسطینیوں نے اپنے جو قدم مضبوطی سے جما لیے تھے، انھیں اُکھاڑا جائے۔

دوم: اسرائیلی سرحدوں سے ملحق لبنان کے علاقے پر قبضہ کرلیا جائے تاکہ روز روز کے فلسطینی حملوں کا امکان ختم ہو سکے۔

سوم: لبنانی عیسائیوں کو فلسطینیوں اور مقامی مسلمانوں کے خلاف ہلاّ شیری دی جائے تاکہ مقامی لوگ آپس ہی میں اُلجھے رہیں اور یوں اسرائیل کی طرف کوئی میلی آنکھ سے نہ دیکھ سکے۔

بظاہر اسرائیل ان مقاصد کے حصول میں کامیاب رہے۔ وہ جنوبی لبنان کے خاصے بڑے حصے پر اپنا تسلط قائم کر چکا ہے اور وہاں مسلمانوں کے خلاف اپنے عیسائی حاشیہ نشینوں کا اقتدار قائم کرنے کی فکر میں ہے۔ بیروت کے قریب صابرہ اور شیطیلہ کے فلسطینی کیمپوں پر توپوں، ٹینکوں، بحری اور ہوائی جہازوں سے یلغار کر دی۔ فلسطینی بیچارے جو پہلے ہی اپنوں کے لگائے ہوئے زخموں کی وجہ سے نڈھال تھے، معمولی ہتھیاروں کی مدد سے کب تک مقابلہ کرتے۔ اگرچہ وہ کئی دن تک ''میدانِ جنگ'' میں ڈٹے رہے، تاہم آخرکار انھیں ہزیمت اٹھانا پڑی۔ یاسر عرفات بمشکلِ تمام اپنی جان بچا سکے۔ مغربی ذرائع ابلاغ نے اس موقع پر خوب بغلیں بجائیں۔ انھوں نے اسے اسرائیل کی ''فتحِ عظیم'' اور یاسر عرفات کی ''شکستِ فاش'' سے تعبیر کیا۔ اسرائیلیوں اور ان کے حواریوں نے ان دونوں کیمپوں میں اس قدر سفاکی، درندگی اور شقاوت کا مظاہرہ کیا اور اتنے بے گناہ انسانوں کا خون بہایا کہ چنگیز اور ہلاکو کی یاد تازہ ہوگئی اور ساری دُنیا ''الامان، الامان'' پکار اُٹھی۔

لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ ہر شر میں خیر کا پہلو پنہاں ہوتا ہے۔ یہاں بھی وہی صورت پیش آئی۔ اسرائیل کی ساری تدبیریں اُلٹی پڑ گئیں۔ اس نے تقریباً نہتے جلاوطن فلسطینیوں کو پہلے بے دست و پا بنا دیا ہو لیکن قدرت کے رنگ نیارے ہیں۔ فلسطینیوں کو جب نہ اُردن نے قبول کیا اور نہ لبنان میں جائے پناہ مل سکی جہاں سے وہ دشمن کے خلاف برسرِ پیکار ہو سکتے تو خود ان علاقوں سے، جن پر اسرائیل نے جنگ 1967ء کے دوران میں قبضہ کرلیا، آزادی و حریت کی آواز بلند ہونے لگیں اور وہاں کے عربوں نے غاصب و قابض دشمن کے خلاف تحریکِ مزاحمت کا، جسے ''انتفادہ'' کا نام دیا گیا ہے، آغاز کر دیا۔ یہ تحریک اتنی جان دار اور رُوح پرور ثابت ہوئی ہے کہ چھوٹے چھوٹے معصوم بچے، جن کی عمریں بمشکل سات سات، آٹھ آٹھ سال ہوں گی، بڑھ چڑھ کر اس میں حصہ لے رہے ہیں۔ لوگ گرفتار ہوتے ہیں، اسرائیلی بربریت کا نشانہ بنتے ہیں، اپنی آنکھوں اپنے گھروں کو مسمار اور فصلوں کو نذرِ آتش ہوتا دیکھتے ہیں، ملک بدر ہوتے ہیں، گولیوں سے ان کے جسم بھنتے ہیں، ذرا ذرا سی بات پر بے رحم اور سنگ دل فوجی درندوں سے ٹھڈے، لاٹھیاں اور گولیاں کھاتے ہیں، جسمانی،

ذہنی اور روحانی ایذائیں سہتے ہیں، لیکن ان کے پائے استقلال میں کوئی جنبش نہیں آئی۔ اسرائیل نے ہر حربہ آزمالیا، ہر ظلم آزمالیا لیکن وہ اس تحریک کو ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ تحریک کی طوالت، فلسطینیوں کی استقامت اور ان کے جذبۂ حریت کی فراوانی نے ان کے بدترین مخالفوں کو بھی انگشت بدنداں کر دیا ہے، بادلِ ناخواستہ ہی سہی، وہ شمعِ آزادی کے ان پروانوں کے حضور ہدیۂ عقیدت پیش کرنے پر مجبور ہیں۔

دوسری طرف انقلابِ دیگر نمودار ہوا۔ تحریکِ آزادئ فلسطین کے صدر یاسر عرفات اور دوسرے رہنماؤں نے سجدہ سہو یوں ادا کیا کہ انھوں نے نہ صرف اسرائیل کے خلاف ''متشددانہ'' کارروائیوں کا سلسلہ بند کر دیا بلکہ اسرائیل کو زندہ و تابندہ کرنے کی حامی بھر لی۔ لیکن اسرائیل پر اس ''نے نوازی'' کا کچھ اثر نہیں ہوا بلکہ اس کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔ وہ ابھی تک یاسر عرفات اور ان کے ساتھیوں کو ''دہشت گرد'' کہنے پر مصر ہے، مقبوضہ علاقوں سے اپنا قبضہ ختم کرنے راضی نہیں اور فلسطینیوں کے ساتھ کسی قسم کی بات چیت کا ڈول ڈالنے سے انکاری ہے۔ چنانچہ فلسطین کا مسئلہ یوں کا توں لٹکا ہوا ہے اور مستقبل قریب میں اس کے حل ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔

اوپر جن باتوں کا ذکر کیا گیا ہے، فطرتاً ایڈورڈ سعید کی کتاب میں ان کا ذکر نہیں ملے گا کیونکہ یہ ان واقعات کے رونما ہونے سے پہلے لکھی جا چکی تھی لیکن مصنف نے اپنی کتاب میں جن بنیادی مباحث، صیہونیت کیا ہے؟ یہ کہاں سے آئی؟ یہودیوں نے اس کے فروغ کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلے؟ مغربی سیاست دانوں نے مکر و فریب کے کیا کیا جال بچھائے؟ نام نہاد لبرل دانشوروں، ناول نگاروں، شاعروں، مقالہ نویسوں، سفرناموں کے مصنفوں اور صیہونیت کے دیگر ہمدردوں نے کیسے فضا ہموار کی؟ خود صیہونیوں نے فلسطین میں آباد ہونے کے لیے کن کن جتنوں سے کام لیا اور اپنے دعاوی کو سچا ثابت کرنے کے لیے کن کن تاویلوں کا سہارا لیا؟ جب اسرائیل قائم ہو گیا تو فلسطینیوں کو کیسے ملک بدر کیا گیا؟ اور تمام تر دعووں کے باوجود انھیں آج تک کیسے درجہ دوم کے شہری بنائے رکھا گیا؟ فلسطینیوں نے تحریکِ آزادی کیسے منظم کی اور فلسطینی شاعروں، کہانی نویسوں، دوسرے ادیبوں، مصنّفوں اور دانشوروں نے کیسے اس تحریک کے لیے زمین ہموار کی اور اس کی آبیاری کی؟ پی ایل او اور دوسری تحریکیں کیسے وجود میں آئیں؟ جنگ سڑسٹھ کے کیا نتائج مرتب ہوئے؟ کیمپ ڈیوڈ کے معاہدے نے کیا گل کِھلائے؟ فلسطینیوں کے نقطۂ نظر سے فلسطین کے مسئلے کا کیا حل ممکن ہے؟ وغیرہم...... کو اپنی کتاب کا موضوع بنایا ہے اور ان پر جو سیر حاصل بحث کی ہے، وہ ہمیں اس مسئلے کو اس کے صحیح تناظر میں دیکھنے میں بہت مدد دیتی ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس مسئلے کو پہلی مرتبہ صحیح انداز سے پیش کیا گیا ہے، تو غلط نہ ہوگا۔

ایڈورڈ سعید نے اپنی یہ کتاب صیہونیت کے اصل چہرے سے نقاب سرکانے اور اس ضمن میں مغرب کے نام نہاد لبرل سیاست دانوں اور دانش وروں نے جو مکروہ کردار ادا کیا ہے، اس کا بھانڈا بیچ چوراہے پھوڑنے کی غرض سے لکھی تھی۔ وہ اپنے اس مقصد میں کہاں تک کامیاب رہے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ صیہونیوں نے یہ کتاب ہی بازار سے غائب کرا دی، اب تو کسی خوش نصیب کو ہی دستیاب ہوتی ہے۔

جب چھاپہ خانہ وجود میں نہیں آیا تھا، کسی کتاب کا غائب کرنا آسان نہیں تھا۔ مولانا سیّد مناظر احسن گیلانی کے بقول کم از کم برصغیر میں ایسا کرنا ناممکنات میں تھا۔ مسلمانوں کے عہدِ حکومت کے درمیان میں لوگوں کا ایک ایسا طبقہ وجود میں آچکا تھا جنھیں ورّاق یا نسّاخ① کہتے تھے۔ یہ ہر کوچہ و بازار میں کھڑے رہتے تھے۔ چونکہ ان لوگوں کا ذریعۂ روزگار نقل نویسی تھا اس لیے یہ ہمیشہ اس ٹوہ میں رہتے تھے کہ کون سی کتاب کون سے شہر یا قصبے میں دستیاب ہے۔ جونہی کوئی آرڈر موصول ہوتا، وہ فوراً اس کی نقل کرتے اور گاہک تک پہنچا دیتے۔

عبدالقادر بدایونی اکبر اعظم کے دربار کے ساتھ منسلک تھے اور اپنے زمانے کے زبردست وقائع نویس تھے۔ انھیں اکبر اعظم کے اکثر اعمال وافعال سے شدید اختلاف رہتا تھا۔ ایک مطلق العنان عہدِ حکومت میں وہ اس کا اظہار کھلے بندوں نہیں کر سکتے تھے۔ ہوتا یہ تھا کہ وہ روزمرہ کے واقعات کی صورت میں قلمبند کرتے

---

① وہ لوگ جو قرآن مجید، حدیث یا دوسری کتابوں کی نقول تیار کرتے تھے یا کاغذ فروشی کا کاروبار کرتے تھے، انھیں ورّاق کہتے تھے۔ برصغیر میں انھیں نسّاخ بھی کہتے تھے۔ (''فوائد بہیہ'' از مولانا عبدالحیؒ فرنگی محلی بحوالہ ''پاک و ہند میں، مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت'' از مولانا سیّد مناظر احسن گیلانی، صفحہ 57)

یہ لوگ اپنے کام میں کتنے پھرتیلے تھے۔ اس کی بے شمار مثالیں سیّد مناظر احسن گیلانی نے اپنی محولہ بالا کتاب میں دی ہیں۔ بلگرام کے ایک عالم شاہ طیب نے چار پانچ سو صفحے کی ''شرح ملّا جامی'' ایک ہفتے میں نقل کر دی۔ انھوں نے ایک اور ضخیم کتاب ''بہجۃ المحافل'' 23 دنوں میں خوشخط رقم کر دی۔ فیضی اور ابوالفضل کے والد شیخ مبارک نے اپنے ہاتھ سے پانچ صد کتابیں تحریر کی تھیں اور سب سے حیرت انگیز واقعہ یہ ہے۔ مشرقی پنجاب کے قصبے حصاء میں حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے خاندان کے ایک بزرگ شیخ جنید حصاری مقیم تھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے ان کی زُود نویسی کے متعلق لکھا ہے، ''در سہ روزہ تمام قرآن مجید باعراب ی نوشت'' تین دنوں میں زیر زبر پیش کے ساتھ قرآن مجید تحریر کرنا معجزہ ہی ہوسکتا ہے۔ لیکن اس سے اس زمانے کی زودنویسی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ روزنامہ ''ہندو'' مدراس کے بقول برصغیر میں چھاپے خانے پر پہلی کتاب 1557ء میں چھپ چکی تھی لیکن چھاپے خانے مقبول نہ ہو سکے کیونکہ وہ خطاطوں کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھے۔

رہتے تھے۔ اپنی زندگی میں انھوں نے کسی کو اس کی ہوا تک نہیں لگنے دی۔ لیکن جونہی ان کی آنکھ بند ہوئی، نساخوں کو اس تصنیفِ بے بہا کی سن گن مل گئی اور انھوں نے دنوں کے اندر اندر اس کے نسخے تمام مملکت میں پھیلا دیے۔ اس وقت جہانگیر سریرائے تخت تھا۔ اسے بھی خبر مل گئی۔ سنتے ہی آگ بگولا ہو گیا۔

''اولادِ او (عبدالقادر) طلب داشتہ واعتراض ساختند''

انھوں نے عذر پیش کیا:

''آنہا گفتند ما خوردسال بودیم، خبرے نداریم۔''

جہانگیر کی سمجھ میں کچھ کچھ بات آ گئی۔ بہر حال اس نے ملا کے بچوں سے مچلکہ لے لیا کہ کتاب کی اشاعت نہ ہونے پائے لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اس زمانے کی ''وراقیت'' اور ''نساخیت'' کا نظام اتنی وسعت اختیار کر چکا تھا کہ جہانگیر کی مطلق العنان حکومت اپنی تمام کوششوں کے باوجود ملا کی تاریخ معدوم کرانے سے قاصر رہی۔

اس کے برعکس آج جب پریس اتنی ترقی کر چکا ہے، اور تو اور نقول کی تیار کرنے کی مشینیں ہر گلی نکڑ پر موجود ہیں، کتاب غائب کرانا اتنا مشکل نہیں۔ اگر کسی حکمران کی جبین ناز پر کسی کتاب کی اشاعت سے بل پڑ جائیں، تو اس کی اشاعت پر آناً فاناً پابندی لگ جاتی ہے۔ تیسری دُنیا کے ہم چوں ما دیگرے نیست قسم کے حکمران یہی طریقہ پسند فرماتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ایسا کرنے سے زیر زمین کام کرنے والوں کی چاندی ہو جاتی ہے۔ ایک طریقہ صیہونیوں نے اختیار کیا ہے جونہی ان کے کانوں میں بھنک پڑتی ہے کہ کوئی ایسی تصنیف بازار میں آتی ہے یا آنے والی ہے، وہ اس کی تمام کاپیاں خریدنے دوڑتے ہیں۔ کتاب تلف ہو جاتی ہے اور اگر پبلشر مغربی ہے، تو پھر ترکش کے تمام تیر آزما کر اس کی مزید اشاعت رکوا دی جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایڈورڈ سعید کی اس کتاب کے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کی واردات گزری ہے۔ راقم الحروف کو اپنے قیامِ لندن کے دوران میں کسی دکان پر بھی، نہ نئی نہ پرانی کتابیں بیچنے والی، اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہ ہو سکا۔ حتیٰ کہ Foyles میں بھی نہیں، جن کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ ہر وقت پچاس لاکھ کتابیں سٹاک میں رکھتے ہیں اور دُنیا کے سب سے بڑے کتب فروش ہیں۔ معلوم نہیں خالد احمد ڈپٹی ایڈیٹر فرنٹیر پوسٹ لاہور نے اپنے واشنگٹن میں قیام کے دوران میں یہ کتاب کیسے اور کہاں سے ڈھونڈ نکالی۔ انھوں نے محمد سلیم الرحمٰن کو پڑھنے کے لیے دی۔ وہ اسے پڑھ کر چونکے اور فیصلہ کیا کہ اس کا ترجمہ ہونا چاہیے۔ محمود گیلانی ایسی چیز چھاپنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ فوراً حامی بھر لی۔ ترجمے کے لیے قرعہ فال ناچیز کے نام نکلا اور یوں اسے اُردو میں منتقل کرنے کا موقع میسر آیا۔

ایڈورڈ سعید نے اپنی یہ کتاب امریکی قارئین کے لیے تحریر کی تھی۔ یوں اس میں ایسی بے شمار شخصیات، واقعات اور اصطلاحات کے حوالے ہیں جن سے اہلِ مغرب تو خوب واقف ہیں لیکن اس ناچیز کی دانست میں چند ایک لوگوں کو چھوڑ کر وہ اُردو کے عام قارئین کے لیے اجنبی ہیں۔ چنانچہ موضوع کو عام سہل بنانے کے لیے متعلقہ مقامات پر حواشی تحریر کر دیے گئے ہیں۔ جہاں مصنف نے خود حواشی تحریر کیے ہیں وہاں لفظ ''مصنّف'' لکھ دیا گیا ہے۔ انگریزی اور دوسری زبانوں کی مختلف کتابوں کے نام بھی مصنف ہی نے دیے ہیں۔ باقی حواشی راقم الحروف کے تحریر کردہ ہیں، اس لیے ان میں کوئی اغلاط ہوں تو اس کی ذمہ داری اسی کے کندھوں پر ہوگی نہ کہ فاضل مصنّف کے۔

ترجمے پر نظرِ ثانی محمد سلیم الرحمٰن نے کی ہے۔ عربی مقامات اور اشخاص کے ناموں کے تلفظ کے بارے میں سجاد رضوی نے اعانت کی ہے۔ میں ان دونوں احباب کا مشکور ہوں۔

شاہد حمید

لاہور

21 ستمبر 1989ء

دیباچہ

اگرچہ اس کتاب کا بیشتر حصہ 1977ء کے دوران میں اور 1978ء کے اوائل میں تحریر کیا گیا تھا، تاہم مشرقِ وسطیٰ کی تاریخ کے اس انتہائی اہم دور 78-1977ء میں جو واقعات رُونما ہوئے، یہ کتاب محض ان کے حوالے سے تحریر نہیں کی گئی ہے۔ اس کے برعکس میرا مقصد یہ تھا کہ میں ایک ایسی کتاب تحریر کروں جو امریکی قارئین کے سامنے فلسطینی مؤقف کی ایک ایسی تصویر پیش کرے جو ایک وسیع اکثریت کے نقطۂ نظر کی نمایندگی کرتی ہو۔ یہ درست ہے کہ فی زمانہ (مغرب میں) فلسطینیوں اور فلسطینی مسئلے کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا رہا ہے لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ جہاں تک فلسطینیوں کے مؤقف کا تعلق ہے، اس کی تحسین کرنا تو بہت دُور کی بات ہے، (مغرب کے) اکثر لوگوں کو یہ بھی علم نہیں کہ یہ مؤقف ہے کیا۔ اس مؤقف کو ایک منضبط اور مربوط شکل میں پیش کرنے کے لیے میں نے زیادہ تر جس چیز پر انحصار کیا ہے، اسے بجا طور پر فلسطینی تجربہ کہا جا سکتا ہے اور جب 1880ء کے عشرے کے اوائل میں صیہونی نو آبادکاروں کے اولین قافلے فلسطین کے ساحلوں پر وارد ہونے لگے، تو یہ تجربہ اپنے آپ کو جاننے اور پہچاننے کا تجربہ بن گیا۔ اس کے بعد فلسطینی تاریخ ایک اپنا ہی مخصوص اور عرب تاریخ سے خاصا مختلف رُخ اختیار کر لیتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس صدی کے دوران میں کچھ فلسطینیوں نے کیا اور جو کچھ دوسرے عربوں نے کیا، ان کے مابین متعدد روابط پائے جاتے ہیں لیکن فلسطینی تاریخ کی وہ خصوصیت، جو اسے دوسروں سے مختلف بنا دیتی ہے...... اس کا صیہونیت کے ساتھ کاری قومی تصادم...... اپنے خطے میں اپنی مثل آپ ہے۔

اس کتاب کو تحریر کرنے میں میری جو غرض و غایت تھی اور میں نے اس ضمن میں جو کارکردگی دکھائی ہے (یہ دونوں باتیں خواہ کتنے ہی نقائص اور خامیوں سے لبریز ہوں) ان میں فلسطینی تاریخ کی اس بے مثال خصوصیت (جس کا ذکر اوپر آیا ہے) نے میری رہنمائی کی ہے۔ خود ایک فلسطینی ہونے کے ناطے میں نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ ایک قوم کی حیثیت سے ہم میں جو کمزوریاں اور کوتاہیاں ہیں، میں ان سے آگاہ رہوں۔ بعض معیاروں کے مطابق ہم شاید دوسروں سے کوئی مختلف قوم نہیں۔ ہماری قومی تاریخ یہ گواہی دیتی ہے کہ جب ہمارا مقابلہ بنیادی طور پر ایک یورپی اور جاہ طلب نظریے اور اس کی عملی تفسیر سے ہوا تو ہم مات کھا گئے۔ ہم مغرب کو یہ جتانے میں ناکام رہے ہیں کہ ہم جس مقصد کے حصول کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں، وہ مبنی بر انصاف ہے۔ تاہم میرا خیال ہے کہ ہم نے اپنے سیاسی تشخص اور ارادے کی تعمیر شروع کر دی ہے۔ ہم نے آہستہ آہستہ، دھیرے دھیرے، اپنے اندر ایک زبردست لچک پیدا کر لی ہے اور اس سے بھی بڑی بات یہ ہوئی ہے کہ ہمارا زبردست قومی احیا ہوا ہے۔ ہم نے تیسری دُنیا کی تمام اقوام کی حمایت حاصل کر لی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس حقیقت کے باوجود کہ جغرافیائی طور پر ہم منتشر ہو چکے ہیں اور مختلف ٹولیوں میں بٹ چکے ہیں، اور اس حقیقت کے بھی باوجود کہ دُنیا میں کوئی ایسا علاقہ نہیں، جسے ہم اپنا علاقہ کہہ سکیں، ہم زیادہ تر ایک قوم کی حیثیت سے متحد ہو چکے ہیں۔ ہمارا یہ اتحاد کیوں ممکن ہوا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ فلسطینی تصور (ہمیں جس قسم کی بے دخلی کا اور جس قسم کے جبر و تشدد کا، جو صرف ہمارے لیے ہی روا رکھا گیا، تجربہ ہوا، یہ تصور اسی تجربے کا شاخسانہ ہے) میں اتنی قوت ہے کہ یہ مختلف الخیال عناصر کو آپس میں مربوط کر سکتا ہے۔ چنانچہ ہم سب نے اس تصور کو مثبت جوش و خروش کے ساتھ لبیک کہا۔ فلسطینیوں کو جو ناکامیاں اٹھانا پڑیں اور بعد میں جس طرح ان کا احیا ہوا، یہی وہ باتیں ہیں جنھیں ان کی جیتی جاگتی تفصیلات و جزئیات سمیت میں نے اس کتاب میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

تاہم میرا گمان یہ ہے کہ جب بھی میرے (امریکی اور یورپی) قارئین کے سامنے فلسطینی مسئلہ آتا ہے، تو ان میں سے بہتوں کے ذہنوں میں فوراً دہشت گردی کا تصور لپکنے لگتا ہے اور میں نے اس کتاب میں دہشت گردی کا جو زیادہ ذکر نہیں کیا تو اس کی جزوی وجہ یہ ہے کہ فلسطینیوں کو بالکل ناجائز اور غیر منصفانہ انداز سے، جس سے کینہ اور بغض چھلکا پڑتا ہے، دہشت گردی کے مترادف قرار دے دیا جاتا ہے۔ اگر میں ایسا کرتا تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ میں اپنا استدلال دفاعی انداز سے پیش کر رہا ہوں۔ اس صورت میں یا تو میں یہ کہتا کہ ہماری ''دہشت گردی''، جیسی بھی ہے، اس کا جواز موجود ہے اور یا پھر میں یہ نقطۂ نظر اختیار کر لیتا کہ فلسطینی دہشت گردی نام کی کوئی چیز سرے سے موجود ہی نہیں ہے اور لوگ خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بنا لیتے ہیں۔ تاہم

حقائق اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہیں اور یہ ضروری ہے کہ ان میں سے بعض کا یہاں اعادہ کر دیا جائے۔ محض اعداد و شمار ہی کو لے لیں۔ اب تک جتنی انسانی جانوں کا اتلاف ہوا ہے اور جتنی املاک تباہی و بربادی کا شکار ہوئی ہیں، انھی کو اگر پیشِ نظر رکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ اب تک صیہونیوں نے فلسطینیوں کے ساتھ جو کچھ کیا ہے، اس کا اس سے کوئی مقابلہ ہی نہیں جو انتقاماً جوابی کارروائی کے طور پر فلسطینیوں نے صیہونیوں کے ساتھ کیا ہے۔ گزشتہ بیس سالوں سے اسرائیل، اُردن اور لبنان میں فلسطینی پناہ گزینوں کے کیمپوں کو جس طرح تقریباً مسلسل اپنے حملوں کا نشانہ بناتا چلا آ رہا ہے، وہ اس حقیقت کی صرف ایک نمائندہ تصویر ہے کہ صیہونیوں اور فلسطینیوں نے تباہی و بربادی کے جو ریکارڈ قائم کیے ہیں، ان دونوں میں سرے سے کوئی تناسب نہیں ہے۔

میرے خیال میں اس سے بھی بدتر بات یہ ہے کہ مغربی (اور یقیناً صیہونی لبرل) صحافی اور دانشور اپنی گفتگوؤں اور تحریروں میں بڑی منافقت برتتے ہیں کیونکہ (جب فلسطینی دہشت گردی کا ذکر آتا ہے تو وہ فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیتے ہیں لیکن) وہ اس صیہونی دہشت گردی کے متعلق ایک لفظ تک نہیں کہتے بلکہ ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی تصویر بنے رہتے ہیں۔ ① کیا یہ صریحاً بے ایمانی نہیں کہ جب فلسطینیوں کی کارروائیوں کا تذکرہ مقصود ہوتا ہے تو اپنے غیظ و غضب کا اظہار کرنے کے لیے "اسرائیلی شہری باشندوں" یا "قصبوں" اور "دیہاتوں" یا "سکولوں کے (معصوم) بچوں" کے خلاف "عربوں" کی دہشت گردی جیسی بلیغ تراکیب استعمال کی جاتی ہیں لیکن جب اسرائیل معصوم و بے گناہ فلسطینی شہری باشندوں پر بم باری کرتا ہے تو "فلسطینی ٹھکانوں" پر "اسرائیلی" حملے جیسی غیر جانبدارانہ لفاظی سے کام لیا جاتا ہے کیونکہ اس قسم کی تراکیب اور الفاظ سے قطعاً یہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ اسرائیلی حملوں کا اصل ہدف جنوبی لبنان میں فلسطینی پناہ گزینوں کے کیمپ ہیں حالانکہ اشارہ انھی کی طرف ہوتا ہے (دسمبر 1978ء کے اواخر میں جو واقعات پیش آئے، ان کے متعلق امریکی اخبارات میں خبریں اور رپورٹیں شائع ہوئیں، اب میں انھی خبروں اور رپورٹوں کے حوالے سے بات کر رہا ہوں) جب سے (1967ء) اسرائیل نے مغربی کنارے اور غزہ پر قبضہ کیا ہے، اسرائیلی قابض حکام وہاں آئے روز جس قسم کی چیرہ دستیاں روا رکھ رہے ہیں اور جس طرح کی دوسری شرم ناک کارروائیاں کر رہے ہیں، ان میں قطعاً کوئی کمی نہیں آئی لیکن مغرب (اور اسرائیل) کے اخبارات و جرائد اور

---

① اس سے ملتی جلتی سنسر شپ کا ایک جائزہ امریکا کے ماہر لسانیات نوم چومسکی نے اپنے مضمون "Ten years after tet: The Big Story that got away" میں پیش کیا تھا۔ یہ مضمون ایک جریدے "More" کی جلد ہشتم شمارہ 6 (جون 1978ء) کے صفحات نمبر 23-16 پر شائع ہوا تھا۔

دوسرے ذرائع ابلاغ ان کے بارے میں منہ میں گھنگنیاں ڈالے بیٹھے رہتے ہیں اور ٹس سے مس تک نہیں ہوتے لیکن اگر بیت المقدس کے کسی بازار یا مارکیٹ میں ایک بھی بم پھٹ جائے تو وہ اپنی چیخ چنگھاڑ سے آسمان سر پر اُٹھا لیتے ہیں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے بہت کراہت محسوس ہوتی ہے کہ ایک بھی امریکی اخبار نے اسرائیل فوج کے چیف آف سٹاف جنرل گُور Gur کا مندرجہ ذیل انٹرویو شائع نہیں کیا:

سوال: کیا یہ سچ ہے کہ (مارچ 1978ء کے دوران میں اسرائیل نے لبنان پر جو چڑھائی کی تھی، اس کے دوران میں) آپ نے لوگوں کے بے ترتیب جمگھٹوں پر بلا تخصیص اور بلا امتیاز بم باری کی تھی؟

جواب: میں ان لوگوں میں سے نہیں جن کی یادداشت انتخابی ہوتی ہے (یعنی جو چاہا، یاد رکھا، جو چاہا بھلا دیا) کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ ان دس سالوں کے دوران میں ہم نے جو کچھ کیا، اس کے بارے میں مَیں جھوٹ موٹ یہ کہہ دوں کہ مجھے اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں؟ ہم نے پوری نہر سویز کے کنارے کنارے کیا کیا؟ یہی نا کہ پندرہ لاکھ افراد کو پناہ گزیں بنا دیا! آپ کہاں رہتے ہیں؟...... ہم نے اسمٰعیلیہ، سویز، بندر سعید، اور بندر فواد پر بم باری کی اور پندرہ لاکھ افراد پناہ گزیں بن گئے...... پھر یہ جنوبی لبنان کی آبادی کب سے اتنی مقدس ہوگئی ہے (کہ ہم ان پر بم باری نہ کریں؟) وہ خوب جانتے تھے کہ دہشت گرد کیا کر رہے ہیں۔ آوِی وِم کے قتلِ عام کے بعد میں نے اعلیٰ حکام کی اجازت کے بغیر جنوبی لبنان کے چار دیہات پر بم باری کرائی۔

سوال: شہری اور غیر شہری باشندوں کے مابین کسی تخصیص کے بغیر؟

جواب: کیسی تخصیص؟ عِربِد① کے باشندوں نے کیا کیا تھا کہ وہ ہماری بم باری کے مستحق ٹھہرے؟

سوال: لیکن فوج جو اعلامیے جاری کرتی ہے، ان میں تو یہی دعویٰ کیا جاتا ہے کہ "ہم نے دہشت گردوں کے خلاف جوابی فائرنگ کی" یا "دہشت گردوں کے ٹھکانوں پر جوابی حملے کیے؟"

جواب: بھائی ذرا سنجیدگی سے بات کریں۔ کیا آپ کو علم نہیں تھا کہ ہم نے دشمن کو ٹھکانے اور اسے رزم آرائی سے بیزار کرانے کے لیے جس طویل جنگ کا آغاز کیا تھا، اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اردن کی ساری وادی اپنے باشندوں سے خالی ہوگئی؟

سوال: پھر آپ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ آبادی کو سزا دی جانا چاہیے؟

---

① شمالی اُردن کا ایک خاصہ بڑا قصبہ۔ اس کی آبادی زیادہ تر فلسطینیوں پر مشتمل ہے۔

جواب: بالکل! اور اس بارے میں میرے ذہن میں قطعاً کسی قسم کا شک وشبہ نہیں۔ جب میں نے (جنوبی لبنان پر حملے کے دوران میں) یانوخ ① کو طیارے، توپ خانہ اور ٹینک استعمال کرنے کی اجازت دی تو مجھے ٹھیک ٹھاک معلوم تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ ہماری آزادی کی جنگ کو شروع ہوئے تیس سال کا عرصہ بیت چکا ہے۔ اس سارے عرصے کے دوران میں ہم شہری (عرب) آبادی کے خلاف ہی تو جنگ لڑتے رہے ہیں جو شہروں اور دیہاتوں میں آباد تھی اور جب بھی ہم (ان شہری باشندوں کے خلاف) ایسی جنگ کرتے ہیں، تو بار بار یہی سوال پوچھا جاتا ہے:

''کیا ہمیں عام شہریوں پر حملے کرنا چاہییں یا نہیں کرنا چاہییں؟'' ②

چنانچہ دہشت گردی کے متعلق ایک بات جو عیاں ہے، وہ یہ ہے کہ اس کے ادراک میں بھی عدم توازن پایا جاتا ہے اور اس کے ارتکاب میں بھی عدم توازن ہی کارفرما ہے۔ مثلاً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسرائیل جن فلسطینیوں کو اپنی جیلوں میں محبوس کرتا ہے، فلسطینی ان کی رہائی کے لیے مختلف انداز سے کوششیں کرتے ہیں۔ بعض اوقات ان کوششوں میں بعض اسرائیلی باشندوں کو یرغمال بنا لیا جاتا ہے تاکہ اسرائیل پر دباؤ ڈالا جا سکے۔ لیکن اس سلسلے میں جب بھی اسرائیلی یرغمالیوں کو استعمال کیا گیا تو ہر بار یہ اسرائیلی افواج ہی تھیں جنھوں نے توپوں کے دہانے کھولنے اور عمداً خون کے دریا بہانے میں پہل کی لیکن محض اعداد وشمار کے حوالے دینے اور وضاحتیں پیش کرنے سے کچھ نہیں بنتا...... کیونکہ یہودیوں اور عربوں کے مابین، فلسطینیوں اور صیہونی یہودیوں کے مابین، فلسطینیوں اور باقی بنی نوعِ انسان (مغرب میں یہی نظر آتا ہے کہ فلسطینی ساری دُنیا سے برسرِ پیکار ہیں) کے مابین، یہودیوں اور اہلِ مغرب کے مابین مخاصمت اور عناد کی داستان اتنی قدیم اور طویل ہے کہ اس کو پڑھ کر ایک دفعہ تو انسان کی سٹی گم ہو جاتی ہے اور اس کے ہوش وحواس سُن ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اب مسئلہ فلسطین ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے ساتھ بے شمار ہولناکیاں وابستہ ہیں اور جس کی جزئیات اخلاقی اعتبار سے بڑا الجھاؤ پیدا کرتی ہیں۔ تاہم (مغرب میں) اس مسئلے کو یوں پیش کیا جاتا ہے جیسے نہ تو کوئی ہولناکی اس کے ساتھ وابستہ ہے اور نہ اخلاقی اعتبار سے اس کی جزئیات میں کوئی الجھاؤ ہے۔ اسے آسانی سے، سہولت سے، ناگزیر طور پر، دبا کر، بھینچ کر، ''فلسطینی دہشت'' کا نام دے دیا جاتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے

---

① یانوخ: اسرائیل کے شمالی محاذ کا کمانڈر، یہ اس کے نام کی تصغیر ہے۔

② روزنامہ ''الھمیش مار'' مورخہ 10 مئی 1978ء

جو طریقے استعمال کیے جاتے ہیں، ایک فلسطینی کی حیثیت سے مجھے ان پر غصہ بھی آتا ہے اور میں ان کی مذمت بھی کرتا ہوں۔ تاہم ایک ایسے شخص کی حیثیت سے، جو ہر قسم کے مختلف طریقوں سے اس مسئلے سے اثر انداز ہوا ہے، میں یہ ضرور کہوں گا............ میں یہاں ایک واحد فلسطینی کی حیثیت سے بات کر رہا ہوں...... کہ یہ جو طیاروں کے اغوا کی وارداتیں ہوتی ہیں، جو لوگ ایسی مہموں پر نکل پڑتے ہیں جن میں خود ان کے اپنے ہلاک ہونے کا زیادہ احتمال ہوتا ہے (اسے وہ خودکشی کا مشن کہتے ہیں) یہ جو چھپ چھپ کر افراد کو قتل کیا جاتا ہے، یہ جو درسگاہوں اور ہوٹلوں کو بم باری کا نشانہ بنایا جاتا ہے، اس قسم کی باتوں نے مجھے دہلا دیا ہے۔ اس دہشت گردی نے جو اپنے ستم رسیدگان پر بجلی بن کر ٹوٹ پڑتی ہے، مجھ پر لرزہ طاری کر دیا ہے اور مجھے تو اس دہشت گردی سے بھی ہول آنے لگا ہے جو ان فلسطینی مردوں اور عورتوں کے دلوں اور دماغوں میں جاگزیں ہو گئی ہے۔

جنھیں حالات نے اس قسم کی کارروائیاں کرنے پر مجبور کر دیا۔ چونکہ میں اس قسم کا کوئی جھوٹا دعویٰ نہیں کرتا کہ میں یہ کتاب ایک غیر جانبدار یا لاتعلق مبصر کی حیثیت سے لکھ رہا ہوں، مجھے یہ یقین ہے کہ خود دہشت گردی پر سامنے سے حملہ کرنے کی کوشش کرنے کے بجائے میرے لیے یہ بہتر ہو گا کہ میں اپنے قارئین تک اس وسیع تر فلسطینی داستان کے کچھ معانی پہنچانے کی سعی کروں جس کی یہ سب باتیں شاخسانہ ہیں، اور اگر اپنے اختتام پر یہ داستان ضیاع اور مصائب و آلام کے المیوں کی شدت کم نہ کر سکے...... اور یہ کر بھی نہیں سکتی...... تو بھی یہ کم از کم ان قارئین کے سامنے وہ کچھ تو پیش کر دے گی جو اب تک ان کی نظروں سے اوجھل رہا ہے یعنی ان پر اس اجتماعی قومی زخم کی حقیقت عیاں ہو جائے گی جو ہر فلسطینی کے لیے مسئلہ فلسطین میں موجود ہے۔

ایک چھوٹی سی غیر یورپی قوم کی منجملہ دیگر خصوصیات کے ایک خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ اس کی تحویل میں دستاویزوں، تاریخ کی کتابوں، خود نوشت سوانح عمریوں، ڈائریوں، روزنامچوں اور اس قسم کی دیگر تحریروں کا وافر ذخیرہ نہیں ہوتا۔ فلسطینیوں کے معاملے میں بھی یہ بات درست ہے اور فلسطینی تاریخ کے متعلق اگر کوئی عظیم اور مستند کتاب نہیں ملتی تو اس کی وجہ بھی یہی ہے۔ میں نے یہاں اس کمی کی تلافی کرنے کی کوشش نہیں کی اور میرا ایسا نہ کرنے کی وجوہات بالکل صاف طور پر واضح ہیں۔ میں نے اس کتاب میں جو کچھ پیش کرنے کی سعی کی ہے، وہ یہ ہے کہ فلسطینی تجربہ تاریخ کا ایک اہم اور ٹھوس جزو ہے اور یہ تاریخ کا ایک ایسا جزو ہے جسے صیہونیوں اور اہل مغرب دونوں نے زیادہ تر نظر انداز کر رکھا ہے۔ صیہونیوں نے اسے اس لیے نظر انداز کیا ہے کیونکہ ان کی تمنا یہ تھی کہ کاش ایسی تاریخ وقوع پذیر ہی نہ ہوتی اور یہاں تک یورپیوں اور

امریکیوں کا تعلق ہے، انھوں نے اس لیے اس سے آنکھیں پھیر لیں کہ دراصل ان کی سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ وہ اس کا کریں کیا۔ میں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ مسلم اور عیسائی فلسطینی، جو صدیوں سے فلسطین میں آباد چلے آرہے تھے، یہاں تک کہ 1948ء میں انھیں مار مار کر باہر بھگا دیا گیا، اسی تحریک کے ناشاد اور بدقسمت نخچیر تھے جس کا واحد مقصد عیسائی یورپ کے ہاتھوں یہودیوں کو ظلم و ستم سے نجات دلانا تھا لیکن یہ کتنی ستم ظریفی کی بات ہے کہ چونکہ صیہونیت یہودیوں کو فلسطین میں لانے اور انھیں ایک قوم کی صورت میں ڈھالنے میں بطریق احسن کامیاب رہی ہے، دُنیا کو اس بارے میں مطلق چتا نہیں ہوئی کہ اس مہم کے نتیجے کے طور پر فلسطینیوں پر کیا بیتی۔ انھیں گھر سے بے گھر ہونا پڑا۔ دَر دَر کی خاک چھاننا پڑی۔ ہر قسم کے پُرآشوب حالات اور مصائب و آلام کی بھٹی میں سے گزرنا پڑا لیکن کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ چنانچہ ضرورت اس بات کی ہے کہ کوئی ایسا ستم ظریف سامنے آئے جو تصویر کے دونوں رُخ دکھا سکے۔ اس تصویر کا ایک رُخ وہ کامیابی اور کامرانی ہے جس کے ڈنکے چار دانگِ عالم بج رہے ہیں اور دوسرا رُخ وہ تباہی و بربادی ہے جس کا بہتوں کو علم ہی نہیں ہے۔

اس تباہی کا نقشہ حنا ارینٹ [1] نے بدیں الفاظ کھینچا ہے:

> ''جنگ (عظیم دوم) کے بعد یہ ظاہر ہوگیا کہ یہودی مسئلہ، جو واحد ناقابلِ حل مسئلہ متصور ہوتا تھا، حقیقتاً حل ہوگیا ہے...... اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے جو ذرائع بروئے کار لائے گئے، ان کی مدد سے پہلے تو ایک علاقے میں نوآبادیاں تعمیر کی گئیں اور پھر اس کی تسخیر عمل میں آئی...... لیکن اس سے نہ تو اقلیتوں کا مسئلہ حل ہوا اور نہ ان لوگوں کا جن کا کوئی وطن نہیں رہا تھا۔ ہماری صدی کے عملاً تمام دوسرے واقعات کی طرح یہودی مسئلے کے حل نے بھی پناہ گزینوں کی محض ایک نئی قسم...... عرب...... پیدا کر دی۔ اس طرح ان لوگوں کی تعداد میں، جن کا کوئی اپنا وطن نہیں تھا، سات سے آٹھ لاکھ افراد کا اضافہ ہوگیا۔''[2]

جیسا کہ میں نے اس کتاب میں بار بار اس بات کی تکرار کی ہے کہ...... جہاں تک اسرائیل اور اس کی تاریخ کا تعلق ہے، اس کی تعریف کے تو نہایت تسلسل کے ساتھ پُل باندھے گئے ہیں لیکن جہاں تک فلسطینیوں

---

① حنا ارینٹ (Hannah Arendt) 1906-75ء ایک جرمن نژاد امریکی مؤرخ

② حنا ارینٹ: "The Origins of Totalitarianism" New York Harcourt Brace Jownoivich (صفحہ نمبر 29)

کی حقیقی صورتِ حال کا تعلق ہے کہ وہ بھی گوشت پوست کے انسان ہیں اور جیسے تیسے اپنی زندگی گزار رہے ہیں، ان میں سے ہر شخص کی ایک چھوٹی موٹی داستانِ حیات ہے اور اس کی یہ داستان ان مصائب و آلام سے عبارت ہے جو اسے برداشت کرنا پڑے، اور یہ کہ ان لوگوں کی بھی کچھ امنگیں ہیں، کچھ آرزوئیں ہیں۔ پہلے تو کوئی مانتا ہی نہیں تھا کہ حقیقت میں ان لوگوں کا بھی کوئی وجود ہے، خیر اب اتنا تو تسلیم کر لیا گیا ہے کہ یہ لوگ واقعی روئے زمین پر موجود ہیں۔ اب حالات نے کچھ پلٹا کھایا ہے اور اچانک مسئلہ فلسطین بہت اہمیت اختیار کر گیا ہے اور ایک حل کا متلاشی ہے۔ عالمی رائے عامہ مطالبہ کر رہی ہے کہ اس مسئلے پر، جسے اب تک حقارت سے نظر انداز کیا جاتا رہا ہے لیکن جو مشرقِ وسطیٰ کے تعطل میں مرکزی نقطے کی حیثیت رکھتا ہے، مناسب توجہ دی جائے جس کا کہ وہ مستحق ہے۔ لیکن بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان سب باتوں کے باوجود کوئی معقول اور تسلی بخش حل تو بہت دُور کی بات ہے، اس معاملے کے بارے میں مناسب و موزوں بحث و تمحیص کا امکان بھی دھند لکے میں لپٹا ہوا ہے۔ بحث مباحثہ تو تب ہو جب حالات سازگار ہوں اور یہاں، جیسا کہ میں پیشتر ازیں بھی عرض کر چکا ہوں، یہ حال ہے کہ (مغرب میں) فلسطینیوں کے متعلق یہ تاثر گہرا اور پختہ ہو چکا ہے کہ وہ بس پناہ گزیں ہیں، انتہا پسند ہیں اور یا پھر دہشت گرد ہیں، پھر ان کے بارے میں عام بحث مباحثہ کیسا؟ مشرقِ وسطیٰ کے ''ماہرین'' کا ایک خاصا بڑا طبقہ اس بحث و تمحیص پر اپنی اجارہ داری قائم کرنے پر تُلا رہتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اس کے افراد عمرانی علوم کی گھسی پٹی اصطلاحیں، جنھیں ان کے علاوہ اور کوئی نہیں سمجھتا، اور بوسیدہ نظریاتی آرا، جنھیں علم کا لبادہ اوڑھا کر پیش کیا جاتا ہے، استعمال کرتے ہیں اور میرے خیال میں سب سے اہم بات وہ تہذیبی اور ثقافتی رویہ ہے جو اہلِ مغرب کے رگ و پے میں سما چکا ہے اور جس کے ماخذ وہ صدیوں پرانے تعصّبات ہیں جو وہ (اہلِ مغرب) اسلام، عربوں اور مشرق (اورینٹ) کے متعلّق روا رکھتے ہیں۔ چونکہ فلسطینی بھی مشرقی ہیں، عرب ہیں اور زیادہ تر اسلام کے پیروکار ہیں،، اس لیے ان کے بارے میں بھی اہلِ مغرب نے یہی رویہ اپنا لیا ہے۔ اس رویے نے جس سے اپنی باری آنے پر صیہونیت نے فلسطینیوں کے متعلّق اپنا نقطۂ نظر اخذ کیا، ہمیں انسانیت کے زمرے سے خارج کر دیا اور ہمیں ایک ایسی چیز بنا دیا جو وبالِ جان ہو، اس لیے بمشکل قابلِ برداشت ہو۔

یہ کہنا تو شاید زیادتی ہوگا کہ مشرقِ وسطیٰ اور فلسطینیوں کے متعلّق معاشرتی علوم کے نقطۂ نظر سے جو علمی مطالعے منظرِ عام پر آتے ہیں، ان سب میں اس روایت کو جاری رکھا گیا ہے لیکن میرے خیال میں یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ ان کا رجحان اسی طرف ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ان میں اکثر مطالعے اس

اندازِ فکر کی، جس نے فلسطینی حقوق کے مقابلے میں صیہونیت کو جائز قرار دے دیا ہے، خوشہ چینی کرتے ہیں اور بے شمار اہم امور میں اسے بلا چون و چرا صحیح تسلیم کر لیتے ہیں، تو یہ کہنا پڑے گا کہ اس صورت میں یہ (مطالعے) بیکار کی اشیا بن جاتے ہیں اور مشرقِ وسطیٰ کی حقیقی صورتِ حال کی تفہیم میں وہ کسی قسم کی مدد نہیں کرتے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جنگِ عظیم دوم کے بعد اس ملک (امریکا) میں جدید مشرقِ وسطیٰ کے (امور و حالات کے) متعلق جتنے بھی سنجیدہ مطالعے پیش کیے گئے ہیں، ان میں سے تقریباً ایک بھی ایسا نہیں جس نے کسی ایک شخص کو بھی اس صورتِ حال کے متعلق تیار کیا ہو جو اس علاقے میں رونما ہو رہی ہے معاملہ خواہ ایران کے حالیہ واقعات کا ہو یا لبنان کی خانہ جنگی کا، فلسطینیوں کی مزاحمت کا ہو یا 1973ء کی جنگ میں عربوں کی کارکردگی کا، یہ بات ان سب پر صادق آتی ہے۔ میرا یہ قطعاً ارادہ نہیں کہ میں اپنی اس کتاب کو عمرانی علوم کی ان تصنیفات کی اور خاص طور پر ان تصنیفات کی، جو سرد جنگ کے آغاز کے بعد سپردِ قلم کی گئی ہیں، استدلالی انداز سے تردید کرنے کا ذریعہ بنا لوں، جن کے متعلق بڑے طمطراق سے یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ان میں سائنسی معروضیت اختیار کی گئی ہے حالانکہ ان کے متعلق کسی نے یہ بالکل صحیح کہا ہے کہ ان پر نظریاتی تعصب کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ اس قسم کا استدلالی انداز، جو محض دوسروں کے نقطۂ نظر کی تردید کے لیے اختیار کیا جاتا ہے، عموماً (اخلاقی) ''اقدار سے عاری'' ہوتا ہے اور اس لیے اس میں لغزشوں کا امکان بھی زیادہ ہوتا ہے۔ میرا شعوری طور پر یہ پختہ ارادہ ہے کہ میں اس قسم کی لغزشوں سے اپنا دامن بچائے رکھوں۔ دوسری باتوں کے علاوہ ان لغزشوں میں مندرجہ ذیل بھی شامل ہیں:

سیاسی حقائق کی وہ کہانیاں اور رپورٹیں جن میں توجہ کا مرکز محض عظیم طاقتوں کی رقابت اور چشمک کو بنایا گیا ہو۔ ایسی نگارشات جن میں یہ دعویٰ کیا گیا ہو کہ ہر وہ چیز قابلِ قبول اور قابلِ تمنا ہے جس کا تعلق مغرب سے ہو جس کا مقصد تیسری دُنیا کے ممالک پر جدیدیت کا رنگ چڑھانا ہو۔

ایسی تحریریں جن میں عوامی تحریکوں کو تو نظر انداز کر دیا جاتا ہے لیکن ظالم و جابر اور معمولی یا اوسط درجے کی چھچھ حکومتوں کی، جنھوں نے کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دیا ہوتا، تعریفوں کے پُل باندھے جاتے ہیں اور انھیں شیر بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔

ایسی تصنیفات جن میں ہر اس چیز کو جو آسانی سے کسی بنے بنائے مخصوص سانچے میں ٹھیک طرح سما نہ سکے یا جس پر کسی مخصوص طریقۂ فکر، طریقۂ عمل یا اصول کا اطلاق نہ ہو سکتا ہو، حالانکہ اس کے مقاصد ''تعقلی''، ''تجربی'' اور ''عملی'' ہوتے ہیں، یہ کہہ کر مسترد کر دیا جاتا ہے کہ یہ تاریخ کے اصولوں کے مطابق نہیں۔

ان تصورات میں جو فاش خامیاں ہیں، انھیں علانیہ اس بات کا ذمے دار ٹھہرایا گیا کہ ایران ''ہمارے''

ہاتھوں سے نکل گیا یا یہ کہ ''ہم'' اسلام کے احیائے نو کے متعلق پیش گوئی کرنے سے قاصر رہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس بات کی کوئی گنجائش نہ چھوڑی گئی کہ یہ تصورات جن مقدمات پر قائم ہیں، ان کا جائزہ لیا جا سکے۔ چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ انھیں تصورات پر دوبارہ اصرار ہو جاتا ہے اور ایک مرتبہ پھر عمرانی علوم کے ماہرین، جنھیں فیصلے مرتب کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کرنا ہوتا ہے، کوتاہ نظری پر مبنی انھی چیزوں کا دوبارہ مشورہ دینے لگتے ہیں اور ایک مرتبہ پھر امریکا کی خارجہ پالیسی کو ایسے مقاصد کے حصول کے لیے داؤ پر لگا دیا جاتا ہے جو (میرے جیسے) غیر ماہرین کی نظروں میں کبھی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتے یا پھر اس پالیسی کو رجعت پسندانہ تاریخی خوابوں کی تکمیل کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ اس قسم کے خواب بھی کبھی پورے نہیں ہو سکتے اور جبکہ میں یہ سطور سپردِ قلم کر رہا ہوں، کیمپ ڈیوڈ کے معاہدوں کے فاش نقائص نے میرے نکتے کو صحیح ثابت کرنا شروع کر دیا ہے۔

تاہم میرا خیال ہے کہ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ 1976ء تک صیہونیوں اور ماہرین کے ہاتھوں فلسطینیوں کی جو سبکی اور بے وقری ہوتی رہی اور نتیجتاً انھیں جس طرح بے وقعت گردانا گیا، اس سے خود فلسطینی بھی متفق تھے۔ پھر ہم نے اپنے آپ کو دریافت کر لیا۔ ہم نے دُنیا کو دریافت کیا اور دُنیا نے ہمیں دریافت کر لیا۔ ہم جس طرح رات کے اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہے اور پھر جس طرح آہستہ آہستہ ہماری بیداری ہوئی، میں نے اسے بیان کرنے کی کوشش کی ہے تاہم اس سرزمین (فلسطین) پر، علاقے پر، عالمی سیاست وغیرہ وغیرہ پر جس طرح ہماری زندگی کا سورج غروب ہوا، اسے بھی میں نے نظر انداز نہیں کیا لیکن اس سارے تجربے کے دوران میں وہ عنصر، جو صیہونیت نے تشکیل کیا تھا، ہمارے ساتھ رہا۔ ہمارے لیے نہ تو یہ کوئی نظری مسئلہ تھا اور نہ دُشنام طرازی کا معاملہ۔ انداز مختلف سہی لیکن صیہونیت ہمارے لیے بھی اتنی ہی اہم ہے جتنی کہ یہ یہودیوں کے لیے ہے۔ ہمیں اس کے متعلق دُنیا کو جو لازماً بتانا چاہیے، وہ یہ ہے کہ اس کا مفہوم کس طرح ہمارے لیے چند ٹھوس چیزوں کی صورت میں نکلا جن کی زندہ نشانیاں ہم اجتماعی طور پر اٹھائے پھر رہے ہیں۔

میں نے اپنی کتاب کو ایک سیاسی مقالہ کہا ہے کیونکہ میں نے اس میں فلسطینیوں کے مسئلے کو امریکی قارئین کے سامنے اس انداز سے نہیں پیش کیا جیسے یہ کوئی ایسی چیز ہو جو نہ تو کسی بیرونی چیز سے متاثر ہوتی ہو اور نہ کسی بیرونی چیز پر اثر انداز ہو سکتی ہو اور نہ میں نے اسے ایک کامل چیز بنا کر پیش کیا ہے کہ اس پر مزید کچھ کہنے سننے کی گنجائش ہی نہ ہو بلکہ میں نے اسے ایک ایسی چیز کے طور پر پیش کیا ہے جس پر غور کیا جانا چاہیے، جسے آزما کر دیکھنا چاہیے، جس پر توجہ دی جانا چاہیے۔...... قصہ مختصر، میں نے اسے ایک ایسا موضوع بنا کر پیش کیا ہے جس سے سیاسی طور پر نپٹا جانا چاہیے۔ ہم کافی عرصے تک نہ تو تاریخ کی کتابوں اور مضمونوں کا عنوان

بن سکے اور نہ کسی نے ہمارے متعلق بحث و تمحیص کی ضرورت محسوس کی۔ اپنے ہی منکسرانہ انداز سے یہ کتاب فلسطین کے مسئلے کو ایک ایسا موضوع بنانے کی کوشش کرتی ہے جس پر بحث و تمحیص ہونا چاہیے اور جس کی سیاسی تفہیم ہونا چاہیے۔ مجھے اُمید ہے کہ قارئین بہت جلد اس نتیجے پر پہنچ جائیں گے کہ اس کتاب میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے، وہ کسی ''ماہر''[1] کا نقطۂ نظر نہیں اور نہ یہ کوئی ذاتی گواہی قسم کی چیز ہے، بلکہ یہ ان حقیقتوں کا ایک سلسلہ وار بیان ہے جن کا (فلسطینی عوام یا دوسروں کو) تجربہ ہو چکا ہے۔ اس کی بنیاد انسانی حقوق اور معاشرتی تجربے کے تضادات پر رکھی گئی ہے اور حتیٰ الوسع اسے ایک ایسی زبان میں تحریر کیا گیا ہے جسے عام لوگ اپنی زندگی میں روزانہ استعمال کرتے ہیں۔

کتاب میں جس استدلال سے کام لیا گیا ہے۔ اس کی تشکیل چند ایک اساسی مقدمات سے ہوئی ہے۔ ان میں سے ایک مقدمہ یہ ہے کہ ایک قوم، جسے فلسطینی عرب قوم کہا جاتا ہے، (روئے زمین پر) مسلسل موجود رہی ہے۔ دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ صیہونیت اور عالمِ عرب کے مابین جو تعطل پایا جاتا ہے، اس کی تفہیم کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس تجربے کو سمجھنے کی کوشش کی جائے جو کہ فلسطینیوں کو ہوا ہے۔ ایک اور مقدمہ یہ ہے کہ اسرائیل کی خود بھی اور اس کے حامیوں کی بھی اقوال و افعال دونوں طرح سے یہ کوشش رہی ہے کہ جیسے بھی ہو، فلسطینیوں کا نقش محو کر دیا جائے کیونکہ کئی (اگرچہ سارے نہیں) اعتبار سے یہودی مملکت کی تعمیر فلسطین اور فلسطینیوں کی نفی پر کی گئی ہے۔ اسرائیل نے ہمارے ساتھ جو کچھ کیا ہے، ہمارا محض وجود ہی اس کو اس بارے میں موردِ الزام ٹھہرانے کے لیے کافی ہے۔ چنانچہ ایک نمایاں حقیقت یہ ہے اور یہ حقیقت آج بھی اپنی جگہ پر موجود ہے کہ اگر آپ نے اسرائیل میں یا کسی کٹر صیہونی کے سامنے فلسطین یا فلسطینیوں کا محض نام لے دیا ہے جس کا نام لینا ہی ان کے نزدیک گناہ ہے اور آخری بات جسے میں اخلاقی طور پر اس قدر صحیح تصور کرتا ہوں کہ اس میں کسی اگر مگر کی گنجائش ہی نہیں، یہ ہے کہ تمام انسان انفرادی طور پر بھی اور گروہی حیثیت سے بھی اس بات کے مستحق ہیں کہ انھیں بنیادی حقوق جن میں خود ارادیت کا حق بھی شامل ہے، حاصل ہوں۔ ان حقوق سے میری مراد یہ ہے کہ

کسی انسان کو، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اپنے گھر یا وطن سے ''منتقلی'' کی دھمکی نہیں دی جانا چاہیے۔

---

[1] یہاں اس لفظ سے مراد مغرب کے وہ لوگ ہیں جو اپنے بارے میں یہ گمان کرتے ہیں کہ انھیں مشرقِ وسطیٰ کے امور و معاملات پر پورا عبور حاصل ہے۔

کسی انسان کے خلاف محض اس بنا پر امتیاز نہیں برتا جانا چاہیے کہ وہ الف یا ب مذہب کا ماننے والا نہیں۔

کسی انسان کو کسی صورت میں بھی اور کسی بنا پر بھی اپنے وطن، قومی شناخت یا ثقافت سے محروم نہیں کیا جانا چاہیے۔ میرا اندازہ ہے کہ میں اس کتاب میں جو بنیادی سوال اُٹھا رہا ہوں، وہ یہ ہے:

''فلسطینیوں کے بارے میں اسرائیل کیا کرنا چاہتا ہے، امریکا کیا کرنا چاہتا ہے اور عرب کیا کرنا چاہتے ہیں؟''

اگر فلسطینی تجربے کی حقیقتیں تسلیم کر لی جائیں تو میں نہیں سمجھتا جیسا کہ صدر سادات اور ان کے مختلف حامی ہمیں یہ باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ننانوے فیصد پتے امریکا کے ہاتھ میں ہیں، اور نہ مجھے یہ یقین ہے کہ وہ (پتے) زیادہ تر اسرائیل یا عرب مملکتوں کے ہاتھوں میں ہیں۔ اصل بات...... جس نے اس کتاب کا معرضِ وجود میں آنا ممکن بنایا...... یہ ہے کہ اگر ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ فلسطینی ہاتھ بھی خالی نہیں، ان کے پاس بھی کچھ پتے ہیں اور یوں کہنا چاہیے کہ یہی وہ پتے ہیں جو ان کی اُمنگوں اور آرزوؤں، ان کی جدوجہد اور کامیابیوں (اور ناکامیوں) کو متعین کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ تاہم مجھے اس بات سے انکار نہیں کہ مسئلہ فلسطین کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اب یہودی اور امریکی کیا سوچتے اور کیا کرتے ہیں اور یہی وہ پہلو ہے جس پر اس کتاب میں توجہ دی گئی ہے۔

میں ایک بات کا ذکر، جو اظہر من الشمس ہے، اس لیے کر رہا ہوں تا کہ اس بنیادی وجودی اصول کی اہمیت واضح ہو سکے جس پر میرے خیال کے مطابق ایک قوم کی حیثیت سے ہمارے تجربے کا انحصار ہے۔ ہم ایک سرزمین پر رہتے تھے جسے فلسطین کہا جاتا تھا۔ ہمیں جس طریقے سے بے دخل کیا گیا اور جس طرح ہمارا وجود مٹانے کی کوشش کی گئی، کیا یہ باتیں محض اس لیے جائز تھیں کہ ان یہودیوں کو، جو نازیت کی بھینٹ چڑھنے سے بچ گئے تھے۔ سہارا دیا جا سکے؟ (یہودیوں کو سہارا دینا قابلِ تعریف بات سہی لیکن) اس عمل میں ہم میں سے تقریباً دس لاکھ فلسطینیوں کو اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا اور ہمارے معاشرے کو ناموجود بنا دیا گیا۔ وہ کون سا اخلاقی یا سیاسی معیار ہے جس کی بنا پر ہم سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ ہم اپنے قومی وجود، اپنے وطن اور اپنے انسانی حقوق اور دعاوی سے دست بردار ہو جائیں؟ جب ایک پوری قوم کو یہ ''مژدہ'' سنایا جاتا ہے کہ وہ قانونی اعتبار سے غیر حاضر ہے، بلکہ اس کے خلاف فوجیں بھی استعمال کی جاتی ہیں (تا کہ اس کا نام ونشان مٹایا جا سکے) اس کے نام کے خلاف مہمیں چلائی جاتی ہیں (تا کہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ اس نام کی کوئی قوم روئے زمین پر موجود نہیں) اس کی تاریخ تبدیل کر دی جاتی ہے تا کہ دُنیا کو یہ ''باور'' کرایا جا سکے کہ اس کا تو

کوئی وجود ہی نہیں، تو پھر ہمیں یہ بتایا جائے کہ وہ کون سی دُنیا ہے جہاں اس کی قسم کی باتوں اور ہتھکنڈوں کے خلاف کوئی دلیل کام نہیں آسکتی؟ اگرچہ وہ تمام مسائل، جنھوں نے فلسطینیوں کے اردگرد حصار بنا رکھا ہے، پیچیدہ ہیں اور ان میں عظیم طاقتوں کی سیاست، علاقائی تنازعات، طبقاتی کشمکش اور نظریاتی کشیدگی سبھی کچھ ملوث ہے لیکن فلسطینی تحریر کو جس قوت نے زندہ وتوانا رکھا ہے اور جس نے اس میں نئی رُوح پھونکی ہے، وہ یہ ہے کہ اسے ان سادہ لیکن انتہائی اہمیت کے حامل مسائل سے آگہی ہے۔

جب امریکا ایشیا اور افریقا کے متعلق اپنی خارجہ پالیسی کی تشکیل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو فلسطینی واحد ایسی قوم نہیں جس کے متعلق وہ غلط اندازے لگاتا ہے یا جسے وہ نظر انداز کر دیتا ہے (کئی اور کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوتا ہے) جنوری 1979ء میں جس طرح ایرانی حزبِ اختلاف نے شاہ کی حکومت کا تختہ اُلٹا، یہاں اس کا ذکر یقیناً برمحل ہے۔ (امریکا نے ایران کے متعلق بالکل غلط تخمینے لگائے حالانکہ) اس کے پاس معلومات کا فقدان نہیں تھا (بے شک صدر کارٹر نے ''گھنا'' بن کر اور زمانہ سازی سے کام لے کر ایران میں ناکامی کا الزام ''خفیہ معلومات فراہم کرنے والے اداروں'' کے سر دھر دیا تھا لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ انھیں سب حالات کا علم تھا) اگر افراد کے بارے میں یہ بات درست ہے کہ وہ پیچیدہ اور بے ترتیب حقیقتوں کے صاف سُتھرے اور عام فہم حل چاہتے ہیں تو ظاہراً اداروں اور حکومتوں کے بارے میں بات بالکل غلط ہونا چاہیے لیکن جہاں تک فلسطینی مسئلے کا تعلق ہے، امریکی حکومت کے بارے میں یہ بات بالکل صحیح ہے۔ موجودہ انتظامیہ اس اعلان کے ساتھ برسرِاقتدار آئی تھی کہ وہ مشرقِ وسطیٰ کے امن کے متعلق ایک جامع سمجھوتے کے حق میں ہے۔ اس جامع سمجھوتے میں یہ مفروضہ بھی شامل تھا کہ مسئلہ فلسطین کا ''اس کے تمام پہلوؤں سمیت'' ایک منصفانہ حل تلاش کیا جائے گا لیکن جب سے کیمپ ڈیوڈ کے معاہدے منظرِ عام پر آئے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ یہ (امریکی انتظامیہ) اس مسئلے کا مجموعی طور پر جائزہ لینے یا کسی بھی لحاظ سے اس کے ساتھ سنجیدگی سے عہدہ برآ ہونے میں بے بس ہوگئی ہے۔ اس نے یہ کیسے فرض کر لیا ہے کہ تمام دوسری قوموں نے جو کچھ قبول کیا ہے، یہ چالیس لاکھ باشندے اس سے کم تر (نام نہاد حکومت خوداختیاری) پر راضی ہو جائیں گے؟ اس نے یہ کیوں فرض کر لیا ہے کہ تنازعے میں ملوث ایک بڑے فریق کی عدم موجودگی میں صلح ناموں پر دستخط کیے جا سکتے ہیں؟ اس نے یہ کیونکر فرض کر لیا ہے کہ علاقے کی سٹیج پر جو سب سے بڑا کردار فعال طور پر سرگرم عمل ہے، اس کا کبھی سامنا کیے بغیر ہی خارجہ پالیسی چلائی جاسکتی ہے؟ اس نے یہ کیوں فرض کر لیا ہے کہ چونکہ آپ کی تمنا ہے کہ طاقت ور مخالف گروپ نظروں سے اوجھل ہو جائیں تو وہ چٹکی بجاتے نظروں سے اوجھل ہو جائیں گے؟ اس نے یہ کیسے فرض کر لیا ہے کہ فلسطینیوں کو مستقلاً اسرائیل کی نوآبادی بننے پر رضامند ہونا چاہیے جبکہ دُنیا کی

کوئی دوسری قوم ایسا کرنے کے لیے تیار نہیں؟ اس نے یہ کیوں فرض کر لیا ہے کہ فلسطینی اپنے قومی حقوق کی بازیابی کے لیے، جن سے انھیں محروم کیا گیا ہے، جو غصب کر لیے گئے ہیں، جنھیں پاؤں تلے کچل دیا گیا ہے، غیر معینہ عرصے تک جنگ جاری نہیں رکھ سکیں گے (حالانکہ وہ مشرقِ وسطیٰ کے ہر بحران میں نبرد آزما رہے ہیں)؟ یہ ہیں وہ سوالات جو ان حیران کن حد تک ہنگامہ خیز تبدیلیوں کے پسِ منظر میں، جو اس وقت مشرقِ وسطیٰ میں رونما ہو رہی ہیں، یہ کتاب اُٹھانے اور ان کے جوابات مہیا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ مجھے یہ بھی امید ہے کہ اس کتاب کے اختتامی باب میں قارئین کو ان فوری اہمیت کے حامل مسائل کے منصفانہ تجزیے کا تفصیلی ذکر بھی ملے گا جو کیمپ ڈیوڈ کے معاہدوں کے بعد مشرقِ وسطیٰ کے بارے میں امریکی پالیسی، عرب اور علاقائی سیاست اور فلسطینیوں کے مؤقف اور ان کے رویوں کا تعین کر رہے ہیں۔

میں یہ کتاب آسانی سے نہیں لکھ سکا۔ اس کا بیشتر حصہ جدید فلسطینی تاریخ کے مفہوم کے مطالعے اور اس پر غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ تاہم اس کتاب کا ایک اچھا خاصا حصہ اس فعال شرکت کا ثمر ہے جو فلسطینیوں کے حقِ خود ارادیت کے حصول میں اکثر حوصلہ شکن تلاش میں کی گئی۔ (کم از کم میں اپنے بارے میں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ) میں نے اس تلاش میں جو شرکت کی، وہ جلاوطنی کی حالت میں کی۔ چنانچہ ناگزیر طور پر روزمرّہ کے واقعات، خبروں، اچانک تبدیلیوں اور اتفاقی گفتگوؤں نے میرے اعصاب پر شدید بوجھ ڈالا اور رہی سہی کسر غلط قسم کی تصریحات نے پوری کر دی۔ مجھے اندیشہ ہے کہ میں اس نوعیت کی باتوں کے اثرات سے بچ نہیں سکا ہوں گا۔ بہرحال ان (اثرات) سے بالکل ہی بچ نکلنا بھی غلط ہوتا۔ تاہم مجھے اس بات کا شعور ہے کہ میں نے تو حالیہ تاریخ کی محض تلخیص ہی پیش کی ہے اور نہ مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کے متعلق محض پیشین گوئی کی ہے بلکہ اس سے بڑھ کر کچھ کرنے کی کوشش کی ہے۔ فلسطینیوں کو جو تجربہ ہوا ہے اور عصری سیاسی منظر کے ساتھ اس تجربے کو جو مناسبت ہے، مجھے امید ہے کہ میں ان دونوں کی فلسطینی نقطۂ نظر سے تشریح و تعبیر کرنے میں کامیاب رہا ہوں۔ ایک فلسطینی کی حیثیت سے اپنی ذات کے متعلق اپنے خیالات و احساسات کی یوں تشریح کرنے سے محسوس ہوتا ہے، جیسے آپ اپنے آپ کو جنگ کے لیے آمادہ و تیار کر رہے ہوں۔ مغرب کا، جہاں میں رہتا ہوں، رویہ یہ ہے کہ وہ ہر اس شخص کو جو فلسطینی ہونے کا دعوے دار ہو، سیاسی اعتبار سے ایک قسم کا راندۂ قانون (یا اشتہاری مجرم) تصور کرتا ہے۔ اگر وہ اسے مفرور یا اشتہاری مجرم نہ بھی سمجھے تو بھی وہ اسے معاشرے سے باہر کا فرد تو ضرور قرار دے دیتا ہے اور یوں وہ اس سے کسی قسم کا راہ و رسم بڑھانے کا روادار نہیں ہوتا۔

اس کتاب کا مسودہ تیار کرنے میں ڈیبی روجرز، اسما خولی اور پال لی پاری نے میری جو مدد کی ہے، میں

اس کے لیے ان کا ممنون ہوں۔ اپنے ہم وطن فلسطینیوں کے ساتھ، جنھوں نے میری طرح ایک قوم کی حیثیت سے اپنی صورتِ حال سمجھنے کی کوشش کی ہے، میری جو برسوں بحثیں ہوتی رہی ہیں، میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا، سمجھا اور حاصل کیا ہے۔ میرے ان نفیس دوستوں نے بھی، جو اس ملک (امریکا) میں، اسرائیل میں اور عرب ممالک میں رہتے ہیں۔ اپنے اپنے علم میں مجھے شریک کیا ہے۔ تاہم فرداً فرداً ان کے نام گنوانا اور ان کے سامنے اپنی مخصوص احسان مندی کا اظہار کرنا، اس تجربے کو، جس میں ہم سب شریک رہے ہیں اور جس کے بغیر یہ کتاب تحریر نہیں کی جاسکتی تھی، غیر ضروری طور پر حقیر بنانا یا خواہ مخواہ اس کی اہمیت گھٹانا ہے۔

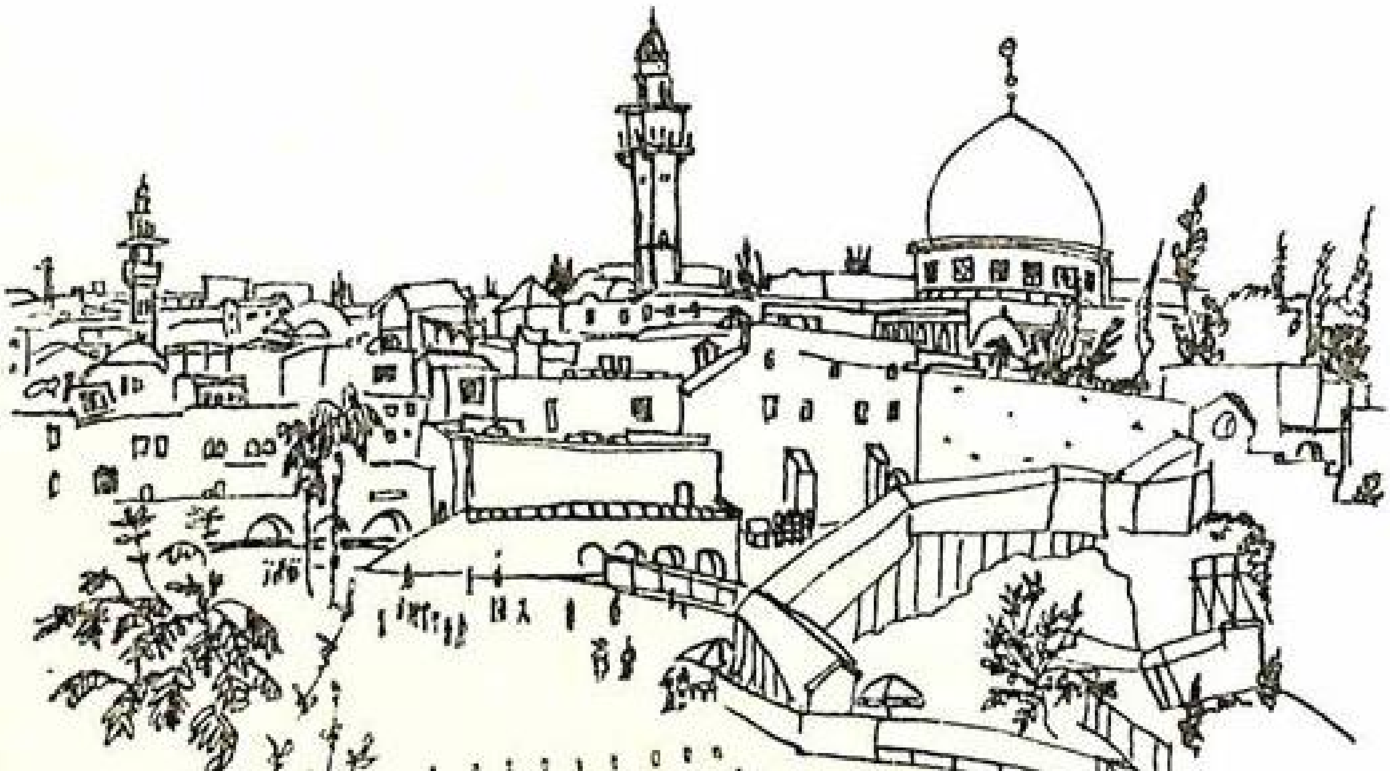
میرے ان دو دوستوں کے اذہان میں، جن کے ناموں کو صفحۂ انتساب پر یادگار بنایا گیا ہے، کبھی اس قسم کا تصور بھی نہیں آیا ہوگا کہ ان کی زندگیاں مجھے اتنا متاثر کریں گی اور میری ذات پر ان کے اتنے گہرے نقوش ثبت ہوں گے، میرے یہ دونوں دوست فلسطینی تھے۔ جلاوطنوں کی حیثیت سے دونوں کی زندگیاں بہت عجیب و غریب انداز سے گزریں اور مرتے دم تک دونوں کے ذہنوں پر یہ خبط بھوت بن کر سوار رہا کہ وہ جلاوطن ہیں اور پھر جب انھوں نے موت کو گلے لگایا تو وہ بھی ان کے لیے مسرّت کا کوئی پیغام نہ لائی بلکہ یہ موت بھی تلخی سے بھرپور، ناشاد اور افسوس ناک تھی۔ میری رائے میں دونوں ہی نہایت عمدہ اور اچھے انسان تھے۔ فرید حداد ایک ڈاکٹر تھا۔ وہ ایک عرب ملک میں رہتا تھا اور وہیں اس کا انتقال ہوا۔ میں اسے کئی سالوں سے جانتا تھا اور مجھ سے بہتر کسی اور کو یہ علم نہیں تھا کہ اسے نہ صرف اس بات کا شدید احساس تھا کہ انسانی ناانصافی کیا ہوتی ہے اور کیوں ہوتی ہے بلکہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے متعلق کیا کیا جانا چاہیے۔ وہ سرتاپا عینیت پسند اور بے غرض تھا۔ اسے قید خانے میں سخت ایذائیں دی گئیں اور وہیں 1961ء میں اس کا انتقال ہوا۔

تاہم اپنی زندگی کے آخری دم تک (جہاں تک میں یہ بات بتانے کے قابل ہوسکا ہوں) اس نے جو کچھ کیا، ایک انسان ہونے کے ناتے اور ایک سیاسی جنگ جو پسند ہونے کے ناتے کیا، نہ کہ اس لیے کہ وہ لازماً ایک فلسطینی تھا۔ راشد حسین ایک فلسطینی شاعر تھا۔ وہ استہزائی کام کا بادشاہ تھا۔ 1966ء تک وہ اسرائیل میں ہی مقیم رہا۔ پھر وہ امریکا چلا آیا اور مرتے دم تک وہیں آباد رہا۔ 1948ء (قیامِ اسرائیل کے بعد فلسطینی دیہاتوں پر جو کچھ بیتا اور وہاں زندگی نے جو رُخ اختیار کیا، اس کے متعلق میرا سارا علم اس کا مرہونِ منّت ہے۔ (فلسطینی دیہاتوں کی یہی وہ نئی زندگی ہے جس نے فلسطین کے مسئلے کو ایک فقید المثال قوت عطا کی ہے) جذبے کے اعتبار سے راشد حسین ایک کشادہ دل، عالی منش اور بے تعصب انسان تھا جو کچھ اس کے دل میں ہوتا تھا، وہی وہ زبان پر لے آتا تھا، سیاسی اعتبار سے وہ ایک بہت ایمان دار اور دیانت دار شخص تھا۔ اس

کی زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح تھی۔ چنانچہ جو شخص بھی اس سے ملتا تھا، اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔ وہ ایک ایسا فلسطینی تھا جو آزادانہ رائے کا مالک اور صحیح معنوں میں انقلاب کا شیدائی تھا۔ اپنے انھی نظریات کی بنا پر اسے بے پناہ مصائب کا سامنا کرنا پڑا اور یہی مصائب 1977ء میں اسے موت سے ہم کنار کر گئے۔ فلسطینی جس مقصد کے حصول کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں، فرید حداد اور راشد حسین نے اپنی عملی مثالوں سے مجھے اس کا مفہوم سمجھایا ہے۔ یہی وہ مقصد ہے جس پر اپنے بے شمار دوسرے ہم وطنوں کی طرح، جو دُنیا کے مختلف مقامات پر مقیم تھے، انھوں نے بھی اپنی جانیں نچھاور کر دیں۔

ایڈورڈ سعید

مسئلۂ فلسطین



پہلا باب

مسئلہ فلسطین

①

فلسطین اور فلسطینی

انیسویں صدی کے ساتویں آٹھویں عشرے کے اختتام تک ہر وہ چیز جو اس خیالی خبط کے، جو یونان اور ترکی کے مابین حدِ فاصل کا کام دیتا ہے، مشرق میں واقع ہے، ''اورینٹ'' کہلاتی تھی۔ چونکہ یہ لفظ یورپ والوں کی اختراع تھا، اس لیے (ان کے نزدیک) یہ لفظ کئی صدیوں تک ایک خاص قسم کی ذہنیت (جیسا کہ ''اورینٹل ذہن'' جیسی ترکیب اس کا منہ بولتا ثبوت ہے) اور چند مخصوص نوع کی ثقافتی، سیاسی بلکہ نسلی خصوصیات بھی (جیسا کہ مستبد اورینٹل حکمران، اورینٹل ہوس رانیاں اور شہوت پرستیاں اور اورینٹل شان وشوکت اور جاہ وجلال، اورینٹل پُراسراریت جیسے تصورات سے عیاں ہے) کی نمائندگی کرتا رہا لیکن یورپ والے جب بھی اورینٹ کا تصور باندھتے تو (یہاں کی بوقلمونی کو قطعاً نظرانداز کر کے) سبھی کو ایک ہی لاٹھی سے ہانک دیتے تھے اور سب کے متعلق بلاتمیز ایک عمومی رائے قائم کر لیتے تھے۔ (ان کے نزدیک) اورینٹ (مشرق) نہ صرف یہ کہ مختلف اور جہانِ دیگر تھا بلکہ یہ وہ سرزمین تھی جہاں کے فاصلے لامحدود تھے، جہاں کے باشندے جو زیادہ تر رنگ دار تھے، دیکھنے میں ایک ہی طرح کے نظر آتے تھے اور ان کے مابین امتیاز کرنا مشکل امر تھا۔ یہ رومانوں کی سرزمین تھی۔ یہاں کے مقامات ومناظر میں نامانوس اور اجنبی سحر تھا۔ ''عجائباتِ مشرق'' ایک طرح کی پُراسراریت میں ملفوف تھے۔ تاہم ہر وہ شخص جو ملکہ وکٹوریا کے آخری عہد کی سیاسی تاریخ سے

آگاہ تھے، ضرور جانتا ہوگا کہ اب یورپ والوں کو جس بات کی تشویش تھی، وہ ''اورینٹ'' نہیں تھا، بلکہ اس کی جگہ ایک نئے مسئلے نے لے لی تھی، جو بہت تکلیف دہ تھا، جس کی نوعیت زیادہ تر سیاسی تھی اور جسے انھوں نے ''مشرقی مسئلے'' کا نام دے دیا تھا، اندازہ لگایا گیا ہے کہ 1918ء تک یورپی اقوام زمین کے 85% رقبے پر اپنا نوآبادیاتی تسلط قائم کر چکی تھیں اور اس رقبے کا خاصا بڑا حصہ ان علاقوں پر مشتمل تھا، جسے پہلے محض اورینٹل ① کہا جاتا تھا اور اورینٹ کے ساتھ جو رومانی داستانیں وابستہ تھیں، وہ اب پادر ہوا ہو چکی تھیں۔ ان کی جگہ نئے مسائل نے لے لی تھی کہ اورینٹ کے ساتھ نپٹا کیسے جائے۔

ان میں پہلا مسئلہ تو یہ تھا کہ وہاں جو یورپی اقوام برسرِ پیکار تھیں ان کی آپس میں ہی مسابقت اور چپقلش چل رہی تھی۔ دوسرا مسئلہ خود محکوم اقوام کا تھا، جو اپنی آزادی کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھیں۔ چنانچہ اورینٹ اب کوئی ایسی جگہ نہیں رہ گیا تھا جو کہیں ''اُدھر'' واقع تھا بلکہ اب وہ ایک ایسی جگہ بن چکا تھا جس کے مسائل اس بات کے متقاضی تھے کہ ان پر فوری توجہ دی جائے، ان کی تمام جزئیات کی گہرائی تک جایا جائے۔ اب اورینٹ ایک خطہ نہیں تھا بلکہ یہ تو مختلف خانوں میں منقسم تھا۔ ان میں ایک خانہ وہ ہے جسے مشرقِ وسطیٰ کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا، آج بھی اسے اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ اورینٹ کا وہ خطہ ہے کہ جب بھی اس کا ذکر ہوتا ہے تو ذہن میں وہ بے شمار پیچیدگیاں، مسائل اور تنازعات ابھرنے لگتے ہیں جو اس کے ساتھ وابستہ ہیں اور اس کا مرکزی نقطہ وہ چیز ہے جسے میں مسئلۂ فلسطین کا نام دوں گا۔

جب ہم کسی موضوع، مقام یا شخص کا ''مسئلہ'' کی ترکیب استعمال کرتے ہیں تو ہم اس سے مختلف قسم کے کئی مفاہیم مراد لیتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص حالاتِ حاضرہ کا جائزہ لینے کے بعد اپنی بات کا اختتام بایں الفاظ کرتا ہے ''اب میں ''م'' کے مسئلے کی طرف آتا ہوں۔'' یہاں نکتہ یہ ہے کہ ''م'' ایک ایسا مسئلہ ہے جو دوسرے تمام مسائل سے علیحدہ اور مختلف ہے، اس لیے ہمیں اس سے علیحدہ ہی نبرد آزما ہونا ہوگا۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ جب ''مسئلہ'' کی ترکیب استعمال کی جاتی ہے تو اس سے اشارہ ایک ایسے مسئلے کی طرف کیا جاتا ہے جو بہت پرانا ہو، خصوصی طور پر گنجلک ہو، اور فوری توجہ کا متقاضی ہو۔ مثلاً حقوق کا مسئلہ، مشرقی (یورپی) ممالک کا مسئلہ، آزادیٔ افکار کا مسئلہ۔ تیسرا نکتہ یہ ہے (اور ان معنوں میں یہ ترکیب ذرا کم ہی استعمال کی جاتی ہے) کہ ''کا مسئلہ'' کی ترکیب ایک ایسے انداز سے استعمال کی جاسکتی ہے جس سے یہ مترشح ہو کہ اس ترکیب میں جس چیز کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے اس کی حیثیت عرفی غیر یقینی، مشتبہ اور غیر مستحکم ہے۔ لوخ نیس ② کی بلا کے وجود کا

① ایڈورڈ سعید: Orientalism!، ناشر: Pantheon۔ Books New York صفحات 31-49

مسئلہ اس کی واضح مثال ہے۔ جب ''نہ تو مسئلہ'' کی ترکیب فلسطین کے ضمن میں استعمال کی جاتی ہے تو اس میں تینوں قسم کے مفاہیم مضمر ہوتے ہیں۔ اورینٹ کی طرح، جس کا ایک جزو ہے، فلسطین بھی ایک دوسری دُنیا میں واقع ہے جو اس دُنیا سے قطعی مختلف ہے، جس سے یورپ اور امریکا کے باشندے آشنا ہیں اور جو بحرِاوقیانوس کے اردگرد آباد ہے۔ ایک لحاظ سے فلسطین ایک ایسا مسئلہ بھی ہے جو جنگِ عظیم دوم کے بعد دُنیا کا تکلیف دہ حد تک انتہائی متنازع مسئلہ بن چکا ہے۔ یہ وہ مسئلہ ہے جس کے کئی شاخسانے ہیں۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جو فلسطین پر قابض ہونے کی تگ و تاز میں مصروف ہیں۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو اس کی بازیابی کے لیے جدّوجہد کر رہے ہیں۔ فریقین کی یہ جدّوجہد خود فلسطین کے اندر بھی جاری و ساری ہے۔ کسی دوسری جدّوجہد کی نسبت جو تقریباً اتنا ہی عرصہ جاری رہی ہو جتنے عرصے سے فلسطین کے لیے ہو رہی ہے، اس جدّوجہد میں نسبتاً کہیں زیادہ لوگوں کی توانائیاں صرف ہوئی ہیں اور آخری نکتہ یہ ہے ...... اور اس کتاب کو زیرِ تحریر لانے کا محرک بھی یہی نکتہ بنا ہے...... کہ فلسطین ایک ایسا تصور ہے جس پر بے پناہ تُوتُو میں میں ہوئی ہے، نزاعی بحثیں چلی ہیں، کھینچا تانی ہوئی ہے اور اس بحث مباحثے میں بعضوں نے تو اس کے وجود کو ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ ایک طرف تو فلسطینی اور اُن کے حمایتی ہیں کہ ان کے سامنے اس کا محض نام ہی لے دیا جائے تو وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ایک اہم اور مثبت سیاسی ادّعا کا اظہار ہو گیا ہے۔ دوسری طرف فلسطینیوں کے دشمن ہیں جو اس نام سے ہی بدکتے ہیں اور گلا پھاڑ پھاڑ کر کہیں زیادہ منفی اور دھمکی آمیز انداز سے اس کے وجود سے انکار کرنے لگتے ہیں۔ یہاں ہم اُن مظاہروں کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو اس صدی کے ساتویں عشرے کے آخری اور آٹھویں عشرے کے بیشتر سالوں کے دوران میں امریکا کے بڑے بڑے شہروں کے گلی کوچوں میں ہوتے تھے۔ ان مظاہروں کے دو فریق تھے۔ ایک فریق نعرہ لگاتا تھا کہ ''فلسطین موجود ہے'' دوسرا فریق گرہ لگاتا تھا کہ ''فلسطین نام کا کوئی ملک صفحۂ ہستی پر موجود نہیں۔'' آج کل فلسطین میں ② سرکاری دستور یہ ہے کہ جب بھی فلسطینیوں کا ذکر مقصود ہو تو انھیں ''نام نہاد فلسطینی'' کہا جاتا ہے۔ تاہم اتنا بھی غنیمت ہے ورنہ مسز گولڈا میئر ③ نے تو نہایت منہ پھٹ انداز سے 1969ء میں یہ دعویٰ کر دیا تھا کہ فلسطینیوں کا روئے زمین پر کوئی وجود نہیں۔

---

① لوخ نیس Loch Ness (ملاحظہ ہو ضمیمہ نمبر 2 صفحہ 603)

② آج کا اسرائیل

③ گولڈا میئر (1898-1978) اسرائیل کی ایک سابق وزیر اعظم (1969-75) روس کے شہر کیف میں پیدا ہوئی۔ امریکا میں تعلیم پائی۔ 1921ء میں فلسطین چلی گئی۔ صیہونیت کے لیے تندہی سے کام کرتی رہی۔ قیامِ اسرائیل کے بعد اور روس میں سفیر مقرر ہوئی۔ 1973ء کی عرب اسرائیل جنگ اسی کی وزارتِ عظمیٰ کے عہد میں لڑی گئی۔

اور حقیقت یہی ہے کہ آج فلسطین کا وجود عنقا ہو چکا ہے۔ اس کی یا تو محض ایک یاد باقی رہ گئی ہے یا پھر یہ ایک تصور، ایک سیاسی اور انسانی تجربے کے طور پر زندہ ہے یا پھر آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلسطین ایک پیہم عوامی عزم کو بروئے کار لانے کا نام ہے اور یہ آخری بات زیادہ اہم ہے۔ فلسطین کے متعلق یہ تمام باتیں میرے اس مقالے کا موضوع بنیں گی۔ تاہم میں ایک لمحے کے لیے بھی آنکھیں میچ کر یہ نہیں کہوں گا کہ فلسطین، ہر اُس شخص جو اس وقت مغرب میں رہائش پذیر ہے اور تصنیف و تالیف کے کام میں مشغول ہے، ''کا مسئلہ'' نہیں۔ تاہم اس بات کا اعتراف بھی ایک ایسے میدان میں قدم دھرنا ہے جو نسبتاً اجنبی اور غیر مانوس ہے۔ بہت سے لوگوں کے نزدیک جو اخبارات و رسائل کا مطالعہ کرتے ہیں، جو ٹیلی ویژن دیکھتے اور ریڈیو سنتے ہیں، جنھیں یہ گمان ہے کہ انھیں سیاسی مسائل کی محض شد بد ہی نہیں بلکہ وہ بہت کچھ جانتے ہیں، جو یہ اعلان کرتے ہیں کہ بین الاقوامی تنازعات کے متعلق وہ ماہرانہ رائے کے مالک ہیں، مشرق وسطیٰ بنیادی طور پر عرب اسرائیلی تنازع (کشمکش، مسئلہ، جدّ وجہد وغیرہ) ہے اور یا اس سے کچھ ہی زیادہ۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ نقطۂ نظر حقیقت کو گھٹا کر پیش کرتا ہے لیکن اس نقطۂ نظر کی اصلی خامی یہ ہے کہ اس نے آج کے مشرق وسطیٰ سے فلسطین کے کسی عمل دخل کو لغوی طور پر خارج کر دیا ہے کیونکہ بادی النظر میں یہی دکھائی دیتا ہے کہ ستمبر 1978ء سے جب (امریکا کے) صدر جمی کارٹر، (اسرائیل کے وزیر اعظم) مناچم بیگن اور (مصر کے) صدر انور سادات واشنگٹن کے قریب کیمپ ڈیوڈ میں سر جوڑ کر بیٹھے تھے، یہی تینوں کامل طور پر مشرق وسطیٰ کی علامت بن چکے ہیں۔ مشرق وسطیٰ کے متعلق جو کتابیں، رسالے، مضامین وغیرہ لکھے گئے ہیں (کم از کم 1968ء تک) ان کی بیشتر تعداد یہی تاثر دیتی رہی کہ مشرقِ وسطیٰ میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا لب لباب یہ ہے کہ یہ ایسی نہ ختم ہونے والی جنگوں کا ایک سلسلہ ہے جو اسرائیل اور چند عرف ممالک کے مابین جاری ہیں۔ یہ کہ 1948ء تک ایک ملک موجود تھا جسے فلسطین کے نام سے پکارا جاتا تھا، اور یا یہ کہ اسرائیل کا وجود...... یا عام محاورے کے مطابق اس کی ''آزادی''...... فلسطین کے استیصال کا نتیجہ تھا، یہ وہ حقائق ہیں جن کے درست ہونے کے متعلق کوئی جھگڑا نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ یہی وہ حقائق ہیں جن سے ان لوگوں کی بیشتر تعداد، جو مشرقِ وسطیٰ میں پیش آنے والے واقعات و حالات میں دلچسپی لیتے ہیں، کم و بیش لاعلم ہے یا ناواقف۔ [1] لیکن اس سے

---

[1] انگلستان کے ذرائع ابلاغ (باہمی رضامندی سے) مسئلہ فلسطین کے متعلق جس سنسر شپ کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں، اس کا تفصیلی ذکر Michael Adams & Mayhew کی کتاب Publish it Not: The Middle East Cover-up......

اہم تربات یہ ہے کہ آج ان تقریباً چالیس لاکھ باشندوں سے، جن میں مسلمان اور عیسائی دونوں شامل ہیں، جو اپنے آپ کو فلسطینی گردانتے ہیں اور جنھیں فلسطینی سمجھا جاتا ہے، یا تو مسلسل چشم پوشی اختیار کی جاتی ہے اور یا پھر ان کے متعلق لاعلمی پائی جاتی ہے حالانکہ یہی وہ لوگ ہیں جن سے فلسطین کا مسئلہ عبارت ہوتا ہے اور اگر (فی الوقت) فلسطین کے نام کا کوئی ملک (روئے زمین پر) موجود نہیں تو اس سے یہ مطلب بھی اخذ نہیں ہوتا کہ کوئی ملک نہیں، تو پھر کوئی فلسطینی بھی نہیں۔ فلسطینی ہیں اور اس مقالے کے ذریعے ان کی حقیقت کو قارئین کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

عصر حاضر کی تاریخ کا بیشتر حصہ فلسطینیوں کے اردگرد گھومتا ہے اور جس طرح وہ خود امکانی اور غیر امکانی مقامات پر بکھرے ہوئے ہیں، اسی طرح ان کی تاریخ بھی ممکن اور غیر ممکن مقامات پر بکھری ہوئی ہے۔ امورِ خارجہ کے متعلق کوئی سمپوزیم (مذاکرہ) منعقد کرنا ہو، کوئی عالمانہ تحریر قلم بند کرنی ہو یا کوئی اخلاقی رویہ اختیار کرنا ہو، ان میں سے کوئی بھی چیز اس وقت تک مکمل نہیں سمجھی جاتی جب تک اس میں (گھما پھرا کر ہی سی) فلسطینی (بعض اوقات اسے ''عرب'' بھی کہا جاتا ہے) دہشت گردی کا حوالہ نہ دیا جائے۔ کوئی بھی خوددار

...... میں موجود ہے۔ اس کتاب کو لونگ مین گروپ نے 1975ء میں لندن سے شائع کیا تھا۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جب بھی کسی اسرائیلی باشندے یا اسرائیل کے کسی حمایتی کی کوئی کتاب شائع ہوتی ہے تو امریکا کے مؤقر اخبار ''نیو یارک ٹائمز'' میں اس پر معمول کے مطابق اسرائیل کے کسی مشہور معروف حمایتی کا تبصرہ شائع کیا جاتا ہے، مثلاً مشہور ناول نگار سال بیلو (Saul Bellow) کی کتاب To Jerusalem and Back پر معروف نقاد ارونگ ہاؤ Irving Howe اور ٹیڈی کولک (TeddyKollek) کی کتاب پر، جس میں اُس نے بیت المقدس کے میئر کی حیثیت سے اپنے تجربات بیان کیے تھے، سال بیلو نے تبصرہ کیا تھا۔ اس اخبار کا یہ معمول بھی ہے کہ جب کوئی عرب باشندہ کوئی کتاب تحریر کرتا یا کوئی مغربی عالم اپنی کسی کتاب میں اسرائیل پر معمولی سی نکتہ چینی کر دیتا ہے تو اس کتاب پر تبصرہ بھی کسی صیہونیوں کے حامی نقاد سے ہی کرایا جاتا ہے (مثلاً نوم چومسکی کی کتاب Peace in The Middle East پر Michael Walzer سے تبصرہ لکھوایا گیا۔ 1974ء کے بعد سے جب سے فلسطین کا مسئلہ نمایاں طور پر ابھر کر سامنے آیا ہے New York Review of Books نے کسی فلسطینی کی کوئی تحریر شائع نہیں کی۔ 1978ء کے دوران میں اس جریدے نے آئی ایف سٹون Gold Guido اور Stanley Hoffman کے ایسے مضامین ضرور شائع کیے جن میں اسرائیل پر تھوڑی بہت تنقید کی گئی تھی (واضح رہے کہ یہ تمام اصحاب اس بات کے حامی ہیں کہ فلسطینیوں کو کسی نہ کسی قسم کا حق خودارادیت ملنا چاہیے۔) تاہم یہ اٹل حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ خود فلسطینیوں کو...... جن کی کوئی کمی نہیں...... اپنے متعلق لکھنے کی اجازت قطعاً نہیں دی جاتی۔ اس سے بھی زیادہ قابلِ مذمت بات یہ ہے کہ اسرائیلی حکومت جو کارروائیاں کرتی ہے (اور جنھیں خود اسرائیل کے اخبارات اکثر و بیشتر معمول کے مطابق شائع کرتے رہتے ہیں) ان سے صرفِ نظر کر لیا جاتا ہے اور ان کے متعلق (مغربی اخبارات) ایک لفظ تک شائع نہیں کرتے، حالانکہ یہی کارروائیاں اگر کسی دوسرے ملک کی حکومت کرتی تو انھیں صفحۂ اول پر چیختی چنگھاڑتی سرخیوں کے ساتھ شائع کیا جاتا۔ (مصنف)

ہدایت کار جب کسی حالیہ اور غالباً خود ساختہ سنگین واردات کے متعلّق فلم بنانے کا منصوبہ تیار کرتا ہے، جب تک وہ اپنی کاسٹ میں کسی فلسطینی کو ایک مصدقہ دہشت گرد کی حیثیت سے شامل نہ کر لے، چین سے نہیں بیٹھے گا۔ ''بلیک سنڈے، اور سورسرز'' (جادوگر) جیسی فلمیں فوراً دھیان میں آتی ہیں۔ دوسری طرف مذہبی فریضہ سمجھتے ہوئے......موقع محل کے مطابق...... فلسطینیوں کے ساتھ وہ تمام خصائص وابستہ کر دیے جاتے ہیں جو پناہ گزینوں کا خاصہ ہوتے ہیں۔ کبھی کہا جاتا ہے یہ تو کیمپوں میں گلی سڑی زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں۔ کبھی کہا جاتا ہے یہ تو عرب ممالک کے ''سیاسی فٹ بال'' ہیں۔ کوئی زبانِ طعن دراز کرتا ہے کہ ان کے کیمپ اشتراکیت کے پھلنے پھولنے کے (موزوں) مقامات ہیں۔ ایک دُور کی کوڑی لاتا ہے کہ یہ تو خرگوشوں کی طرح بے حد و حساب بچے پیدا کیے جا رہے ہیں۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ وہ تبصرہ نگار جو جذباتیت کی رَو میں نہیں بہتے اور حالات کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہیں، اکثر یہ کہتے ہیں کہ فلسطینی عالم عرب کے چیدہ اور منتخب روزگار لوگ ہیں۔ مشرقِ وسطیٰ کے کسی دوسری قوم کی نسبت نہ صرف یہ کہ وہ بہتر تعلیم یافتہ ہیں بلکہ (اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر) انھیں عرب ممالک کے حساس ترین مقامات اور حساس ترین ذمہ داریوں پر فائز کر دیا جاتا ہے۔ ایسے تمام ادارے، جیسے خلیجی ممالک کی تیل کی وزارتیں اور تنصیبات جو دباؤ ڈالنے کا ذریعہ بن سکتی ہیں، فلسطینیوں کے دائرۂ اختیار میں دے دی جاتی ہیں۔ تعلیمی اور معاشی مشیر انھیں مقرر کیا جاتا ہے اور عرب بورژوا طبقے (بڑے بڑے بینک کار، صنعت کار، دانشور وغیرہ) کی بیشتر تعداد فلسطینی ہے لیکن ان سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانک دیا جاتا ہے اور تمام فلسطینیوں (خواہ وہ کتنے ہی بڑے مقام پر فائز کیوں نہ ہوں) کے متعلّق یہ مفروضہ قائم کر لیا جاتا ہے کہ وہ فتنہ و فساد کے متوالے اور انتقام کے پیاسے ہیں۔

اور آخری بات یہ ہے کہ 1948ء کے بعد پہلی مرتبہ امریکا میں سیاسی بحث مباحثے کا رخ مسئلۂ فلسطین کی طرف مڑا ہے۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ اگر مشرقِ وسطیٰ میں امن قائم کرنا مقصود ہے تو فلسطینیوں کے مسئلے پر سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کرنا ہوگا تو (پرانے رویوں کے برعکس) صدر کارٹر سے لے کر عام آدمی تک کوئی شخص بھی اس پر ناک بھوں نہیں چڑھاتا اور نہ اسے یہود دشمنی پر محمول کرتا ہے۔ ''فلسطینیوں کا وطن'' اور مجوزہ امن کانفرنسوں میں فلسطینیوں کی نمائندگی کا ٹیڑھا مسئلہ، یہ اب اتنے اہم سوالات ہیں کہ انھوں نے امریکی عوام کے شعور کو جھنجوڑنا شروع کر دیا ہے۔ اگرچہ 1969ء میں پہلی مرتبہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں فلسطینیوں کے حق خود ارادیت کی حمایت میں مثبت انداز سے رائے شماری ہوئی تھی۔ [1] لیکن امرِ واقع یہ ہے کہ واقعات

---

[1] 1969ء میں جنرل اسمبلی نے اپنی قرارداد نمبر 2535 بی کے ذریعے اپنی اس گہری تشویش کا اظہار کیا تھا کہ......

نے صحیح کروٹ اس وقت بدلی جب 1974ء میں یاسر عرفات جنرل اسمبلی کے اجلاس میں (فلسطینیوں کے نمائندے کی حیثیت سے) شریک ہوئے (اگر چہ یاروں نے ان کی اس شرکت کو بھی ایک متنازع مسئلہ بنا دیا تھا)، چنانچہ ان کی اس شرکت کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اب مسئلۂ فلسطین کسی دوسرے مسئلے کا دم چھلا نہیں رہا بلکہ 1948ء کے بعد پہلی مرتبہ جنرل اسمبلی نے اس پر ایک علیحدہ اور خودمختار مسئلے کی حیثیت سے غور وفکر کیا۔ اس سے کچھ لوگوں کو تکلیف تو ضرور ہوئی لیکن عام لوگوں کے اذہان میں یہ مسئلہ ایک نئے اور غالباً خوش آئند انداز سے جاگزین ہو گیا۔

لیکن (جنرل اسمبلی کی) غیر مبہم قراردادوں اور ارادوں کے باوجود، فلسطینیوں کو اب بھی ایک ایسی مخصوص قوم تصور کیا جاتا ہے جس کا دوسرا نام مصیبت ہے...... اور مصیبت بھی ایسی جس کی نہ کوئی اساس ہے اور نہ جس کے پیچھے کوئی سوچ بچار ہے بلکہ ایک ایسی مصیبت جو خواہ مخواہ بلکہ اللہ واسطے کھڑی کر دی جاتی ہے۔ وہ دفع نہیں ہوتے جیسا کہ انھیں ہونا چاہیے تھا، وہ دوسرے پناہ گزینوں (جو بظاہر اپنے پناہ گزین ہونے پر راضی برضا ہو چکے ہیں اور یوں اپنے حال میں مست ہیں) کا مقدر تسلیم نہیں کرتے بلکہ وہ مصیبت پر مصیبت کھڑی کیے جا رہے ہیں۔ اس نکتے کے ثبوت کے طور پر لبنان اور اردن کے حالیہ بحرانوں کو، جن میں فلسطینی بھی شامل ہیں، پیش کیا جاتا ہے اور اگر تبصرہ نگار کچھ زیادہ ہی دقیقہ رس اور دور کی کوڑی لانے والا ہو تو وہ اس ''حقیقت کی طرف بھی اشارہ کرنے سے گریز نہیں کرے گا کہ فلسطینی دراصل اسلام کی نشاۃِ ثانیہ [1]، جو (ان کے نزدیک) بلا ریب ایک نہایت ہی ہیبت ناک واقعہ ہے، کا جزو ہیں۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق جس کے خالق خبطِ عظمت میں مبتلا ہیں، اگر امریکا کا صدر بھی فلسطین کے مسئلے کو اس انداز سے پیش کرے گا کہ مشرقِ وسطیٰ

...... ''فلسطینیوں کو نہ صرف اپنے حقوق سے محروم رکھا جا رہا ہے بلکہ اجتماعی سزاؤں، من مانی نظربندیوں، کرفیو کے نفاذ، مکانوں اور جائیدادوں کے انہدام اور پناہ گزینوں اور مقبوضہ علاقوں کے دوسرے عرب باشندوں کے خلاف ظالمانہ کارروائیوں کے ذریعے اس محرومی کی شدت میں اور بھی اضافہ کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ جنرل اسمبلی فلسطینی عوام کے ناقابلِ تنسیخ حقوق کی توثیق نو کرتی ہے۔'' اس کے ایک سال بعد جنرل اسمبلی نے قرارداد نمبر 2627 سی کے ذریعے اس امر کو تسلیم کیا کہ فلسطین کے باشندے اقوامِ متحدہ کے منشور (چارٹر) کے مطابق مساوی حقوق اور حق خودارادی کے مستحق ہیں۔ (مصنف)

[1] اس سلسلے کا معرکہ آرا مضمون Bernard Lewis کا ہے جو اسلام کی واپسی The Return of Islam کے عنوان سے جریدہ ''کمنٹری'' کے شمارہ جنوری 1976ء میں اشاعت پذیر ہوا تھا، اصل میں یہ مضمون مصنف کے مضمون ''اسلام کی بغاوت'' کا...... جو انڈیانا یونیورسٹی پریس کی مطبوعہ کتاب ''مشرقِ وسطیٰ اور مغرب (1964ء) میں شامل ہے...... نیا رنگ روپ ہے۔ دونوں مضامین صیہونیت کا نفیس اور کارآمد پروپیگنڈہ ہیں۔ میں نے ان دونوں مضامین پر اپنی کتاب ''Orientalism'' کے صفحات 19-316 پر تفصیلی بحث کی ہے۔ (مصنف)

کے امن کا یہ ایک حقیقی اور ناگزیر جزو ہے تو اس کے متعلق یہ تصور کر لیا جائے گا کہ اس کے پیچھے تیل، مسلم عصبیت اور مسلم بلیک میل بول رہی ہے۔

اس قسم کا یہ تمام مواد، جس چیز کی پردہ پوشی کرتا ہے، وہ نہایت پیچیدہ ہے اور آسانی سے (مغربی باشندوں کی) سمجھ میں آنے والی نہیں۔ یہ چیز جسے عام مغربی باشندوں کی نظروں سے اوجھل رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے، ایک ایسی چیز ہے، جس پر کوئی نظریہ منطبق نہیں کیا جا سکتا جس پر دو جمع دو چار کا کوئی اصول نافذ نہیں ہوتا اور نہ جس سے کسی قسم کے جذبات یا رویوں کا اظہار ہوتا ہے۔ میرا اشارہ فلسطینیوں کے اس سو سالہ تجربے کے مرکزی نقطے کی طرف ہے جو بظاہر بہت سادہ نظر آتا ہے لیکن جسے آسان اور سہل الفاظ میں بیان کرنا ناممکن ہے۔ (اس چیز سے) میری مراد ایک ایسی سرزمین ہے، جسے فلسطین کا نام دیا جاتا ہے۔ صدیوں سے اس سرزمین پر ایک بہت بڑی اکثریت آباد تھی جو اگرچہ زیادہ تر گلہ بانوں اور کاشتکاروں پر مشتمل تھی، تاہم اسے معاشرتی، ثقافتی، سیاسی اور معاشی طور پر ایک قوم کی حیثیت سے شناخت کیا جا سکتا تھا۔ اس قوم کی (ایک بہت بڑی اکثریت کی) زبان عربی اور مذہب اسلام تھا۔ یہ قوم...... اور اگر آپ جدید تصورات کے مطابق انھیں قوم کے درجے سے محروم کرنا چاہتے ہیں تو افراد کا یہ گروہ...... اپنی شناخت اس سرزمین کے حوالے سے کرتی تھی، جس کے سینے کو چیر کر یہ اناج اور دوسری فصلیں کاشت کرتی تھی اور جس پر یہ اپنے جانور چراتی تھیں اور جس پر یہ آباد تھی۔ (یہ قوم فقر و فاقے کی زندگی گزارتی تھی یا ٹھاٹ باٹ کی یہاں یہ بات غیر متعلق ہے۔) اس شناخت کا احساس اسے اس وقت کے بعد خاص طور پر ہوا جب یورپی اقوام نے اپنے طور پر یہ فیصلہ کیا کہ وہ اس سرزمین پر قبضہ کر لیں گی اور یہاں ان یہودی باشندوں کو آباد کریں گی جنھیں دوسرے ممالک سے لایا جانا تھا۔ جہاں تک ہم سمجھ پائے ہیں، ہمیں اس امر کی کوئی واضح علامت نظر نہیں آئی کہ فلسطینیوں نے اس جدید قبضے کو تسلیم کر لیا ہے یا یہ کہ صیہونیوں نے فلسطین کو مستقل طور پر فلسطین سے بے دخل کر دیا ہے۔ یہ جو کچھ بھی ہے لیکن اصل بات یہی ہے کہ جسے ہم فلسطینی حقیقت کہتے ہیں، اس کی تعمیر کل بھی اس نئے غیر ملکی استعمار کے خلاف مزاحمت پر ہوئی تھی، آج بھی یہ اسی مزاحمت پر استوار ہے اور آئندہ بھی اسی پر استوار رہے گی۔ اس بات کا بھی امکان زیادہ ہے کہ اس (مزاحمت) کے معکوس مزاحمت جو ابتدا ہی سے صیہونیوں اور اسرائیلیوں کا طرۂ امتیاز رہی ہے، جاری رہے گی یعنی صیہونیوں اور اسرائیلیوں نے نہ کبھی یہ تسلیم کیا ہے اور نہ وہ آئندہ کبھی یہ تسلیم کریں گے کہ فلسطینی عربوں کا بھی کوئی وجود ہے، نتیجتاً وہ ان کے وجود کی نفی کرتے رہے ہیں اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے کیونکہ (وہ خوب اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ) فلسطینی عرب محض تکلیف دہ پریشانی (کا باعث) ہی نہیں بلکہ وہ آبادی کا ایک ایسا طبقہ ہیں جس کی جڑیں اس زمین کے ساتھ اس حد تک وابستہ ہیں کہ انھیں کسی

طریقے سے بھی اکھاڑا نہیں جاسکتا۔

چنانچہ فلسطین کا مسئلہ ادّعا اور انکار کے مابین ایک مقابلہ اور چشمک زنی ہے اور یہی وہ سوسالہ چشمک زنی ہے جس نے اسرائیل اور عرب ممالک کے مابین موجودہ تعطل کو زندہ رکھا ہے اور جو اس تعطل کو سمجھ میں آنے والی چیز بناتا ہے۔ اپنی ابتدا ہی سے یہ مقابلہ مضحکہ خیز حد تک انمل اور بے جوڑ چلا آرہا ہے۔ جہاں تک اہلِ مغرب کا تعلق ہے، (ان کے مطابق) فلسطین ایک ایسی سرزمین ہے جہاں نو وارد یہودیوں نے جو نسبتاً ترقی یافتہ ہیں (کیونکہ وہ یورپی النسل ہیں) تعمیر و ترقی اور تہذیب کاری کے میدانوں میں معجزے کر دکھائے ہیں اور جنھوں نے عربوں کے خلاف جنھیں ہمیشہ ڈھور ڈنگر بنا کر پیش کیا جاتا رہا اور جس کے متعلق ہمیشہ یہ رائے قائم کی گئی کہ وہ اجڈ، گنوار اور تہذیب سے بے بہرہ ہیں، اس لیے کریہہ اور قابلِ نفرت ہیں، زبردست کامیاب تکنیکی جنگیں لڑی ہیں۔ اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ مقابلہ دو ایسی ثقافتوں کے مابین ہے جن میں ایک ترقی یافتہ ہے (اور ہر آن مزید آگے قدم بڑھائے جارہی ہے۔) اور دوسری نسبتاً پسماندہ اور کم و بیش روایت پسند ہے لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ اس مقابلے میں وہ کون سے ہتھیار اور اوزار تھے، جو استعمال ہوئے اور ان ہتھیاروں اور اوزاروں نے مابعد تاریخ کو کیسے متشکل کیا، چنانچہ (بادی النظر میں) یہ تاریخ فلسطین پر یہودی دعاوی کی صحت کی تصدیق اور نتیجتاً فلسطینی دعاوی کی تکذیب کرتی نظر آتی ہے۔

دوسرے الفاظ میں ہمیں یہ بات سمجھ لینا چاہیے کہ فلسطینیوں اور صیہونیوں کے مابین جو کشمکش جاری ہے، وہ موجودگی اور تشریح و تعبیر کے مابین کشمکش ہے جس میں مؤخر الذکر اوّل الذکر پر مسلسل غالب آتی اور اسے بیخ و بن سے اکھاڑتی نظر آتی ہے۔ یہ موجودگی کیا تھی؟ اس بات سے قطع نظر کہ فلسطینی عرب کس قدر پسماندہ، غیر مہذب، اجڈ اور ڈھور ڈنگروں کی طرح بے زبان تھے، وہ حقیقت جس سے نظریں نہیں چرائی جاسکتیں، یہی ہے کہ وہ اس سرزمین پر موجود تھے۔ اٹھارویں یا انیسویں صدی کے دوران میں شاتوبری آں ①، مارک ٹوین ②، لامارتین ③، نیوال ④، ڈیزرائیلی ⑤ اور دوسرے ادیبوں نے مشرق کے متعلق جو سفرنامے تحریر کیے

---

① Vicomte Francois Rene,de Chateaubriand

② امریکی صحافی اور مزاح نگار (1835-1910) اس کا اصلی نام Samuel Clemens تھا۔

③ Alphonse Marie Louis de Prat de Lamartine فرانسیسی شاہ اور سیاستدان

④ ایک فرانسیسی مصنف اور سفرنامہ نگار

⑤ Benjamin Disraeli (1804ء-1881ء) برطانیہ کا مشہور یہودی وزیر اعظم مصنف، ناول نگار اور سفارت کار

کیے، ان کے مطالعے کے بعد یہ حقیقت واشگاف طور پر نظر آئے گی کہ ان میں ان عرب باشندوں کا ذکر کیا گیا ہے جو فلسطین کی سرزمین پر آباد تھے۔ اسرائیلی ذرائع کے مطابق 1822ء میں فلسطین میں آباد یہودیوں کی تعداد چوبیس ہزار سے زیادہ نہیں تھی اور یہ تعداد ملک کی کل آبادی کے جس کا غالب حصہ عربوں پر مشتمل تھا، دس فیصد سے بھی کم تھی۔ یہ درست ہے کہ ان سفرناموں میں عربوں کو عام طور پر غیر دلچسپ اور غیر ترقی یافتہ بنا کر پیش کیا گیا ہے لیکن (اس حقیقت سے تو انکار نہیں کیا گیا کہ) وہ کم از کم وہاں موجود تھے۔ چونکہ یہ سرزمین فلسطین کے نام سے موسوم تھی، اس لیے مغربی اذہان نے اس کے موجود حقائق اور باشندوں کو کبھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جو اس سرزمین پر حاوی تھے بلکہ اہل مغرب کے لاشعور میں یہ بات ہمیشہ رچی بسی رہی کہ چونکہ یہ سرزمین ایک مہتم بالشان اور درخشاں ماضی کی امین رہی تھی، اور بظاہر ایک عظیم الشان اور پُرشکوہ مستقبل کے بے پناہ امکانات سے بھرپور ہے۔ اس لیے اس پر از سرِ نو قبضہ کرنا اور اس کی نئے سرے سے تعمیر ضروری ہے۔

الفانسے دی مارتین کی تحریریں اس بارے میں ایک واضح مثال پیش کرتی ہیں۔ اس نے 1833ء میں اس علاقے کی سیاحت اور ''سفرنامہ مشرق'' Voyage en Orient کے نام سے کئی سو صفحات پر مشتمل اپنے سفر کی داستان تحریر کی۔ جب اس کی یہ کتاب اشاعت کے مراحل سے گزر رہی تھی تو اس نے اس کے ساتھ ایک ضمیمہ بھی شامل کر دیا۔ اس ضمیمے کا نام ''خلاصۂ سیاست'' تھا۔ اس ضمیمے میں اس نے فرانس کی حکومت کو کئی تجاویز پیش کیں۔ اگرچہ اس نے اپنی اصل کتاب میں اپنی ان بے شمار ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے جو اس نے مقدس سرزمین میں عرب کسانوں اور شہری باشندوں کے ساتھ کی تھیں، لیکن اپنے ضمیمے میں وہ ان تمام باتوں کو گول کر گیا اور (بڑی ڈھٹائی کے ساتھ) اس نے یہ اعلان کیا کہ یہ علاقہ حقیقتاً ایک ملک نہیں (غالباً اس کے خیال کے مطابق وہاں کے باشندے ''اصل'' شہری نہیں تھے) چنانچہ فرانس کے لیے یہ ایک سنہری موقع ہے کہ وہاں وہ ایک سامراجی یا نوآبادیاتی منصوبے کا آغاز کر دے۔ ① لامارتین نے جو طریقۂ واردات اختیار کیا، وہ یہ ہے کہ اس نے ایک موجود حقیقت پر یعنی رہائش پذیر عربوں کا طبقے پر...... مستقبل کی ایک آرزو کے ذریعے...... پر خطِ تنسیخ پھیر دیا اور حقیقت سے ماورا ایک نیا خیال پیش کر دیا کہ یہ (فلسطین کی) سرزمین تعمیر و ترقی کے لیے ایک زیادہ مستحق طاقت کے لیے خالی (اور چشم براہ) ہے۔ بعینہٖ یہ بالکل اسی قسم کی سوچ ہے جس نے انیسویں صدی کے اواخر میں اسرائیل زینگ ول ② کو فلسطین کے متعلق یہ صیہونی نعرہ تخلیق کرنے کی

---

① الفانسے لامارتین: سفرنامہ مشرق ناشر: ہاشت، پیرس، ایڈیشن مطبوعہ حصہ دوم صفحہ: 533

② اسرائیل زینگ ول (Zangwill) (1864ء۔1926ء) برطانوی مصنف اور صیہونی تحریک کا زبردست پرچارک

جرأت دلائی: ''قوم کے بغیر سرزمین، سرزمین کے بغیر قوم کے لیے۔''

واقعہ یہ ہے کہ فلسطین اہلِ مغرب کے تخیل اور سیاسی عزائم میں ہمیشہ یہ ایک خاص کردار ادا کرتا رہا ہے اور اس بات پر تو عمومی اتفاق رائے پایا جاتا ہے کہ یہ مغرب ہی ہے جہاں جدید صیہونیت کا ظہور ہوا ہے۔ فلسطین کے حصول کی خاطر مختلف تحریکیں وجود میں آئیں اور زائرین کی حیثیت سے لوگ جوق در جوق یہاں آتے رہے۔ یہ سب کچھ صلیبی جنگوں کا ثمر اور انعام تھا۔ پھر یہ وہ جگہ بھی ہے جس کا محض نام ہی (اس کا بار بار نام تبدیل کیے جانے کا سلسلہ بھی زلفِ یار کی طرح طویل بلکہ غیر مختتم ہے) عقیدوں اور اصولوں کا مسئلہ رہا ہے۔ جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ اس سرزمین کو فلسطین کے نام سے پکارنا یا نہ پکارنا، یعنی اسے فلسطین کی بجائے (مثال کے طور پر) اسرائیل یا صیہون کے نام سے موسوم کرنا، یہ سب کچھ ایک سیاسی عزم کی غمازی کرتا ہے۔ اس سے جزوی طور پر اس مشکوک دعویٰ پر کچھ روشنی پڑتی ہے جس پر صیہونیوں کی حمایت میں لکھی گئی تحریروں میں اصرار کیا جاتا ہے کہ رومی سلطنت میں یہ محض ایک انتظامی خطے کا نام تھا اور اس (سلطنت کے زوال) کے بعد اس نام کو کبھی دوبارہ استعمال نہیں کیا گیا تاآنکہ 1922ء میں یہ علاقہ برطانوی تسلط میں آ گیا۔ اسی تسلط کے دوران میں اس نام کا دوبارہ چلن ہوا۔ اس دعویٰ کا مقصد یہ جتلانا ہے کہ فلسطین بھی محض ایک تعبیر و تشریح ہے اور اس نام میں تو اتنا بھی تسلسل اور وقار نہیں پایا جاتا جتنا کہ بطور نام اسرائیل میں پایا جاتا ہے۔ یہاں بھی ہمیں اس قسم کے ہتھکنڈے کی مثال ملی ہے جیسا لامارتین نے استعمال کیا تھا۔ یعنی یہ کہ مستقبل یا ماضی کے ایک سہانے تصور یا خواب کو اس طریقے سے کام میں لایا جائے کہ ماضی اور مستقبل کے مابین جو حقائق موجود ہیں، انھیں ملیامیٹ کر دیا جائے ورنہ سچی بات یہ ہے کہ ان لاتعداد نگارشات کو تو آپ بے شک ہاتھ بھی نہ لگائیں جو اہلِ یورپ نے قرونِ وسطیٰ سے اب تک تحریر کی ہیں اور جن میں بار بار فلسطین کا حوالہ دیا گیا ہے۔ آپ اگر محض ان جغرافیہ دانوں، مؤرخوں، فلسفیوں اور شاعروں کی تصنیفات پر ہی جو آٹھویں صدی سے عربی زبان میں لکھی جا رہی ہیں، ایک سرسری نظر ڈال لیں تو آپ کو فلسطین سے متعلق (بے شمار) حوالے مل جائیں گے۔ ممکن ہے کہ یہ نکتہ اتنا اہم نہ ہو لیکن اس سے یہ ثابت کرنے میں ضرور مدد ملتی ہے کہ علمیاتی طور پر فلسطین...... کیونکہ فلسطین ایک ایسا مقام ہے جس کے ساتھ بے پناہ تخیلات اور عقائد وابستہ ہیں...... کے نام کو اور وہاں اس کے باشندوں کی موجودگی کو کس طرح حقیقت سے عدم حقیقت میں، اور موجودگی کو عدم موجودگی میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ میرے خیال میں اس سے بھی اہم نکتہ یہ ہے کہ جہاں تک عرب فلسطینیوں کا تعلق ہے، ان کے نزدیک قرونِ وسطیٰ سے لے کر موجودہ زمانے تک فلسطین کی تسخیر اور اس کے متعلق یورپ والوں نے جتنے بھی دوسرے منصوبے بنائے ہیں، ان میں صیہونیوں کے منصوبے سب سے زیادہ کامیاب رہے ہیں

اوران کی اس منصوبہ سازی کا عرصہ بھی باقی اہلِ یورپ کے منصوبوں کی نسبت کہیں زیادہ طویل ہے۔ میں یہاں یہ بات محض نسبتاً ایک سیدھے سادے تاریخی بیان کے طور پر کہہ رہا ہوں، ورنہ جہاں تک دوسرے ابتدائی منصوبوں کے مقابلے میں صیہونی منصوبے کی نسبتاً اپنی خوبیوں کا تعلق ہے تو میں فی الحال ان کے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔

فلسطین ساتویں صدی کے اواخر تک غالب طور پر ایک عرب اور مسلم ملک بن گیا تھا۔ اس کے تقریباً فوراً ہی بعد تمام عالمِ اسلام اس کی زرخیزی اور خوبصورتی کی بنا پر اور اس کی مذہبی اہمیت کے پیش نظر بھی، اس کی حدود اور خصوصیات سے...... جن میں اس کا عربی نام، فلسطین بھی شامل ہے...... شناسا ہو چکا تھا۔ مثال کے طور پر ہمیں عربی زبان کی یہ تحریر، جو دسویں صدی کے اواخر میں قلم بند کی گئی تھی، نظر آتی ہے۔

"فلسطین شام کے صوبوں کا انتہائی مغربی صوبہ ہے۔ اس کی طویل ترین لمبائی رفحہ سے شروع ہوتی ہے اور تجون کی سرحد پر ختم ہوتی ہے۔ ایک گھوڑ سوار کو یہ مسافت طے کرنے میں دو دن درکار ہوں گے۔ یہ تو رہی اس کی لمبائی...... جہاں تک اس کی طویل ترین چوڑائی کا تعلق ہے تو وہ جافہ سے ریحہ تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس مسافت کو طے کرنے کے لیے بھی ایک گھوڑ سوار کو دو دن کا عرصہ لگے گا۔ جبل الزور، دیارِ قوم لوط، الجبل اور الشاحراح جو کہ ایلہ تک پھیلا ہوا ہے...... الجبل اور الشاحراح، دو الگ الگ انتظامی اکائیاں ہیں لیکن ایک دوسرے کے ساتھ متصل ہیں...... فلسطین میں شامل ہیں اور وہاں کی حکومت کے ماتحت ہیں۔

بارشیں اور شبنم فلسطین کی آبیاری کرتی ہیں۔ اس کے درخت اور مزروعہ اراضی مصنوعی آبپاشی کے محتاج نہیں۔ صرف نابلس میں آپ یہ دیکھیں گے کہ آبِ رواں اس مقصد کے لیے استعمال ہو رہا ہے۔ فلسطین شامی صوبوں کا زرخیز ترین صوبہ ہے۔ اس کا صدر مقام اور سب سے بڑا شہر رام اللہ ہے۔ لیکن آبادی اور حجم کے اعتبار سے بیت المقدس اس کے تقریباً ہم پلہ ہے۔ اپنے چھوٹے حجم کے باوجود فلسطین میں تقریباً بیس مساجد ایسی ہیں، جہاں جمعہ کا خطبہ دیا جاتا اور نماز پڑھائی جاتی ہے۔ ①

---

① ژائی لے سترانژ نے اپنی کتاب Palestine Under The Moslems: A Description of Syria and Holy Land from A.D.650 to 1500 میں جو قدیم مسلم جغرافیہ دانوں کی تحریروں کے تراجم پر مشتمل ہے اور ابن ہنکل کی اس تحریر کا حوالہ دیا ہے۔ (مصنف)

1516ء میں فلسطین خلافتِ عثمانیہ کا ایک صوبہ بن گیا لیکن اس سے نہ تو اس کی زرخیزی میں کوئی کمی واقع ہوئی اور نہ اس کے ایک عرب اور اسلامی علاقہ ہونے پر کوئی اثر پڑا۔ اس کے تقریباً ایک سو سال بعد ایک انگریز شاعر جارج سینڈز نے فلسطین کا نقشہ بدیں الفاظ کھینچا ہے: ''یہ وہ سرزمین ہے جہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں۔ یہ قابلِ آباد عالم کا قلب ہے، اس کی آب و ہوا معتدل ہے۔ یہ خوب صورت اور دلفریب پہاڑوں اور زرخیز وادیوں سے آراستہ ہے۔ اس کی چٹانوں سے فرحت بخش پانی رہتا ہے اور اس کا کوئی علاقہ ایسا نہیں جو مسرت و انبساط یا منفعت سے مبرا ہو۔''[1] آٹھویں اور انیسویں صدی کے مابین اس قسم کے بیانات نہ صرف سفرناموں میں بکثرت اور تواتر کے ساتھ ملتے ہیں بلکہ فلسطین کے قدرتی وسائل کا جائزہ لینے کے لیے انگریزوں نے جو ادارہ قائم کیا تھا، وہ بھی اپنی سہ ماہی سائنسی رپورٹوں میں اس قسم کی باتیں نہایت تسلسل کے ساتھ کرتا تھا۔

یہاں اس بات کو ذہن نشین کرنا بہت ضروری ہے کہ اگرچہ 1882ء سے یہودی آبادکار مسلسل فلسطین میں داخل ہو رہے تھے لیکن حالت یہ تھی کہ 1948ء کے موسم بہار سے چند ہفتے قبل تک، جب اسرائیل کا قیام عمل میں آیا، یہاں عربوں کی بے پناہ اکثریت تھی۔ مثلاً 1931ء کی مردم شماری کے مطابق ملک کی کل آبادی دس لاکھ تینتیس ہزار اور تین سو چودہ تھی اور اس میں یہودیوں کی تعداد محض ایک لاکھ چوہتر ہزار اور چھ سو چھ تھی۔ 1936ء میں یہودیوں کی تعداد بڑھ کر تین لاکھ چوراسی ہزار اور اٹھتر تک پہنچ گئی تھی جب کہ کل آبادی تیرہ لاکھ چھیاسٹھ ہزار اور چھ سو بانوے تھی۔ 1946ء میں کل آبادی انیس لاکھ بارہ ہزار اور ایک سو بارہ تھی اور اس میں یہودیوں کی تعداد چھ لاکھ آٹھ ہزار اور دو سو پچیس تھی۔[2] اعداد و شمار کے سارے گورکھ دھندے میں ''مقامی باشندوں'' کو نو وارد آبادکاروں سے بآسانی الگ پہچانا جا سکتا تھا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ ''مقامی باشندے'' تھے کون؟

یہ جو ''مقامی باشندے'' تھے، سبھی عربی بولتے تھے اور ان کی غالب تعداد سنی مسلمانوں پر مشتمل تھی، اگرچہ ان میں عیسائی، دروزی اور شیعہ مسلمان اقلیتیں بھی شامل تھیں...... اور یہ ساری اقلیتیں بھی عربی ہی

---

① اس تحریر کا حوالہ Richard Bevis نے اپنے مقالے Making The Desert Bloom: An Historical Picture of Pre-Zionist Palestine میں دیا تھا۔ یہ مقالہ ''مڈل ایسٹ نیوز لیٹر'' کے شمارہ فروری مارچ 1971ء میں شائع ہوا تھا۔

② حوالے کے لیے دیکھیں: The Anglo Palestine Years Books 1947، مطبوعہ لندن 1948ء

بولتی تھیں......تقریباً 65% فلسطینی عرب کاشتکاری کرتے تھے۔ یہ تقریباً پانچ سو دیہات میں رہتے تھے۔ یہ اپنی زمینوں پر فصلیں کاشت کرتے اور پھل اور سبزیاں اگاتے تھے، فلسطین کے تمام بڑے بڑے شہر...... بیت المقدس، حیفہ، جافہ، اریحہ، الناصرہ، عکہ، نابلس، حَبرون......زیادہ تر فلسطینی عربوں نے تعمیر کیے تھے اور جب ان شہروں کے قرب و جوار میں ناجائز طور پر قبضہ کرنے والے صیہونیوں نے نئی بستیاں تعمیر کر لیں تو بھی فلسطینی عرب ان قدیم شہروں میں ہی مقیم رہے پھر فلسطینی دانشوروں اور پیشہ ور اشخاص پر مشتمل ایک اچھا خاصا معزز طبقہ بھی موجود تھا۔ چھوٹے پیمانے پر ہی سہی، لیکن صنعتیں اور کارخانے لگانے کا عمل بھی شروع ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک زبردست قومی شعور کی رو بھی چل پڑی تھی۔ جدید فلسطین کی معاشرتی، معاشی اور سماجی زندگی کی تنظیم بھی آزادی اور سامراج دشمنی کے انھی مسائل پر استوار رہی تھی جن کا چرچا پورے خطے میں ہو رہا تھا لیکن فلسطینیوں کا مزید دردِ سر یہ بھی تھا کہ انھیں ان مسائل سے بھی عہدہ برآ ہونا پڑا جو ایک طرف تو خلافتِ عثمانیہ ورثے میں چھوڑ گئی تھی، دوسری طرف رہی سہی کسر صیہونی آبادکاری اور (جنگِ عظیم اول کے بعد) برطانوی تسلط نے پوری کر دی تھی اور طرفہ تماشا یہ کہ ان تمام مسائل سے انھیں بہ یک وقت نپٹنا پڑا۔ انیسویں صدی کے آخری چند برسوں سے عظیم بیداری کی جو لہر روحوں کو گرما رہی تھی کسی استثنا کے بغیر تقریباً سبھی عرب اپنے آپ کو اس کا جزو محسوس کر رہے تھے اور یہی وہ احساس ہے جس نے ان کی جدید تاریخ کو، جو اگرچہ کئی دوسرے اعتبار سے تو انتشار اور تفرقے سے مملو نظر آتی ہے، تقویت اور شیرازہ بندی عطا کی۔ حکم دروازہ، خلیل بیداس، خلیل سکاکینی اور نجیب نصر جیسے فلسطینی ادیب، لکھاری اور دانش ور، فتوہ اور نجدہ، عرب ہائر کمیٹیاں اور عرب لیگ آف عرب نیشنل لبریشن (جو یہ دلیل دیتی تھی کہ فلسطین کا مسئلہ صرف عرب اور یہودی مل جل کر ہی طے کر سکتے ہیں)......جیسی سیاسی تنظیمیں......ان سب کا عوام کے کسی نہ کسی طبقے پر گہرا اثر و رسوخ تھا۔ یہ سب لوگ اور تنظیمیں یہ فیصلہ کرتی تھی کہ "غیر یہودی"، فلسطینی جمہور کی توانائیاں کس سمت میں استعمال کی جانا چاہییں۔ انھوں نے ایک فلسطینی شناخت تخلیق کی، جس کا مقصد یہ تھا کہ برطانوی حکمرانی اور یہودی آبادکاری، دونوں کی ڈٹ کر مخالفت کی جائے۔ اس سے ایک اور فائدہ یہ ہوا کہ فلسطینیوں کے ذہنوں میں یہ تصور جڑ پکڑ گیا کہ ان کا تعلق ایک واضح قومی گروپ سے ہے، جس کی ایک اپنی زبان (فلسطینی عربی بولی) ہے اور جس کا ایک اپنا مخصوص قومی احساس ہے (جسے صیہونیت سے بالخصوص خطرہ درپیش ہے۔)

فلسطین پر قبضہ کرنے کے لیے جب صیہونیوں نے (اندازاً یہ زمانہ جنگِ عظیم اول کے دوران اور اس کے فوری بعد کا ہے) سنجیدگی کے ساتھ منصوبہ بندی شروع کی تو ابتدا ہی سے اس بات کے واضح شواہد ملنے لگے تھے (اور روز بروز یہ تصور عام ہوتا جا رہا تھا) کہ اسرائیل کی تعمیر اس عرب فلسطین کے کھنڈرات پر

کرنا مقصود ہے۔ شروع شروع میں اس تصور کو گول مول انداز سے اور سات پردوں میں چھپا کر پیش کیا جاتا تھا اور یہ اس لیے تا کہ اسے نوآبادیاتی نظام کو تعمیرِ نو کے جو اعلیٰ پیمانے کے یورپی استعمار کے لیے فیصلہ کن حیثیت رکھتی تھی، موافق بنایا جاسکے۔ تھیوڈور ہرزل ① نے 1895ء میں اپنے روزنامچے میں یہ تحریر کیا کہ فلسطین کے متعلق کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ اس نے اس ضمن میں جو الفاظ استعمال کیے، وہ یہ تھے:

''ہمیں مفلس اور قلاش آبادی کو ان کے اپنے ملک میں روزگار کے ہر قسم کے ذرائع سے محروم کرنا ہوگا اور راہداری کے ممالک میں ان کے لیے معاش کے ذرائع تلاش کر کے انھیں سرحد پار دھکیلنا ہوگا۔''

لیکن مفلس اور قلاش لوگوں کی جائدادیں ہتھیانے اور انھیں ملک بدر کرنے کے عمل میں ہمیں نہایت احتیاط، سلیقے، ہوشیاری اور فرزانگی سے کام لینا ہوگا۔ ②

اس زمانے کے دوران میں جو اعلان بالفور ③ پر منتج ہوا، صیہونیوں کی طرف سے برطانوی حکومت کے ساتھ خط و کتابت کا کام لارڈ روتھ چائلڈ ② نے سرانجام دیا۔

اس نے 18 جولائی 1917ء کو برطانیہ کی حکومت کے سامنے جو محضر نامہ پیش کیا اس میں اس اصول کا ذکر کیا گیا ہے جس کے تحت فلسطین کی تشکیل نو کر کے اسے ''یہودی قوم کے وطن'' کے سانچے میں ڈھالنا تھا

---

① Theodor Herzl (1860ء-1904ء): آسٹریا کا ہنگری نژاد شہری۔ اتفاقِ رائے سے اسے صیہونیت کا بانی مانا جاتا ہے۔ پیشے کے اعتبار سے صحافی تھا۔ صیہونیت کی بنیادی دستاویزات اسی کی تحریر کردہ ہیں۔

② Theodor Heizl:"Complete Diaries" ed Raphael Patantan Tran: Harry Zohn [New York: Herzl Press] v.1. p.86.

③ اعلان بالفور وہ رسوائے زمانہ دستاویز ہے جسے یہودی سرمایہ داروں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے پہلی جنگِ عظیم کے دوران میں برطانوی حکومت نے جاری کیا۔ اس کا مصنف آرتھر جیمز بالفور (Balfour) (1848ء-1930ء) تھا اگرچہ بالفور 1902ء سے 1905ء تک برطانیہ کا وزیر اعظم رہ چکا تھا۔ لیکن جنگِ عظیم اول کے دوران میں وہ وزیر خارجہ کے عہدے پر متمکن تھا۔ اس کے اعلان کی رو سے فلسطین سرکاری طور پر صیہونیوں کا وطن تسلیم کر لیا گیا اور ان کے ساتھ یہ وعدہ بھی کر لیا گیا کہ وہاں بعد میں یہودیوں کی آزاد مملکت قائم کردی جائے گی۔

④ (Rothsehild) جس کا جرمن تلفظ ''روٹ شلٹ'' ہے، جرمنی کا ایک یہودی سود خور خاندان تھا۔ اس خاندان کے ایک فرد مے ایر (Meyer) روتھ چائلڈ نے جرمنی کا پہلا بینک قائم کیا۔ بینک کاری کے کاروبار میں اس خاندان نے اتنی ترقی کی کہ اس کا شمار یورپ کے امیر ترین سرمایہ داروں میں ہونے لگا اور اس کے افراد مختلف ممالک بشمول فرانس، برطانیہ اور امریکا میں پھیل گئے اور جہاں بھی گئے، وہاں انھوں نے زبردست اثر و رسوخ حاصل کر لیا۔ برطانیہ کے لارڈ روتھ چائلڈ کا تعلق اسی خاندان کے ساتھ تھا۔

تھا۔ اس اعلان کے چھ ہی عرصے کے بعد شائم ویزمان ① نے ڈنکے کی چوٹ اس حقیقت کا اظہار کرنا تھا کہ
''برطانوی قوم پر اب یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگئی ہے کہ صرف یہودی قوم اتنی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہے کہ وہ فلسطین کی تعمیرِ نو کر سکے اور جدید اقوام (کی صفوں) میں اسے ایک (اعلیٰ و ارفع) مقام دلا سکے۔''
انگلستانی یہودیوں کے سب سے بڑے فقیہ ② ڈاکٹر جے ایچ ہرز (Herz) نے بڑے خطیبانہ انداز سے اس زبردست اور کارگر برطانوی حمایت کا ذکر کیا ہے جو وہ ''یہودی باشندوں کے لیے فلسطین میں ایک قومی وطن کے قیامِ نو'' کے سلسلے میں کر رہا تھا۔ ان میں سے کسی بیان میں بھی اس امر کی مطلق صراحت نہیں کی گئی کہ اس وقت فلسطین میں کیا پایا جائے گا (بالفاظِ دیگر یوں کہیں کہ آیا اس وقت فلسطین غیر آباد ہے اور اگر یہ آباد ہے تو کن لوگوں سے آباد ہے۔) تاہم ملک کی ''تشکیلِ نو'' اور ''تعمیرِ نو'' جیسی ترکیبات کا بلا مغالطہ اور صریحی مطلب یہی نکلتا ہے کہ اس کی موجودہ تشکیل کا...... جس میں لاکھوں عرب باشندے شامل تھے...... شیرازہ بکھیر دیا جانا تھا (یہ کام کیسے کیا جانا تھا اور کہاں کیا جانا تھا، کسی نے بھی اس کی وضاحت کرنے کی زحمت نہیں کی) تاکہ اس کی جگہ ایک نئی یہودی مملکت کی داغ بیل ڈالی جا سکے۔ یہ اعلانات جن میں ان لوگوں نے اپنے عزائم کی نشاندہی کی تھی، کچھ ایسے اسلوب میں پیش کیے گئے، جس سے اس حقیقت کی طرف، جو لاریب تکلیف دہ تھی (لیکن اپنی جگہ موجود تھی)، غیر مبہم الفاظ میں ذرا سا اشارہ بھی نہیں کیا گیا کہ ملک تو پہلے ہی (ایک نو آبادی کی حیثیت سے ہی سہی) تشکیل شدہ تھا اور ایک نئی استعماری طاقت اس کی جو تشکیلِ نو کرنا چاہتی ہے، اس سے یہاں کے باشندوں کو کوئی خوشی نہیں ہوگی۔ جہاں تک خود ان بیانات کا تعلق ہے، تو اپنی جگہ وہ بالکل صحیح ہیں۔ فلسطین کی تعمیرِ نو ہوئی۔ اس کی تشکیلِ نو عمل میں آئی اور اسے نئے سرے سے قائم کیا گیا۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے جو ہتھکنڈے استعمال کیے گئے، وہ کتنے ظالمانہ اور سفاکانہ تھے، اس کی ایک جھلک موشے دایان ③

① شائم ویزمان 1874ء میں روس میں پیدا ہوا۔ جرمنی میں اس نے کیمسٹری کی تعلیم حاصل کی پھر وہ سوئٹزرلینڈ اور برطانیہ کی یونیورسٹیوں میں تدریس کے شعبوں سے منسلک رہا۔ جنگِ عظیم اول کے دوران میں اس نے ایسی ٹون (Acetone) جو دھما کا خیز مواد بنانے میں استعمال ہوتی ہے، تیار کرنے کا نسبتاً بہتر اور ارزاں طریقہ دریافت کیا۔ اس کی یہ ایجاد بھی اعلان بالفور منظور کرانے میں مددگار ثابت ہوئی۔ یزمان صیہونیت کے بانیوں میں شمار ہوتا ہے۔ وہ اسرائیل کا پہلا صدر بھی منتخب ہوا۔ اس کا انتقال 1952ء میں ہوا۔

② یہودی امام: اس کا اصل لقب خاخام یا Rabbi (ربی) ہوتا ہے یہودی فوج میں بھی ربی ہوتے ہیں۔ چیف ربی کا درجہ بریگیڈیئر کے برابر ہوتا ہے۔

③ اسرائیل کا مشہورِ زمانہ یک چشم جرنیل اور سیاست دان فوج سے ریٹائر ہونے کے بعد وہ کئی سال اسرائیل کا......

کے اس بیان میں نظر آجاتی ہے جو اس نے اپریل 1969ء کے دوران میں دیا تھا:

''ہم اس ملک میں وارد ہوئے جہاں پہلے ہی عرب آباد تھے اور ہم یہاں ایک عبرانی یعنی یہودی مملکت قائم کر رہے ہیں۔ اس ملک کے کافی علاقوں میں ہم نے عربوں سے زمینیں خریدیں (یہ زمینیں ملک کے کل رقبے کا چھ فیصد تھیں) ہم نے عرب دیہاتوں کی جگہ یہودی گاؤں تعمیر کیے، آپ تو ان عرب دیہاتوں کے نام بھی نہیں جانتے اور اس (لاعلمی) کے لیے میں آپ کو موردِ الزام نہیں ٹھہراتا کیونکہ اب جغرافیہ کی وہ کتابیں ہی ناپید ہو چکی ہیں، (جن میں ان عرب دیہاتوں کا ذکر تھا۔) نہ صرف یہ کہ یہ کتابیں ناپید ہو چکی ہیں بلکہ یہ خود عرب دیہات بھی ناپید ہو چکے ہیں۔ جہاں پہلے مہابوں تھا۔ وہاں نہالال (دایان کا اپنا گاؤں) ابھرا۔ جبۃ کی جگہ جبوت نے، حنیفس کی جگہ سرید نے اور تل شمعان کی جگہ کیقار کیھوشوا نے لے لی ہے۔ اس ملک میں ایک بھی مقام ایسا نہیں جہاں پہلے عرب آبادی موجود نہیں تھی (اسرائیلی جریدہ ہاارے تز، مؤرخہ 4 اپریل 1969ء)''

موشے دایان نے اگرچہ کافی صاف گوئی سے کام لیا ہے لیکن اس نے بھی زہر ہلاہل کو شکر میں لپیٹ کر پیش کیا ہے۔ جب وہ یہ کہتا ہے کہ ''عرب دیہات بھی ناپید ہو چکے ہیں۔'' تو اس کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان دیہاتوں کو نہایت منظم طریقے سے مسمار کیا گیا، ان کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی تا آنکہ وہ بالکل ملیامیٹ ہو گئے اور یوں ان کا نشان بھی صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔ ایک اسرائیلی پروفیسر نے، جس کا نام اسرائیل شہاک ہے اور جو اس وحشیانہ کارروائی پر بے حد رنجیدہ ہے، ایسے تقریباً چار سو دیہات شمار کیے ہیں جنھیں اس طریقے سے ملیامیٹ کر دیا گیا۔ وہ کہتا ہے کہ ''ان دیہاتوں کو اپنے مکانات، باغات کی دیواروں، بلکہ قبرستانوں اور قبروں کے کتبوں سمیت نیست و نابود کر دیا گیا۔ چنانچہ صحیح معنوں میں وہاں اب ایک پتھر تک نہیں بچا۔ چنانچہ آج کل جب وہاں کبھی کسی غیر ملکی کا گزر ہوتا ہے تو اسے (نہایت فخر کے ساتھ) یہ بتایا جاتا ہے۔ صاحب! یہاں پہلے تو کچھ بھی نہیں تھا، صرف اجاڑ بیابان اور ویرانہ تھا۔''[1] اس رویے میں اور تباہی و بربادی کی اس پالیسی میں جو اسرائیل نے (عرب ممالک کے خلاف چھ روزہ جنگ میں مکمل کامیابی حاصل

......وزیرِ خارجہ رہا۔ 1981ء میں اس کا انتقال ہوا۔ یہودیوں کی دہشت گرد تنظیم ''ہگانہ'' کا سربراہ بھی یہی شخص تھا۔

① Documents form Israel.1967-73 Reading for a Critique of Zionism. ed. Uri Dauis Morton Mezuinsky [London: Ithaca Press, 1975], p.44

کرنے کے بعد) 1967ء اور مابعد کے برسوں کے دوران میں مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی میں اختیار کی، بڑی ناخوشگوار مطابقت پائی جاتی ہے۔ لندن کے مؤقر اخبار ''سنڈے ٹائمز'' کے انیس جون 1977ء کے شمارے کے مطابق اسرائیل 1969ء کے اواخر تک ان علاقوں میں عربوں کے سات ہزار پانچ سو چون اور اگست 1971ء تک سولہ ہزار دو سو بارہ مکانات مسمار کر چکا تھا۔

(تباہی و بربادی کی) یہ (المناک) داستان یہیں ختم نہیں ہوجاتی۔ انتہائی احتیاط اور باریک بینی کے ساتھ جو اعداد و شمار اکٹھے کیے گئے ہیں، ان کے مطابق 1948ء میں تقریباً سات لاکھ اسّی ہزار عرب فلسطینیوں کو اپنے گھروں اور جائدادوں سے محروم اور بے دخل کیا گیا تاکہ فلسطین کی ''تشکیلِ نو اور تعمیرِ نو'' کے کام کو سہل بنایا جاسکے۔ ① یہی وہ فلسطینی پناہ گزیں ہیں، جن کی تعداد اب بیس لاکھ سے متجاوز ہوچکی ہے۔ 1967ء (کی جنگ) کے بعد جو علاقے اسرائیل کے قبضے میں چلے گئے (اور جن کے متعلق اسرائیل کا سابق دہشت گرد وزیر اعظم یہ دعویٰ کرتا رہا کہ انھیں ''آزاد'' کرالیا گیا ہے) ہمیں فلسطینیوں کی کل تعداد میں ان مقبوضہ علاقوں کے سترہ لاکھ باشندوں کو جن میں وہ پانچ لاکھ نفوس بھی شامل ہیں، جو 1967ء کی جنگ سے قبل ہی اسرائیل میں محکومی کی زندگی گزار رہے تھے، شامل کرلینا چاہیے۔ فلسطین کی یہ کایا پلٹ، جس کے نتیجے کے طور پر اسرائیل وجود میں آیا، ایک انتہائی اور غیر معمولی طور پر مہنگا منصوبہ...... خاص طور پر فلسطینی عربوں کے لیے...... ثابت ہوا ہے۔

① Janet Abu-Lughod: The Demographic Transformation of Palestine"ed. Ibrahim Abu-Lughed [Evanstion, III. Northnestern Universty Press 1971] pp.53-61.

②

فلسطین اور مغرب کے لبرل حلقے

فلسطین کے متعلق جتنے منصوبے، ان میں صیہونیوں کے منصوبے بھی شامل ہیں، بھی تجویز ہوئے ہیں، ان سب میں فلسطین کے موجود حقائق کو جھٹلانے کے لیے اس (بودی) دلیل کا سہارا لیا گیا ہے کہ یہ سب کچھ ایک ''بلندتر'' (یا بہتر، زیادہ قابلِ قدر، جدیدتر، موزوں تر، اس قسم کے تقابلی الفاظ کا ایک ذخیرہ ہے، جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا) مفاد، مقصد یا مشن کے لیے کیا گیا ہے۔ یہ ''بلندتر'' مقاصد ان کے مؤیدین اور محرکین کو (ان کی اپنی دانست میں) نہ صرف ان کو یہ دعویٰ کرنے کا حق دیتے ہیں کہ فلسطین کے مقامی باشندے وہ جیسے بھی ہیں، اس قابل نہیں کہ ان کے متعلق کچھ سوچا جائے یا ان پر کچھ توجہ دی جائے، چنانچہ وہ عدم موجود ٹھہرتے ہیں، بلکہ یہ محرکین و مؤیدین یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ انھیں یہ دعویٰ کرنے کا بھی حق حاصل ہے کہ فلسطین کے مقامی باشندوں کی جگہ قطعی طور پر نئے باشندے لے چکے ہیں اور خود فلسطین کی جگہ ایک نئی مملکت قائم ہو چکی ہے۔ دونوں چیزوں کی مکمل طور پر ماہیت تبدیل ہو چکی ہے، اس لیے ان کی بحالی ایک ناممکن امر بن چکی ہے۔ یہ سب دعاوی عین اس وقت پیش کیے جا رہے ہیں جب یہی مقامی باشندے ان (دعاوی) کے بالکل برعکس ثابت کر رہے ہیں۔ یہاں پھر عرب فلسطینی کا سامنا ایک ایسے حریف سے ہو گیا ہے جس کے برتر ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ حریف جب شعوری طور پر اپنے آپ کو اور ایک فلسطینی کو اپنے تصور میں لاتا ہے تو وہ پوزیشن کے اعتبار سے اپنے آپ کو ایک برتر مقام پر پاتا ہے۔ اس برتری کی، جسے مختلف صورتوں میں بیان کیا جاتا اور ثابت کیا جاتا ہے، ایک واضح مثال قدرتی طور پر اعلان بالفور ہے جسے برطانوی حکومت نے نومبر 1917ء میں لارڈ روتھ چائلڈ (جو اس زمانے میں یہودی مفادات کی ترجمانی اور

نمائندگی کرتا تھا) کے نام ایک مراسلے کی صورت میں پیش کیا تھا اور جس میں اس نے یہ وعدہ کیا تھا کہ ''فلسطین میں یہودیوں کی قومی مملکت کے قیام کا ہمدردی سے جائزہ لیا جائے گا۔'' اس اعلان کے مطابق جو باتیں اہم ہیں ان میں سے پہلی بات یہ ہے کہ یہ کافی مدت سے فلسطین پر صیہونی دعاوی کو ایک قانونی بنیاد فراہم کر رہا ہے اور دوسری بات یہ ہے (اور ہمارے مقاصد کے لیے یہ بات برہانِ قاطع کا درجہ رکھتی ہے) کہ یہ وہ بیان ہے جس کی پوزیشنل قوت کی اہمیت کا اندازہ صرف اسی وقت لگایا جاسکتا ہے جب فلسطین کے مردم شماری سے متعلق اعداد وشمار یا وہاں کے انسانی حقائق سے نظریں چرائی نہ جائیں بلکہ ان حقائق کو واضح طور پر مدنظر رکھا جائے۔ پھر یہ کہ اس اعلان کو:

1۔ ایک یورپی قوم نے

2۔ ایک غیر یورپی علاقے کے متعلق

3۔ علاقے میں آباد مقامی اکثریت کی موجودگی اور آرزوؤں کو نہایت ڈھٹائی کے ساتھ نظر انداز کرتے ہوئے مرتب کیا اور......

4۔ اس نے اس خطے کے متعلق ایک غیر ملکی گروہ سے وعدے وعید کی صورت اختیار کر لی تا کہ یہ غیر ملکی گروہ لغوی طور پر اس خطے کو یہودیوں کے قومی وطن میں تبدیل کر سکے۔

آج اعلان بالفور جیسے بیان پر گریہ زاری کرنا لاحاصل ہے۔ زیادہ کارآمد بات یہ نظر آتی ہے کہ اس کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ یہ تاریخ کا ایک جزو ہے، چند ایسی خصوصیات کا اسلوب اور مجموعہ ہے جن سے مسئلۂ فلسطین کی ناگزیر طور پر تشکیل ہوئی ہے کیونکہ اسے آج بھی زیرِ بحث لایا جاسکتا ہے۔ اس اعلان میں بالفور نے جن نکات کی تصریح کی ہے، ان میں اس مفروضے کو کسی حیل وحجت کے بغیر صحیح تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ایک سامراجی طاقت کو یہ بلندتر حق حاصل ہے کہ وہ کسی علاقے کو جس طرح اس کا جی چاہے، ٹھکانے لگا سکتی ہے جیسا کہ بالفور نے خود حتمی انداز سے کہا ہے کہ یہ بات اسی وقت خاص طور پر صحیح ہے جب معاملہ فلسطین جیسے اہم خطے اور صیہونیت جیسے عظیم تصور کا ہو، جس کے متعلق یہودیوں کا یہ خیال تھا کہ یہ ایک ایسا عظیم تصور ہے جس کا مقصد ایک ایسے خطے کی بازیابی سے قطعاً کم نہیں جس کی وعید خود خداوند نے یہودی قوم کو دے رکھی ہے اور اس کے ساتھ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ اس تصورِ عظیم کو عملی جامہ پہنانے سے یہودی مسئلہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔ ان امور کے بارے میں خود بالفور کے ذہن میں قطعاً کوئی الجھاؤ نہیں تھا۔ 1919ء میں اس نے جو دستاویز مرتب کی تھی، اس کے مندرجہ ذیل اقتباس پر غور فرمائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کابینہ کے ایک رکن کی حیثیت سے اس نے مشرقِ وسطیٰ کے متحارب فریقین کے ساتھ جو مختلف اور متضاد وعدے کیے، وہ ان سے

کسی حد تک بہ خوبی آگاہ تھا اور بالآخر جس بات کو اہمیت دی گئی، وہ وعدوں کی خلاف ورزی نہیں تھی بلکہ وہ کس طرح اہم ترجیحات کے بارے میں اس کی (یعنی ایک برتر سیاسی، ثقافتی بلکہ نسلی ذات کا بھی ایک مراعات یافتہ رکن ہونے کی حیثیت سے اس کی اپنی) سمجھ بوجھ تھی۔

مراسلۂ میثاق ① میں جو تضاد پایا جاتا ہے، وہ شام کی خود مختار قوم کی نسبت فلسطین کی خود مختار قوم کے ضمن میں اور بھی واشگاف انداز سے نظر آتا ہے، کیونکہ جہاں تک فلسطین کا تعلق ہے تو ہم نے اس کے بارے میں اتنی بھی تجویز نہیں سوچی کہ اس ملک کے موجودہ باشندوں کی خواہشات ہی دریافت کر لی جائیں، اگرچہ امریکی کمیشن بظاہر یہ مطالبہ کر رہا ہے کہ ہم انھیں یہ بتائیں کہ آخر یہ (خواہشات) ہیں کیا۔ قطع نظر اس بات کے کہ صیہونیت غلط ہے یا صحیح، اچھی ہے یا بری، چاروں بڑی طاقتیں اس کی اور صرف اس کی حمایت کا عہد و پیمان کر چکی ہیں۔ صیہونیت کی جڑیں نہ صرف صدیوں پرانی روایات میں مضبوطی سے راسخ ہیں بلکہ موجودہ ضروریات اور مستقبل کی امیدیں بھی انھیں میں جکڑی ہوئی ہیں۔ چنانچہ ان سات لاکھ عربوں کی جو اس وقت اس مقدس سرزمین میں آباد ہیں، خواہشات اور تعصبات کی نسبت صیہونیت کہیں زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ میرے خیال کے مطابق یہی طرزِ عمل درست ہے۔ ②

تاہم یہ محض ایک (ذاتی) رائے کا اظہار نہیں بلکہ ایک (سوچا سمجھا) پالیسی بیان تھا۔ اس (بیان) نے اگر ساری دُنیا کے لیے نہیں، تو کم از کم ان سات لاکھ عربوں اور ان کے اخلاف کے لیے، جن کی سرزمین کے متعلق فیصلے صادر کیے جا رہے تھے، یقیناً تاریخ کے دھارے کا رخ بدل دیا۔ اس قسم کے بیانات میں جو قوت مضمر ہے، اس کے ماخذ کے متعلق تو میں بعد میں بحث کروں گا۔ فی الحال میں اس نکتے کی، جو میں نے اوپر بیان کیا تھا کہ آویزش اور مقابلہ ایک مبینہ طور پر ''بلند تر'' اور ایک ادنیٰ حقیقت کے مابین ہے، وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔

تقریباً عین اسی زمانے میں، جب بالفور اپنی دستاویز قلم بند کر رہا تھا، (فلسطین کے اندر) ایسے حقائق موجود تھے کہ جنھیں کیفیت (Quality) کے اعتبار سے تو مختلف تفاسیر و تشریحات کا تو ضرور لبادہ پہنایا جا سکتا

---

① اس میثاق کے ذریعے برطانیہ اور فرانس کی حکومتوں نے اپنے اس وعدے کا اعلان کیا تھا کہ اگر عثمانی۔ نو آبادیوں کے عرب اتحادی طاقتوں کی حمایت جاری رکھیں گے تو (پہلی) جنگِ عظیم کے اختتام پر انھیں آزادی دے دی جائے گی۔

② بالفور کے بیان کا یہ اقتباس کرسٹوفر سائیکس (Sykes) نے اپنی کتاب Crossroads to Israel ناشر انڈیانا یونیورسٹی پریس بلومنگٹن انڈیانا 1965 کے صفحہ نمبر 5 پر نقل کیا گیا ہے۔

تھا، لیکن جہاں تک کمیت کا تعلق ہے، تو اس پر کسی قسم کی بحث کی گنجائش نہیں تھی۔ مردم شماری کے مطابق جو اس زمانے کی آبادی کے حقائق ① کے متعلق واحد قابلِ اعتماد ماخذ ہے، (ڈنڈی مارنے اور آبادی کے کئی طبقوں کی تعداد شماری نہ کرنے کے باوجود اسرائیلی مؤرخین نے بھی اس مردم شماری کے اعداد و شمار کو مسلسل استعمال کیا ہے۔) 1914ء میں فلسطین کی کل آبادی ''چھ لاکھ نواسی ہزار اور دو سو بہتر نفوس پر مشتمل تھی۔ اس میں یہودیوں کی تعداد ساٹھ ہزار سے زیادہ نہیں تھی (شاید اس سے بھی کم ہو۔)'' 1922ء میں جو مردم شماری ہوئی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ''فلسطین میں اس سال مسلمانوں کی تعداد پانچ لاکھ نوے ہزار اور آٹھ سو نوے تھی (یعنی کل آبادی کا اٹھتر فیصد) عیسائیوں کی تعداد (ان میں بیشتر عرب تھے اگرچہ کچھ انگریز اور دوسرے یورپی باشندے بھی اسی زمرے میں شامل کر لیے گئے تھے۔) تہتر ہزار اور چوبیس تھی (یعنی کل آبادی کا 9.6 فیصد) دس ہزار (ایک فیصد) سے بھی کم دوسرے مذاہب کے پیروکار تھے۔ جہاں تک یہودیوں کا تعلق ہے، ان کی کل تعداد تراسی ہزار اور سات سو چورانوے (یعنی گیارہ فیصد) تھی۔ یہودیوں کی اس کل تعداد میں دو تہائی یورپی تارکینِ وطن اور ان کے اخلاف شامل تھے، ان تارکین وطن میں کچھ تو وہ لوگ تھے جو انیسویں صدی کے اواخر میں فلسطین میں وارد ہوئے تھے اور باقی برطانیہ کی عملداری کے بعد۔'' جیسا کہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ جنگِ عظیم دوم کے اختتام پر غیر یہودی آبادی کا تناسب ستر فیصد تھا اور باقی تیس فیصد آبادی یہودیوں پر مشتمل تھی اور ان یہودیوں میں سے بھی ستر فیصد کا ارتکاز شہروں اور دیہاتوں میں تھا نہ کہ ''زمین پر''، جس کے متعلق یہ مفروضہ قائم کر لیا گیا ہے کہ یہ تو محض اجاڑ بیابان تھا اور یہ یہودی تھے جنھوں نے اس ریگزار کو گل و گلزار میں تبدیل کر دیا۔ ② مزید برآں اگر آبادی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ برطانوی حکومت جس پالیسی پر عمل پیرا تھی، اس کا اصل مقصد صیہونیوں کو منفعت پہنچانا تھا۔ آبادی میں فطری اضافہ عام طور پر ڈیڑھ فیصد سالانہ ہوتا ہے لیکن برطانوی حکومت نے ملک میں زبردستی یہودی اکثریت بنانے کی جس پالیسی کو اپنا رکھا تھا، اس کے نتیجے کے طور پر 1922ء اور 1946ء کے مابین یہودی آبادی میں نو فیصد سالانہ اضافہ ہو

---

① ان حقائق سے میری مراد ان نفوس سے ہے جن کی گنتی کی جا سکتی تھی (اور امر واقع یہ ہے کہ 1922ء کے دوران میں برطانوی حکومت نے مردم شماری کے ذریعے ان کی تعداد گنی تھی)۔ (مصنف)

② Janet Abu Lughod: The Demographic transformation of palestine. A Survey of Palestine. Prepared in December 1945 and January 1946 for the information of Anglo-American Committee of Inquiry(Jerusalem 1946)p146.

رہا تھا۔ صرف 1927ء کے ایک سال کے دوران میں یہ اضافہ 18.7 فیصد اور 1934ء میں 25.9 فیصد تک پہنچ گیا۔ ①

مقامی اور غیر مقامی باشندوں کے مابین اس عدم تناسب کو پروان چڑھانے کے لیے جو استبدادی اور جابرانہ سیاسی ہتھکنڈے اختیار کیے گئے، انھیں صرف اسی صورت میں قابلِ قبول بنایا جاسکتا تھا کہ ان کے حق میں وہی عقلی دلائل استعمال کیے جائیں جو بالفور نے استعمال کیے تھے، محض (کثیر) تعداد اور موجودگی کی بجائے برتر تصور کو فلسطین پر حکومت کرنا چاہیے اور یہی وہ تصور...... یعنی صیہونیت...... تھا جسے عین 1948ء تک اور اس کے مابعد قانونی طور پر جائز ٹھہرایا جاتا رہا۔ جہاں تک صیہونیوں کا تعلق ہے، وہ واضح طور پر یہ سمجھتے تھے کہ اس نقطۂ نظر سے منفعت صرف انھی کو حاصل ہوگی۔ عربوں کی کثیر آبادی سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ یہ سرزمین تو پہلے ہی آباد ہے تو دور کی بات ہے، وہ یہودی آبادکار، جو ابتدا میں یہاں وارد ہوئے وہ انھیں (عربوں کو) یوں نظر انداز کرتے تھے (جیسے ان کا کوئی وجود ہی نہ ہو) اس رویے کے حق میں مختلف دلائل دیے جاتے تھے جو ان مفروضات پر مبنی تھے جن پر بالفور نے اپنے مؤقف کی عمارت تعمیر کی تھی۔ ایک اسرائیل نے اسرائیلیوں کے متعلق حال ہی میں ایک کتاب تحریر کی ہے، اس کتاب میں اس نے بیسویں صدی کے ابتدائی اور درمیانی برسوں کے دوران میں آنے والے یہودی آبادکاروں کی بے بصیرتی کا رونا تو رویا ہے لیکن وہ اس بے بصیرتی کے ڈانڈے بالفور اور استعماریت کی اخلاقی علمیات سے نہیں ملا سکا۔ ① یہ بے بصیرتی جس طرح بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے بیر بوروچوف (Ber Borochov) جیسے فکریات کے بانیوں (Ideologues) اور بائیں بازو ہی کی "ہے پوئل ہیت زائر" جیسی تحریکوں کے معاملے میں صحیح ہے، اسی طرح دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے ولادی میر جبوتنسکی (Jabotinsky) جیسے رومان پسندوں اور اس کی ترمیم پسندوں (Revisionists) (اسرائیل کے سابق وزیر اعظم مناچم بیگن کے سیاسی اسلاف) کے متعلق بھی اتنی ہی درست ہے۔ جیسا کہ ایموس ایلون نے ثابت کیا ہے کہ صیہونی نہاں خانۂ دل سے یہ سمجھتے تھے کہ عرب مسئلہ ایک ایسی چیز ہے جس سے انھیں یا تو بالکل ہی صرفِ نظر کرنا ہے اور یا پھر اس سے کاملاً انکار (اور یوں انھیں اس پر تنقید کرنے میں آسانی رہے گی۔) اگرچہ جبراً و قہراً فلسطین کے متعلق صیہونی یہودیوں کے احساسات، تاریخ اور تاریخی تجربہ اور خیالات و تصورات مختلف تھے۔ پھر بھی بالفور جس نظریے پر کاربند تھا،

---

② Amos Elon: The Israelis Founders and Sons 1971. Reprinted New York: Bantam Books, 1972], pp.194ff.

اس کے اور صیہونی نظریے کے مابین کوئی حدِ فاصل نہیں کھینچی جا سکتی۔ اپنے تمام تر اختلافات (اور یہ اختلافات اچھے خاصے تھے) کے باوجود برطانوی استعمار پسندوں اور صیہونیوں کے ذہنوں میں مستقبل کے متعلق جو نقشے آتے تھے ان میں کلی مطابقت پائی جاتی تھی۔ دونوں کی یہ کوشش تھی کہ فلسطین میں عربوں (کی موجودگی) کو زیادہ سے زیاد گھٹا کر پیش کیا جائے بلکہ اس کی بالکل ہی تنسیخ کردی جائے کہ ان کی تو بس ثانوی حیثیت ہے اور یوں انھیں آسانی کے ساتھ نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ دونوں کے اذہان میں مستقبل کے متعلق جو نقشے تھے، دونوں کی نظروں میں ان کی اخلاقی معنی خیزی ایک ایسی سرزمین پر، جو بے پناہ اہمیت کی حامل تھی، مقامی باشندوں کی محض موجودگی سے کہیں بلند و برتر تھی۔ (جیسا کہ ہم باب دوم میں دیکھیں گے۔) بنیادی طور پر مستقبل کے متعلق ان دونوں آرزوؤں کا تعلق اہلِ یورپ کے اس اندازِ فکر سے ہے جس کے مطابق وہ یہ سمجھتے تھے کہ انھیں دُنیا کو مہذب بنانے کا فریضہ سونپا گیا ہے۔ اس اندازِ فکر کی تعمیر اس قسم کے تصورات پر کی گئی تھی کہ انسانوں، نسلوں اور تہذیبوں کے مابین عدم مساوات پائی جاتی ہے۔ اس عدم مساوات کے نتیجے کے طور پر وہ خود اپنے آپ کو توعظمت و توقیر کے ایک ایسے بلند مقام پر سرفراز کر سکتے تھے جس کا حقیقت سے شاید دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ لیکن جہاں تک بدقسمت مقامی باشندوں کا تعلق تھا، ایک طرف تو وہ ان کے وجود ہی سے انکاری تھے، دوسری طرف ان کے رویے میں تضاد کا یہ پہلو کتنا واضح ہے کہ جن باشندوں کے وجود کا اقرار کرنے سے وہ شرماتے تھے، انھیں تعزیر و تادیب کے انتہائی سخت شکنجوں میں کسنے میں انھیں مطلق کوئی عار نہیں ہوتا تھا۔

پیش آمدہ مسائل سے نپٹنے کے لیے صیہونی جو منصوبے بناتے تھے اور ان کے یہ منصوبے جس طرح فلسطین کے مقامی باشندوں پر اثر انداز ہوتے تھے۔ پھر ان مقامی باشندوں کے خلاف وہ جو تقریری کارروائیاں کرتے تھے، ان دونوں باتوں کا ذکر تو میں اپنی کتاب میں بعد میں کروں گا۔ فی الحال میں جس امر کا خصوصی ذکر کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ اپنی جدید تاریخ کی بیشتر مدت کے دوران میں فلسطین اور اس کے مقامی باشندوں کو جس چیز سے واسطہ پڑا ہے، وہ یہ ہے کہ ان کے وجود سے نہایت شدومد کے ساتھ انکار کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک ایسی سرزمین پر جس پر قبضہ کرنے کی انھیں شدید خواہش تھی، مقامی باشندوں کی کثیر تعداد کو قلیل بنا کر پیش کرنے کے لیے صیہونی اپنے آپ کو یہ یقین دلانے لگے کہ ان (مقامی باشندوں) کا تو کوئی وجود ہی نہیں اور اگر ان کا کوئی وجود ہے بھی تو نہ ہونے کے برابر ہے۔ پہلے ان کے وجود سے انکار کر گیا، پھر ان کے راستے میں روڑے اٹکائے گئے، ان کو سکیڑنے، ان کا منہ بند کرنے اور ان کے اردگرد گھیرا تنگ کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ یہ ایک انتہائی پیچیدہ پالیسی ہے کیونکہ اس پالیسی میں نہ صرف صیہونیوں کی وہ

پالیسی بھی شامل ہے جو انھوں نے عربوں کے متعلق اختیار کر رکھی تھی بلکہ اس میں اسرائیل کی وہ پالیسی شامل ہے جو اسرائیل نے اپنی عرب نوآبادیوں کے متعلق اپنا رکھی ہے۔ پھر 1967ء سے مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی میں اسرائیلی قابض فوجیں جس کردار کا مظاہرہ کر رہی ہیں، وہ بھی اسی پالیسی کا جزو ہے۔ یہ مسائل بھی ایسے ہیں کہ میں ان کا ذکر بعد میں اپنی کتاب میں کروں گا۔ تاہم یہاں یہ استفسار کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ آخر فلسطینی تجربے کے یہ پہلو اہلِ مغرب کی نگاہوں سے کیوں اوجھل ہیں اور وہ اس کا ذکر کیوں نہیں کرتے۔ صیہونی اور فلسطینی عمل اور ردِعمل کے طور پر کس طرح ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں، یہاں ہمارا واسطہ اسی کشمکش کے بعض پہلوؤں سے پڑتا ہے۔

جب کہ میں بار بار عرض کر چکا ہوں کہ فلسطین ایک ایسی دھرتی ہے جہاں دو فریق ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار ہیں۔ ان میں ایک فریق مقامی باشندوں پر مشتمل ہے جو اس دھرتی پر موجود ہیں (یا تھے۔) دوسرا فریق ان لوگوں پر مشتمل ہے جو باہر سے یہاں وارد ہوئے۔ یہ نو وارد بنیادی طور پر ترقّی یافتہ ثقافت کی یورپی اور مغربی صورت کے علمبردار تھے۔ چنانچہ اس آویزش کا خاصا بڑا حصہ خود فلسطین کے باہر عمل میں آیا۔ 1918ء سے قبل فلسطین خلافتِ عثمانیہ کا ایک صوبہ تھا۔ 1918ء کے بعد یہ سرکاری طور پر ان علاقوں میں شامل ہو گیا جو برطانیہ کے زیرِ اثر تھے۔ جہاں تک فلسطین کے اندر یہودی اقلیت کا تعلق ہے۔ صیہونیت کا اس کے ساتھ تعلق برائے نام تھا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ دُنیا جہاں کے یہودی اعلان بالفور میں دلچسپی لے رہے تھے خود فلسطین میں جو یہودی برادری موجود تھی، اس اعلان کی انھیں ہوا بھی نہ لگنے دی گئی اور نہ اس کے متعلق وہاں کوئی پبلسٹی کی گئی۔ ① یہ رویہ اگر لفظی طور پر نہیں تو کم از کم معنوی طور پر ضرور بالفور کے اس نقطۂ نظر کے عین مطابق تھا کہ ''مقامی باشندوں'' سے کسی قسم کا صلاح مشورہ کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں (اتفاق سے اگر ان ''مقامی باشندوں'' میں کچھ یہودی بھی شامل تھے، تو بھی اس نقطۂ نظر پر کوئی حرف نہیں آتا) بعد ازاں سپریم جنگی کونسل کے سامنے جو پیرس امن کانفرنس منعقد کرنے کے لیے قائم کی گئی تھی، سلوین لیوی ② نے صیہونی وفد کی ترجمانی کے فرائض سرانجام دیے۔ اس نے اپنی شہادت قلم بند کراتے ہوئے یہ دلیل پیش کی:

---

① دیکھیں ڈورین انگریمز (Doreen Ingrams) کی کتاب Palestine Papers 1917-1922 ناشر London: John Marrey 1972 Speed of Conflict صفحات 20-28

② (Sylyain Levi) ایک معروف فرانسیسی مستشرق۔ اس کتاب میں جو نکات اٹھائے گئے ہیں، ان کو صحیح ثابت کرنے کے لیے اس کا یہ پیشہ بہت اہم ہے۔ (مصنف)

''اگرچہ اخلاقی نقطۂ نظر سے صیہونی کا کام زبردست اہمیت کا حامل ہے لیکن فلسطینی جس پر چھ لاکھ عرب باشندے آباد ہیں، ایک چھوٹا اور غریب ملک ہے۔ (چنانچہ) (نووارد) یہودی، جن کا معیارِ حیات عربوں کے معیار زندگی سے کہیں بلند ہے، آہستہ آہستہ انھیں (عربوں کو) اپنے گھروں اور جائدادوں سے محروم کرنے پر مائل ہوجائیں گے۔ ① ویزمان کے مطابق اس بیان نے صیہونیوں کے پاؤں تلے سے زمین نکال دی اور انھیں اچھی خاصی کوفت ہوئی کیونکہ جیسا کہ اس نے بعد میں کہنا تھا: ''دُنیا یہودی ریاست (اور غالباً صیہونی تحریک) کے متعلق اس وقت اپنا کوئی فیصلہ سنائے گی جب وہ یہ دیکھے گی کہ عربوں کے ساتھ یہ کس قسم کا برتاؤ کرتی ہے۔'' ② کیونکہ یہ حقیقتاً دُنیا ہی تو تھی جس نے صیہونیت کی کامیابی کو ممکن بنایا اور صیہونیوں کے حامیوں اور سامعین کی حیثیت سے اہلِ دُنیا کے متعلق صیہونیوں کی یہ سوجھ بوجھ ہی تھی جس نے فلسطین پر قبضہ کرنے کی جدّوجہد میں اہم عملی کردار ادا کیا۔

اگرچہ یہ بات بھی درست ہے کہ انیسویں صدی کے آخری اور بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں جان ہوبسن (Hobson) جیسے سامراج مخالف مفکر بھی موجود تھے جو اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ روئے زمین پر ''غلام اقوام'' موجود ہیں اور یہ کہ ترجیحات کی فہرست میں ان اقوام کی رائے کی کوئی اہمیت نہیں، پھر بھی جس سفا کانہ انداز سے بالفور نے مقامی باشندوں کو بے وقعت اور حقیر جانا تھا اور یوں انھیں بالکل نظر انداز کر دیا تھا، باقی دُنیا انھیں اس طور نظر انداز کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ تاہم صیہونی اور خود انگریز بھی یہ خوب سمجھتے تھے کہ مقامی باشندے (ایک نہ ایک روز کسی نہ کسی طرح ضرور نمودار ہوں گے اور جب وہ نمودار ہوں گے تو دُنیا کو اپنی مزاحمت سے آگاہ کر دیں گے۔ ③ جارج انتونیس ④ کی کتاب ''عربوں کی بیداری'' کے مطابق انگریز

---

① انگریز صفحہ:58

② Chim Weizmann Trial and Error: The Auto biography of chaim Weizmann [New York: Harper and Row, 1959], p.462.

③ یہ جو میں نے لفظ ''نمودار'' استعمال کیا ہے اس سے میری مراد یہ ہے کہ مصرین کو مقامی باشندے محض جسمانی طور پر ہی نظر نہیں آئیں گے بلکہ وہ اس سے کچھ آگے بھی دیکھ سکیں گے (یعنی بیرونی دُنیا یہ سمجھ سکے گی کہ آخر یہ فلسطینی چاہتے کیا ہیں اور ان کی آرزوئیں اور امنگیں کیا ہیں۔) مصنف

④ عربوں کی جدّوجہد آزادی کے بارے میں جتنی تصنیفات بھی منظرِ عام پر آئی ہیں۔ ان میں جارج انتونیس (Antonius) کی کتاب (The Arab Awakening) بہترین ہے۔ (مصنف)

اور صیہونی اس امر سے نابلد نہیں تھے کہ عربوں کی نشاۃِ ثانیہ انھیں (عربوں کو) اس ناممکن تضاد سے آگاہ کر دے گی جو ان دونوں منصوبوں کے مابین پایا جاتا ہے جو ایک طرف تو انھوں نے خود اپنے اور اپنے علاقوں (بشمول فلسطین) کے لیے تیار کیے ہیں اور دوسری طرف وہ جو صیہونیوں، بالفور اور فرانسیسیوں نے مرتب کیے ہیں۔ مزید برآں، دُنیا کے یہودیوں کی بیشتر تعداد اِس وقت بھی اور اُس وقت بھی فلسطین میں نہیں بلکہ اس دُنیا میں تھی اور ہے جسے یورپی/ امریکی دُنیا کہا جاتا ہے۔ اب کرنے کا کام یہ رہ گیا کہ (کسی نہ کسی طرح) فلسطین کو ایک یہودی مملکت میں تبدیل کر دیا جائے اور اس کے ساتھ ہی یہ اہتمام کر دیا جائے کہ دُنیا مقامی باشندوں کے احتجاج کو سنجیدگی سے نہ لے سکے (اور بعدازاں تو ایسے طریقے وضع کیے گئے کہ جن کے استعمال سے یہ فائدہ ہوا کہ کسی کو اس احتجاج کی کانوں کان خبر تک نہ ہو سکی) جیسا کہ میں اوپر تحریر کر چکا ہوں کہ ایک منظم طریقے سے فلسطینیوں کے وجود ہی سے انکار کیا جا رہا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ایک طرف تو فلسطینیوں کے گھروں اور جائدادوں کو نیست و نابود کیا جاتا تھا ان کے راستے میں طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کی جاتی تھیں، ان کی نقل و حرکت پر پابندیاں لگا دی جاتی تھیں اور جہاں بس چلتا تھا انھیں زندانوں میں نظر بند کر دیا جاتا تھا۔ دوسری طرف کوشش یہ کی جاتی تھی کہ عالمی مجالس میں مسئلۂ فلسطین کا کسی طور ذکر نہ ہونے پائے تاکہ فلسطینیوں کی کہیں شنوائی نہ ہو سکے۔ اس پر طرہ یہ کہ صیہونی اپنی آرا اور حقیقت کی وسیع پیمانے پر تشہیر کرنے اور فلسطینی عربوں کی آرا اور ان کی حقیقت پر پردہ ڈالنے میں کامیاب رہے۔ ایک منفی منصوبہ جو ایک حقیقت سے انکار کرنے اور اس کی راہ میں رکاوٹیں حائل کرنے کے لیے وضع کیا گیا تھا، ایک دوسرے منصوبے کی (جو اس کا ہم پلہ تھا اور جو ان معنوں میں اس کا الٹ بھی تھا کہ اس کا مقصد مثبت تھا جس کی زیادہ سے زیادہ تشہیر کرنا تھا) تخلیق کا موجب بنا۔

یہاں میں محض پراپیگنڈے کا ذکر نہیں کر رہا جو اگر زیادہ تر فلسطین کے متعلق دروغ گوئی ہی پر مبنی ہوتا تو اسرائیل کا روپ دھارنے میں صیہونیت کا کبھی مددگار نہ ہوتا۔ میں جس بات پر زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس پراپیگنڈے کے لیے جو لائحۂ عمل اختیار کیا گیا اس میں بے پناہ قوت تھی، اس پراپیگنڈے کا مرکزی نقطہ یہ تھا کہ فلسطین کو ایک صیہونی نو آبادی کے قالب میں ڈھالا جائے۔ وہاں اپنی کامرانیوں، کارناموں اور فقیدالمثال اداروں کا ڈھنڈورا پیٹا جائے۔ یہ بالکل وہی اسلوب تھا جو آج بھی اسرائیل نے اپنا رکھا ہے کہ اسرائیل اپنے متعلق جو معلومات فراہم کرتا ہے، ان میں اس امر کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ اپنی خودداری کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے جائیں، اپنی مصلحتوں کو بھی عزتِ نفس کا حصہ بنا کر پیش کیا جائے اور بڑھ چڑھ کر اس بات کی تشہیر کی جائے کہ ہم ہی وہ لوگ ہیں جو نئے راستے تراشتے ہیں اور ”نئے

کاموں کا بیڑا اٹھاتے ہیں۔'' اس پراپیگنڈے کی قوت کا یہ عالم ہے کہ امریکی بالخصوص اس کی رو میں نہایت آسانی کے ساتھ بہہ جاتے ہیں اور اپنے آپ کو اس کا ہم خیال بنانے میں انھیں قطعاً کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔ اس پراپیگنڈے میں جو قوت پنہاں ہے اور جس طرح وہ لوگوں کے دل و دماغ اپنی گرفت میں لے لیتا ہے، اس کا اصل پہلو یہ ہے کہ اس نے فلسطین کی عرب حقیقت کو منظم طریقے سے دبا دیا ہے۔ ایک مثال پیشِ خدمت ہے۔ یہودیوں نے اجتماعی کاشتکاری کے زرعی فارم [1] قائم کر رکھے ہیں۔ ان فارموں کے متعلق جتنی تحریریں قلمبند کی گئی ہیں، ان میں سے بیشتر میں ان حقائق کا قطعاً ذکر نہیں کیا گیا کہ قیام اسرائیل سے قبل (بلکہ اس کے بعد بھی) عربوں کو کبھی بھی ان کی رکنیت کا اہل نہیں سمجھا گیا، یہ کہ ان فارموں کا وجود ان کرائے کے (عرب یا مشرقی یہودی) مزدوروں کا مرہونِ منّت ہے جو سستے داموں مل جاتے ہیں اور یہ کہ یہ اجتماعی فارم ان زمینوں پر قائم کیے گئے یا قائم کیے جا رہے ہیں جو عربوں سے زبردستی چھینی گئی ہیں۔ [2] صیہونیوں نے فلسطین کے مقامی عرب باشندوں کے متعلّق جو پالیسی اختیار کر رکھی ہے، اس پر جو اعتراضات کیے جا سکتے ہیں، بجائے اس کے کہ وہ ان کا پیشگی جواب تیار کرتے، صیہونی ترجمان ان کا ذکر ہی نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ بظاہر یہی معلوم ہوتا کہ یہودی تو بہت بے ضرر اور معصوم ہیں وہ تو اپنے یہ اجتماعی فارم غیر آباد زمینوں پر قائم کر رہے ہیں۔ ہم جو یہودی آباد کاران پر بلا ترغیب وتحریص کام کر رہے ہیں اور یوں زبردست معاشرتی یونٹ قائم کر رہے ہیں۔

چنانچہ فلسطین میں یہ سلسلہ چلتا رہا اور اس ضمن میں آوودا اوریت [3] جیسی جماعتوں کو آلہ کار کے طور پر استعمال کیا گیا۔ ایلموس ایلون کے مطابق اس قسم کی جماعتوں کا مقصد نو واردان (فلسطین میں وارد ہونے والے یہودی صیہونی منصوبے کا جزو تھے) کے لیے مکمل طور پر علیحدہ معاشی شعبہ قائم کرنا تھا (اور بہانہ یہ بنایا گیا کہ) ملک کی تعمیر نو کی خاطر یہودیوں کو مقامی مزدوروں کا قطعاً استحصال نہیں کرنا چاہیے۔ یہودیوں کو سب

---

① اجتماعی کاشتکاری کے ان فارموں کی صیہونی کبتز (Kibbutz) کہتے ہیں۔ اصل میں یہ عبرانی لفظ ''قبتظ'' کی شکل ہے جس کے معنی اکٹھا کرنا ہے۔ پہلا کبتز 1910ء میں جھیل طبریہ کے کنارے تعمیر کیا گیا تھا۔ چونکہ یہاں کی زمین دلدلی تھی اس لیے بہت سستے داموں مل گئی تھی۔ کبتز پر محض کاشتکاری ہی نہیں ہوتی تھی بلکہ کسانوں کو زبردست فوجی تربیت بھی دی جاتی تھی۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اسرائیل کے بہترین فوجی دستے ان اجتماعی فارموں نے ہی مہیا کیے تھے۔

② ان اجتماعی فارم کی قلعی ایک کتاب The Candid Kibbutz میں کھولی گئی ہے۔ اسے لندن کی ایک فرم MERAG نے 1978ء میں شائع کیا تھا۔ (مصنف)

③ Avoda Irvit (یہودی مزدور تنظیم)

کچھ خود ہی کرنا چاہیے۔ جہاں تک مقامی باشندوں کا تعلق ہے، جوں جوں ملک کے عام حالات بہتر ہوتے جائیں گے اور معاشی ترقی کی رفتار تیز ہوتی جائے گی۔ وہ بالواسطہ طور پر اس سے، بالخصوص تجارت سے مستفید ہوتے رہیں گے۔ لیکن ابھی سے (ہر میدان میں) خود کفالت حاصل کرنے کی کوششوں میں تمام یہودیوں کو لازماً شریک ہونا چاہیے۔ ان پر یہ لازم ہے کہ وہ اپنے تمام جسمانی کام خود اپنے ہاتھوں سے کریں، یہ کام خواہ کتنے ہی دشوار ہوں، ان کا معاوضہ کتنا ہی حقیر ہو اور یہ کتنے ہی ارزل اور نیچ ہوں۔ اگر عرب محنت کا ''استحصال'' نہیں ہوگا تو عرب مزدور ''معروضی طور پر'' صیہونیوں کے مخالف نہیں بن سکیں گے...... آوودا اوریت کی اساس جزوی طور پر غیر عملی اصول پرستانہ التباس پر استوار کی گئی تھی۔ عقلی اعتبار سے اس میں متناقض عناصر کی بھرمار تھی۔ عملی طور پر اس نے ایک ایسی ذیلی ثقافت (سب کلچر) کو تخلیق کیا جو ایک وسیع تر معاشرے کے تقاضوں سے بے قید تھی اور اس کی خوشہ چین بھی نہ تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے ''حقیقت''...... یہ حقیقت ترکی تھی، برطانوی تھی یا عرب...... سے کچھ اس قسم کی مامونیت حاصل تھی جس نے اس کے ارکان کو اپنے خوابوں سے جی بہلانے کے لیے کھلا چھوڑ دیا۔''①

(اس رویے سے) مقامی باشندوں کو جو سب سے بڑا اور براہِ راست فائدہ حاصل ہوا، وہ یہ تھا کہ وہ اپنے وطن سے ہی محروم ہو گئے۔ تاہم ایلون نے جو نکتہ اٹھایا ہے، وہ عمومی طور پر درست اور معقول ہے۔ مقامی باشندوں سے زمینیں ہتھیانے کے لیے صیہونیوں نے آوودا اوریت جیسی تنظیمیں اور اس قسم کے جو دوسرے ذرائع استعمال کیے، ان کے متعلق کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ''معروضی طور پر'' کسی قسم کے استحصال میں مصروف ہیں۔ اس سیاق و سباق میں لفظ ''معروضی'' نہایت واضح لیکن انتہائی سفاکانہ معانی اختیار کر لیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے (اور یہ تھا) کہ صیہونی اپنی تیاریاں مکمل کریں گے۔ وہ اپنی ابتدائی رزم آرائیوں کے فوائد معروضی طور پر اپنے دائرے کے اندر حاصل کریں گے اور ان کی ان رزم آرائیوں کا ہدف کوئی دوسرا نہیں ہوگا، یہاں بھی اور آئندہ بھی۔ ''کوئی دوسرا'' سے مراد یہ غیر یہودی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں کہ ایلون کو بھی فلسطین میں برطانوی اور عرب ''حقیقت'' کے مابین کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ اسے یہ بات سمجھائی ہی نہیں دی کہ یورپ کی کسی سامراجی طاقت کے مقابلے میں مقامی باشندوں کو جو کئی صدیوں سے مسلسل فلسطین میں رہتے چلے آ رہے تھے، نسبتاً کہیں زیادہ اخلاقی اختیار حاصل تھا اور حاصل ہے اور یہی بات صیہونیوں کو بھی کبھی سجھائی نہیں دی جنھوں نے عرب فلسطینیوں کا معروضی طور پر قلع قمع کرنے کے لیے 1948ء سے ہر قسم کے ہتھکنڈے

---

① ایموس ایلون، اسرائیلی، بانی اور بیٹے صفحات: 222-220

استعمال کیے ہیں۔ (وہاں) جو کچھ پیش آیا، اس کے متعلق ایک مخصوص نقطۂ نظر ویزمان کے اس جملے سے ملتا ہے۔ ''یہ تو ایک معجزہ تھا کہ خس کم ہوگیا اور جہاں پاک ہوگیا۔ یہ تو ایک معجزہ تھا کہ اسرائیل کا کام اتنا آسان ہوگیا۔''①

چنانچہ صیہونیت کی طرف سے جتنی بھی اپیلیں ہوئیں وہ مجبوراً اور ضرورتاً بین الاقوامی اپیلیں تھیں۔ صیہونی جدّ وجہد کا مقام صرف جزوی طور پر فلسطین کے اندر تھا۔ 1948ء تک اور اس کے بعد بھی ......اس ضمن میں خود ویزمان نے جو کچھ کیا، وہ اس جدّ وجہد کی بہترین مثال ہے۔ اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار ہی نہیں تھا کہ اس جدّ وجہد کو مغربی ممالک کے بڑے بڑے شہروں میں جاری رکھا جائے۔ وہیں سے اس مقصد کے لیے سرمایہ، رضا کار، پراپیگنڈے کے ذرائع اور دوسرے وسائل فراہم کیے جاتے تھے اور کیے جاتے ہیں۔ ایک طرف تو یہ کیفیت تھی کہ صیہونیت کے خلاف مقامی باشندے جو مزاحمت کر رہے تھے، مغرب میں اسے یا تو سرے سے ہی نظر انداز کر دیا جاتا یا پھر اسے بہت گھٹا کر پیش کیا جاتا۔ دوسری طرف صیہونی مسلسل یہ دعویٰ کرتے رہتے کہ انگریز ان کے فلسطین میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں داخل ہونے میں رکاوٹیں کھڑی کر رہے ہیں۔ 1922ء اور 1947ء کے مابین دُنیا فلسطین کے جس اہم مسئلے کا مشاہدہ کر رہی تھی وہ یہ نہیں تھا (جیسا کہ فلسطینی یہ تصور کرنے کی کوشش کریں گے) کہ یہ مقامی باشندوں اور نئے آباد کاروں کے مابین کسی آویزش کا مسئلہ تھا بلکہ دُنیا کے سامنے یہ مسئلہ جس انداز سے پیش کیا جاتا تھا، اس سے یہ مسئلہ انگریزوں اور صیہونیوں کے مابین آویزش کا مسئلہ بن جاتا تھا۔ اس عظیم الشان علمیاتی② کارنامے...... میں یہ فلسفیانہ اصطلاح اس لیے استعمال کر رہا ہوں کیونکہ اور کوئی دوسری اصطلاح ایسی نہیں جس کے ذریعے مناسب طور پر یہ بتایا جاسکا کہ کس طرح تقریباً دس لاکھ مقامی باشندوں کو دُنیا والوں کے اذہان سے کھرچ دیا گیا کہ وہ یہ بھول ہی گئے کہ یہ لوگ بھی کہیں موجود تھے......کی ستم ظریفی میں اس وقت اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے جب ہمیں یہ

---

① ویزمان کے اس قول کا حوالہ جیمز میکڈانلڈ نے اپنی کتاب My Mission to Israel کے صفحہ نمبر 176 پر دیا ہے اس کتاب کو Simon Schuster نے 1951ء میں نیویارک سے شائع کیا تھا۔

② علمیات (epistemology) فلسفے کی ایک شاخ ہے۔ اس کا مقصد علم کی نوعیت اور اس کے ماخذوں کی جانچ پڑتال کرنا ہے۔ چنانچہ یہ علم اس قسم کے امور سے بحث کرتا ہے کہ علم کیا ہے؟ کیسے حاصل ہوتا ہے کیا صداقت کا یقین علم ممکن ہے؟ اس کی امکانی حدود کیا ہیں، علم صحیح عقل کی بنیاد پر ہے یا حواس پر، حسی تجربہ کس حد تک قابل اعتماد ہے؟ عقل پر کس حد تک بھروسا کیا جاسکتا ہے اور کیا وجدان بھی علم کا ذریعہ ہے؟

یاد آتا ہے کہ 1948ء میں جب اسرائیل نے یہ اعلان کیا کہ اس نے ایک مملکت کا روپ دھار لیا ہے تو قانونی طور پر یہ فلسطین کے چھ فیصد سے کچھ ہی زیادہ حصے کا مالک تھا اور اس کی یہودی آبادی فلسطین کی پوری آبادی کا ایک معمولی حصہ تھی۔ اس رویے اور آووداارادیت کے ''اصولوں'' کو بڑی استقامت اور تسلسل کے ساتھ اپنایا گیا اور ان سے سرِ موانحراف نہیں کیا گیا یعنی دُنیا کے سامنے یہی ڈھنڈورا پیٹتے رہو کہ ہم تو مظلوم ہیں۔ برطانیہ ہمارے خون کا پیاسا ہے کیونکہ وہ ایک سامراجی قوت ہے۔ اس کے ساتھ مقامی باشندوں کو نظر انداز کرتے رہو اور اس وقت تک کسی کو ان کے متعلق کہنے کا موقع نہ دو جب تک معروضی طور پر یہ نظر نہ آئے کہ آپ ان کا براہِ راست استحصال کر رہے ہیں (اور یہ تو آپ پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ غیر یہودیوں کو اپنے کسی کام کے قریب مت پھٹکنے دو، کہیں آپ پر استحصال کا الزام نہ لگ جائے)۔

صاف ظاہر ہے کہ مغربی ممالک میں صیہونی پراپیگنڈے کا آغاز وہاں کے یہودی طبقوں نے کیا اور وہی اس میں پیش پیش تھے البتہ بعد ازاں خود اہلِ مغرب بھی اس دوڑ میں شریک ہوگئے اور انھوں نے صیہونیوں کے ترکش کو اپنے تیروں سے بھر دیا۔ تسخیرِ فلسطین کے سلسلے میں صیہونیوں نے جس مہم کا آغاز کیا، اس کا بنیادی نکتہ یہ تھا اور اب بھی یہی ہے کہ یہ اپیل تو ایک مخصوص نوعیت کی چیز کے لیے ہے لیکن اس کے جواز کے لیے اسے ایک ایسا عمومی رنگ دے دیا گیا ہے کہ اس کی ہر قسم کی مخالفت ناممکن حد تک عمومی نظر آئے (یعنی اس مخالفت کا ہدف کوئی مخصوص چیز نہ بن سکے) اور یوں عمومی طور پر یہ (مخالفت) ناقابلِ قبول نظر آنے لگے (یعنی کوئی شخص بھی اسے صحیح ماننے پر تیار نہ ہو۔) اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ مغرب کے وہ حلقے جو اپنے آپ کو لبرل ① اور روشن خیال تصور کرتے تھے، وہ بھی اس کی حمایت پر کمربستہ ہوگئے۔ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، وہ ان چند مثالوں سے واضح ہو سکے گا جو میں یہاں دے رہا ہوں۔ انیسویں صدی کی آخری دہائی کے دوران میں ہرزل نے صیہونیت کا جو تصور پیش کیا، اس کے مطابق یہ (صیہونیت) ایک تحریک کا نام تھا، اس کا مقصد یہودیوں کو آزادی دلانا اور مغرب میں یہود دشمنی کے مسئلے کو حل کرنا تھا، بعد ازاں جب اس تصور کی

---

① (Liberal): مغرب میں لبرل اس شخص کو کہتے ہیں جو یہ سمجھتا ہے کہ ہر شخص کو اپنے ضمیر کے مطابق سوچنے اور عمل کرنے کا حق حاصل ہے لیکن لبرل شخص کا یہ فرض بھی بنتا ہے کہ وہ دوسروں کی آزادیٔ رائے کا احترام کرے اور کمزوروں کا تحفظ کرکے جمہوری اقدار کو پروان چڑھائے۔ معاشرتی بہبود کے لیے سرکاری ذرائع کا استعمال اس کے نزدیک جائز ہے لیکن وہ کاروبار میں کسی قسم کی سرکاری مداخلت کا شدت سے مخالف ہے۔ لبرل اشخاص شہری آزادیوں کے علمبردار، غلامی کے مخالف اور عام لوگوں کو ووٹ کا حق دینے کے حامی ہیں۔ وہ مذہب کو شخصی چیز سمجھتے ہیں اور اس میں کسی قسم کی مداخلت پسند نہیں کرتے۔ وہ معاشرے میں کچھ نہ کچھ تبدیلیاں لانا چاہتے ہیں لیکن انقلابات اور قوت کے ذریعے تبدیلیوں کے عمل کے سخت مخالف ہیں۔

تشریحات کی گئیں تو اس کا مقصد فلسطین کا حصول قرار پایا تاکہ وہاں اس تصور کی مادی شکل دی جاسکے۔ (شروع میں اس مقصد کے لیے مشرقی افریقہ اور جنوبی امریکا کے بعض علاقے بھی زیرِ غور آئے لیکن بعد میں انھیں ترک کر دیا گیا) فلسطین کو منتخب کرنے کی ایک وجہ تو یہ تھی کیونکہ یہ ایک ایسا مقام تھا جہاں (ان کے بقول) خدا اور یہودیوں کے مابین ایک میثاق طے پایا تھا اور یوں اس سرزمین کے ساتھ ان کی ایک روحانی وابستگی وجود میں آگئی تھی، پھر فلسطین کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ یہ ایک ایسی سلطنت کا پسماندہ صوبہ تھا جو خود اس سے بھی زیادہ پسماندگی کا شکار تھی۔ چنانچہ ابتدا ہی سے صیہونیت کے وکیلوں اور مؤیدین کی یہ کوشش تھی کہ فلسطین پر اس بنا پر دعویٰ جتایا جائے کہ ایک تو یہ (ان کی نظروں میں) پسماندہ اور زیادہ تر غیر آباد خطہ ہے۔ دوسرے یہودیوں (بقول ان کے اپنے) کو چونکہ اس پر ایک منفرد تاریخی استحقاق حاصل ہے، اس لیے وہ اس کی تشکیلِ نو کر کے اسے ایک یہودی وطن میں تبدیل کر سکیں گے۔

چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مغرب میں جو شخص بھی اس تصور کی مخالفت کرتا، فوراً ہی اس پر یہود دشمنی کا ٹھپا لگ جاتا۔ اس کے برعکس اگر آپ اس کی حمایت کرتے تو اس کا مفہوم یہ ہوتا کہ آپ مقامی رہائشی باشندوں کے بنیادی طور پر غیر دلچسپ ٹولے کو محض بے دخل یا نظر انداز نہیں کر رہے بلکہ اس کی نسبت آپ متعدد کہیں زیادہ دلچسپ اور قابلِ قبول سرگرمیوں میں شریکِ عمل ہیں۔ ایک مرتبہ تان پھر اس بات پر ٹوٹ رہی تھی کہ ایک مخصوص مسئلے کو ایک مخصوص حل کے ذریعے طے کیا جائے۔ امید کی یہ ایک ایسی جھلک تھی...... جیسا کہ ابھی ہم دیکھیں گے...... جس میں انھیں (اہلِ مغرب کو) یہ دکھائی دیتا تھا کہ اس کے اندر نہ صرف ایک تعمیری نوآبادیاتی مہم کا نظریہ پنہاں ہے بلکہ اس میں ایک مثبت معاشرتی اور عقلی مسئلے کے متعلق ایک سائنسی اور منضبط رویے کا حامل ایک مثبت تعمیری معاشرتی حل بھی موجود ہے۔ مزید برآں فلسطین کے اندر ایک یہودی ریاست (یا اس ریاست کے حصول کے لیے یہودی تحریک) کے تصور کو ایک زبردست اخلاقی وقار کی خوشبو نے بھی معطر کر دیا تھا اور یہ خاص طور پر اس زمانے میں ہوا جب یورپ پر فاشزم① کے تاریک سائے پھیلنا شروع ہو گئے تھے۔

---

① فاشزم (Fascism) فسطائیت یا فاشیت: محدود معنوں میں اس سے مراد وہ سیاسی اور اقتصادی نظام تھا جسے جنگِ عظیم اول کے بعد مسولینی نے اٹلی میں مروج کیا لیکن وسیع تر معانی میں اس کے ڈانڈے ہٹلر کی نازیت (Nazism)...... ہسپانیہ کے جنرل فرانکو کی آمریت اور برطانوی سیاستدان سر آسولڈ موزلے کی برطانوی یونین سے جا ملتے ہیں۔ یہ تمام تحریکیں، نسلی تفوق، حب الوطنی، یہود دشمنی، مارکیٹ دشمنی اور قومی مفادات کے نظریوں پر پروان چڑھیں۔ ان تحریکوں کے رہنما وفود کے سچے انقلابی تصور کرتے ہیں۔ پارلیمانی جمہوریت سے نفرت کرتے اور اسے کم ظرف، فرسودہ اور غیر مؤثر تصور کرتے۔ یہ تحریکیں وقتی طور پر دوسری جنگِ عظیم کے ساتھ دب گئیں لیکن کئی ممالک میں اب دوبارہ سر اٹھا رہی ہیں۔ چونکہ بنیادی طور پر تحریکیں......

یہاں مسئلہ (اہلِ مغرب کی نظروں میں) ایک ایسی قوم کا تھا جس کی شناخت از منہ قدیم سے اسرائیل کی سرزمین سے پیوست تھی۔ اس کی شناخت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ یہ قوم اگرچہ زبردست اخلاقی اور ذہنی عظمتوں کی امین تھی لیکن اسے آزمائش وابتلا کے ایک طویل دور میں سے گزرنا پڑا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے دور دراز مقامات کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہونا پڑا۔ چنانچہ صورت یہی دکھائی دیتی تھی کہ فلسطین ہی وہ جگہ ہے جہاں ان (یہودیوں) کی ضرورتوں کو مخصوص، احسن اور فراخدلانہ انداز سے پورا کیا جاسکتا ہے۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ اگر آپ مغرب میں اس منصوبے کی مخالفت کرتے تو آپ کو کہیں جائے امان نہ مل سکتی، جس طرح یہ بات کل درست تھی آج بھی اسی طرح صحیح ہے۔ صیہونیت ہمیشہ ہی مخصوص حلوں...... ترکِ وطن، ہسپتالوں کی تعمیر اور بعد ازاں اپنے دفاع کے لیے ہتھیار، سرمایہ...... کی متلاشی رہی ہے۔ (مسائل کے) اس قسم کے حلوں سے (لوگوں کی) تائید وحمایت حاصل ہوتی ہے اور جو لوگ ان حلوں کی نفی کرتے ہیں، ان پر منفی اندازِ فکر اختیار کرنے کا الزام لگ جاتا ہے، ایک ایسا اندازِ فکر جو نہ صرف منفی ہے بلکہ تحریری اور عمومی بھی ہے (اور یوں جس کا حقائق سے دور کا بھی واسطہ نہیں) خود جارج انتونیئس نے بھی اپنی بلند پایہ تصنیف میں عرب بیداری کو (نہ کہ فلسطینیوں کی موجودگی کو) بطورِ دلیل پیش کیا ہے۔ اس کا یہ کہنا ہے کہ اس بیداری کو صرف اسی صورت میں سمجھا جاسکتا ہے کہ اس کا مقصد سارے مشرقِ قریب کو عربی اور اسلامی رنگ میں رنگنا ہے۔ (چنانچہ اس قسم کے نقطۂ نظر پیش کرنے کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ) فلسطین میں صیہونی فتوحات اور کامرانیوں کے متعلق اگر کسی شخص کے ذہن میں کوئی تھوڑے بہت شکوک پیدا بھی ہوتے ہیں تو وہ بھی بدک جائے گا اور اسے لازماً اس ''حقیقت'' (جو صیہونیوں نے ان کے ذہنوں میں راسخ کردی ہے) کا سامنا کرنا پڑے گا کہ میں جن شکوک کی آبیاری کررہا ہوں، ان کا مطلب تو یہ ہوگا کہ میں تو ایک عمومی عرب اور اسلامی بلاک کی حمایت کررہا ہوں، اس بلاک کی جس نے ابھی تک کوئی واضح شکل وصورت اختیار نہیں کی اور ایک محض تجریدی تصور ہے، محض تصور ہی کتنا بھیانک ہے۔ ایک طرف (یورپ میں بیٹھ کر اور یورپ اسلامی دُنیا سے خاصے معقول فاصلے پر ہے) انھیں عالم اسلام ایک تیرہ وتار سمندر نظر آتا ہے اور دوسری طرف

......لبرل نظریات اور روایات کی مخالف اور یہودیوں کی دشمن تھیں۔ اس لیے یورپ اور امریکا کے لبرل طبقوں کو یہودیوں کی حمایت کرنے میں کوئی عیب نظر نہ آیا۔ کیونکہ وہ انھیں مظلوم تصور کرتے تھے۔ یوں وہ ایک مظلوم طبقے کی طرف داری کو اپنا اخلاقی فریضہ گرداننے لگے لیکن وہ یہ بھول گئے کہ وہ اس طرح ایک اور مظلوم طبقے (فلسطینی) کو وجود میں لانے کے عمل میں حصہ دار بن گئے ہیں۔

انھیں مٹھی بھر یورپی یہودیوں کی انتہائی دلفریب اور نفیس تصویر دکھائی جاتی ہے کہ وہ کس طرح جان جوکھم سے کام لے کر اس تیرہ و تار اسلامی دُنیا کے عین قلب میں نفاست اور روشنی کی تہذیب کی آبیاری کر رہے ہیں۔ (کون ہے جو پھر متاثر نہیں ہوگا؟) صیہونیوں کو (مغرب میں) ایک ایسا مقام حاصل تھا کہ (جس سے فائدہ اٹھا کر) وہ فلسطین اور اس کے حقائق کو اہلِ مغرب کے سامنے ایسے الفاظ اور اصطلاحات میں پیش کر سکتے تھے جنھیں اہلِ مغرب مخصوص اور عمومی دونوں انداز سے سمجھ بھی سکتے تھے اور قبول بھی کر سکتے تھے۔ اس لیے مغرب میں جس شخص نے بھی صیہونی دلائل کو قبول کرنے سے انکار کیا، اسے مقہور و مردود قرار دے دیا گیا، کبھی کہا جاتا کہ اس کا رویہ اور سوچ منفی ہے، کبھی اس پر یہود دشمنی کی چھاپ لگا دی جاتی اور یوں اسے اسلام اور عربوں کا چمچہ بنا دیا جاتا۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ان میں سے جو بھی صورتِ حال ہو، صیہونیت کے متبادل کے طور پر جو بھی تجویز پیش کی جاتی اسے یا تو عمومی نوعیت (جس کا مسئلہ خاص سے کوئی تعلق نہیں) کا ٹھہرا دیا جاتا یا پھر اسے شرمناک قرار دے کر مسترد کر دیا جاتا۔ اس کے مقابلے میں صیہونیت کے تصور کو اس طرح پیش کیا جاتا کہ یہ ایک مخصوص مسئلے کا مخصوص لیکن صاف ستھرا حل (یا جواب) پیش کرتا ہے۔ آخر (مغرب میں) کون شخص یہ دعویٰ کر سکتا تھا کہ اسے معلوم ہے کہ عرب اور مسلمان کیا چاہتے ہیں، کیا کرنا چاہتے ہیں اور ان کی منزل کیا ہے؟ اُس زمانے میں (اور قابلِ افسوس بات یہ ہے کہ اِس زمانے میں بھی) اس قسم کے محض سوالات اٹھا دینے سے یہ دلیل دینا ممکن ہو جاتا تھا کہ ''عرب'' عام طور پر ناپسندیدہ برائیوں کے پتلے ہیں۔

ان برائیوں کو جب مغرب کے عام باشندوں کے سامنے پیش کیا جاتا تو پڑھنے اور سننے والوں پر دہشت کا غلبہ ہو جاتا اور ان پر کپکپی طاری ہو جاتی۔ (بد قسمتی سے) اصل بات یہ ہے کہ ''عربوں'' کی ہمیشہ دوسروں نے نمائندگی کی (یعنی ان کے متعلق دوسرے ہی بتاتے رہے کہ وہ کیا ہیں اور کیا چاہتے ہیں) خود انھیں کہنے کا کبھی موقع فراہم نہیں کیا گیا۔ اس میں اتنا اضافہ اور کر لیں کہ اگرچہ سیاسی طور پر فلسطینی عربوں کی موجودگی روز بروز عیاں تر ہوتی جا رہی ہے لیکن عجیب متناقض بات یہ ہے کہ ان کی یہی موجودگی...... خواہ یہ خود فلسطین کی سرزمین پر ہی کیوں نہ ہو...... انھیں حقیقتاً ایک باعزت مقام دلانے میں مانع ہے، بلکہ انھیں یہ مقام دلائے جانے کی شدت سے مخالفت کی جاتی ہے۔ مثلاً زمانہ حال میں ایک سو سے زائد ممالک اور خود تمام فلسطینیوں نے تنظیم آزادی فلسطین (پی ایل او) کو تمام فلسطینی باشندوں کی واحد جائز نمائندہ جماعت تسلیم کیے رکھا ہے۔ لیکن اس کے باوجود نہ امریکا اور نہ اسرائیل یہ ماننے کے لیے تیار ہیں کہ پی ایل او فلسطینیوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس کے برعکس کیمپ ڈیوڈ کے معاہدے[1] نے بڑی ڈھٹائی اور رعونت کے ساتھ فلسطینی

[1] یہ معاہدہ امریکا کے سابق صدر جمی کارٹر، اسرائیل کے سابق وزیر اعظم مناچم بیگن اور مصر کے مقتول صدر انوار السادات کے مابین طے پایا تھا۔ اس پر تفصیلی بحث اس کتاب کے آخری باب میں کی گئی ہے۔

نمائندگی کا حق امریکا، اسرائیل اور مصر کو بخش دیا۔

صیہونیت کو دلکش...... یعنی اسے اس طرح خوبصورت غلاف میں لپیٹ کر پیش کیا جائے کہ اسے صحیح معنوں میں سچی اور حقیقی حمایت حاصل ہو جائے...... بنانے کے لیے اس کے رہنماؤں نے نہ صرف یہ کہ عربوں کو نظر انداز کر دیا بلکہ جہاں ان سے نپٹنا ناگزیر ہو جاتا، وہاں وہ ان کی ترجمانی کا فریضہ خود ہی سنبھال لیتے۔ وہ اہلِ مغرب کے سامنے ان کی اس طرح تصویر کشی کرتے کہ انھیں ایک مخصوص رنگ کی عینک لگا کر ہی سمجھا اور ان سے نپٹا جا سکتا تھا۔ صیہونیوں اور اہلِ مغرب کے مابین زبان اور نظریے کا اشتراک موجود تھا اور یہ اشتراک ابھی تک موجود ہے لیکن جہاں تک عربوں کا تعلق ہے، وہ اس اشتراک کا جزو نہیں تھے۔ خاصی بڑی حد تک اس اشتراک کا انحصار اس عداوت کی، جو اہل مغرب کو اسلام سے بالخصوص اور مشرق سے بالعموم تھی، زبردست روایت پر ہے جو آج بھی مغرب میں موجود ہے۔ میں نے اس روایت کا تفصیلی ذکر (مکمل ثبوت کے ساتھ) اپنی ایک دوسری کتاب میں کیا ہے۔ میں اپنے قارئین سے درخواست کروں گا کہ اگر وہ تفصیلات کی گہرائی میں جانا چاہتے ہیں تو وہ اس چیز کا، جسے میں نے مشرقیت (اورینٹلزم) کا نام دیا ہے، مطالعہ کریں۔ میری اس کتاب میں آپ کو اس طویل اور تسلسل سے لبریز تاریخ کی داستان بھی مل جائے گی جس کی تان آج کل عربوں پر آن کر ٹوٹی ہے، یہ عرب واحد انسانی گروپ ہے جس کے آج بھی نسلی بنیادوں پر نشانۂ تضحیک بنائے جانے کے عمل کو مغرب میں برداشت کیا جاتا ہے بلکہ عمداً اس عمل کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ ① موضوع عامیانہ ہو یا ظالمانہ، شریک بحث دانش ور ہوں یا عام لوگ، گفتگو، تحریر اور تقریر، ہر جگہ عربوں اور اسلام کو بدخصالی، خباثت، بدی، ذلت اور خواری، عیاشی و بدکاری، بے وقوفی، حماقت اور کند ذہنی کا مرقع بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور انھی ''اوصاف'' کی وہ ہر مقام پر نمائندگی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اپنے مغربی نظریاتی آباؤ اجداد کی طرح صیہونیوں نے بھی اسلام اور عربوں کی اس مجموعی (اور بھیانک) تصویر کشی کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ اس تصویر کشی کو انھوں نے اپنے مقاصد کے لیے کیسے استعمال کیا اور جب وہ یہ کام کر رہے تھے تو خود (اخلاقی اعتبار سے) کسی مقام پر کھڑے تھے، ان باتوں پر یہاں توجہ دینے کی ضرورت ہے کیونکہ یہ باتیں اس امر کی ایک بے عیب مثال پیش کرتی ہیں کہ کس طرح پراپیگنڈہ، سیاست میں رچی بسی علمیت اور نظریاتی معلومات طاقت حاصل کرتی ہیں، پالیسی نافذ کرتی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ''معروضی صداقت'' کا لبادہ بھی اوڑھ لیتی ہیں۔

---

① میں نے اس نکتے پر تفصیلی بحث اپنی کتاب Orientalism کے صفحات نمبر 328-284 میں کی ہے۔ (مصنف)

صیہونیوں نے سب سے پہلا کام تو یہ کیا کہ ایک ایسی قوم کی حیثیت سے جو جزوی طور پر ''مشرقی'' تھی لیکن جو مشرق والوں کی بے اعتدالیوں اور خرابیوں سے چھٹکارا پا چکی تھی، اہلِ مغرب کے سامنے مشرقی (اورئنٹیل) عربوں کے طور طریقوں کی تشریح وتصریح کا فریضہ اپنے ذمے لے لیا، وہ یہ بتانے لگے کہ عرب حقیقتاً کیا ہیں اور کیا کرنا چاہتے ہیں، لیکن انھوں نے اہلِ مغرب کو اس بات کا کبھی ذرا سا احساس نہ ہونے دیا کہ خود ان کی طرح عرب بھی فلسطین میں موجود ہیں۔ اس طریق کار کا فائدہ یہ ہوا کہ صیہونیت ہمیشہ یوں نظر آتی جیسے یہ مشرق قریب کی زندگی کی مقامی حقیقتوں میں پوری طرح گھلی ملی ہوئی بھی ہے اور ایک لحاظ سے اسے ان پر برتری بھی حاصل ہے۔ مثال کے طور پر ویزمان کے مندرجہ ذیل خط پر غور فرمائیں۔ یہ خط اس نے تیس مئی 1918ء کو بالفور کے نام تحریر کیا تھا اور اس کے مندرجات غیر معمولی انداز سے بہت سے حقائق کو بے نقاب کرتے ہیں۔

''یہاں جو صورتِ حال پائی جاتی ہے اور صیہونی کمیشن کو جن مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، میں ان کے متعلق نہایت ذمے داری کے احساس کے ساتھ آپ کو یہ چند سطور لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں......

عرب، جو سطحی طور پر ہوشیار اور تیز فہم نظر آتے ہیں، ایک اور صرف ایک چیز......قوت اور کامیابی......کی پرستش کرتے ہیں، چنانچہ اگرچہ یہ کہنا تو غلط ہوگا کہ فوجی محاذ پر کوئی پیش رفت نہ ہونے کی وجہ سے برطانوی وقار کو دھچکا لگا ہے لیکن یہ بات بھی یقیناً درست ہے کہ اس سے اس (برطانوی وقار) میں کوئی اضافہ بھی نہیں ہوا...... برطانوی حکام خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ غداری، دغابازی اور بے وفائی عربوں کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ چنانچہ انھیں اس بارے میں مسلسل چوکس اور محتاط رہنا پڑے گا کہ ان سے کوئی ایسی حرکت نہ سرزد ہوجائے جس سے عربوں کو ذرا بھی شکوہ شکایت کا موقع مل سکے۔ دوسرے الفاظ میں عربوں کی ''نازبرداری'' کی جانی چاہیے تاکہ وہ فوج کی پشت میں چھرا نہ گھونپ سکیں۔ چونکہ عرب صورتِ حال کا (صحیح) اندازہ لگانے میں بہت ہوشیار واقع ہوئے ہیں اس لیے وہ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ حتی الامکان چیخ پکار بھی خوب کرتے ہیں اور موقع ملے تو بلیک میل کرنے سے بھی کبھی نہیں چوکتے۔''

اس چیخ و پکار کی پہلی آواز اس وقت سنائی دی جب آپ اپنا اعلان (اعلان بالفور) منظرِ عام پر لائے۔ اس اعلان کو طرح طرح کے غلط معانی پہنائے گئے اور اس کی قسم قسم کی غلط توضیحات کی

گئیں۔ وہ یہ کہتے نہیں تھکتے کہ انگریز مفلوک الحال عربوں کو سرمایہ دار یہودیوں کے چنگل میں دے رہے ہیں۔ یہ سرمایہ دار یہودی جنرل ایلن بی ① کی فوج کی جلو میں اس بات کے منتظر ہیں کہ وہ گدھوں کی طرح آسان شکار پر جھپٹیں اور ہر شخص کو فلسطین کی سرزمین سے نکال باہر کریں......

ہم دیکھ رہے ہیں کہ اعلی انتظامی عہدوں پر تو روشن خیال اور دیانتدار انگریز افسر تعینات ہیں لیکن بقیہ انتظامی ڈھانچے کو جوں کا توں برقرار رکھا گیا ہے اور ان تمام مناصب اور اسامیوں پر عرب اور شامی اہلکار کام کر رہے ہیں...... ہمارا یہ تجربہ ہے کہ یہ اہلکار بدعنوان اور نااہل ہیں اور ان بھلے وقتوں کی یاد میں آنسو بہاتے رہتے ہیں۔ جب انتظامی امور صرف بخشش کے بل بوتے پر انجام پاتے تھے......انگریزی حکومت جتنا انصاف پسند اور منصف مزاج بننا چاہتی ہے، عرب اہلکار اتنا ہی رعونت پسند ہوتے جا رہے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہنا چاہیے کہ عرب اہلکار ملک کی زبان، عادات و اطوار اور طور طریقوں کو سمجھتے ہیں۔ ② یہ اہلکار پرلے درجے کے عیاش اور تماش بین ہیں، اس لیے انھیں انصاف پسند اور صاف ستھرے ذہنوں کے مالک انگریز اہلکاروں کے مقابلے میں، جو مشرقی اذہان کی عیاریوں اور روباہ کاریوں سے آشنا نہیں ہوتے، زبردست فوقیت حاصل ہے۔

اپنی موجودہ صورت میں انتظامیہ واضح طور پر یہود دشمن اور یہود مخالف ہے...... انتظامیہ کے مختلف شعبوں کے انگریز سربراہ غیر متعصب اور منصب مزاج ہیں اور ملک کے دو بڑے فرقوں ③ کے مابین تعلقات میں باقاعدگی پیدا کرنے کے سلسلے میں وہ توازن کا دامن ہاتھ سے

① Allenby (1936ء-1861ء) بعد میں یہ شخص برطانوی فوج میں فیلڈ مارشل کے عہدے پر متمکن ہوا۔ جنگِ عظیم اول کے دوران میں اس نے مقامی عربوں کی مدد سے خلافتِ عثمانیہ کی فوجوں کو مشرقِ وسطیٰ کے میدانوں میں پے در پے شکستوں سے دوچار کیا۔

② ویزمان اس بات کو جس قدر انہونی بنا رہا ہے وہ حقیقتاً اتنی انہونی ہے نہیں کیونکہ عرب اہلکار اسی ملک (یعنی فلسطین کے باشندے تھے) جو بہرحال ایک عرب ملک تھا (اور ہے) لیکن ویزمان کی چالاکی ملاحظہ فرمائیں کہ چونکہ عرب وہاں ہیں، اس لیے وہ اپنی اس موجودگی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ (مصنف)

③ یعنی عرب اور یہودی۔ ان دونوں فرقوں پر یکساں طور پر لفظ "بڑے" کا اطلاق کرنا مبالغہ آرائی کی تمام حدود کو پھلانگ جانے کے مترادف ہے تاہم ویزمان یہی حرکت کر رہا ہے (مصنف)

نہیں چھوڑتے بلکہ اس کی تمام جزئیات کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ لیکن اس مشکل صورتِ حال میں وہ صرف جس چیز سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں وہ اصولِ جمہوریت ہے۔ یہ وہ اصول ہے جو نسبتاً عددی قوت کو پیش نظر رکھتا ہے اور اعداد کی یہ سفاک اکثریت ہمارے خلاف جاتی ہے کیونکہ ایک یہودی کے مقابلے میں عرب تعداد میں پانچ ہیں......

اگر حالات جوں کے توں رہے تو لازماً اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک عرب فلسطین وجود میں آجائے گا بشرطے کہ فلسطین میں عرب نام کی کوئی قوم ہوئی (1) لیکن حقیقتاً یہ نتیجہ بر آمد ہوگا نہیں کیونکہ فلاحین (2) تو چار صدیاں پیچھے رہ چکے ہیں جب کہ وقت بہت آگے نکل چکا ہے۔ رہے آفندی (3) (برسبیل تذکرہ، یہاں میں یہ عرض کردوں کہ موجودہ نظام کا اصل فائدہ صرف انھی کو پہنچ رہا ہے) تو وہ نہ صرف نااہل ہیں بلکہ بے ایمان، حریص اور وطن دشمن بھی ہیں۔ (4)

ویزمان کی صاف گوئی سبق آموز ہے۔ اس کی بڑی لسانی شعبدہ بازی یہ ہے کہ اس نے بالفور کی طرح اپنی شناخت ایک یورپی (باشندے) کی حیثیت سے کرائی ہے جو مشرقی اور مغربی اذہان کے مابین فرق کو خوب سمجھتا ہے۔ اس امتیاز کے شاخسانے کے طور پر ہر قسم کے نتائج مستنبط ہوگئے ہیں چونکہ عرب مشرقی (اورینٹل) ہیں، اس لیے یورپی باشندوں اور صیہونیوں کے مقابلے میں وہ کمتر درجے کے انسان اور کم قابلِ قدر ہیں۔ وہ غدار ہیں، دھوکے باز ہیں، بے وفا ہیں، اخلاقی اور روحانی اعتبار سے ناقابلِ اصلاح وغیرہ وغیرہ۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اس بات کے مستحق نہیں کہ کسی ملک کے مالک بن سکیں خواہ ان کی عددی اکثریت انھیں اس حق سے سرفراز ہی کیوں نہ کرتی ہو۔ درحقیقت ویزمان نمائندہ حکومت کے متعلق جان سٹوارٹ مِل (5) کے دلائل کی جگالی کر رہا ہے جن کے مطابق ہندوستانیوں کو حکومت خود اختیاری کے حق سے محروم رکھنا اس لیے واجب

---

(1) یہاں ویزمان ''قومیت'' کا وہ پیمانہ استعمال کرتا ہے، جو انیسویں صدی کے دوران میں افریقہ کے سیاہ فاموں اور جنوبی امریکا کے ریڈ انڈین باشندوں کو سفید فام نوآبادکاروں کے خلاف مزاحمت سے باز رکھنے کے لیے وضع کیا گیا تھا کیونکہ قوم کا لفظ صرف گوروں پر منطبق ہوسکتا تھا۔ (مصنف)

(2) عرب ممالک کے کاشتکار اور کھیت مزدور۔

(3) خلافتِ عثمانیہ کے عہد میں امرا کو جو خطابات دیے جاتے تھے، ان میں سے ایک خطاب آفندی بھی تھا۔ خطاب کے ساتھ ان لوگوں کو جاگیریں بھی ملتی تھیں۔

(4) Ingram Palestine Papers, pp.31-32

(5) John Stuart Mill۔ (1806ء۔1873ء) برطانوی فلسفی اور ماہرِ اقتصادیات

قرار پایا کیونکہ وہ انگریزوں سے صدیوں ''پیچھے'' تھے۔[1] یوں ویزمان کی صیہونیت کو سفید فام یورپ کی ثقافتی اور نسلی بالادستی کے گھناؤنے اور قبیح پہلوؤں کے متماثل قرار دینے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ اس کے ساتھ وہ نہایت آسانی سے اپنے آپ کو ان لوگوں کا جو مشرق کے متعلق ماہرانہ علم اور رائے رکھتے ہیں اور جنھیں عام طور پر مستشرقین، ماہرینِ مشرق، شعبۂ عرب کے کارکنوں، جیسے القابات سے نوازا جاتا ہے، ہم مثل بنالیتا ہے کیونکہ ایسا کرنے سے اسے بہت فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ جہاں تک مشرق کے رنگ دار باشندوں کے خلاف جن کا اصلی سیاسی دعویٰ عددی (ان کی ''بے رحم اور سفاک اکثریت'') معلوم ہوتا ہے ورنہ (صیہونیوں کے خیال کے مطابق) کمیت کے اعتبار سے اس دعوے میں کوئی جان نہیں، جہاں تک محاذ آرائی کا تعلق ہے، صیہونی اپنا رشتہ سفید فام یورپی باشندوں کے ساتھ جوڑ لیتے ہیں۔ پھر صیہونی عربوں کی ترجمانی کے فرائض بھی سنبھال لیتے ہیں (کیونکہ ان کا یہ دعویٰ ہے کہ ہم مشرقی ذہن کو اندر سے جانتے ہیں) وہ اہلِ یورپ کے سامنے ان کی نمائندگی کرتے ہیں، ان کے خیالوں، آرزوؤں اور امنگوں کی تشریح وتعبیر کرتے ہیں۔ یورپیوں اور صیہونیوں دونوں کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ منصفانہ برتاؤ، تہذیب اور ترقّی کے علمبردار ہیں اور یہ وہ تصورات ہیں جو مشرق کے باشندوں کی سمجھ سے بالاتر ہیں، جیسا کہ ویزمان خود بیان کرتا ہے کہ فلسطین میں جو آویزش جاری ہے، وہ دراصل مقامی باشندوں سے زمین ہتھیانے کی جدّوجہد ہے لیکن اس جدّوجہد کو ایک تصور نے باوقار بنادیا ہے کیونکہ تصور ہی تو سب کچھ ہوتا ہے۔

ثانیاً، فلسطین اور اس علاقے کے دوسرے مقامات پر صیہونیوں کی عربوں کے ساتھ جو آویزش چل رہی ہے، اہلِ مغرب اس سے یہ مطلب نکالتے تھے (اور اس آویزش میں اپنی ہی بھلائی پاتے تھے) کہ یہ دراصل وہی پرانی آویزش ہے جو صدیوں سے مغرب اور مشرق کے، جس کا سبب سے بڑا قائم مقام (Surru Gate) اسلام ہے، مابین جاری ہے۔ وہ (اہلِ مغرب) یہ سمجھتے تھے کہ اب یہ آویزش زیادہ وسعت پذیر ہورہی ہے، ایسا رخ اختیار کرتی جارہی ہے جیسے یہ ابد تک جاری رہے گی بلکہ اب تو اس کی شدّت میں بھی اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ یہ محض ایک نوآبادیاتی مسئلہ نہیں رہا تھا بلکہ اب اس نے ایک تہذیبی رخ اختیار کرلیا تھا۔ صیہونیوں نے جب اپنی منصوبہ بندی شروع کی تھی تو اس کے بالکل آغاز ہی سے بالفور جیسے صیہونیت کے مغربی حمایتیوں پر یہ بات بالکل واضح تھی کہ مغربی طاقتوں کو اب یہ مقصد اپنے پیشِ نظر رکھنا پڑے گا کہ انھیں (ایک نہ ایک دن)

---

1. ایرک سٹوکس (Eric Stokes) نے اس موضوع پر اپنی کتاب English Utilitanans and India میں تفصیل سے بحث کی ہے، یہ کتاب Clarendon Press نے 1959ء میں آکسفورڈ سے شائع کی تھی۔

فلسطین کو اپنی نو آبادی بنانا ہوگا۔ ہرزل نے (اس) تصور کو استعمال کیا۔ ویزمان نے اسے استعمال کیا اور بعد ازاں ہر سرکردہ اسرائیلی نے اسے استعمال کیا ہے۔ اسرائیل وہ آلہ تھا جس کے ذریعے اسلام...... اور بعد ازاں سوویت یونین اور کمیونزم...... کو پابہ زنجیر کیا جاسکتا تھا یا دورباش کہا جاسکتا تھا۔ صیہونیت اور اسرائیل کو روشن خیالی، حریت اور جمہوریت علم اور روشنی کا گہوارہ تصور کیا جانے لگا۔ یعنی یہ تو وہی قدریں اور اصول ہیں جنھیں ''ہم'' (اہلِ مغرب) سمجھتے اور جن کے لیے ''ہم'' جدّوجہد میں مصروف ہیں۔ اس کے مقابلے میں صیہونیت کے دشمن کیا ہیں؟ وہ تو بس مشرقی، مطلق العنانی، ظلم وستم، نفسانیت، جہالت اور پسماندگی کی دوسری اقسام کی حامل اجنبی روحیں ہیں جو بیسویں صدی کا لبادہ پہن کر سامنے آگئی ہیں۔ اگر وہ اس زبردست اور مہتم بالشان مہم، جس کا نام صیہونیت ہے، کو سمجھ نہیں پائے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ''ہماری'' اقدار سے مایوس کن حد تک بے بہرہ ہیں، انھیں (اہلِ مغرب کو) یہ بات قطعاً اہم نظر نہیں آتی تھی کہ مسلمان پسماندہ ہی سہی لیکن ان کا ایک اپنا طرزِ حیات تھا اور انسان ہونے کی ناتے انھیں یہ حق حاصل تھا کہ وہ اس طرزِ حیات کو اپنائے رکھیں اور اس پر چلتے رہیں اور انھیں (اہلِ مغرب کو) اس بات میں بھی کوئی اہمیت نظر نہیں آتی تھی کہ ''زمین'' کے ساتھ ان (مسلمانوں) کی وابستگی اتنی ہی شدید ہوسکتی تھی جتنی کہ یہودیوں کی، بلکہ ایک لحاظ سے تو ان کی یہ وابستگی یہودیوں کی وابستگی سے بھی شدید تر تھی کیونکہ وہ صحیح معنوں میں صدیوں سے یہاں رہتے چلے آرہے تھے اور اپنا سب کچھ اس میں لگا چکے تھے، جبکہ یہودی تو جلاوطنی کے عالم میں صیہون کی محض تمنّا ہی کر رہے تھے۔ حقیقتاً (مغرب میں) جس بات کو اہم گردانا گیا وہ ان کی نسلی برتری کے تصورات تھے (صیہونیوں نے ان تصورات کو بلا پس و پیش ہتھیا لیا) کیونکہ ان تصورات کے مطابق ایک ایسے خطے پر، جسے ان تصورات کے موافق مانا جاتا تھا، قانونی طور پر سفید ناموں کی برتری اور حق کو جتایا اور قائم رکھا جاسکتا تھا۔

ان میں سے کتنے خیالات ایسے ہیں جو ان امریکی باشندوں کی، جو اپنے آپ کو روشن خیال سمجھتے ہیں اور لبرل جمہوریت کا علم اُٹھائے پھر رہے ہیں، روزمرہ کی گفتگو اور ان کی تصانیف و تقاریر میں مسلمہ حقائق کا درجہ پاچکے ہیں؟ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس قسم کے خیالات کی فوراً اور قطعی انداز سے تحریری دستاویز تیار کی جائے۔ یہاں میں جتنی بھی مثالیں پیش کروں گا، ان میں سے ہر ایک دو باہمی طور پر آپس میں مربوط طریقوں سے صیہونیت اور اسرائیل پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس سلسلے میں جو پہلا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ صیہونیت کو فی نفسہٖ نہایت حیرت انگیز اور قابلِ تعریف چیز ٹھہرایا جاتا ہے۔ یہ کسی بھی شخص یا کسی بھی چیز کے سامنے جواب دہ نہیں کیونکہ یہ معاشرے اور انسان کے متعلق اہلِ مغرب کے خیالات سے پوری طرح ہم آہنگ ہے دوسرا طریقہ جو اختیار کیا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ جو شخص یا ادارہ صیہونیت یا اسرائیل کی راہ میں روڑے اٹکاتا

نظر آتا ہے، اس کے فعل کو نہایت معیوب، احمقانہ اور اخلاقی اعتبار سے نہایت نازیبا تصور کیا جاتا ہے اور...... یہ بات بہت اہم ہے...... ان کا (یعنی عربوں کا) نقطۂ نظر کبھی براہ راست نہ سنا جائے۔ صرف صیہونیوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ان کی ترجمانی کریں۔ پہلے طریقے کی وضاحت کے لیے رین بولڈ نی بور [1] کی مثالیں لیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے ابتداً اس شخص کا عربوں یا اسلام کے ساتھ دور کا بھی تعلق واسطہ نہیں تھا، سوائے اس کے کہ اس نے ان (اسلام اور عربوں) کے متعلق (مروّج مغربی) خیالات آنکھیں بند کر کے اپنا لیے تھے۔ اس کے باوجود نی بُور نے تقسیمِ فلسطین کے حق میں بعض دوسری اہم شخصیات کے ساتھ اکیس نومبر 1947ء کو "نیویارک ٹائمز" کے نام ایک طویل مراسلے پر دستخط ثبت کر دیے۔ اس مراسلے میں جن دلائل کا سہارا لیا گیا، ان کا لب لباب یہ ہے:

"سیاسی طور پر ہم یہ دیکھنا پسند کریں گے کہ مشرق وسطیٰ کے ممالک اسی قسم کی جمہوریت پر عمل پیرا ہوں، جو ہمارے ہاں پائی جاتی ہے۔ معاشرتی اور معاشی طور پر ہم یہ چاہیں گے کہ مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کو اس طور ترقّی کی شاہراہ پر ڈالا جائے کہ مقامی لوگوں کے حالات بہتر ہو جائیں اور اس خطے کے وسائل اور منڈیوں تک (ہماری) رسائی ہو سکے۔ ہم اس مسئلے کا خواہ کسی طریقے سے جائزہ لیں، دوسرے الفاظ میں طویل المیعاد نقطۂ نظر کے مطابق، امریکی مفادات کا تقاضا یہ ہے کہ انسانی کوششوں کے تمام دائروں میں مشرقِ وسطیٰ کو برق رفتاری کے ساتھ جدید بنا دیا جائے۔"

جو شخص ذرا سا بھی معروضی اندازِ فکر اختیار کر کے مشرقِ وسطیٰ کے مسائل کا جائزہ لینا چاہتا ہے، اسے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مشرقِ وسطیٰ میں ترقّی اور جدیدیت کا صرف ایک ہی ہراول دستہ ہے اور وہ ہے یہودی فلسطین [2] ترقّی کا، دوسرا عنصر عیسائی لبنان ہے جسے فی الحال عرب لیگ [3]

---

① Reinbold Niebuhr (1892ء-1971ء) عیسائی دینیات (Theology) کا ایک امریکی ماہر

② بنیادی طور پر ایک نوآبادیاتی سکیم کو پروان چڑھانے کے لیے نیم مارکسی زبان جس انداز سے استعمال کی گئی ہے، ذرا اس پر غور فرمائیں۔ (مصنف)

③ عرب لیگ: یہ تنظیم مصر، عراق، شام، لبنان، اردن، سعودی عرب اور یمن نے باہمی مذاکرات کے ذریعے 1945ء میں قائم کی تھی۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد دوسرے عرب مماک بھی اس میں شامل ہو گئے۔ تنظیم کے مقاصد میں رکن ممالک کی پالیسیوں کے درمیان روابط پیدا کرنا شامل ہیں۔ اسرائیل کا مقاطعہ اس کا بنیادی مقصد ہے۔ پی ایل او بھی اس تنظیم کی رکن ہے۔

کے ہمہ عربیت [1] اور ہمہ اسلامیت [2] جیسے عقائد کو ماننے والوں نے لبنان کی عیسائی اکثریت [3] کی خواہشات اور جذبات کے علی الرغم دبا کر رکھا ہوا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ میں یہودی فلسطین اور عیسائی لبنان ہی تو مغربی تہذیب کے دو جزیرے ہیں ورنہ امریکی نقطۂ نظر سے وہاں کے عرب مسلمانوں سے کسی قسم کی توقع وابستہ کرنا خام خیالی ہے۔ وہ ایک بالکل مایوس کن تصویر پیش کرتے ہیں۔

امریکا کے ثقافتی حلقوں میں نی بُور کی دانشوری سند کا درجہ رکھتی ہے۔ چنانچہ وہ جو کچھ یہاں کہتا ہے وہ پوری طرح مستند ہے۔ جہاں تک فلسطینی عربوں کا تعلق ہے، جب تک وہ نی بُور کی اس قسم کی مستند باتوں کا ہدف بنتے رہیں گے، وہ یہی سمجھیں گے کہ ان باتوں کے ذریعے تشدد اور صرف تشدد (اس سے کم اور کوئی بات نہیں) کا پرچار کیا گیا ہے۔ ان ممالک کے متعلق...... جب نی بُور ان کی ترجمانی کے فرائض سرانجام دے رہا تھا، تو ان ممالک میں کروڑوں عرب مسلمان آباد تھے...... جب آپ اس قسم کے الفاظ اور جملے ''ہم یہ دیکھنا پسند کریں گے۔'' اور ''ہم یہ چاہیں گے۔'' استعمال کریں گے تو لازماً ان سے یہی مترشح ہوگا کہ اس بات کی قطعاً کوئی اہمیت نہیں کہ خود یہ ممالک کیا چاہتے اور کس بات کی تمنا رکھتے ہیں۔ ''ہماری'' خواہشات کو ان کی خواہشات پر غلبہ حاصل ہونا چاہیے۔ ایک ناقابلِ ترمیم فرمان کے ذریعے، جو بے شک بے اصولی پر مبنی ہے۔ ''ہماری'' خواہشات یہ فرماتی ہیں کہ ترقّی کا ''صرف ایک ہی ہراول دستہ ہے۔'' جو دو حقیر اقلیتوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے بھی صرف ایک اقلیت مقامی ہے جب کہ دوسری درآمد شدہ ہے۔ اس مراسلے پر دستخط ثبت

---

① ہمہ عربیت (Pan-Arabism): وہ تحریک جس کا مقصد تمام عرب ممالک کا اتحاد ہے تاکہ وہ اپنی آرزوؤں اور امنگوں کی ایک مشترکہ پلیٹ فارم سے تکمیل کر سکیں۔ اس کی اساس مشترکہ زبان، ثقافت اور تہذیب ہے۔

② ہمہ اسلامیت یا اتحادِ اسلامی (Pan-Islamism) یہ تحریک انیسویں صدی کے دوران میں وجود میں آئی۔ علامہ جمال الدین افغانی اس تحریک کے روحِ رواں تھے۔ مغربی استعمار اسے ہمیشہ ہی اپنا مدمقابل تصور کرتا رہا ہے۔ چنانچہ برطانیہ، فرانس اور یورپ کے دوسرے ممالک کی حکومتیں ہمیشہ اس کی راہ میں روڑے اٹکاتی رہیں۔

③ لبنان میں سرکاری طور پر تین فرقوں، عیسائیوں، سنی مسلمانوں اور شیعہ مسلمانوں کو اہمیت حاصل ہے۔ ملک کا صدر عیسائی، وزیر اعظم سنی مسلمان اور پارلیمنٹ کا صدر شیعہ مسلمان ہوتا ہے۔ عیسائیوں کا یہ دعویٰ ہے کہ ملک میں انھیں اکثریت حاصل ہے۔ لیکن عملاً اس دعوے کی تصدیق ممکن نہیں کہ وہاں کئی دہائیوں سے کوئی مردم شماری نہیں ہوئی۔ مسلمانوں کا یہ دعویٰ ہے کہ اب اکثریت ان کی ہے۔ وہ یہ الزام بھی لگاتے ہیں کہ عیسائی اسی لیے مردم شماری نہیں ہونے دیتے کہ کہیں ان کے دعوے کا پول نہ کھل جائے۔

کرنے والوں میں سے کسی کو بھی کبھی یہ خیال نہ آیا کہ مشرقِ وسطیٰ کے باشندوں کی ایک زبردست اکثریت کی خواہشات بالکل ''فطری'' ہیں اور جس ''مصنوعیت'' کا نی بُور اور اس کے دوست ذکر کر رہے تھے، اس کا اطلاق کہیں زیادہ مناسب انداز سے صیہونیوں اور مارونی عیسائیوں [1] پر ہو سکتا تھا۔ [2] مشرقِ وسطیٰ کے مسلم ممالک جو مایوس کن تصویر پیش کرتے ہیں، یہ ''جزیرے'' [3] اس کی شدت کو کم کر دیتے ہیں۔ یہ تصویر کن لوگوں کو اور کس مقصد کے پیشِ نظر مایوس کن نظر آتی ہے؟ جو بات ہر مہذب مغربی شخص پر عیاں ہونا چاہیے، نی بور اسے زبان پر لانا مناسب نہیں سمجھتا'' (مہذب اہلِ مغرب کی نگاہوں میں) اسلام یہودیت اور نصرانیت کا دشمن ہے، اس لیے ''ہماری'' پالیسی یہ ہونی چاہیے کہ ''ہم'' یہودی فلسطین اور نصرانی لبنان کی حمایت کریں۔ یہ کہ اس علاقے میں جس کا ذکر نی بور اتنی تحکم پسندی سے کرتا ہے، فی الحقیقت ایک جیتی جاگتی قوم بھی موجود ہو سکتی ہے، تو یہ امکان ہی اتنا لرزہ خیز ہے کہ اس کے متعلق سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ وہ نظریاتی پردہ جس کے ذریعے اس قوم کا وجود لغوی طور پر نگاہوں سے اوجھل کر دیا گیا ہے، اسے اور اس کے دوستوں کو اس قسم کی باتیں کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے کہ صیہونیت ترقّی اور جدیدیت کا دوسرا نام ہے۔ اسلام اور عرب اس کے بالکل الٹ ہیں۔ صرف نی بور کو تمام فریقوں کی ترجمانی کا حق حاصل ہے۔ ہمیں یہ بات بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ وہ یہودیوں اور لبنانی عیسائیوں کی جس انداز سے حمایت کرتا ہے، اس میں بھی بادشاہوں کے انداز کی شفقت جھلکتی نظر آتی ہے۔

اس سے ایک سال قبل نی بور نے ''فلسطین کے متعلق ایک نیا نقطۂ نظر'' کے عنوان سے ایک مضمون تحریر کیا تھا جو ایک برطانوی ''جریدے سپیکٹیٹر'' (Spectator) میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں اس کا رویہ قدرے صلح جویانہ تھا، کیونکہ یہ مضمون ایک ایسے زمانے میں تحریر کیا گیا تھا جب فلسطین میں یہودیوں کی آمد کو محدود کرنے کا نامختتم مسئلہ ایک بحرانی صورت اختیار کر چکا تھا۔ چنانچہ اسے یہ کہنا پڑا کہ ''موجودہ صورتِ حال کے پیشِ نظر فلسطینی مسئلے کے متعلق کسی امریکی شہری کے مشورے یا نکتہ چینی کو برطانیہ میں پسند نہیں کیا جائے گا۔

---

① لبنان کے عیسائی ماروبی فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ فرقہ پوپ کی بالادستی کو تو مانتا ہے لیکن عبادت اپنے طریقے سے اور عربی زبان میں کرتا ہے۔ اس کا بانی مارون تھا۔

② بعد ازاں اسرائیل کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور لبنان پر خانہ جنگی کا جو عذاب نازل ہوا یہ رویہ نادانستہ طور پر ان کی پیش بینی کرتا نظر آتا ہے۔ (مصنف)

③ اگر نی بور ذرا کم زمانہ ساز اور عیار ہوتا تو انھیں ''جزیرے'' نہ کہتا بلکہ ''نوآبادیاں'' کہتا۔ (مصنف)

بایں ہمہ نی بُور نے یہ محسوس کیا کہ ''اگر میں کوئی مشورہ پیش نہیں کر سکتا تو بھی میرا یہ فرض تو بنتا ہے کہ میں کوئی نیا نقطۂ نظر پیش کروں یا کم از کم ایسا نقطۂ نظر جو برطانیہ کے لیے مفید ثابت ہوگا۔'' ''نیو یارک ٹائمز'' میں جو مراسلہ شائع ہوا، اس کے برعکس اس مضمون میں وہ ایک سامراجی طاقت سے براہِ راست مخاطب ہو رہا ہے۔ اندازِ بیان ایسا ہے جیسے ایک سامراجی ادارہ کسی دوسرے سامراجی ادارے سے مخاطب ہو۔

''میں جانتا ہوں کہ امریکا میں نہ تو عربوں کے حقوق کو درخورِ اعتنا سمجھا جاتا ہے اور نہ ان پریشانیوں پر کوئی خاص توجہ دی جاتی ہے جو برطانیہ کو عالمِ عرب سے عہدہ برآ ہوتے وقت اٹھانا پڑتی ہیں۔ اس کے برعکس میرے لیے جو بات الجھن کا باعث بنتی ہے، وہ یہ ہے کہ یہاں کا (یعنی برطانیہ کا) ایک عام شہری عرب ''رائے'' کا تو ذکر کرتا ہے لیکن اس بات کا مطلق ذکر نہیں کرتا کہ یہ رائے (عام عربوں کی رائے نہیں بلکہ) چند جاگیرداروں اور وڈیروں کی رائے ہے۔ اس علاقے (یعنی فلسطین) میں درمیانہ طبقہ تو بالکل ہی عنقا ہے اور رہے مفلوک الحال عام لوگ، تو وہ اذیت ناک غربت کی چکی میں اس بُری طرح پس رہے ہیں کہ ان کے لیے رائے ایک ناممکن عیاشی ہے۔ عرب مسئلے کے ساتھ ایک مشکل یہ ہے کہ یہودی جس قسم کی تکنیکی اور حرکی (Dynamic) تہذیب مقامی طور پر (یعنی فلسطین میں) روشناس کرانے میں ممد ثابت ہو سکتے تھے جسے امریکی سرمائے کی پشت پناہی حاصل ہونا چاہیے تھی اور جس کی مدد سے آبی وسائل کو ترقی دی جاسکتی تھی، اراضی کا تحفظ کیا جاسکتا تھا اور مقامی انسانی وسائل کو صحیح طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا، وہ تہذیب اگرچہ عرب عوام کے لیے تو مفید اور نفع بخش ہے لیکن وہ عرب چودھریوں کے لیے قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ عارضی طور پر تو اسے زبردستی نافذ کرنا ہوگا۔ تاہم اس بات کا امکان موجود ہے کہ بالآخر عوام اسے قبول کر ہی لیں گے۔ ①

قصہ اس مضمون کے تحریر کیے جانے سے پہلے کا ہو یا بعد کا، نی بُور کو اس بات کا کبھی مجرم نہیں ٹھہرایا جاسکتا کہ اس نے ''عرب حقوق'' کی حمایت تو رہی ایک طرف، جھوٹے منہ ہی سہی، کبھی ان کا ذکر تک کیا ہو۔ سیدھی بات ہے کہ اس سے یہ حرکت کبھی سرزد نہیں ہوئی۔ چنانچہ اس کا افتتاحی جملہ محض لفاظی ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اپنا یہ جملہ اس نے اپنی اصل بات کہنے کے لیے بطور ڈھال استعمال کیا ہے۔ چنانچہ اپنے نہاں خانۂ دل کی جو بات وہ کہنا چاہتا ہے یہ ہے کہ عرب رائے عامہ کی قطعاً کوئی وقعت نہیں۔ (اپنی اس رائے

① سپیکٹیٹر مؤرخہ 16 اگست 1946ء صفحہ: 163۔

کے حق میں اس نے جو عمرانی دلائل دیے ہیں وہ بالکل لایعنی اور جعلی ہیں۔) اگر ان دلائل کو صحیح تسلیم کرلیا جائے تو ان کا مطلب یہ ہوگا کہ ''مفلوک الحال عوام'' کو کسی قطعہ زمین کی بھی ضرورت نہیں (جہاں وہ اپنی جہالت، پسماندگی اور انحطاط پسندی کو ہی فروغ دے سکیں)۔ تاہم اس کے دل کی اصل بات یہ بھی نہیں۔ درحقیقت اصل بات، جس کا وہ کھلے بندوں اظہار کرنا چاہتا ہے، یہ ہے کہ عربوں کی (اپنی) کوئی رائے ہے یا نہیں، انھیں اس امر کی قطعاً اجازت نہیں دی جاسکتی کہ یورپی یہودی جس نوع کی ''تکنیکی اور حرکی تہذیب''، فلسطین میں متعارف کررہے ہیں، وہ اس کے نفوذ کے راستے میں کوئی روڑے اٹکا سکیں۔ اس قسم کا نکتہ پیش کرنے میں زیادہ آسانی رہتی اگر وہ مثال کے طور پر براہِ راست یہ دعویٰ کرسکتا کہ

(الف) عرب اتنے کم تر ہیں کہ وہ اپنی قسم آپ ہیں اور روئے زمین پر کہیں ان کی مثال نہیں ملتی۔

(ب) عام عربوں کی اپنی نہ تو کوئی رائے ہے اور نہ ارادہ، وہ تو اپنے آقاؤں کے بے دام غلام ہیں۔ ان کے یہ آقا مایوس کن حد تک انحطاط پسند اور زوال پذیر جاگیردارانہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اگرچہ ان کی اپنی تعداد بہت قلیل ہے لیکن وہ عام لوگوں کو کٹھ پتلیوں کی طرح اپنے اشاروں پر نچاتے ہیں۔ تو دوٹوک اور صاف صاف بات کہنے کی بجائے نی بُور نے جو رویہ اختیار کیا ہے، ثقافتی اعتبار سے وہ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ ''ارشاد'' کرتا ہے کہ اس نے جو دلائل پیش کیے ہیں، وہ نہ صرف اس تکنیکی حرکی تہذیب کی، جو صیہونی اپنے ساتھ لائے ہیں، وکالت کرتے ہیں بلکہ اس نے تو عام عربوں (کے مفادات) کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے۔

چلیں، ہم اس حقیقت کا ذکر نہیں کرتے کہ نی بُور اگر چاہتا تو فلسطینی عربوں کی حالیہ تاریخ میں اسے متعدد ایسی مثالیں دستیاب ہوسکتی تھیں جن سے اس بات کی نشان دہی ہوتی کہ عرب صیہونیوں اور صیہونیت کے خلاف کئی مرتبے بے ساختہ علمِ بغاوت بلند کرچکے ہیں یا یہ کہ عرب کسانوں نے غیر حاضر عرب جاگیرداروں کے خلاف کئی مرتبہ یہودی آبادکاروں کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن لاحاصل۔ جو بات اسے نظر نہیں آتی...... بالکل اسی طرح جس طرح مارکس کو نظر نہیں آئی تھی جب وہ آج سے سو سال قبل ہندوستان میں مقیم انگریزوں کے متعلق اپنے خیالات قلم بند کررہا تھا...... وہ یہ ہے کہ جب تکنیکی اور حرکی تہذیب ''بھی'' مفلوک الحال عوام کی زندگیوں میں نوآبادیاتی انداز سے درانداز ہوتی ہے، تو اس سے قومی حقوق کی خلاف ورزی ہوتی ہے، علاوہ ازیں ہمیں یہ توقع ہونا چاہیے تھی (اور بعد کے سالوں میں یہ توقع نقش برآب ہی ثابت ہوئی) کہ عیسائی دینیات کے ایک ماہر عالم فاضل شخص کو [1] جس کی شہرت چاردانگِ عالم میں پھیل چکی تھی، اپنے نقطۂ نظر سے

[1] یہاں اشارہ نی بُور کی طرف ہے۔

ہی سہی، اس حقیقت کا ادراک حاصل ہو جائے گا کہ فلسطین میں ایک یہودی آباد کار کی آمد سے ایک یا متعدد عرب باشندے اپنے گھر بار اور جائدادوں سے محروم ہوں گے اور اسی تناسب سے انسانی حقوق بھی پامال ہوں گے اور آخر میں ہمیں یہ توقع ہونا چاہیے تھا کہ نی بُور ''مفلوک الحال عوام'' کی کچھ سننے اور ان کی خواہشات معلوم کرنے کی کوشش کرے گا یا کم از کم وہ اتنا ہی فرض کرے گا کہ ان (عرب عوام) کی کم و بیش فطری خواہشات میں یہ خواہش تو ضرور شامل ہوگی کہ انھیں ان کے گھروں اور جائدادوں سے بے دخل نہ کیا جائے یا انھیں ایک برتر تہذیب سے متشددانہ انداز سے ''مستفید'' نہ کیا جائے۔

اگر نی بُور جنوبی افریقہ یا ریاست ہائے متحدہ امریکا کے جنوبی علاقوں کی صورتِ حال کا ذکر کر رہا ہوتا، تو اس کے اس مشفقانہ رویے اور اس رویے میں مضمر نسلی مفاہیم کو قطعاً برداشت نہ کیا جاتا۔ اس صورت کو صحیح انداز سے سمجھنے اور پرکھنے کی ضرورت اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ہمیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ نی بُور (اور اس کے متعلق یہ بات میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں) اپنے متعلق اس حُسنِ ظن میں مبتلا ہے کہ وہ ایک ترقّی یافتہ یا ترقّی پسند لبرل نقطۂ نظر کی ترجمانی کر رہا ہے۔ خیر، پھر ہمارے اذہان میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ ہوسکتا ہے، نی بُور کو اس بات کا علم ہی نہ ہو کہ فلسطین میں ہو کیا رہا ہے؟ یا (اور میرے خیال میں اصل بات یہی ہے) وہ حقیقتاً یہی سمجھتا ہو کہ ثقافتی اعتبار سے صیہونیت ''عرب انحطاط پسندی'' سے برتر اور افضل ہے۔

اب موقع ہے کہ میں دوسرے طریقے کے بارے میں ایک مثال پیش کروں۔ اس مثال سے اس امر کی وضاحت ہو جائے گی کہ صیہونیت کو اپنے تمام مثبت اور ایجابی پہلوؤں سمیت (مغرب میں) جو حمایت حاصل ہوئی تھی، وہ اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ فلسطین میں عربوں کی موجودگی کا اعتراف تو صرف بے دلی سے کیا جاتا تھا لیکن اپنے اس احساس کا بہت مثبت اور پسندیدہ انداز سے اظہار کیا جاتا تھا کہ صیہونیوں نے بہت اچھا کیا کہ عرب فلسطین کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ میں اس ضمن میں جو مثال پیش کر رہا ہوں، وہ ایڈمنڈ ولسن ① کی ہے۔ ثقافتی اعتبار سے ولسن کو نی بُور سے کوئی کمتر مقام حاصل نہیں تھا اور نہ اسے ثقافتی اور تہذیبی اقدار کا اس سے (یعنی نی بُور سے) کوئی کمتر ترجمان سمجھا جاتا تھا بلکہ ایک لحاظ سے اسے نی بُور پر کچھ تفوق ہی حاصل تھا کیونکہ وہ ادبیات، معاشرے، تاریخ اور اخلاقیات کا نہایت سمجھدار اور باذوق نامی گرامی نقاد تھا۔ وہ ان لوگوں کی ایک جیتی جاگتی مثال تھا، جنھوں نے اپنی زندگی کا یہ مقصد بنالیا ہوتا ہے کہ وہ تمام عمر مغربی (اور عالمی) تہذیب کے ان عناصر کے مابین امتیاز تلاش کرتے رہیں گے جو ایک طرف تو وہ ہوتے ہیں جو زندگی کو آگے

---

① Edmund Wilson۔ (1895-1972): معروف امریکی ادیب اور نقاد تھا۔

بڑھاتے ہیں اور دوسری طرف وہ ہوتے ہیں جو زندگی کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں۔'' بلکہ اسے پیچھے دھکیلتے ہیں (میں نے زندگی کے متعلّق جو تراکیب استعمال کی ہیں، وہ جذباتی ضرور ہیں لیکن بہرحال میں نے انھیں استعمال کر دیا ہے)۔ ولسن اور کچھ ہو یا نہ ہو لیکن اس نے کبھی بھی مملکت، یا کسی ایسی چیز کے ساتھ جس میں جارحانہ وطنیت (شوونیت)① کا ذرا سا شائبہ بھی پایا جاتا ہو، یا جو روایت یا رسم و رواج کا درجہ اختیار کر چکی ہو، اپنا سلسلہ نہیں جوڑا تھا اور نہ اس نے کبھی یہ کہا تھا کہ اسے ان چیزوں کے ساتھ اتفاق ہے یا ان کے ساتھ اس کا کوئی دور کا بھی واسطہ ہے۔ اس کا ہر قاری...... اور اس ملک (امریکا) کا وہ ایک ایسا ادیب تھا جس کی کتابیں سب سے زیادہ پڑھی جاتی تھیں...... اس کے اس رویے سے خوب آگاہ ہوگا۔ ولسن کو یہودیوں، عبرانی (ادب و ثقافت) اور عہد نامہ عتیق② سے بطورِ خاص دلچسپی تھی۔ جب وہ ساٹھ کے پیٹے میں داخل ہوا تو اس نے یہودیوں کے متعلّق ایک مقالہ سپردِ قلم کیا۔ دوسری باتوں سے قطع نظر اس نے اس مقالے میں ایک دعویٰ یہ کیا کہ ''عبرانی انجیل میں جو جملے، تراکیب اور اسالیبِ بیان استعمال کیے گئے ہیں، اس میں جو رؤیائے صادقہ بیان کیے گئے ہیں، ان سے دُنیا کی کسی اور قوم کی تہذیب اتنا متاثر نہیں ہوئی جتنا کہ پہلے انگریزوں اور بعد میں امریکی پیوری ٹنوں③ کی،④ اس نے جس انداز سے عبرانی ادب و ثقافت کا مطالعہ کیا اور پھر بحر مردار⑤ کے اڑوس پڑوس میں دریافت ہونے والے صحیفوں⑥ پر جو کتاب لکھی، اس سے یہ بات خوب واضح ہو جاتی ہے کہ اس پر یہودیوں اور یہودیت کی گرفت کتنی مضبوط ہے۔ یہ بجا ہے کہ اس قسم کا رویہ عام طور پر دوسروں کے لیے کوئی مسئلہ کھڑا نہیں کرتا لیکن معاملہ جب اسرائیل کا ہو تو صورتِ حال ایک نیا رخ اختیار کر لیتی ہے۔

---

① شوونیت (Chauvinism): جنگ جویانہ اور متشدد حب الوطنی کا جذبہ جو شہنشاہ فرانس، نپولین، کی فوج کے ایک داستانی سپاہی نکولس شاواں (Chavin) کے نام سے موسوم ہے۔ اس قسم کی حب الوطنی میں اپنے وطن اور قوم کی تعریف تو جارحانہ اور غیر تنقیدی انداز سے کی جاتی ہے لیکن دوسرے سے نفرت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا جاتا۔ اب اس لفظ کا اطلاق ایسے گروپوں پر بھی ہوتا ہے جو اپنے آپ کو برتر اور دوسروں کو کمتر سمجھتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی مرد عورتوں کی صلاحیتوں کے متعلّق اچھی رائے نہ رکھے تو کہا جاتا ہے کہ وہ

ہے یا مردانہ شوونیت کا اسیر ہے

② عیسائیوں کی مقدس کتاب ''انجیل'' دو حصوں پر مشتمل ہے۔ عہد نامہ عتیق اور عہد نامہ جدید۔ ''عہد نامہ عتیق'' یہودیوں کی مقدس کتاب ''توریت'' پر مشتمل ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی زندگی میں اسی پر عمل پیرا ہے۔ ''عہد نامہ جدید'' ان کے آسمان پر زندہ اٹھائے جانے کے بعد ان کے مختلف حواریوں نے تحریر کیا تھا۔..........

اپنی کتاب ''سیاہ، سرخ، بھورا اور زیتونی''،[1] میں ولسن نے ایک طویل باب تحریر کیا ہے جس میں اس نے ایک ایسے انداز میں جس میں مصنف اپنے موضوع سے بار بار بھٹک جاتا ہے، اپنے دورۂ اسرائیل کی تفصیل شرح و بسط سے بیان کی ہے۔ اس نے اپنی یادداشتیں اور تاثّرات روزنامچے کی صورت میں قلم بند کیے

............(بقیہ حاشیہ)

③ (Purtans): انگلستان میں جب پروٹسٹنٹ مذہب کو فروغ حاصل ہوا تو اس میں ایک طبقہ ایسا پیدا ہوا جو چاہتا تھا کہ ملک کے سرکاری مذہب کے، جو ''کلیسائے انگلستان'' کہلاتا ہے، رسوم و عقائد کو سادہ بنایا جائے اور مذہبی امور میں شدید نظم و ضبط پیدا کیا جائے۔ اس طبقے کے انتہائی پسندانہ نظریات نے ملک کے اکثر لوگوں کو ان کا مخالف بنا دیا اور ان میں سے بیشتر لوگ سترھویں صدی میں امریکا چلے گئے تاکہ وہ کسی قسم کی مخالفت کے بغیر اپنے عقائد پر عمل کر سکیں۔ ان لوگوں کا پہلا جہاز ''مے فلاور'' جس پر ایک سو دو اشخاص (جن میں اکتالیس مرد اور باقی ان کے بیوی بچے تھے) سوار تھے۔ اکیس دسمبر 1620ء کو امریکا کے مقام پلائی ماؤتھ پر لنگر انداز ہوا۔ یہیں انھوں نے امریکا کی پہلی نو آبادی قائم کی۔ یہ لوگ جدید امریکا کے بانی کہلاتے ہیں اور اسی بنا پر ان کی اولاد آج بھی اپنے آپ کو دوسروں سے بہتر تصور کرتی ہے بلکہ وہاں کا برہمن طبقہ بن چکی ہے۔

④ A Piece of My Mind: Reflections at Sixty از ایڈمنڈ ولسن۔ ناشر ڈبل ڈے اینڈ کمپنی نیویارک (1958ء) صفحہ 75

⑤ فلسطین اور اردن کے مابین کھارے پانی کی جھیل۔ اس میں کوئی جاندار زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہ روئے زمین کا سب سے نچلا مقام ہے۔

⑥ بحر مردار کے صحائف: السٹریٹڈ ورلڈ انسائیکلو پیڈیا (ناشر: بوبلی پبلشنگ کمپنی، نیویارک) کے مطابق (صفحہ 214) ابتدا میں انجیل کے جو نسخے تحریر کیے گئے، وہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ضائع ہو گئے۔ بیسویں صدی کے وسط تک جو نسخے دستیاب تھے، ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا، جو 1350ء سے قبل تحریر کیا گیا ہوگا۔ تاہم 1947ء اور اس کے بعد کے سالوں میں بعض عرب چرواہوں کو بحر مردار کے آس پاس غاروں میں ایسی تحریریں ملیں جو چرمی کاغذوں یا جھلیوں پر لکھی ہوئی تھیں ان کے متعلق یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ انجیل کے بعض قدیم ترین حصوں پر مشتمل ہیں۔ ان میں سے بعض کے متعلق یہاں تک دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے دو سو سال پہلے تحریر کیے گئے تھے۔ یہ نسخے حکومتِ اردن نے بیت المقدس میں محفوظ کر دیے تھے۔ لیکن 1967ء میں جب مشرقی بیت المقدس پر اسرائیل کا قبضہ ہو گیا تو یہ نسخے بھی اس کی تحویل میں چلے گئے۔ لاہور کے انگریزی روزنامہ نیشن کی گیارہ جون 1987ء کی اشاعت میں کیتھ نرس (NURSE) کا ایک مضمون شائع کیا ہے۔ جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ ان نسخوں کا ابھی عشر عشیر بھی شائع نہیں ہو سکا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اسرائیل کے یہودی ان پر اپنا حق جتا رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کی ترتیب و تدوین ان کی ذمہ داری ہے۔ لیکن ایک وجہ غالباً یہ بھی ہے کہ ان نسخوں کی اشاعت سے عیسائیت اور یہودیت کے بعض بنیادی عقائد پر زد پڑنے کا احتمال ہے، اس لیے چالیس سال گزرنے کے باوجود یہودی اور عیسائی علما ان کی اشاعت پر رضامند نہیں ہو سکے اور آپس میں لڑ جھگڑ رہے ہیں۔

① Black, Red, Blond and Clive ناشر: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، نیویارک: 1956ء

ہیں۔اس کا اسلوبِ بیان واقعاتی ضرور ہے لیکن اس کا ایک جھول یہ ہے کہ اس میں زیادہ تر ائکل سے کام لیا گیا ہے اور بے ترتیبی صاف دکھائی دیتی ہے۔اس نے اسرائیل کے متعلق جتنی باتیں بھی تحریر کی ہیں، ان میں سے بیشتر ایسی ہیں جن پر اس کے عبرانی ادبیات کے مطالعے اور یہودیت میں اس کی دلچسپی کی چھاپ واضح طور پر نظر آتی ہے (یعنی اگر اس نے ان چیزوں سے پہلے ہی مطالعہ نہ کیا ہوتا اوران سے وہ اتنا متاثر نہ ہو چکا ہوتا، تو اس کا رویہ قطعی مختلف ہوتا۔) ایک مقام پر وہ (صیہونیوں کی) دہشت گردی پر حاشیہ آرائی کرتا ہے اور تسلیم کرتا ہے کہ اسرائیل کی مملکت اسی دہشت گردی کے بل بوتے پر معرضِ وجود میں آئی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ اس سارے قضیے میں کچھ باتیں قابلِ ملامت بھی ہوں۔ اس کا خیال ہے کہ صیہونیوں کی یہ دہشت گردی ''نازیوں کے ظلم وستم اور برطانوی پالیسی کا شاخسانہ تھی۔'' تاہم وہ ناپسندیدگی کے انداز سے مزید کہتا ہے کہ (صیہونیوں میں) ''دہشت گردی کی عادت راسخ ہو چکی ہے۔'' اس میں شدید مذہبی تعصب کا عنصر شامل ہو گیا ہے۔ ولسن یہیں پر اکتفانہیں کرتا بلکہ وہ معاملے کو کافی آگے لے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ''اسرائیلیوں نے عربوں کے بارے میں جس قسم کی سنگدلانہ اور بے رحمانہ عدم رواداری کی علامتیں ظاہر کی ہیں، وہ بالکل اس ظالمانہ اور بے رحمانہ رویے کی یاد دلاتی ہیں جو اسرائیل نوازوں نے ان لوگوں (عربوں) کے متعلق اختیار کیا تھا، جنھیں انھوں نے اپنے گھروں اور جائیدادوں سے بے دخل کر دیا تھا۔'' معلوم ہوتا ہے کہ بے دخلی کی حقیقت کے متعلق ولسن کوئی واضح مؤقف اختیار نہیں کرسکا، سوائے اس کے کہ اس نے انجیل کا یہ جملہ دہرا دیا ہے کہ ''بس ایسا ہو گیا۔'' اس کے اس اندازِ فکر سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ دُنیا میں جہاں کہیں بے دخلیوں کا عمل ہو رہا ہے، اس نے ان کے متعلق ایک خاص قسم کی غیر جانبداری اختیار کر رکھی ہے۔ لیکن اس موقع پر ہمیں یہ بات رہ رہ کر یاد آرہی ہے کہ جب ولسن اپنے ان خیالات اور تاثرات کو الفاظ کا جامہ پہنا رہا تھا، وہ حقیقتاً اس خطے میں موجود تھا جہاں بے دخلیوں اور عدم رواداری کا عملاً مظاہرہ ہو رہا تھا۔ ایک دو جملوں کے بعد جب ہم اس کی مندرجہ ذیل تحریر پڑھتے ہیں تو (اچانک) ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ انجیل کا تو ذکر ہی نہیں کر رہا۔

چنانچہ اسرائیل میں عربوں...... خاص طور پر جب ہم انھیں ملک کے اندر دیکھتے ہیں...... کی پوزیشن یہ ہے کہ وہ ہمیں ایک ایسی قوم نظر آتے ہیں جو تندخُو اور آتش مزاج ہونے کے باوصف ابھی تک اپنی دلکشی اور دلفریبی تو برقرار رکھے ہوئے ہے لیکن ذہنی اعتبار سے اس کی صلاحیتوں کو زنگ لگ چکا ہے اور ان صلاحیتوں کو نکھارنے کا اسے یارا ہی نہیں رہا۔ ملک کے اکثریتی طبقے سے اس قوم کا تعلق منقطع ہو چکا ہے مگر مسلسل ایک مسئلہ بنا ہوئی ہے۔ عربوں کے عکہ جیسے بڑے قصبے کے پُرہجوم گلی کوچوں کی غلاظت کو دیکھ کر ایک اسرائیلی کو

بالکل اس طرح گھن آتی ہے جس طرح ایک مغربی سیاح کو۔ کیونکہ جب یہودی، جو خاندانی تعلقات کو بہت سنجیدگی سے لیتے ہیں اور جنھوں نے اسرائیل میں پولینڈ اور جرمنی سے آنے والے یتیموں اور ناکندہ تراش یمنیوں کے بچوں کو اتنی محنت سے پالا پوسا اور پروان چڑھایا ہے، علم سے بے بہرہ اور بیماریوں کے ستائے ہوئے غلیظ اور گندے عرب بچوں کے غول کے غول دیکھتے ہیں جو تنگ و تاریک اور غلاظت سے بھرپور گلیوں میں چیختے چلاتے اور بھیک مانگتے پھرتے ہیں، تو ان پر ایک قسم کی اخلاقی دہشت طاری ہو جاتی ہے۔ قدیم زمانے میں یہودیوں کے فقیہوں نے شادی نکاح پر جو قدغنیں لگائی تھیں اور گوناگوں قسم کی جو کڑی شرائط عائد کی تھیں (آج کل کے زمانے میں) وہ ہمیں بہت سخت اور جابرانہ معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن دوسری طرف جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ عربوں کو طلاق کی اتنی آسانیاں حاصل ہیں اور پھر ان کی عادات بھی خانہ بدوشانہ ہیں، جس سے کسی خاندان کے باپ کو یہ ترغیب ملتی ہے کہ جب اس کا جی چاہے، وہ بہ یک جنبشِ ابرو اپنی بیوی اور آل اولاد کو چھوڑ سکتا ہے اور کسی دوسرے مقام پر جا کر کسی دوسری عورت کو اپنے گھر بسا سکتا ہے، تو ہمیں یہ برائی پہلی برائی سے بدتر محسوس ہوتی ہے۔ یہ بات نہیں کہ ہر اس شخص کے دل میں جس نے مغرب میں تربیت پائی ہے، عربوں کے لیے جو حقارت امنڈتی ہے، وہ فطری نہیں ہے اور نہ یہ بات ہے کہ اسرائیل جو ظالمانہ کارروائیاں کرتا ہے، اردن میں آباد عرب پناہ گزیں اپنی احمقانہ ہٹ دھرمیوں سے ان کا احمقانہ جواب فراہم نہیں کرتے، اقوامِ متحدہ کی ریلیف اینڈ ورکس ایجنسی نے انھیں بار بار یہ پیشکش کی کہ اگر آپ دوسرے مقامات پر آباد ہونا چاہیں تو ہم آپ کی ہر طرح کی مدد کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن وہ ہیں کہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ اس قسم کی ہر پیشکش کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیتے ہیں اور طوطے کی طرح ایک ہی بات کی رٹ لگائے جا رہے ہیں کہ ہم تو اسرائیل میں ہی اپنے دیہاتوں اور زمینوں پر واپس جائیں گے۔

یہاں میں اس خاص رویے کا ذکر کر رہا ہوں جو اسرائیل کے یہودیوں میں پنپ رہا ہے اور ان کا طرۂ امتیاز بنتا جا رہا ہے۔ یہ اسی رویہ کا نتیجہ ہے کہ یہودی غیر یہودیوں کے ساتھ مل جل کر رہنا نہیں چاہتے بلکہ وہ اسرائیل کو صرف اور صرف یہودی مملکت بنانے پر مصر ہیں۔ یہ رویہ ایک قوم (یا شخص) کو خاص حد بندیوں میں جکڑ دیتا ہے اور بعض اوقات اس کے اثرات تباہ کن ہوتے ہیں۔ تاہم اس رویے کے برعکس یہودی روایت میں جو حیات بخش عناصر پائے جاتے ہیں، ان کا ذکر میں بعد میں کروں گا۔ ①

جہاں تک یہودیوں کے اس رویے کا تعلق ہے جس کا ذکر ولسن نے اوپر کیا ہے کہ وہ غیر یہودیوں کے

---

① Black Red Band and Clive صفحہ: 462-63

ساتھ مل جل کر نہیں رہنا چاہتے، اگر وہ اس رویے کو عربوں کے بارے میں اپنائیں تو اسے (ولسن کو) ان کے اس رویے میں کوئی برائی نظر نہیں آتی۔ اس نے عربوں کی جو مختصر تصویر کشی کی ہے۔ اس میں وہ مکمل طور پر کریہہ، بدصورت اور غیر دلکش نظر آتے ہیں۔ عربوں کی فلاکت اور مفلسی کے پس پردہ جو عوامل کارفرما ہیں، ولسن کو وہ اتنے اہم نظر نہیں آتے جتنی کہ اس فلاکت اور مفلسی کی موجودگی۔ حالانکہ اگر وہ چاہتا تو اسے ان عربوں کے بارے میں جو اسرائیل میں موجود ہیں، حقائق معلوم کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آتی۔ جہاں تک عربوں اور خاندان کے بارے میں ان کے احساس (محبّت یا لاتعلقی) کے متعلق اس (ولسن) کی باتوں کا تعلق ہے، تو یہ باتیں صرف اس طرح سمجھ میں آسکتی ہیں جس طرح کوئی اس قسم کی (مہمل اور بے سروپا) باتوں کو سمجھنے کی کوشش کرے کہ ''مشرقیوں'' کو انسانی زندگی کا اتنا احساس نہیں جتنا کہ ''ہمیں'' ہے۔ دوسرے الفاظ میں ولسن کی باتوں کا مطلب یہ ہے کہ عرب بچوں کی قطعاً پروا نہیں کرتے۔ وہ محبّت اور نفرت کے احساسات سے عاری ہیں۔ وہ تو بس ایسے جانور ہیں جن کا کام جلدی جلدی بچے پیدا کرنا ہے۔ عربوں کے متعلق جو ایک ''خاص قسم کی حقارت'' محسوس کی جاتی ہے، اس کا دائرۂ عمل اس حد تک بڑھ جاتا ہے کہ جب عرب فلسطینی کسی دوسرے مقام پر آباد ہونے سے انکار کرتے ہیں بلکہ اس معاملے میں ''ہٹ دھرمی'' کا مظاہرہ کرتے ہیں، تو ان پر ''احمق'' ہونے کا لیبل چسپاں کر دیا جاتا ہے۔ لیکن آدمی کو شدید ترین غصّہ اس وقت آتا ہے جب ذکر اس سلوک کا آتا ہے جو 1948ء اور اس کے بعد یہودیوں نے ان عربوں کے ساتھ روا رکھا تھا جو اپنے گھر بار چھوڑ کر بھاگے نہیں تھے۔ یہاں وہ صریحاً بددیانتی اور جھوٹ کا ارتکاب کرتا ہے۔ وہ صرف یہ کہہ کر بات ٹال دیتا ہے کہ یہودی غیر یہودیوں کے ساتھ مل جل کر رہنا نہیں چاہتے۔ (حالانکہ حقائق محض یہی نہیں تھے بلکہ ان سے قطعی مختلف تھے۔) جس زمانے میں ولسن اسرائیل کی سیر و سیاحت کر رہا تھا، عربوں پر جن قوانین کا اطلاق کیا جاتا تھا، وہ ایمرجنسی ڈیفنس ریگولیشنز ① تھے۔ ابتداً یہ قوانین انگریزوں نے اپنے دورِ حکومت کے دوران میں وضع کیے اور نافذ کیے تھے، انگریزوں نے یہ قوانین عربوں اور یہودیوں دونوں کے خلاف استعمال کرنا تھے (جب اسرائیل کے قیام کے بعد حالات تبدیل ہو گئے تو) یہ قوانین علانیہ نسل پرستانہ صورت اختیار کر گئے کیونکہ اسرائیل میں انھیں کبھی بھی یہودیوں کے خلاف استعمال نہیں کیا گیا۔ اسرائیل نے 1948ء میں انھیں عربوں کو قابو میں رکھنے کے لیے برقرار رکھا۔ ان قوانین کے تحت انھوں نے عربوں کی آزادانہ نقل و حرکت پر پابندیاں لگائیں اور انھیں

① ہنگامی دفاعی قوانین

انھیں زمینیں خریدنے، اپنی آبادکاری کرنے وغیرہ کے حقوق سے محروم کیا۔ برطانوی دورِ حکومت کے دوران میں یہودی نہایت باقاعدگی کے ساتھ ان قوانین کی مذمت کرتے رہتے تھے اور یہ کہتے نہیں تھکتے تھے کہ یہ قوانین سامراجی اور نسل پرستانہ ہیں۔ لیکن جوں ہی ان کی مملکت، اسرائیل، معرضِ وجود میں آئی، انھی قوانین کو عربوں کے خلاف استعمال کیا گیا۔ ان باتوں کے متعلق ولسن کے پاس کہنے کو ایک لفظ بھی نہیں۔ ولسن نے جس فروگذاشت کا مظاہرہ کیا ہے، اس کا قطعاً کوئی جواز نہیں بنتا کیونکہ اگر حقائق چاہییں تو وہ بآسانی صابری جریس کی کتاب ''اسرائیل کے عرب'' [1] میں دستیاب ہو سکتے ہیں۔ پھر خود صیہونیوں کی ایسی تصانیف کا فقدان نہیں جن میں صاف صاف اس بات کی نشان دہی کی گئی ہے کہ اسرائیلیوں نے عربوں کو دبانے اور اپنی مطلب براری کے لیے ان سابقہ سامراجی قوانین کو کس قدر غلط طریقے سے استعمال کیا۔

سب سے بڑھ کر ولسن کی اس تصنیف میں جو بات واضح ہو کر ابھرتی ہے، وہ یہ حقیقتِ ثابتہ ہے (اگرچہ وہ علانیہ تو اسے حقیقتِ ثابتہ نہیں کہتا لیکن بین السطور مطلب یہی نکلتا ہے) کہ جس شخص، خاص طور پر اگر وہ شخص روشن خیال اور انسان دوست [2] لبرل ہو، کا جی چاہے، وہ مشرقِ وسطیٰ کے حالات کے متعلق اپنے خیالات کا تحریری اظہار کر سکتا ہے، تقریریں کر سکتا ہے، بحثیں کر سکتا ہے اور اپنی ماہرانہ رائے دے سکتا ہے۔ میرے خیال میں یہ ایک بے حد اہم بات ہے۔ انیسویں صدی میں اگر کوئی شخص مشرقِ وسطیٰ کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا تھا تو اس کی نگاہیں مستشرقین کی طرف اٹھتی تھیں کہ انھی کو ماہرِ علوم تصور کیا جاتا تھا لیکن بیسویں صدی میں اس صورتِ حال میں زبردست تبدیلی رونما ہو گئی۔ فی زمانہ اگر کسی شخص کو مشرق (اور مشرقیوں) کے متعلق کوئی معلومات درکار ہوں، تو اس کی نگاہیں صیہونیوں کی طرف اٹھتی ہیں۔ چنانچہ مشرقِ وسطیٰ میں ولسن جو

---

① Sabri Jiryis: The Arabs in Israel trans. Inea Engler (New York: Monthly Review Press, 1976

② یہ انگریزی لفظ Humanistion کا ترجمہ ہے۔ Humanism اصل میں ایک تہذیبی اور ذہنی تحریک تھی جو پندرھویں سولھویں صدی میں تحریکِ احیائے علوم کے شاخسانے کے طور پر وجود میں آئی۔ زمانہ قدیم کے یونانی اور رومی ادبیات، فنونِ لطیفہ اور فلسفیانہ افکار کے مطالعہ نے مغربی دانشوروں اور مفکروں کو مذہبی نقطۂ نظر ترک کرنے اور سیکولر نقطۂ نظر اختیار کرنے کی طرف مائل کیا۔ اب خدا کائنات کا مرکز نہ رہا، بلکہ انسان اس کا مرکز قرار پایا، اس لیے توجہ بھی اسی کی بھلائی اور بہتری پر مرکوز ہونا چاہیے۔ چنانچہ مغرب میں لادینی خیالات پھیلانے میں اس تحریک نے اہم کردار کیا۔ تاہم اس تحریک کے محرکین اور مؤیدین اپنے آپ کو انسان دوست اور انسان شناس قرار دیتے ہیں اور انسانی اقدار کو پھیلانے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ مصنف نے یہ لفظ انھی معنوں میں استعمال کیا ہے۔

جو کچھ دیکھتا ہے...... بلکہ اس بارے میں کوئی بھی مغربی شخص جو عام طور پر دیکھتا ہے...... وہ یہودی تناظر میں دیکھتا ہے۔ ان کے نزدیک اسرائیل ہی معیار ہے، اسرائیلی (موقع پر) موجود ہیں، ان کے خیالات و تصورات اور ادارے مستند طور پر مقامی ہیں۔ عرب وبالِ جان اور باعثِ آزار ہیں۔ فلسطینیوں کی حقیقت نیم افسانوی ہے (اور دلیل کو مزید آگے بڑھا کر یہاں تک فتویٰ صادر کر دیا جاتا ہے کہ ان کی حقیقت محض پراپیگنڈہ ہے ورنہ ان کا کوئی وجود نہیں) وغیرہ وغیرہ۔ یہ بات تو فراموش کر دی جاتی ہے کہ اسرائیل معرضِ وجود میں کیسے آیا تھا۔ (البتہ تان جس بات پر ٹوٹتی ہے، وہ یہ ہے کہ) اسرائیل ایک مغربی جمہوریت ہے کہ یہود مخالف عرب خواہ مخواہ اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے ہیں۔ یوں اصل حقیقت تو نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے، اور اس کے بالکل برعکس جو صورتِ حال ہے، وہ مکمل حقیقت کا روپ دھار کر سامنے آجاتی ہے۔ میں نے اوپر کے صفحات پر کہیں یہ عرض کیا تھا کہ صیہونی ''سچائی'' کو تحلیل کرنے کے عمل میں مصروف رہتے ہیں، تو ولسن نے جو رویہ اختیار کیا ہے، وہ ان کے عمل کی عظیم ترین کامیابی کی مثال ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ولسن نے عربوں کے متعلق جو باتیں تحریر کی ہیں، وہ نادرست نہیں بلکہ وہ ان معنوں میں بالکل درست ہیں کہ وہ ان باتوں کی ہوبہو اور لفظ بلفظ نقل ہیں جو اسرائیل (مغربی آبادکاروں کی حیثیت سے جو ایک پسماندہ خطے میں رہائش اختیار کیے ہوئے ہیں) عربوں اور ان کی ''خانہ بدوشانہ'' عادات کے متعلق اپنے خیالات و محسوسات کے ذریعے انڈیلتے رہتے ہیں لیکن (حقائق کی) تحریف اتنی مکمل ہے کہ ہمیں یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ اسرائیلیوں اور عربوں کے مابین جس قسم کے تعلقات پائے جاتے ہیں، وہ فطرت کے حقائق نہیں، بلکہ وہ نتیجہ ہیں ایک مخصوص اور مسلسل عمل کا، جس کے ذریعے لوگوں کو اپنے گھروں سے باہر نکال دیا جاتا ہے، انھیں اپنی املاک سے محروم اور بے دخل کر دیا جاتا ہے اور اس طرزِ عمل کے پیچھے جو عوامل کارفرما ہیں، وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے نوآبادیاتی اور عملاً (defacto) نسلی امتیاز پر مبنی ہیں، مزید برآں ہم یہ بھی فراموش کرنے لگتے ہیں کہ صیہونی (مقامی باشندے نہیں تھے بلکہ) یورپ سے فلسطین میں وارد ہوئے تھے۔

③

نیابت کا مسئلہ

یہاں میں جو بات کہنے کی کوشش کر رہا ہوں، وہ یہ ہے کہ ولسن جیسے اشخاص کی تحریریں بعینہٖ اس سیاسی حقیقت کی عکاسی کرتی ہیں جس کا پرتو میرے خیال میں امریکا کے اس طبقے کی جو اپنے آپ کو روشن خیال لبرل جمہوریت کا علمبردار تصور کرتا ہے، روزمرہ کی گفتگو اور تحریر و تقریر میں دکھائی دیتا ہے اور سیاسی حقیقت یہ ہے کہ مغرب کے لبرل طبقے اور صیہونیوں اور اسرائیلیوں کے بالادستی کے نظریات کے مابین ایک کلی مطابقت بلکہ امتزاج موجود ہے۔ میں نے لفظ ''بالادستی'' عمداً استعمال کیا ہے اور جس طرح میں نے یہ لفظ استعمال کیا ہے، اس میں ان تمام مفاہیم کی گونج شامل ہے، جو اطالیہ کے اس عظیم مارکسی دانشور انتونیو گرام شی[1] (Gramsci) کی، جس نے سیاست (کے میدان) میں ثقافت اور دانش وروں کی اہمیت کا تجزیہ کیا ہے، تحریروں میں پائے جاتے ہیں۔ ''بالادستی'' کے ایک مفہوم کی تفصیلی تشریح کرتے ہوئے گرام شی نے اس کے ساتھ رضامندی کا تصور منسوب کیا ہے۔ بالفاظِ دیگر، بالادستی محض تغلب سے ہی قائم نہیں ہوتی بلکہ

---

① انتونیو گرامشی (1891ء-1937ء) ایک اطالوی مصنف، ابتدا میں جمالیات کے مشہور اطالوی ماہر کروچے سے متاثر ہوا۔ پھر مارکس اور اینگلز کا مطالعہ کیا اور کمیونسٹ بن گیا۔ لینن کے ساتھ بھی کچھ عرصہ کام کرتا رہا۔ 1931ء میں پالمیر وتغلیاتی کے ساتھ مل کر کمیونسٹ پارٹی آف اٹلی قائم کی۔ اسی سال وہ اٹلی کی پارلیمنٹ کا رکن بھی منتخب ہوگیا۔ چونکہ وہ لگی لپٹی رکھے اٹلی کے ڈکٹیٹر مسولینی پر تنقید کرتا تھا۔ اس لیے 1926ء میں اسے نظر بند کر دیا گیا۔ اپریل 1937ء میں اسے رہائی تو نصیب ہوگئی لیکن چند ہی دنوں بعد اس کا انتقال ہوگیا۔ گرامشی کمیونسٹ پارٹی کا نظریہ ساز تھا۔ اس کی مشہور ترین کتب ''خطوطِ زندان'' (1947ء) اور ''جدید شہزادہ'' (1949ء) اس کی موت کے بعد شائع ہوئیں۔

(بعض اوقات) اس میں (مغلوب کی) رضامندی، تسلیم اور منظوری بھی شامل ہوتی ہے۔ جیسا کہ نی بُور اور ولسن کی مثالوں سے واضح ہوجاتا ہے کہ بیسویں صدی کے وسط تک مغرب کے لبرل طبقے اور صیہونیوں کے خیالات میں کسی قسم کا بُعد باقی نہیں رہا تھا بلکہ دونوں کے نقطۂ نظر میں برضا و رغبت اس قسم کی مماثلت پیدا ہوچکی تھی کہ من تُوشدم، تُومن شدی کی کیفیت ہوگئی تھی۔ یہ مماثلت کیوں پیدا ہوئی؟ اس کی وجوہ بہت پیچیدہ ہیں (اور اس کا شاید کوئی قابلِ قبول جواز بھی موجود ہو) لیکن جہاں تک فلسطینی عربوں کا تعلق ہے، ان کے لیے اس بالا دستانہ تعلق کا ٹھوس مطلب تباہی و بربادی کے سوا اور کچھ نہیں تھا اور اس بارے میں کوئی دو آرا نہیں ہو سکتیں۔ صیہونیت اور مغرب کے لبرل ازم کے مابین جو مماثلت وجود میں آئی، اس کا سیدھا سادہ مطلب یہ نکلتا تھا کہ جس حد تک کوئی عرب باشندہ فلسطین میں اپنی املاک اور گھر بار سے بے دخل اور محروم ہوچکا تھا۔ اسی حد تک وہ ''ناشخص'' (non person) بن چکا تھا کیونکہ (اب) فلسطین میں خود صیہونی (اس کی جگہ) واحد شخص بن چکا تھا۔ اس بنا پر کہ عرب باشندے کی منفی شخصیت (مشرقی، انحطاط پسند، فروتر) عیاں تر ہوگئی تھی۔ لبرل مغرب کو صیہونیت میں تعقل خرد اور عینیت [2] کی کامرانی نظر آتی تھی۔ لبرل ازم کو (صیہونیت میں) بس یہی

---

② عینیت یا مثالیت یا آئیڈیلزم (Idealism) فلسفے میں دو اصطلاحیں...... مادیت اور عینیت...... عام استعمال کی جاتی ہیں۔ ''مادیت'' کے ماننے والوں کے مطابق دُنیا میں مادے کے سوا اور کوئی جوہر موجود نہیں۔ اس عقیدے کے مطابق شعور اور ارادہ بھی مادے ہی کے مظاہر ہیں۔ فلسفے کا آغاز بھی مادیت پرستی سے ہی ہوا تھا۔ جب پہلی مرتبہ انسان دیومالائی طرزِ فکر و احساس سے آزاد ہوا اور اس نے دیوتاؤں کی مدد کے بغیر خود غور و فکر کا کام شروع کیا تو فلسفہ وجود میں آیا۔ یونان کے ابتدائی مفکرین سبھی کے سبھی مادہ پرست تھے۔ پھر افلاطون علمی افق پر نمودار ہوا۔ فلسفے کی تاریخ میں وہ پہلا شخص ہے جس نے مادی کائنات کو ایک عالمِ امثال کا عکس قرار دے کر مادیت کی روایت سے انحراف کیا اور عینیت (مثالیت) کی بنیاد ڈالی۔ مادیت پرستوں کے خیال میں مادہ تمام کائنات پر محیط ہے۔ مادہ ازلی اور غیر فانی ہے۔ مادے میں حرکت کی صلاحیت موجود ہے اور یہ حرکت مقررہ قوانین کے تحت ہو رہی ہے۔ دوسری اشیا کی طرح شعور اور ذہن بھی ایٹمی ذرات سے مرکب ہیں لیکن کائنات میں کوئی ذہن یا شعور کارفرما نہیں، دوسرے الفاظ میں اس کائنات پر کوئی آفاقی یا یزدانی قوت حاوی نہیں۔

اس کے برعکس عینیت پسندوں کا نظریہ یہ ہے کہ اصل حقیقت مادہ نہیں بلکہ خیال یا ذہن اصل حقیقت ہے، مادہ تو محض خیال کا عکس ہے۔ یہ مادی کائنات جسے ہم اپنے حواس کے ذریعے معلوم کرتے ہیں، اصل کائنات نہیں بلکہ یہ اس کائنات کا محض ایک عکس ہے جو ہماری مادی کائنات سے ماورا ہے۔ چنانچہ اپنی نمود کے لیے مادہ ذہن کا محتاج ہے اور یہ ذہن ہی مادے کا خالق ہے۔ کوئی شے موجود ہے یا نہیں، اس کا انحصار میرے علم پر ہے اور میرے پاس جو علم ہے، وہ میری ذہنی کیفیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ چنانچہ میری ذہنی کیفیت ہی کا وجود حقیقی ہے۔ اس نظریے کے ماننے والے ایک مقام پر پہنچ کر یہ دعویٰ بھی کرنے لگے کہ مادے کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں۔ یہ جو خارجی کائنات ہے اور جسے عام طور پر مادے پر مشتمل سمجھا جاتا ہے، خدا (اور کسی حد تک انسان) کے ذہن سے آزاد اپنا کوئی وجود ہی نہیں رکھتی۔........

کچھ دکھائی دیتا تھا اور کچھ نہیں، (کیونکہ یہ زیادہ تر دیکھنا ہی یہی کچھ چاہتی ہے۔) (دوسری طرف) صیہونیت کو لبرل ازم میں اپنے متعلق وہی کچھ نظر آتا تھا، جس کا عکس وہ دُنیا پر ڈالنا چاہتی تھی۔ دونوں ہی صورتوں میں (بحیثیت انسان) عربوں کا اخراج ہوگیا۔ اب اگر ان کی کوئی تصویر باقی بھی ہے تو محض اتنی کہ وہ وبالِ جان ہیں، منفی سوچ اور کردار کے مالک ہیں اور اقدارِ ''بد'' کے نمائندے ہیں۔ سیدھی سادی معاشیات پر نظریے نے کس طرح تفوق حاصل کیا بلکہ اسے پاؤں تلے مسل ڈالا، یہ اس کی انوکھی اور بے نظیر مثال ہے۔ کیونکہ اب تک جو حالات رونما ہوئے ہیں، ان کے پیشِ نظر خالص معاشی وجوہ کی بنا پر (اور اسرائیل اور صیہونیوں کو جو بے حدوحساب امداد دی گئی ہے، اگر اس کو پیش نظر رکھا جائے تو بھی) اسرائیل (کا قیام) ایک عظیم سانحہ ثابت ہوا ہے لیکن چونکہ اس کے متعلق یہ باور کیا جاتا ہے کہ خرد و تعقل کے ہراول دستے کی حیثیت سے یہ کامیابی سے ہمکنار ہوا ہے، اس لیے اس کو مزید اور مزید تر امداد دینے کا جواز موجود ہے اور اس کا قیام بھی صحیح سے صحیح تر ثابت ہو چکا ہے۔ حالانکہ جن وجوہ کی بنا پر اس کے قیام و بقا کو صحیح ثابت کیا جاتا ہے، وہ روز بروز سکڑتی جا رہی ہیں۔

نی بُور اور ایڈ منڈ ولسن بالترتیب (موجودہ صدی کے) پانچویں اور چھٹے عشرے کی پیداوار ہیں۔ 1967ء کی جنگ کے بعد اسرائیل کی سرحدیں بے حد وسیع ہوگئیں۔ اس کا ایک نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اس کے زیر تسلط عرب باشندوں کی تعداد بھی بڑھ کر تقریباً دس لاکھ ہوگئی۔ فلسطینیوں کی اس نئی واقعیت سے کوئی شخص بھی، اور اسرائیل تو بالکل ہی نہیں، نظریں نہیں چرا سکتا تھا۔ اب ہر اس شخص پر، جو یہودی نہیں تھا، لفظ ''عرب'' چسپاں کرنے سے کوئی بات نہیں بنتی تھی۔ ایک طرف تو اسرائیل میں ''پرانے'' عرب موجود تھے۔ پھر (جنگ 1967ء کے بعد) مغربی کنارے اور غزہ کے نئے باشندے ان میں شامل ہوگئے۔ دوسری طرف جنگ جو حریت پسند (جنھوں نے بعد میں تحریک آزادی فلسطین...... پی ایل او...... کا روپ دھارا) اور کئی دوسری مختلف برادریاں اور طبقے تھے جو لبنان، اردن، شام اور خلیجی ریاستوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ حقیقی (فلسطینی) علاقوں اور لوگوں پر اسرائیل کا فوجی تسلط بیس سال سے زیادہ عرصے سے قائم ہے۔ یہ ٹھیک

......اپنی انتہا پر پہنچ کر دونوں نظریات اخلاقیات کی تمام سرحدیں پھلانگ جاتے ہیں۔ البتہ ''عینیت'' کا ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ یہ نامطمئن اقدار سے انحراف کرتا ہے اور نئی اقدار اور نئی منازل کی راہ سمجھاتا ہے۔ یوں یہ انسان کو اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے آمادۂ عمل کرتا ہے۔ اس کا یہ پہلو انسانی جدوجہد میں ہمیشہ مرکزی کردار ادا کرتا رہا ہے۔ یوں صیہونیت بھی اس کے ماننے والوں کے لیے ''عینیت'' بن جاتی ہے۔

ہے کہ مغربی کنارے کو جودیہ اور سماریہ [1] کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے لیکن وہاں جو لوگ موجود ہیں، انھیں آسانی سے، کم از کم فی الحال تو نہیں، تحلیل نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ صیہونیت، لبرل ازم کے راستے کی نئی رکاوٹ قبضے کا مسئلہ ہے۔ اسرائیل یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ فوجی قبضے کا درحقیقت مطلب یہ ہے کہ ''مل جل کر رہا جائے۔'' یہ تصور اتنا سہانا ہے کہ ایک مرتبہ ''نیویارک ٹائمز'' نے بھی اس پر نہایت جوش و خروش سے صاد کر دیا۔ چنانچہ اس نے اپنے 2 مئی 1976ء کے شمارے میں اپنے ادارتی کالموں میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے عربوں کا پراپیگنڈہ کرنے والوں کی شدید مذمت کی اور ان پر الزام لگایا کہ وہ ہر قسم کی نہایت گھناؤنی اور ذلیل حرکتوں کا ارتکاب کر رہے ہیں (عربوں کے ان حامیوں کی ''ذلیل ترین'' حرکت یہ تھی کہ وہ کھلے بندوں اسرائیل کو اس بات پر مطعون کرتے تھے کہ اس نے عربوں کے علاقے پر ناجائز قبضہ کر رکھا ہے)۔ اس (نیویارک ٹائمز) نے اسرائیل کے سرکاری نقطۂ نظر کی جگالی کرتے ہوئے (بڑی ڈھٹائی کے ساتھ) یہ اعلان کیا کہ مغربی کنارے اور غزہ پر (اسرائیل کا) فوجی قبضہ سابق فلسطین میں عربوں اور یہودیوں کے مابین ''آئندہ تعاون کے لیے ایک نمونہ اور مشعل راہ'' ثابت ہو گیا۔ کسی دوسرے متن کے حوالے سے اس قسم کی بات نہیں کہی جا سکتی تھی۔ فوجی قبضے کو لوگوں کے مابین اچھے اور خوشگوار تعلقات کا نمائندہ بنا کر پیش کیا گیا، اسے ایک ایسی سکیم کے طور پر آگے بڑھایا گیا جس پر ایک مشترکہ مستقبل کی تعمیر کی جا سکتی تھی، بالکل اسی انداز سے جس طرح ''خود اختیاری'' (اٹانومی) کے متعلق یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ...... ارتز...... اسرائیل [2] کے عرب حقیقتاً یہی چاہتے ہیں۔

معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوتا۔ ہمیں ایک مرتبہ جس مسئلے کا جائزہ لینا ہوگا، وہ نمائندگی کا مسئلہ ہے اور یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو ہمیشہ فلسطین کے مسئلے کے آس پاس گھات لگائے بیٹھا رہتا ہے۔ میں یہ بات پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ صیہونیت ہمیشہ فلسطین اور فلسطینیوں کی ترجمانی کا فریضہ اپنے ذمے لیتی رہتی ہے اور اس کا مطلب ہمیشہ یہی رہا ہے کہ یہ ایک ناکے بندی کا عمل ہے۔ یعنی اس عمل کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ عالمی سٹیج پر فلسطینیوں کی آواز براہِ راست نہیں سنی جا سکتی اور نہ وہ دُنیا کے سامنے بلا واسطہ اپنی نمائندگی کر سکتے ہیں۔ جس

---

① یہودی دریائے اُردن کے مغربی کنارے کو جودیہ سماریہ کہتے ہیں۔ جبکہ فلسطینی اسے ''الضفۃ الغربیہ'' کہتے ہیں۔

② ''ارتز اسرائیل'' عبرانی...... لفظ ''ارض'' کی ہی ایک شکل ہے۔ چنانچہ لغوی طور پر ارتز اسرائیل کے معانی ارض اسرائیل ہی ہیں لیکن مجازاً (یہودیوں کے نزدیک) اس سے مراد وہ تمام علاقے ہیں جو کبھی یہودی مملکت کا حصہ تھے۔ چنانچہ آج کل اسے ''عظیم تر اسرائیل'' کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

طرح ایک ماہر مستشرق کا یہ ایمان تھا کہ جن مقامی باشندوں اور قدیم قبیلوں (کی بود و باش، رہن سہن، طرز معاشرت وغیرہ) کا اس نے مطالعہ کیا ہے صرف وہی ان کی ترجمانی (گو پدرانہ شفقت کے ساتھ) کرسکتا ہے...... اس کی موجودگی، ان کی عدم موجودگی پر دلالت کرتی تھی...... چنانچہ صیہونی بالکل اسی انداز سے دُنیا کے سامنے فلسطینیوں کی ترجمانی کرتے تھے۔ لیکن اس قسم کا رویہ ہر زمانے اور ہر مقام کے لیے ممکن نہیں۔ چنانچہ وہ تمام تحریکیں جو جنگِ عظیم دوم کے بعد مختلف قسم کی شورشوں اور باغیانہ سرگرمیوں میں ملوث ہوئیں، اس امر کو بہ خوبی سمجھ چکی ہیں اور اسے اپنے حق میں استعمال کرچکی یا کررہی ہیں۔ ایک ایسے عہد میں، جب اطلاعات دُنیا کے گوشے گوشے میں بآسانی اور بعض اوقات فوراً اسی وقت پہنچ جاتی ہیں، سنسنی خیز گوریلا کارروائیاں اور دہشت گردی کے ''کارنامے'' اپنی بات ''براہِ راست'' پہنچاسکتے ہیں، اپنی نمائندگی بلاواسطہ کر سکتے ہیں، خواہ ان کے اردگرد کتنے ہی حصار کیوں نہ کھڑے کردیے جائیں اور ان کے وجود کو نگاہوں سے اوجھل کرنے کے کتنے ہی جتن کیوں نہ کیے جائیں۔ وقت آنے پر، ان کی موجودگی جسے دبانے کی اتنی کوششیں کی گئیں، چھن چھن کر باہر آنے لگتی ہے اور اپنے اردگرد باندھے ہوئے حصار یا ناکا بندی کو توڑنے کا راستہ تلاش کرلیتی ہے اور یہ بات اس وقت اور بھی صحیح ثابت ہوتی ہے جب ان کی موجودگی کا سرے سے ہی انکار کردیا جائے۔ اسرائیلیوں کی ایک واضح اکثریت کے ساتھ یہی کچھ ہوا تھا۔ جن لوگوں کی موجودگی سے جو تازہ ترین انکار کیا گیا ہے، وہ فلسطینی ہیں۔ اپنے روزِ قیام سے صیہونیت نے جن جن غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے، یہ انکار اس کی عظیم ترین (لیکن ناگزیر ترین) غلطی ثابت ہوا ہے۔ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کا تفصیلی ذکر میں اگلے باب میں کروں گا۔ یہاں میں صیہونیوں اور مغرب کے لبرل طبقے کی بالادستی کے بارے میں اتحاد کی چند حالیہ مثالیں پیش کروں گا تاکہ مثالوں کا وہ سلسلہ جن کا آغاز میں نے نی بور اور ولسن سے کیا تھا، مکمل ہوجائے۔

میرا خیال ہے کہ یہ بات عمومی طور پر درست ہے کہ اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ امریکی رائے عامہ کے نزدیک کون سے خیالات قابلِ قبول ہوسکتے ہیں اور سیاسی طور پر انھیں صحیح ہونے کا شرف حاصل ہوسکتا ہے، تو آپ کو یہ دیکھنا پڑے گا کہ کون کس کی ترجمانی کررہا ہے۔ صحیح نتیجے پر پہنچنے کا یہ تقریباً بے خطا پیمانہ ہے۔ امریکا کے بعض چیدہ چیدہ حلقوں میں ویت نام کے قومی محاذِ آزادی (نیشنل لبریشن فرنٹ) کے مؤقف کو جو زبردست پذیرائی حاصل ہوئی اور اسے جس پُرزور طریقے سے حق وانصاف کے عین مطابق ٹھہرایا گیا، اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ویت نام میں امریکی مہم جوئی کے خلاف جن لوگوں نے آواز بلند کی، ان میں سے متعدد شخصیات ایسی تھیں، جو انتہائی بلند مقام کی حامل تھیں، تقریباً ہر شخص ان کے نام اور کام سے آگاہ تھا، ہر کوئی ان

کے چہروں سے شناسا تھا، انھیں معاشرے میں شہرت اور عزت حاصل تھی۔ چنانچہ اگر ڈاکٹر سپوک ① جین فونڈا ② نوم چومسکی ③ اور سینٹر میک گورن ④ تمام کے تمام ایک ہی چیز کی مذمت کریں، تو ان کے متعلق یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ جس بات کی وہ مذمت کر رہے ہیں، تو جو بات اس کے الٹ ہوگی، وہ صحیح ہوگی۔ اسرائیل کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ جب اسرائیل کے حق میں یا اس کی جانب سے کسی چیز کا گرم جوشی کے ساتھ ذکر ہو تو مروّجہ دستور کا تقاضا یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو سیاسی یا دانشورانہ محاذ پر سرگرم ہے، ہاں میں ہاں ملائے۔ جب عمومی فضا یہ ہو تو فلسطینیوں کے حق میں کلمۂ خیر کہنا ناممکن ہو جاتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ہر وہ بیان، جس سے اسرائیل کی تائید ہوتی ہے، فلسطینیوں پر دباؤ شدید اور مرکوز کرنے کا موجب بن جاتا ہے کہ وہ اپنی زبانیں بند رکھیں اور ان پر جو جبر ہو رہا ہے، اسے چپ چاپ قبول کر لیں۔ چنانچہ اسرائیل کی حمایت کرنا اور فلسطینیوں کی مخالفت کرنا جائز اور قابلِ قبول ٹھہرتا ہے۔ یہ تو ٹھہرا ایک جامع بدیہی کلیہ، جس پر عمل کرنا ہر کسی کا فرض بنتا ہے۔ لیکن اس سے جو زیادہ فعال اصول برآمد ہوتا ہے، اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اسرائیل کے متعلق اسرائیلیوں کے مضامین اور تحریریں تو آپ کو عام مل جائیں گی لیکن خود عرب اپنے متعلق جو تصانیف سپردِ قلم کرتے ہیں، وہ آپ کو شاذ و نادر ہی کہیں دستیاب ہوں گی۔ یہ محض عددی اعتبار سے ہی شدید عدم تناسب نہیں ہے (اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ امریکا میں مقیم یہودی اور عرب طبقے نہ صرف تعداد کے اعتبار سے شدید عدم تناسب کا شکار ہیں بلکہ کیفیت کے اعتبار سے ایک کو دوسرے سے کوئی نسبت نہیں۔ کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے یہودیوں کو عربوں پر زبردست برتری حاصل ہے) بلکہ کیفیت کے اعتبار سے بھی درست ہے۔ مثال کے طور پر 1973ء کی جنگ کے دوران میں نیویارک ٹائمز سنڈے میگزین نے ایک ہفتے ایک نامور اسرائیلی وکیل کا ایک مضمون شائع کیا جس کا موضوع تھا۔ ''معروف جنگ ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ مبینہ تناسب کی خاطر ایک اور مضمون شاملِ اشاعت کیا گیا لیکن اس کا مصنف (کوئی عرب نہیں بلکہ) شام میں متعین ایک سابق امریکی

---

① سپوک: پورا نام (Benjamin Mclane Spok) ہے سال پیدائش 1903ء ہے۔ یہ شخص امراضِ اطفال کا ماہر معالج ہے۔ تعلیمی امور پر سند کی حیثیت رکھتا ہے اور کئی کتابوں کا مصنف ہے۔

② جین فونڈا (Jane Fonda): مشہور و معروف امریکی ایکٹر ہنری فونڈا کی بیٹی ہے اور خود بھی ایک مانی ہوئی اداکارہ ہے۔ ویت نام کی جنگ میں امریکی حکومت کے کردار کے خلاف امریکا میں جو مہم چلائی گئی اس کی روحِ رواں یہی خاتون تھی۔

③ چومسکی (Noam Chomsky): سالِ پیدائش 1928ء، امریکا کا ماہر لسانیات

④ میک گورن (Georage Stanley Mcgovern): سال پیدائش 1922ء، امریکی سیاستدان، کئی سال امریکی سینٹ کا رکن رہا۔ رچرڈ نکسن کے خلاف صدارتی انتخاب ہار گیا۔

سفیر تھا۔عربوں کے مؤقف کی وضاحت کے لیے اگر کبھی کسی عرب کا انتخاب عمل میں آتا بھی ہے،تو کسی ایسے شخص کو منتخب کیا جاتا ہے جس کی بات کا اثر کم سے کم ہو۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ جب کبھی نمائندہ عرب نقطۂ نظر پیش کیا جاتا ہے،تو پیش کرنے والا یا کوئی مغربی ماہر ہوتا ہے یا پھر کوئی نیم سرکاری عرب ''بیان'' جڑ دیا جاتا ہے۔کمیت اور کیفیت دونوں کو برابر کے پلڑوں میں رکھا جاتا ہے۔

1967ء کے بعد کے عشرے کے دوران میں متعدد مشہور و معروف ہستیوں نے اسرائیل کا دورہ کیا۔ان ہستیوں میں جو لوگ ادیب،صحافی اور مصنّف تھے،انھوں نے اپنے تاثرات کو قلم بند بھی کیا۔تازہ ترین مثال سال بیلو[1] کی ہے۔دوسروں میں سٹیفن سپینڈر[2]،فرانسائنے دو پلیے سی گرے،ریناٹا ایڈلر[3] اور گیری ولز[4] شامل ہیں۔اس عہد کے برعکس،جس کے متعلق ایڈ منڈ ولسن نے اپنے تاثرات رقم کیے تھے،1967ء کے بعد مقبوضہ علاقوں یا وہاں کے عرب باشندوں کو نظر انداز کرنا یا ان سے پہلوتہی کرنا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ اس زمانے میں اسرائیل کے دورے کے متعلق جتنی تحریریں بھی منظرِ عام پر آئیں،ان میں سے ہر ایک میں عربوں کے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور موجود ہے۔تاہم ہر تحریر میں عربوں سے یا تو کسی عرب امور کے اسرائیلی ماہر کے ذریعے

---

① بیلو(Saul Bellow):1915ء میں کینیڈا میں پیدا ہوا۔امریکی شہری بنا،ناول نگاری کے ذریعے شہرت حاصل کی۔1976ء میں ادب کا نوبل انعام کا مستحق ٹھہرا۔عقائد کے اعتبار سے یہودی ہے اور اکثر امریکی اسے موجودہ دور کا عظیم ترین ناول نگار مانتے ہیں۔

② سپنڈر(Stephen Spender):1909ء میں پیدا ہوا۔شاعری میں نام کمایا،ابتدا میں بائیں بازو کے خیالات سے متاثر تھا۔اسی لیے1938ء میں سپین کی خانہ جنگی میں فرانکو کی فوجوں کے خلاف لڑا۔بعد میں ان خیالات سے تائب ہوگیا۔ جنگِ عظیم دوم کے بعد لندن کے مشہور جریدے (Encounter) کا کافی عرصہ ایڈیٹر رہا۔تاہم جب اس جریدے پر الزام عائد ہوا کہ یہ سی آئی اے کے سرمائے پر چل رہا ہے تو ادارت سے مستعفی ہوگیا۔پھر لندن یونیورسٹی میں شعری ادب کا پروفیسر مقرر ہوا۔1981ء میں چین کے دورے پر گیا اور اپنے تاثرات اپنی کتاب ''چائینز جرنل'' میں قلمبند کیے،کلیوزم کے خلاف ایک کتاب The god that Faild کے نام سے مرتب کی جس میں مختلف مشاہیر کے مضامین ہیں۔طبع زاد شعری مجموعے چھپوانے کے علاوہ گارشیا لورکا،رلکے،ہٹلر اور بعض دوسرے یورپی شعرا کی نظموں کے تراجم بھی کیے۔ان کی والدہ کا سلسلہ نسب جرمن یہودیوں سے جا ملتا ہے۔

③ تاریخ پیدائش 19 اکتوبر 1938ء،ناول نگار،رپورتاژ نویس اور صحافی،1967ء کی جنگ کے دوران میں ''نیویارکر'' کی نمائندہ تھی۔

④ تاریخ پیدائش 22 مئی 1934ء،امریکا کی مختلف یونیورسٹیوں میں تدریس کے فرائض دیتا رہا ہے۔آج کل بھی پڑھاتا ہے۔صدر کینیڈی کے متعلق اس کی تصانیف کا بڑا شہرہ ہے۔

ذریعے جو عام طور پر چھپتا ہوا اور زمانہ ساز نو آبادیاتی افسر ہوتا ہے یا کبھی کبھار کسی علمی ادارے سے منسلک کسی شخصیت کے، جس کا پس منظر فوجی سراغ رسانی ہوتا ہے، نپٹا گیا ہے۔ اس معاملے میں سال بیلو اور سٹیفن سپنڈر دونوں کا رویہ بالکل ایک جیسا ہے، مو برابر فرق نہیں۔ ① دونوں کی عرب امور کے ماہرین کے ساتھ گفتگو ہوئی۔ دونوں نے اپنی گفتگو میں یہ جتایا کہ وہ لبرل نقطۂ نظر کے قائل ہیں۔ اعلیٰ انسانی قدروں پر یقین رکھتے ہیں اور دونوں نے اپنی اس تشویش کا اظہار کیا کہ اسرائیل نے (عربوں کے علاقوں پر) جو فوجی قبضہ جما رکھا ہے، کیا اس سے اسرائیل کی جمہوریت پر تو کوئی حرف نہیں آتا؟ اس جمہوریت کی کوئی ''ممکنہ'' خلاف ورزی تو نہیں ہوتی؟ ان (نام نہاد) ماہرین نے جو عرب ''حقیقت'' ان کے سامنے پیش کرنے پر مامور تھے، ان کی تشویش دور کر دی اور انھیں یقین دلایا کہ اسرائیل بھی انسان دوستی کی قدروں پر عمل پیرا ہے اور وہاں جمہوریت پر صحیح معنوں میں عمل ہو رہا ہے۔ اس قسم کے (لایعنی) جوابات سے مغربی دانشور اتنا متاثر ہوتے ہیں کہ مقبوضہ علاقوں کے عرب فلسطینیوں کے متعلق اسرائیلی انھیں جو کچھ بتاتے ہیں کہ یہ (عرب فلسطینی) کیا ہیں، کیا چاہتے ہیں اور کیا محسوس کرتے ہیں، وہ اسے صحیح تسلیم کر لیتے ہیں اور یہ مان لیتے ہیں کہ عرب فلسطینی دراصل وہی کچھ ہیں جو کچھ اسرائیلیوں نے انھیں ان کے متعلق بتایا ہے۔ یہ تو بالکل ایسے ہی ہے کہ (جنوبی افریقہ کی حکومت) ''سیاہ فاموں کے امور'' کے کسی سفید فام ''ماہر'' کے ذمے یہ فرض لگا دے کہ دورے پر آئے ہوئے کسی مغربی دانشور کو یہ سمجھائے کہ جنوبی افریقہ کی سیاہ فام اکثریت در حقیقت کیا ہے، وہ در حقیقت چاہتی کیا ہے اور در حقیقت محسوس کیا کرتی ہے۔ اگر کوئی ایسا موقع آئے تو سفید فام ''ماہر'' سیاہ فاموں کے متعلق جو کچھ کہے گا، اس کے متعلق یہی سمجھا جائے گا کہ وہ غلط بیانی سے کام لے رہا ہے اور یوں اس کی باتوں کو ناقابلِ یقین سمجھ کر مسترد کر دیا جائے گا۔ تاہم عربوں کے متعلق اسرائیلی جو کچھ کہتے ہیں، اسے بالکل صحیح سمجھ لیا جاتا ہے۔ بیلو کی کتاب ''ٹو یروشلم اینڈ بیک'' کو جو پذیرائی حاصل ہوئی ہے اس کی وجہ یہی رویہ ہے۔

یہ بات نہیں کہ اسرائیل کے اندر حقیقتاً جو کچھ ہو رہا ہے، اس کے متعلق کوئی شہادت یا ثبوت نہیں ملتا۔ اسرائیلی امریکا اکثر آتے جاتے رہتے ہیں، ان میں سے بہت سے لوگوں نے اپنے یہاں قیام کے دوران

---

① سال بیلو To Jerusalem and Back ناشر: وائی کنگ پریس نیویارک، 1976ء، سٹیفن سپنڈر Among the Israelis سپنڈر کا یہ مضمون نیویارک ریویو آف بکس نے چھ مارچ 1975ء کو شائع کیا۔ تاہم سال بیلو کی کتاب پر نوم چومسکی نے لندن کے جریدے ''غزال ریویو'' شمارہ نمبر 2 میں What Every American Should Behave کے عنوان سے جو تبصرہ کیا تھا، وہ پڑھنے کی چیز ہے۔ (مصنف)

میں یہ بات بار بار کہی ہے کہ ایک اسرائیلی اور ایک صیہونیت کے امریکی حامی میں ایک بیّن فرق یہ ہے کہ اوّل الذکر کے مقابلے میں موخر الذکر اسرائیل اور اس کے عرب ''مسئلے'' کے متعلق کہیں کم صاف گو اور بے ریا ہے۔ ① اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکا (یورپ کے معاملے میں یہ بات اب اتنی درست نہیں ہے) میں اسرائیلی اور صیہونیت کے مقاصد و منازل کو عملاً تقدیس کا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔ اسرائیل کے قیام کا ذکر بالکل اسی انداز سے سرگوشیوں میں کیا جاتا ہے جس طرح مارشل پلان ② کا ذکر ہوتا تھا اور جو بلند مقام مارشل پلان کو دیا جاتا تھا، وہی قیامِ اسرائیل کو دیا جاتا ہے۔ ذرائع ابلاغ سے جو لوگ وابستہ ہیں، ان کا تو ذکر ہی کیا، وہ لوگ بھی جو دانشور کہلاتے ہیں یا اعلیٰ تعلیمی اداروں سے تعلق رکھتے ہیں، گروہ در گروہ اسرائیل کے ساتھ اپنے دیوانہ وار عشق کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ اسرائیل اور اس کے مقاصد کے ساتھ ان کا رویہ ایسا ہوتا ہے جیسے اسرائیل کوئی مقدس گائے ہے جس کے حضور حاضری میں پوری رسوم کی بجا آوری ان کا مذہبی فریضہ ہے۔ ذرا سی کوتاہی آبگینوں کو ٹھیس پہنچانے کا سبب بن سکتی ہے۔ کسی بھی دوسرے مقصد کو ان کے نزدیک اتنا تقدّس حاصل نہیں جتنا اسرائیل کو حاصل ہے۔ 1974ء اور 1975ء میں اقوامِ متحدہ اور اس کی ایک ذیلی تنظیم یونیسکو (اقوامِ متحدہ کا تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی امور کا ادارہ) نے صیہونیت کو ذرا سا لتاڑا تھا کہ یہ نسل پرستی کی ایک صورت ہے، بس پھر کیا تھا کہ مغرب میں ایک بھونچال آ گیا۔ اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ۔ ہر طرف ادیبوں، فن کاروں، سیاستدانوں، صحافیوں اور امورِ عامہ میں دلچسپی لینے والے اصحاب نے آسمان سر پر اٹھا لیا، ہاہا کار مچ گئی، دستخط شدہ بیانات جاری ہونے لگے۔ اقوامِ متحدہ اور یونیسکو کی مذمت ہونے لگی اور دعویٰ کیا گیا کہ اسرائیل کو ''یونیسکو'' سے ''خارج'' کیا جا رہا ہے۔ صرف کبھی کبھار کسی شخص...... جہاں تک میں معلوم کر سکا ہوں، نوم چومسکی واحد شخص تھا، جس نے اس بارے میں آواز بلند کی...... نے یہ بتانے کی ضرورت محسوس کی کہ صیہونیوں اور اسرائیلیوں نے فلسطینی عربوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے اور اب تک وہ ان کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں

---

① ملاحظہ فرمائیں آئی ایف سٹون کا مضمون Confessions of a Jewish Dissident اس کا یہ مضمون اس کی اپنی کتاب Underground to Palestine, and Reflections Thirty Years Later میں تتمے کے طور پر شامل ہے۔ یہ کتاب Pantheon Books نے 1978ء میں نیویارک سے شائع کی تھی۔

② دوسری جنگِ عظیم میں مغربی یورپ کے ممالک اقتصادی طور پر بالکل تباہ برباد ہو چکے تھے۔ ان کو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے میں مدد دینے کے لیے 1948ء میں امریکا کے وزیر خارجہ جارج مارشل نے ایک منصوبہ بنایا جو اسی کے نام پر منسوب ہوا۔ یہ امداد صحیح معنوں میں امداد تھی اور اس نے یورپی ممالک کی کایا پلٹ دی۔ آج کل امریکا ترقی پذیر ممالک کو امداد کے نام پر جو قرضے دیتا ہے، ان کا مقصد ان ممالک کو اپنے پاؤں پر کھڑے کرنا نہیں بلکہ اقتصادی طور پر انھیں مفلوج بنانا ہے۔

اور یہ کہ اسرائیل میں ''غیر یہودیوں'' کے خلاف جو امتیازی کارروائیاں جاری ہیں، دُنیا کے دوسرے علاقوں میں نسلی بنیادوں پر ظلم وستم کی جو کارروائیاں ہو رہی ہیں، انھیں کسی طرح بھی ان سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ نوعیت کے اعتبار سے دونوں میں ذرا بھی فرق نہیں۔ اس کی بجائے ہمیں نظر کیا آتا ہے کہ دُنیا کے دوسرے مقامات پر کمینگی اور بدمعاشی کے جو مظاہرے ہوتے ہیں ڈینیل سڑک مونی ہان ① ان کی تو فوراً مذمت کر دیتا ہے۔ لیکن اسرائیل اور صیہونیت کی تعریفوں کے پل باندھ دیتا ہے۔

جس چیز کو عام طور پر ''کاز''② کہا جاتا ہے یا کم از کم ایک ایسا مسئلہ، جو اس حد تک صحیح ہو کہ وہ ''کاز'' بن سکے، تو جہاں تک اس (یعنی کاز) کی عمرانیات کا تعلق ہے، وہ آج کل اسرائیل کے معاملے میں بالکل ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔ یہ بات کم از کم اسرائیل کے کھلے عام ذکراذکار کے ضمن میں بالکل درست ہے۔ اگر مسئلہ سوویت یونین، چلی یا افریقہ میں انسانی حقوق کی کاز کی حمایت کا ہو، تو کوئی لبرل مہر بلب نہیں رہے گا۔ لیکن اگر مسئلے کا تعلق اسرائیل میں پیش آنے والے اسی قسم کے معاملات سے ہو، تو تقریباً سکوتِ مرگ طاری ہو جائے گا اور کوئی مائی کا لال اپنی زبان کو ذرا سی جنبش دینے کی جرأت نہیں کرے گا۔ مقبوضہ علاقوں میں اسرائیل کی فوجی حکومت جو گل کھلا رہی ہے، اسی فوجی حکومت کے ناتے وہاں جو جو خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں اور انسانی حقوق کی جس طرح مٹی پلید ہو رہی ہے، اگر کوئی شخص یا ادارہ انھیں ''کاز'' میں تبدیل کرنے کی کوشش کرے، تو ایسی ہر کوشش کا نہایت ڈھٹائی کے ساتھ ڈٹ کر مقابلہ کیا جاتا ہے۔ یہ بات ان کیسوں میں خاص طور پر نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے جب اسرائیل کے وہ چند ایک نقاد، جن کی تعداد ایک ہاتھ کی انگلیوں کے برابر بھی نہیں (اپنی معلومات کے ضمن میں) جن ذرائع کا حوالہ دیتے ہیں، وہ (کوئی آزاد و خود مختار ذرائع نہیں ہوتے بلکہ خود) اسرائیلی ذرائع ہی ہوتے ہیں۔ عربوں کے مکانات کا انہدام عربوں کی اپنی زمینوں سے بے دخلی، عرب کارکنوں کے ساتھ بدسلوکی، عرب باشندوں کی ناجائز نظر بندی اور انھیں ایذا پہنچانے کی کارروائیاں،

① امریکی یہودی، دانشور، سفارت کار اور سیاستدان، مونی ہان...... کا رویہ اس کی کتاب A Dangesos ---مطبوعہ لٹل براؤن اینڈ کمپنی بوسٹن (1978ء) میں دیکھا جا سکتا ہے۔

② ''کاز'' (Cause): انگریزی زبان کا ایک ہمہ گیر لفظ ہے۔ اس کا ایک مطلب تو وہ اصول، آدرش یا نصب العین ہے جس کے حصول کے لیے ایک شخص یا ایک گروہ تن من دھن سے کام کرنے پر تیار ہو جائے۔ اس کا دوسرا مطلب کسی شخص یا گروہ کا مفاد یا مفادات ہیں جن کے حصول کی خاطر وہ جدوجہد میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ مشہور امریکی رہنما ٹامس پین (--------) کا یہ جملہ اس کی بہترین مثال ہے۔

The Cause America is in great measure the Cause of all mankind

یہ تمام امور ایسے ہیں جن کے متعلق انسانی حقوق کی اسرائیلی لیگ ① کئی برسوں سے اطلاعات فراہم کر رہی ہے، یہ کہ لیگ کی فراہم کردہ اطلاعات درست ہیں، اسرائیلی اخبارات اور جرائد میں شائع شدہ مضامین اور مواد کے تراجم پر مبنی دستاویزی ثبوت مہیا کیے جاتے ہیں۔ تاہم ان میں سے ایک چیز بھی ایسی نہیں جس کا ذکر امریکا کے ذرائع ابلاغ میں بھی کیا جاتا ہو۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ یہ مواد (امریکی) ایڈیٹروں، کالم نگاروں، ٹیلی ویژن کے تبصرہ نگاروں، معروف اور (عام طور پر) صاف گو لبرل شخصیات تک پہنچایا نہیں جاتا۔ (نہیں، انھیں پہنچایا جاتا ہے لیکن مجال ہے کہ کوئی ایک شخص بھی اس کا ذرا سا بھی ذکر کر دے۔) اقوامِ متحدہ کی رپورٹوں، اقوام متحدہ کے زیرِ اہتمام سرحدوں اور عارضی صلح سے متعلق امور کی نگرانی کرنے والے حکام کی تحریر کردہ رودادوں، ایمنسٹی انٹرنیشنل ② اور ریڈ کراس جیسے بین الاقوامی اداروں کے معلوماتی مراسلوں اور درجنوں عربوں اور عرب امریکیوں کی تحریروں کا تو ذکر ہی کیا، خود اسرائیل کی بلا مبالغہ دسیوں خبر رساں ایجنسیاں، لبرل خبرنامے (نیوز لیٹرز) اور لبرل جرائد نہایت باقاعدگی کے ساتھ اس (ناروا) سلوک کا تذکرہ کرتے ہیں جو جنگ 1967ء سے ماقبل اسرائیل اور اس جنگ کے بعد مقبوضہ علاقوں کے عرب باشندوں کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔ لیکن امریکا میں ان تمام معلومات کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور ان میں سے ایک چیز بھی ایسی نہیں جسے کبھی شائع کیا جاتا ہو یا جس کی کبھی وسیع پیمانے پر تشہیر کی جاتی ہو۔ اس فروگزاشت پر پردہ ڈالنے کے جو عمداً حرکات کی جاتی ہیں، ان کی تازہ ترین اور کئی لحاظ سے نہایت بھونڈی اور احمقانہ مثال اس حشر سے ملتی ہے جو اس رپورٹ کے ساتھ کیا گیا جو لندن کے مؤقر اخبار ''سنڈے ٹائمز'' نے 19 جون 1977ء کو ''اسرائیلی مظالم اور ایذا رسانیوں کا آنکھوں دیکھا حال'' کی عنوان سے شائع کی تھی۔ ''ٹائمز'' کے رپورٹروں نے تحقیقاتی تکنیک کے تمام ممکنہ ذرائع استعمال کرنے کے بعد ایک سیر حاصل رپورٹ تحریر کی اور اس میں یہ انکشاف کیا کہ اسرائیل میں باقاعدہ اور باضابطہ عربوں کو ایذائیں پہنچائی جاتی ہیں اور یہ سب کچھ سرکاری منشا اور منظوری سے ہوتا ہے۔ یہ کہ سیکڑوں عربوں کو (مقدمہ چلائے بغیر) نظر بند کر دیا جاتا ہے اور جیلوں میں انھیں طرح طرح کی ایذائیں پہنچائی جاتی ہیں۔ یہ کہ مملکت اس قسم کی تمام کارروائیوں سے چشم پوشی کرتی ہے

---

① Israeli League of Human Rights

② Amnesty international (عفو عامہ کی بین الاقوامی تنظیم) اس تنظیم کا صدر دفتر لندن میں ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ یہ آزادی رائے اور آزادی اظہار کی حامی ہے۔ چنانچہ یہ تنظیم سیاسی نظریات، اور بین الاقوامی سرحدوں سے قطع نظر دنیا بھر کے سیاسی قیدیوں کی رہائی کی وکالت کرتی ہے۔ یہ انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے متعلق ہر سال ایک رپورٹ بھی شائع کرتی ہے۔

کیونکہ ان کے ذریعے ''مقامی'' باشندوں کو ڈرایا دھمکایا، ان پر قابو پایا اور انھیں دہشت زدہ کیا جا سکتا ہے اور یہ کہ اس سلسلے میں جو شہادتیں اور ثبوت سامنے آئے ہیں وہ مکمل طور پر قابلِ یقین اور قابلِ اعتبار ہیں۔ ''بوسٹن گلوب'' کے علاوہ امریکا کے کسی بھی بڑے اور بااثر اخبار (یا جریدے، ہفتہ وار خبرنامے یا ٹیلیویژن کے خبری پروگرام) نے اس رپورٹ کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا اور اسے بالکل گول کر دیا۔ اس رپورٹ کے اشاعت پذیر ہونے کے بعد ایمنسٹی انٹرنیشنل اور ریڈ کراس نے اپنے طور پر تحقیقات کا آغاز کیا اور اپنے اخذ کردہ نتائج رپورٹوں کی صورت میں شائع کیے لیکن آفرین ہے امریکا کے ذرائع ابلاغ پر، ان کے کانوں پر ذرا بھی جوں نہ رینگی اور وہ ان رپورٹوں کو بھی شیرِ مادر سمجھ کر ہضم کر گئے۔ امریکا کے ذرائع ابلاغ نے اطلاعات کے محاذ پر اپنے فرائض کی ادائیگی میں جس مجرمانہ اور انتہائی ماوراغفلت کا ثبوت دیا، نکولس وون ہوفمین [1] نے اس کا بھانڈا بیچ چوراہے میں پھوڑ دیا۔ وہ رقم طراز ہے کہ

> ''اسرائیلی حکام کو کم از کم اتنا تو کرنا چاہیے تھا کہ ان کے خلاف جو مواد اکٹھا کیا گیا ہے (اسرائیل ایذار سانیوں کے متعلق ''سنڈے ٹائمز'' کی رپورٹ) اس کا وہ مطالعہ کرتے اور اس بیان کی نسبت کوئی زیادہ قابلِ قدر چیز پیش کرتے جو لندن میں ان کے سفارت خانے نے جاری کیا ہے اور جس میں محض یہ کہنے پر اکتفا کیا گیا ہے کہ گزشتہ چند سالوں کے دوران میں عرب اپنے پراپیگنڈے کے وسائل کے ذریعے اس نوعیت کے الزامات کی تکرار کرتے چلے آ رہے ہیں حالانکہ مفصل اور دستاویزی شہادتوں کے بعد یہ (الزامات) بالکل بے بنیاد ثابت ہوئے ہیں۔''
>
> اگر اسرائیلی محض دشنام طرازی کرتے رہے اور اپنی برات کے سلسلے میں اپنی ہی تحقیقات پر انحصار کرتے رہے تو اس سے کوئی بات نہیں بنے گی...... گیس کو ایذا رسانی کے آلے کے طور پر استعمال کرنے میں جو مضحکہ ستم ظریفی پائی جاتی ہے۔ [2] وہ ان اسرائیلی حکام کے لیے بھی جنھیں یہ یقین ہے کہ انسانوں کے ساتھ اس قسم کا سلوک کرنے سے جمہوریت کی کاز کو فروغ

---

[1] ہوفمین Nicholas von Hoffman

[2] صیہونیوں نے دُنیا بھر میں کتابوں، جریدوں، فلموں اور ٹیلی ویژن کے پروگراموں کے ذریعے یہ زبردست پراپیگنڈہ کر رکھا ہے کہ جنگِ عظیم کے دوران میں ہٹلر اور اس کے حواریوں نے لاکھوں یہودیوں کو گیس چیمبرز میں محبوس کر کے ہلاک کر دیا تھا۔ یہ اتنا بڑا جھوٹ ہے جس کی مثال پوری انسانی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ اگر ان کے پراپیگنڈے کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو یورپ کی آدھی آبادی یہودی نکلے گی۔ ان کے اس جھوٹ کی کچھ قلعی حکیم محمد سعید نے اپنی کتاب ''جرمنی نامہ'' میں کھولی ہے۔ یہاں ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ جس بات پر وہ نازیوں کی مذمت کرتے نہیں تھکتے، خود وہی وہ عربوں کے ساتھ کر رہے ہیں۔

حاصل ہوتا ہے، ناقابلِ برداشت ہونا چاہیے تھی۔

اکثر امریکی اس (سنڈے ٹائمز کی رپورٹ) بارے میں کچھ بھی جان نہیں پائیں گے۔ اب تک صرف ایک اخبار ''بوسٹن گلوب'' نے اس رپورٹ کو شائع کرنا مناسب خیال کیا ہے۔ دوسروں نے اس معاملے میں جس تغافل اور بے نیازی کا مظاہرہ کیا ہے، اس کی وجہ یہ نہیں کہ جن صحافیوں نے یہ رپورٹ مرتب کی ہے، ان کی دیانتداری اور اہلیت مشکوک ہے۔ (واقعہ یہ ہے کہ) جن صحافیوں کی ٹیم نے حقائق سے پردہ اٹھایا ہے، دُنیا بھر کی صحافی برادری ان کی معترف ہے اور ان کی عزت کرتی ہے۔

اس موقع پر دلچسپی کے جس فقدان کا مظاہرہ کیا گیا، اس کی وضاحت چھیاسی الفاظ پر مشتمل اس مضمون سے ہوجاتی ہے جو ''نیویارک ٹائمز'' کے صفحہ نمبر 13 پر شائع ہوا ہے اور جس میں ایذا رسانی سے متعلق ان تحقیقات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک حد تک یہ بات درست ہے کہ امریکا میں صرف اسی خبر کو خبر تسلیم کیا جاتا ہے جسے ''نیویارک ٹائمز'' خبر تسلیم کرتا ہے لیکن اگر معاملہ غیر ملکی خبروں کا ہو تو یہ بات اور بھی صحیح ثابت ہوجاتی ہے کہ خبر وہی ہے جسے نیویارک ٹائمز خبر قرار دے......

چنانچہ آپ امریکا بھر میں گھوم جائیں آپ کو ایسے اخبارات، جرائد اور نشریاتی اداروں کے ایڈیٹروں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ملے گی، جو خبروں کے معاملے میں آزادانہ فیصلے کرنے کی صلاحیتوں سے مالامال ہوں۔ وہ اتنے کردار اور قدوقامت کے مالک ہیں ہی نہیں کہ آزادانہ اپنی کوئی رائے قائم کرسکیں۔ وہ اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ ملک کا مؤقر ترین روزنامہ ان کی طرف سے فیصلے کرتا رہے کیونکہ انھیں اسی میں اپنی بھلائی نظر آتی ہے۔

اگر معاملہ اسرائیل جیسے مسئلے کا ہو، تو اس قسم کا رویہ اختیار کرنا اور بھی آسان نظر آتا ہے کیونکہ (انھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ) اگر اس معاملے میں انھوں نے کوئی مخالفانہ پبلسٹی کرنے کی جرأت کی، تو (بے چارے) ایڈیٹر کو ملک کی منظم ترین لابی [1] کی انتہائی پُرشور دشنام طرازیوں

---

[1] امریکا میں قانون سازی کا اختیار سینٹ اور ایوانِ نمائندگان (جو مجموعی طور پر کانگریس کہلاتے ہیں) کے ارکان کو حاصل ہے۔ اپنے مطلب کی قانون سازی کرانے کے لیے مختلف گروہ مختلف طریقوں سے ان ارکان پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان گروپوں کو ''لابی'' کہا جاتا ہے۔ ان گروپوں کے ارکان ذاتی مراسم، رشوت، دھونس، دھمکی، پراپیگنڈے، وعدے وعید، غرضیکہ اپنی مطلب براری کے لیے ہر قسم کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ ان تمام گروہوں میں ''یہودی لابی'' سب سے طاقتور ہے۔ یہودی اپنی دولت کے بل بوتے پر نہ صرف ارکانِ کانگریس کے انتخاب پر اثر انداز ہوتے ہیں......

کا سامنا کرنا پڑے گا۔ (چنانچہ اسے خیریت اسی میں نظر آتی ہے کہ وہ چپ رہے۔) دوسرے ممالک میں ایسا نہیں ہوتا۔ وہاں کے ذرائع ابلاغ جمہوری عوام کے سامنے ایسی رپورٹیں پیش کرتے ہیں جو کہیں کم تعصب اور تنگ نظری پر مبنی ہوتی ہیں۔ ①

جس قسم کی روداد ہوفمین نے تحریر کی ہے، اس پر مبنی رپورٹ یا کالم کبھی کبھار شائع بھی ہوجائے تو بھی اس کا کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کی رپورٹیں اتنی خال خال شائع ہوتی ہیں...... یہ خال خال اس لیے شائع ہوتی ہیں کہ انھیں شائع کرنے کی کوئی روایت ہی نہیں بن سکی...... کہ ان کے مؤثر ہونے کا کوئی احتمال ہی نہیں رہتا۔ اسرائیل کے متعلق امریکا کے لبرل حلقوں میں جو اتفاقِ رائے پایا جاتا ہے اور ان میں یہ جو روایت راسخ ہوگئی ہے کہ وہ اسرائیل کے خلاف نہ کچھ کہیں گے اور نہ کچھ سنیں گے، پھر اسرائیلیوں اور لبرل حلقوں کے مابین جس مربوط انداز سے آپس میں تبادلۂ خیالات ہوتا رہتا ہے، تو یہ انھی چیزوں کا اعجاز ہے کہ ہر اس شہادت یا ثبوت کو جو (اسرائیل کے) ذرا بھی ناموافق ہو، فوراً تلف کردیا جاتا ہے یا غیر متعلق قرار دے کر نظروں سے اوجھل کردیا جاتا ہے۔ مزید برآں، ہر وہ چیز یا امر جس کے متعلق کسی شخص کے ذہن میں یہ توقع پیدا ہوجائے کہ یہ اسرائیل کے لیے تباہ کن چیلنج ثابت ہوگی، اس کا اس طرح حلیہ بگاڑ دیا جاتا ہے کہ وہی چیز جس سے پہلے نقصان پہنچنے کا احتمال تھا، اب حمایت اور اعانت کا وسیلہ بن جاتی ہے۔ اس سلسلے کی تازہ ترین مثال مناچم بیگن کا انتخاب لیں۔ سالہا سال سے ہر شخص کو یہ معلوم ہے کہ بیگن ایک دہشت گرد ہے اور خود اس نے بھی اس حقیقت پر کبھی پردہ ڈالنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس کی کتاب ''بغاوت'' (The Revolt) امریکا کی ہر یونیورسٹی اور درمیانے درجے کی پبلک لائبریری میں موجود ہے اور اسے اس سیکشن میں رکھا جاتا ہے جس کے متعلق یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہاں مشرقِ وسطیٰ کے متعلق معیاری کتب ذخیرہ کی گئی ہیں۔ اپنی اس کتاب میں بیگن اپنی دہشت گردی...... جس میں معصوم اور بے قصور خواتین اور بچوں کا قتلِ عام بھی شامل ہے...... کا ذکر بتکرار کرتا ہے اور اس انداز سے کرتا ہے جیسے اس نے کوئی نہایت زبردست نیکی کا کام (حقیقتاً دل و دماغ کو سن کردینے والا) سرانجام دیا ہو۔ وہ کھلے بندوں اقرار کرتا ہے کہ اپریل 1948ء میں فلسطین کے عرب گاؤں دیر یسین ② میں اڑھائی سو عورتوں اور بچوں کا قتلِ عام ہوا تھا، اس کا

...... بلکہ ان کی مرضی کے خلاف کوئی قانون سازی بھی نہیں ہوسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ امریکا میں اسرائیل کے خلاف کوئی بات کرنا تقریباً ناممکن ہے۔

① نکولس وون ہوفمین: روزنامہ ''پائلٹ'' مؤرخہ: 6 جولائی 1977ء

② دیر یسین فلسطین میں عربوں کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ 1948ء میں جب یہودیوں نے یکطرفہ اپنی آزادی اور ......

ذمے دار وہ خود ہے لیکن مئی 1977ء کے عام انتخابات میں اس کی پارٹی کو جب اکثریت حاصل ہوگئی اور وہ اسرائیل کا وزیر اعظم منتخب ہوگیا تو چند ہفتوں کے اندر اندر ہی یہ انقلاب رونما ہوا کہ نہ صرف اس کی دہشت گردی کو فراموش کردیا گیا بلکہ (امریکی) اخبارات اسے اس طور ایک ''مدبر'' سیاستدان کی حیثیت سے پیش کرنے لگے گویا وہ اپنے زمانے کا جنرل ڈی گال ① تھا۔ ہم یہاں یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ اس (بیگن) نے دہشت گردی کی جو کارروائیاں کی تھیں، ان کے ثبوت اور شہادتیں دبا دی گئی تھیں۔ یہ ثبوت اور شہادتیں اپنی جگہ موجود تھیں، ہر وہ شخص جو اسرائیل کے متعلق کچھ کہنا یا لکھنا چاہتا تھا، اس کے سامنے بھی ہمیشہ موجود رہی تھیں اور باقاعدگی کے ساتھ ان کا حوالہ دیا جاتا رہا ہے (اور ایسا اس لیے کیا جاتا ہے کہ بیگن اور اسرائیل کی بعض دوسری اہم شخصیات کے مابین، جیسی کہ مثال کے طور پر ڈیوڈ بن گوریاں اور گولڈا میئر ہیں، ایک خطِ امتیاز کھینچا جاسکے۔ یہ مؤخر الذکر شخصیات ایسی ہیں جن کے متعلق یہ ہمیشہ فرض کیا جاتا رہا ہے کہ وہ صحیح معنوں میں ''مدبر'' سیاست دان تھے) لیکن مغرب کے دانشوروں میں اس بات پر جو زبردست اتفاقِ رائے پایا جاتا ہے کہ اسرائیل کے رہنما جمہوریت پسند ہیں، اپنی معاشرت، ثقافت، چال ڈھال، اور فکر افکار میں بالکل مغربی باشندوں جیسے ہیں اور ان سے اس قسم کی برائیوں کا ارتکاب ہو ہی نہیں سکتا جو عام طور پر عربوں اور نازیوں کے ساتھ منسوب کر دی جاتی ہیں (مغرب والوں نے اسرائیل کے متعلق یہ مفروضہ قائم کرلیا ہے کہ اس کے قیام سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ یہودی ان خرابیوں اور برائیوں کی نفی کرتے ہیں جو نازیوں کا طرۂ امتیاز تھیں) وہ اتنا قوی اور توانا ہے کہ بیگن جیسا لقمہ بھی، جسے عام حالات میں حلق سے نیچے اتارنے اور ہضم کرنے میں شدید دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا، جھاڑ پونچھ کر نئے قالب میں ڈھال دیا گیا ہے اور اسے یوں پیش کیا جارہا ہے جیسے ایک اور اسرائیلی مدبر رہنما منصۂ شہود پر نمودار ہوا ہو۔ (اس کا ایک واضح ثبوت یہ ہے کہ اسے نہ صرف امریکا کی نارتھ ویسٹرن یونیورسٹی نے 1978ء میں ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری سے سرفراز فرمایا بلکہ اس پر طرہ یہ کہ بعد میں سویڈن نے بھی اسے امن کی نوبیل انعام کا جزوی طور پر مستحق قرار دیا۔) سچی بات تو یہ ہے کہ ان لبرل

......اسرائیل کے قیام کا اعلان کیا تو اس کے رہنماؤں نے یہ فیصلہ کیا کہ اسرائیل سے تمام عرب باشندوں کو زبردستی نکال دیا جائے گا۔ اس کا ایک طریقہ یہ سوچا گیا کہ عربوں کے خلاف اس قدر دہشت گردی کی جائے کہ وہ خود ہی اپنے گھروں سے بھاگ جائیں۔ چنانچہ ایک روز جب دیر یسین کے بالغ مرد کھیتوں پر کام کرنے گئے ہوئے تھے، بیگن اور اس کے دہشت گرد ساتھی گاؤں میں آدھمکے۔ انھوں نے بچوں اور عورتوں کو ایک جگہ اکٹھا کیا اور سب کو گولیوں سے بھون ڈالا۔ یہ اتنی خوفناک کارروائی تھی کہ بے شمار عرب باشندے خود ہی خوف اور دہشت کے عالم میں ملک سے راہِ فرار اختیار کر گئے۔

① فرانس کے سابق صدر وہ موجودہ زمانے کے عظیم ترین فرانسیسی مدبر سیاست دان تھے۔

دانش وروں کے پاس، جنھیں ہر جھاڑی کے پیچھے ظلم وستم اور ایذا رسانی کے مناظر نظر آجاتے ہیں اور جنھیں دُنیا کے ہر خطے میں کوئی نہ کوئی ''کاز'' مل جاتا ہے، اسرائیل کے خلاف کہنے کو کچھ نہیں خواہ وہ کتنے ہی لوگوں کو ایذائیں پہنچاتا رہے اور دوسروں کے علاقوں کو اپنی مملکت میں ضم کرنے کی کتنی ہی بلا روک کارروائیاں کرتا رہے۔

یہی بات ان فلسطینیوں پر، جنھوں نے دوسرے ممالک میں پناہ حاصل کر رکھی ہے، صادق آتی ہے۔ اس بارے میں کچھ اختلافِ رائے پایا جاتا ہے کہ 1948ء کے دوران میں کتنے فلسطینیوں کو مجبوراً اپنی زمینوں اور اپنے وطن کو چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کرنا پڑی، مختلف اعداد وشمار کے مطابق یہ تعداد پانچ اور آٹھ لاکھ کے مابین ہے۔ (اسرائیلی ذرائع بھی تعداد کے بارے میں تو اختلاف کرتے ہیں لیکن خود خروج سے انھیں بھی انکار نہیں) تاہم اس بارے میں مکمل اتفاقِ رائے پایا جاتا ہے کہ پناہ گزیں موجود ہیں۔ یہ حقیقت کہ انھیں اپنے وطن سے نکلے تقریباً تیس سال گزر چکے ہیں اور یہ کہ انھیں خود ارادیت کا حق استعمال کرنے کا ابھی تک کوئی موقع نہیں دیا گیا، ثابت کرتی ہے کہ ان کے ساتھ کچھ نہ کچھ ناانصافی ضرور ہوئی ہے لیکن اگر کوئی شخص یہ سوال پوچھ بیٹھے کہ انھیں پناہ گزیں بنانے کا ذمہ دار کون ہے تو اسرائیل کو نہ صرف بری الذمہ اور بے قصور ٹھہرایا جاتا ہے [1] بلکہ امریکا کی طرح اسرائیل کی بھی تعریفوں کے پل باندھ دیے جاتے ہیں کہ یہ بڑا انسان دوست ملک ہے۔ ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ تو آبادی کا ''تبادلہ'' تھا۔ عرب ممالک سے جو یہودی ترکِ وطن کر کے اسرائیل وارد ہوئے، ان کے بدلے کچھ فلسطینی عرب ممالک میں چلے گئے۔ اللہ اللہ خیر سلا اور یہ فلسطینی بھی تو اپنی مرضی سے ہی گئے تھے حالانکہ ''ہگانہ'' [2] ان پر زور دیتی رہی کہ مت جاؤ، اپنے آبائی گھروں ہی میں مقیم رہو۔ یہ کہ وہ لوگ جو وہیں (اسرائیل میں) مقیم رہے، ان کی حالت اپنے ان بھائیوں کی نسبت کہیں بہتر ہے جو پڑوسی عرب ممالک میں مقیم ہیں۔ یہ کہ یہودیوں کے لیے ملجا وماوا صرف ایک ہی ہے جبکہ عربوں کے لیے بیس سے اوپر ممالک کے در کھلے ہیں، پھر یہ عرب یہودیوں کا رویہ کیوں اختیار نہیں کرتے اور اپنے پناہ گزینوں کو کیوں قبول نہیں کرتے؟ یہ کہ 1967ء کی جنگ میں اسرائیل نے مزید فلسطینی علاقوں پر جو قبضہ کیا، وہ اس

---

① مثلاً امریکا کے سابق صدر جمی کارٹر نے یہی رویہ اختیار کیا۔ ویت نام میں امریکی مہم جوئی کے نتیجے کے طور پر جو تباہی و بربادی ہوئی، صدر کارٹر نے بعد میں امریکا کو اس سے بھی بری الذمہ قرار دے دیا۔

② یہودیوں کی ایک دہشت گرد تنظیم۔ 1921ء میں قائم ہوئی۔ صیہونیت کا یہ عسکری باز و تھی۔ پینتیس ہزار مرد اور عورتیں اس کے فعال ارکان تھے اور تقریباً اتنے ہی محفوظ دستوں میں شامل تھے۔ 1948ء میں جب اسرائیل کا قیام عمل میں آیا تو اسی کے دستوں نے عرب فوجوں کا مقابلہ کیا تھا۔ بعد میں اسے اسرائیل کی باقاعدہ فوج میں ضم کر لیا گیا۔

بات کا ثبوت ہے کہ عربوں اور یہودیوں کے مابین ایک ''دوقومی'' وجود ظہور پذیر ہوا ہے۔ یہ کہ مغربی کنارے پر اسرائیل کا جو قبضہ ہوا ہے وہ اصل میں ان پیش گوئیوں کی تکمیل ہے جن کا ذکر انجیل میں آیا ہے۔ یہ کہ ایک فلسطین تو اب بھی موجود ہے (لیکن وہ اسرائیل میں نہیں بلکہ) شرقِ اردن میں ہے۔ یہ کہ دوسرے ممالک کے تارکینِ وطن (مثلاً ہندوستان کے مسلمان، نازی جرمنی سے راہِ فرار اختیار کرنے والے افراد) دیگر ممالک میں آباد ہو گئے ہیں، پھر فلسطینیوں کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی اور وہ کیوں دوسرے ممالک میں آباد نہیں ہو جاتے۔ یہ کہ یہ فلسطینی تو محض سیاسی بساط کے مہرے ہیں جنھیں عرب ممالک کی حکومتیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتی رہتی ہیں، چنانچہ اگر ایک مرتبہ یہ بات ان حکومتوں کے ذہن نشین کر دی جائے کہ وہ اپنے ان ہتھکنڈوں کو غیر معین مدت کے لیے استعمال نہیں کر سکتیں تو ان کے ہوش ٹھکانے آ جائیں گے اور یہ (فلسطینی) کوئی مسئلہ نہیں رہیں گے۔ تاہم یہ تمام باتیں ایک ہی مسئلے کے ارد گرد گھومتی ہیں جس کی کچھ اس انداز سے کایا پلٹ کی گئی ہے کہ وہ صیہونیوں کے اعلیٰ اخلاقی معیار، شرافت اور نیک چلنی کے ثبوت میں ڈھل گیا ہے۔

④

فلسطینیوں کے حقوق

لیکن مسئلۂ فلسطین کے اکثر دوسرے امور کی طرح یہاں بھی ضرورت اس بات کی ہے کہ مختلف باتوں کے مابین ایک رشتہ قائم کیا جائے اور ہم ان کے متعلق یہ مفروضہ قائم نہ کرلیں کہ یہ مخفی امور ہیں (میں یہاں جن شہادتوں کا حوالہ دوں گا، ان میں سے ایک بھی مخفی یا مبہم نہیں۔ ان میں سے بیشتر دستیاب دستاویزات میں بآسانی مل سکتی ہیں) بلکہ یہ تسلیم کرلیں کہ ان باتوں کو یا تو نظرانداز کردیا گیا ہے یا پھر ان کے وجود کو ماننے سے انکار کردیا گیا ہے۔ وہ مناسب و موزوں سیاق، جس کے اندر پناہ گزینوں کے مسئلے سے نپٹا جاسکتا ہے، ہمیں بآسانی دستیاب ہے۔ اوّل: کیا فلسطینی پناہ گزین وطن واپسی چاہتے ہیں؟ وہ معاوضے کے طلب گار ہیں، یا وہ کسی دوسرے مقام پر آباد ہونا چاہتے ہیں؟ دوم: کیا ان سوالات کے نظری اور عملی دونوں جوابات کے متعلق کوئی بین الاقوامی اتفاقِ رائے یا اجماع موجود ہے؟ سوم: اسرائیل کے پاس وہ کون سی جادو کی چھڑی ہے جس کے ذریعے یورپ اور امریکا سے وارد ہونے والے یہودیوں کو پہلے تو تارکینِ وطن قرار دیا جاتا ہے اور پھر انھیں ملک کا شہری بنا لیا جاتا ہے؟ پھر یہی جادو کی چھڑی عرب فلسطینی پناہ گزینوں کو فائدہ اٹھانے سے کس طرح روکتی ہے؟ بجا کہ ان تمام سوالات کے جوابات اخلاقی نوعیت کے ہیں لیکن اپنی سیاسی حقیقت کے پیشِ نظر یہ ہیں دلچسپ اور اہم۔ دوسرے الفاظ میں یہ سوالات علمی ① نہیں، بلکہ یہ ایسے سوالات ہیں جو براہِ راست

① یہاں مصنف نے انگریزی لفظ اکیڈمک (Academic) استعمال کیا ہے بعض اوقات علما اور فضلا اتنی باریکیوں میں چلے جاتے ہیں اور یوں بال کی کھال اتارنے لگتے ہیں کہ ان کا تعلق عملاً دُنیا اور دُنیا کے امور سے کٹ جاتا ہے۔ چنانچہ وہ امور جو غیر عملی ہوں، انھیں اکیڈمک کہا جاتا ہے۔

کروڑوں انسانوں کی زندگیوں، مملکتوں اور نظمِ عالم سے متعلق ہیں۔ آیئے! ہم ان سوالات کا جذبات سے ماورا ہو کر جائزہ لیں۔ اس بارے میں قطعاً کوئی کلام نہیں کہ 1948ء سے قبل اس خطۂ زمین کے، جسے فلسطین کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا، بیشتر حصے پر عرب آباد تھے اور یہ کہ تعداد کے اعتبار سے یہ عرب اکثریت میں تھے۔ قیامِ اسرائیل کے بعد ان عربوں کو یا تو منتشر کر دیا گیا (یا تو وہ خود ہی اپنے گھر بار چھوڑ کر چلے گئے یا پھر انھیں اپنے گھر بار چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا) یا پھر انھیں غیر یہودی اقلیت کی حیثیت سے مملکت میں محصور کر دیا گیا۔ 1967ء کی جنگ میں اسرائیل نے مزید عرب فلسطینی علاقے پر قبضہ کر لیا۔ ان تمام امور کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آج عرب فلسطینیوں کے تین طبقے وجود میں آ گئے ہیں۔ ایک طبقہ تو ان لوگوں پر مشتمل ہے جو 1967ء سے قبل ہی سے اسرائیل میں موجود چلے آ رہے ہیں۔ دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو ان علاقوں میں رہائش پذیر ہیں جن پر اسرائیل نے 1967ء کی جنگ کے دوران میں قبضہ کیا تھا۔ رہا تیسرا طبقہ، یہ ان لوگوں پر مشتمل ہے جو اپنے وطن کو خیر باد کہہ چکے ہیں اور اب فلسطین سے باہر مختلف ممالک اور علاقوں میں زندگی کے دن گزار رہے ہیں، اس قسم کی رائے شماری کا کبھی اہتمام نہیں کیا گیا جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ فلسطینی کیا چاہتے ہیں؟ یہ استصواب کیوں نہیں ہو سکا؟ اس کی وجوہات صاف عیاں ہیں...... پہلی بات تو یہ حقیقت ہے کہ فلسطینی روئے عالم پر موجود تو ہیں لیکن ایک مقام پر نہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ کوئی یہاں گرا اور کوئی وہاں، چنانچہ اب وہ مختلف مملکتوں میں مختلف حکومتوں کے دائرۂ اختیار میں رہائش پذیر ہیں۔ اس سے بڑی پیچیدہ صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ سیاسی طور پر اس قسم کے استصواب کا بندوبست کرنا ناممکن ہے۔ خاص طور پر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بے شمار فلسطینی ایسے ممالک میں مقیم ہیں جہاں استصواب تو رہا ایک طرف، سرے سے انتخابات منعقد کرنے ہی کی کوئی روایت اور ریت نہیں ہے۔ ان وجوہات کی فہرست کو خاصا طویل بنایا جا سکتا ہے...... تاہم ان تمام وجوہ کا ماحصل یہ ہے کہ اس قسم کے استصواب کے راستے میں ایک ایسی مشکل آن کھڑی ہوئی ہے جس کا فی الحال کوئی مداوا نظر نہیں آتا۔ تاہم اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ایسے کوئی ذرائع بھی موجود نہیں جن کی مدد سے فلسطینی اپنے اس انتشار اور جلاوطنی کی کیفیت میں بھی اپنی آرا کا اظہار نہیں کر سکتے۔ وہ بالکل کر سکتے ہیں۔ اگر ہم کسی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے مندرجہ ذیل امور کو پیشِ نظر رکھیں تو ہمیں خاصی سہولت رہے گی۔

فلسطینیوں کی اپنی قومی تنظیم ہے۔ اس کا نام تنظیم آزادی فلسطین یا پی ایل او ہے۔ یہ تنظیم فلسطینیوں میں بے حد مقبول ہے اور وہ صرف اس تنظیم کو اپنی جائز تنظیم قرار دیتے ہیں۔

1967ء کی جنگ کے دوران میں اسرائیل نے جن فلسطینی علاقوں پر قبضہ کیا تھا، وہاں اس نے فوجی

حکومت قائم کر رکھی ہے۔ فلسطینی نہ صرف یہ کہ اس فوجی حکمرانی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں بلکہ وہ اس کے خلاف مسلسل مزاحمت جاری رکھے ہوئے ہیں۔

نہ صرف مقبوضہ علاقوں کے فلسطینی آئے روز کے مظاہروں، ہڑتالوں اور مزاحمت کے دوسرے سیاسی طریقوں کے ذریعے اسرائیلی حکومت کے خلاف مسلسل جدوجہد کر رہے ہیں بلکہ وہ عرب بھی، جو 1967ء سے قبل ہی سے اسرائیل میں مقیم ہیں، اسرائیلی حکومت کے خلاف مزاحمت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

خود فلسطینیوں یا دوسروں نے فلسطینیوں کی حمایت میں جتنی بھی عوامی یا نجی تنظیمیں قائم کر رکھی ہیں، وہ سبھی کی سبھی مختلف طریقوں سے اسرائیل کے خلاف مصروفِ جدوجہد ہیں۔

اگرچہ ایک قوم کے ارکان کی حیثیت سے فلسطینیوں کا مشترکہ تجربہ یہ ہے کہ انھیں بے دخلی اور جلاوطنی سے دوچار ہونا پڑا اور ایک علاقائی وطن سے محرومی کا صدمہ اٹھانا پڑا۔ پھر بھی اگر ہم محولہ بالا امور کو پیشِ نظر رکھیں تو ہمیں یہ ثابت کرنے کے لیے کافی شہادتیں مل جائیں گی اور اس نتیجے پر پہنچنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوگی کہ فلسطینی اپنی موجودہ حالت پر قطعاً قانع نہیں۔ اس کے برعکس وہ بتکرار اس بات پر اصرار کر رہے ہیں کہ انھیں (وطن) واپسی کا حق دیا جائے اور ان کی خود ارادیت کے اظہار کی خواہش کا احترام کیا جائے اور چونکہ صیہونیت ان کی زندگیوں پر بری طرح اثر انداز ہوئی ہے، چنانچہ وہ اس کے خلاف ڈٹ کر مزاحمت کرتے رہیں گے۔

فلسطینی اپنے حقوق پر جو اصرار کر رہے ہیں، وہ کوئی ایسی بات نہیں کہ جس کی کوئی نظیر ہی نہ ملتی ہو اور نہ وہ کوئی بے سیاق کجی ہے۔ اس کی کامل تائید ہر اس بین الاقوامی قانونی اور اخلاقی میثاق سے ہو جاتی ہے، جس سے دُنیائے جدید آشنا ہے۔ 1948ء میں اقوامِ متحدہ نے انسانی حقوق کا جو اعلان نامہ منظور کیا، اس کی شق نمبر 13 میں یہ واضح طور پر قرار دیا گیا ہے کہ

① ہر مملکت کی حدود کے اندر ہر شخص کو نقل و حرکت اور رہائش کا حق حاصل ہے۔

② ہر شخص کو کوئی بھی ملک، بشمول اس کا اپنا ملک، چھوڑنے اور اپنے ملک میں واپس آنے کا حق حاصل ہے۔

1966ء میں شہری اور سیاسی حقوق کے متعلق جس بین الاقوامی میثاق کو حتمی طور پر منظور کیا گیا، اس میں ان بنیادی حقوق کا اعادہ کیا گیا۔ اس میثاق کو 1976ء میں اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی میں توثیق کے لیے پیش کیا گیا۔ چنانچہ اس میثاق کو یہ شرف حاصل ہے کہ اسے تقریباً متفقہ طور پر (صرف پانچ ارکان نے رائے شماری

میں حصہ نہیں لیا، یعنی منفی ووٹ انھوں نے بھی نہیں دیا) منظور کیا گیا۔ اس میثاق کی شق نمبر 12 میں کہا گیا ہے۔

③ ہر شخص ہر ملک، بشمول اس کا اپنا، چھوڑنے میں آزاد ہو گا......

④ کسی بھی شخص کو من مانے طریقوں سے اپنے ملک میں داخل ہونے کے حق سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

اس کے علاوہ اقوامِ متحدہ کا کمیشن برائے انسانی حقوق ڈنکے کی چوٹ پر یہ اعلان کرتا ہے کہ

① ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے وطن لوٹ سکے اور اس ضمن میں کسی قسم کا امتیاز نہیں برتا جائے گا، خواہ یہ امتیاز نسلی ہو، مذہبی ہو، جنسی ہو، سیاسی ہو یا رنگ اور زبان کا یا کسی دوسری رائے کا، نہ یہ دیکھا کہ واپس آنے والے کا قومی یا معاشرتی منظر یا اصل کیا ہے۔ جائیداد، پیدائش، شادی یا کسی دوسری حیثیت کی بنا پر بھی کوئی تمیز روا نہیں رکھی جائے گی۔

② اپنے وطن واپس لوٹنے کے حق سے محروم کرنے کے لیے اسے نہ تو من مانے طریقے سے اپنی قومیت سے محروم کیا جائے گا اور نہ اسے اپنی قومیت ترک کرنے کے لیے مجبور کیا جائے گا۔

③ کسی شخص کو مستبدانہ یا من مانے طریقے سے اپنے وطن میں داخل ہونے کے حق سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

④ کسی شخص کو محض اس بنا پر کہ اس کے پاس پاسپورٹ یا دوسری سفری دستاویزات نہیں ہیں، اپنے وطن واپس آنے کے حق سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ ①

اوپر جن حقوق کا ذکر کیا گیا ہے، کم از کم فلسطینیوں کو ان سے محروم رکھنے کے لیے جن دلائل کا سہارا لیا جاتا ہے، صاف معلوم ہوتا ہے کہ تہیہ یہ کیا گیا ہے کہ ساری توجہ چند گنے چنے دلائل و براہین ہی پر مرکوز کی جائے۔ ہمیں یہ باور کرایا جاتا ہے کہ اگر 1948ء میں فلسطینی اپنے گھر بار چھوڑ کر چلے گئے تھے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ عرب ریاستوں نے انھیں ایسا کرنے کے لیے اکسایا تھا۔ کیونکہ یہ (عرب ریاستیں) اس غلط فہمی میں بتلا تھیں کہ انھیں اسرائیل کے خلاف ایسی زبردست فتح حاصل ہو گی جس سے ان کی گردنیں تن جائیں گی اور وہ اس کے متعلق بڑی شیخی بگھار سکیں گی۔ یوں جب فلسطینی دوبارہ اپنے گھروں کو واپس لوٹیں گے تو وہ بھی

---

① کمیشن برائے انسانی حقوق کی اس دستاویز کا حوالہ اقوامِ متحدہ کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والی کتاب The Rights of Return of the Palestinian People کے صفحات نمبر 6 اور 7 پر موجود ہے۔ یہ کتاب 1978ء میں شائع ہوئی تھی۔

کامیابی و کامرانی کے نشے میں چور ہوں گے۔ خود مجھ پر جو واردات گزری اور جو شہادتیں دستیاب ہیں، ان سب سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ 1948ء میں فلسطینیوں کا جو خروج عمل میں آیا، اس کی فیصلہ کن وجوہ یہ نہیں تھیں بلکہ کچھ اور تھیں، لیکن جہاں تک فلسطینیوں کی واپسی کے حق کے متعلق صحیح استدلال کا تعلق ہے، تو ان کے ترکِ وطن کرنے کی وجہ خواہ کوئی ہو، وہ بالآخر غیر متعلق ہو جاتی ہے کیونکہ اہم بات یہ ہے کہ انھیں واپسی کا حق حاصل ہے۔ بین الاقوامی قانون کا تقاضا یہی ہے، اقوامِ متحدہ نے مختلف مواقع پر جو متعدد قراردادیں منظور کی ہیں (جن کے حق میں خود امریکا ووٹ دیتا رہا ہے) وہ بھی یہی عندیہ دیتی ہیں اور ان کی مرضی و منشا بھی یہی ہے (کہ فلسطینیوں کو اپنے گھروں کو لوٹنے کا حق حاصل ہے۔)[1] درآں حالانکہ بین الاقوامی طور پر ہر شخص کا یہ سیاسی اور اخلاقی حق تسلیم کیا جا چکا ہے کہ جس مقام پر وہ مسلسل رہائش پذیر رہا ہو، جب اس کا جی چاہے وہ وہاں واپس آسکتا ہے، اسرائیل نے جو رویہ اختیار کیا ہے، اس سے (فلسطینیوں کی) واپسی کے تمام راستے مسدود ہو چکے ہیں۔ اول: اس نے پے در پے ایسے قوانین منظور کیے جن کے تحت فلسطین میں وہ زمینیں جو عربوں کی ملکیت تھیں، انھیں خالی اور ان کے مالکوں کو "غیر حاضر" قرار دے دیا گیا۔ یوں جیوش نیشنل فنڈ[2] کو یہ موقع فراہم کر دیا گیا کہ وہ ان زمینوں کو ہتھیا لے۔ دوم: "واپسی کا قانون" منظور اور نافذ کیا گیا۔ اس قانون کی دفعات کے تحت ہر یہودی کو خواہ وہ دُنیا کے کسی بھی تختے پر پیدا ہوا ہو، یہ حق حاصل ہو گیا ہے کہ جب اس کا جی چاہے، وہ فوری طور پر اسرائیل کی شہریت اور وہاں رہائش اختیار کر سکتا ہے (تاہم اس قانون کی رو سے کسی عرب کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اسرائیل کی شہریت اور وہاں رہائش اختیار کر سکے خواہ ناقابلِ تردید شہادتوں کے ذریعے یہ ثابت بھی کر دیا جائے کہ اس کا خاندان پشت در پشت فلسطین میں آباد رہا ہے) یہ دونوں قسم کے قوانین، جو تمام تر یہودیوں کے فائدے کے لیے وضع کیے گئے ہیں، نہایت منظم اور قانونی ہتھکنڈے اختیار کرنے میں اسرائیلی حکومت اور اس کے کارندوں کی اس طور مدد کرتے ہیں کہ فلسطینیوں کے لیے وجہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، یہ ممکن ہی نہیں رہا کہ وہ واپس لوٹ سکیں، اپنی جائدادوں کا معاوضہ طلب کر سکیں اور اسرائیل میں ایک یہودی اسرائیل کے شانہ بشانہ قانون کے تحت ایک برابر کے شہری کی حیثیت سے رہ سکیں۔

---

① اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے پہلی مرتبہ 11 دسمبر 1948ء کو ایک قرارداد منظور کی تھی جس کے تحت فلسطینیوں کا یہ حق تسلیم کیا گیا تھا کہ وہ اپنے گھروں کو واپس جاسکتے اور اپنی جائیدادوں کا قبضہ لے سکتے ہیں۔ اس قرارداد کی کم از کم اٹھائیس مرتبہ توثیق کی جاچکی ہے۔ (مصنف)

② جیوش نیشنل فنڈ اسرائیل کا ایک سرکاری ادارہ ہے۔ قانونی طور پر یہ ادارہ "تمام یہودی قوم کی طرف سے" اسرائیل کی زمینوں کا مالک ہے اور یہ ایک ایسی صورتِ حال ہے جس کی کوئی نظیر کسی دوسری آزاد و نیم آزاد مملکت میں نہیں ملتی۔ (مصنف)

ایک اور دلیل جو دی جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ اگر اتنے زیادہ فلسطینیوں کو، جو بنیادی طور پر (اسرائیل کے خلاف) مخاصمانہ رویہ رکھتے ہیں، واپس لوٹنے کی اجازت دے دی گئی، تو اسرائیل میں جو کچھ وقوع پذیر ہوگا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس (اسرائیل) نے اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی ماری ہے۔ مزید برآں مملکتِ اسرائیل یہودیوں کے لیے قائم کی گئی ہے، چونکہ یہودیوں کو ایک نہ ایک دن صیہون ''واپس'' آنا ہے، اس لیے انھیں ہمیشہ یہ اختیار حاصل رہنا چاہیے کہ جب ان کا جی چاہے، وہ اپنی امکانی واپسی کے حق کو استعمال کر سکیں۔ یہ دونوں دلائل جس انداز سے پیش کیے جاتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پیچھے پیچھے جذبے کی قوت، بلکہ یقین اور شدّت کام کر رہی ہے۔ جس طرح یہ تصور کرنا لاحاصل ہے کہ اسرائیلی یہودی کبھی یہ چاہیں گے کہ وہ ان مقامات یا ممالک کی طرف لوٹ جائیں جہاں سے وہ آئے تھے اسی طرح اس بات کا کوئی فائدہ نہیں کہ عرب فلسطینی محولہ بالا دلائل سے انکار کرتے رہیں۔ فلسطینیوں اور صیہونیوں کے مابین جو کشمکش جاری ہے، اس کے متعلق کسی صحیح الدماغ اور صاحب رائے شخص کو جس ناامیدی اور قنوطیت کا احساس ہوتا ہے، وہ فریقین کی یہ ناکامی ہے کہ ان میں سے کوئی بھی ان حقائق سے سمجھوتا نہیں کر پایا کہ اس سرزمین پر صرف وہی نہیں، بلکہ ایک دوسری قوم بھی موجود ہے، یہ کہ اسے (دوسری قوم کو) جن مصائب و آلام سے گزرنا پڑا، ان کی بھی ایک پُر ملال تاریخ محفوظ ہے، یہ کہ اس (دوسری قوم) نے بھی جذباتی اور سیاسی طور پر بہت کچھ اس سرزمین میں لگا رکھا ہے اور ان سب سے بدتر بات یہ ہے کہ دونوں میں سے ہر فریق یہ سچا جھوٹا یقین کیے بیٹھا ہے کہ اس کا مخالف فریق اس کے لیے محض عارضی طور پر وبالِ جان بنا ہوا ہے۔ اگر کوششیں جاری رکھی جائیں (اور ان کوششوں میں کبھی کبھی تعزیری تشدد بھی شامل کرتے رہنا چاہیے) تو کچھ عرصے کے بعد وہ خود ہی منظر سے اوجھل ہو جائے گا۔ حالانکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ فلسطینی اور اسرائیلی یہودی اب ایک دوسرے کی زندگیوں اور سیاسی مقدروں میں پوری طرح دخیل ہو چکے ہیں۔ اس بات نے قطعی انداز چاہے نہ اختیار کیا ہو...... یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر منقول انداز سے بحث کرنا ممکن...... نہیں لیکن جہاں تک زمانہ حال یا مستقبل قریب کا تعلق ہے، یہ بالکل درست ہے (تاہم ان امور کے باوجود) ایک شخص کو اتنی صلاحیت سے بہرہ ور ہونا چاہیے کہ وہ ان دو قسم کے لوگوں کے مابین حدِ امتیاز کھینچ سکے، ان میں سے ایک تو وہ لوگ ہیں جنھوں نے (اس سرزمین پر) یلغار کی ہے، دوسروں کو (اپنے گھروں اور جائدادوں سے) بے دخل کیا ہے اور ان کی جگہ خود قابض ہو گئے ہیں۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جن پر یلغار ہوئی، جنھیں بے دخلی سے دو چار ہونا پڑا اور جن کی جگہ دوسرے قابض ہو گئے۔ دونوں برابر کی ٹکر نہیں اور نہ آخر کار ان میں سے ایک کبھی دوسرے پر غالب آ سکے گا اور اس پر اپنا تسلط قائم کر سکے گا۔ چنانچہ صیہونی جس سیاسی، قانونی اور علمیاتی نظام کو دوام بخشنے کی کوشش کر رہے ہیں جس کا فوری

(اس کا بتکرار اعادہ کیا جاتا ہے) بلکہ دور رس نصب العین بھی یہ ہے کہ فلسطین اور فلسطینیوں کو دور باش رکھا جائے اور انھیں نزدیک بھی پھٹکنے نہ دیا جائے، ایک ایسا امر ہے، جس کی، میرے خیال میں، مخالفت کی جانا چاہیے اور جس کا نہایت سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کیا جانا چاہیے۔

ایسی مخالفت کا مطلب کیا ہے اور اس کی صورت کیا ہونی چاہیے؟ جن سیاسی اور علمیاتی حالات و کوائف کا میں ذکر کر رہا ہوں، ان کے پیشِ نظر (مغرب میں) اسرائیل اور صیہونیت سے متعلق کسی چیز کی مخالفت کا (فوری) مطلب یہ لیا جائے گا کہ آپ اور کچھ نہیں تو کم سے کم یہود مخالف ضرور ہیں اور اگر اس کی دوسری انتہا پر دیکھا جائے تو آپ قتلِ عام کی حمایت کر رہے ہیں۔ [1] میں سمجھتا ہوں کہ میں یہودیوں کی جو مخالفت کر رہا ہوں، وہ اصولی اور محتاط انداز کی ہے، اس لیے میری مخالفت سے یہ نتائج اخذ کرنا کہ میں یہودیوں کا مخالف ہوں یا ان کے قتلِ عام کا حامی، ایک مفسدانہ، شرانگیز، تخریبی اور مضرت رساں حرکت ہوگی لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ اس قسم کی حرکت نہ صرف ہو رہی ہے بلکہ آئندہ بھی کئی برسوں تک ہوتی رہے گی تاہم معقول بحث مباحثے کا تقاضا یہی ہے (اس قسم کے مباحث پر میرا یقین بہت پختہ ہے) کہ ان اصطلاحات اور تناظرات میں تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کی جائے جن میں بظاہر ناقابلِ حل مسائل کا ادراک کیا جاتا ہے......اور اسرائیلیوں اور فلسطینیوں دونوں نے مل جل کر ایسا ہی لاینحل مسئلہ کھڑا کر دیا ہے، اس لیے دونوں ہی اس قسم کی عقلی تبدیلی کے محتاج ہیں۔

اس قسم کی تبدیلی کے لیے ایک زبردست موقع اس وقت میسر آیا تھا جب یکم اکتوبر 1977ء کو سوویت یونین اور ریاستہائے متحدہ امریکا نے ایک مشترکہ اعلامیہ جاری کیا تھا۔ اس اعلامیے کی ایک اہم شق یہ تھی کہ اس میں فلسطینیوں کے (محض مفادات کا نہیں بلکہ) حقوق کا ذکر کیا گیا تھا اور یہ اعتراف کیا گیا تھا کہ مشرقِ وسطیٰ کا جو بھی قطعی پُرامن حل تلاش کیا جائے گا، اس میں ان امور پر لازماً غور کرنا ہوگا، یہودیوں کی منظم رائے عامہ

---

① اصل میں یہودیوں کی کثیر آبادی کو بابل کے بادشاہ بخت نصر اور بعد میں رومیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ظہور سے قبل ہی فلسطین سے نکال دیا تھا اور یوں وہ یورپ اور افریقہ کے مختلف ممالک میں منتشر ہونے پر مجبور ہو گئے تھے، تاہم یورپ کے باشندوں نے یہودیوں کو کبھی بھی اچھی نظروں سے نہیں دیکھا اور وہ انھیں ہمیشہ سود خوار تصور کرتے رہے۔ چنانچہ ان پر طرح طرح کی پابندیاں لگائی جاتی رہیں اور ان کے خلاف معاشرتی اور قانونی، دونوں سطحوں پر، امتیاز برتا جاتا رہا۔ یورپ والوں کے اس رویے کو یہود دشمنی یا سامیت دشمنی (Anti-Semitism) کہا جاتا ہے۔ تاہم تحریک احیائے علوم اور تحریک اصلاحِ مذہب کے بعد یورپ والوں کا رویہ تبدیل ہونے لگا۔ اب وہ اپنی سابقہ غلطیوں کی تلافی کے لیے ان کی جائز ناجائز ہر طرح حمایت کرتے ہیں۔

نے اس اعلامیے کا جن دشنام طرازیوں اور مجنونانہ یاوہ گوئیوں کے ساتھ خیر مقدم کیا، وہ بہت حوصلہ شکن تھیں۔ نہ صرف یہ کہ امریکا کے یہودیوں کا رویہ ہتک آمیز اور بے ہودہ تھا بلکہ اپنے اس طرزِ عمل پر انھیں ندامت تو کیا ہوتی، الٹا اس پر فخر کا اظہار کیا گیا اور یہ لاف زنی کی گئی کہ ہم نے ہزاروں خطوط اور ٹیلی فون کالوں کے ذریعے وائٹ ہاؤس [1] کا ناطقہ بند کر دیا ہے۔ جو سبق سکھایا جانا مقصود تھا، وہ یہ تھا کہ یہودیوں اور اسرائیل کے حمایتیوں کو ذرا بھی اس بات کا احساس ہوا کہ اسرائیل کے وجود کو کوئی ظاہری یا باطنی خطرہ لاحق ہے، تو وہ حکومت کے خلاف لام بند ہو جائیں گے اور اس کا جینا حرام کر دیں گے۔ [2] اس ڈانٹ ڈپٹ اور تخویف کا مفہوم یہ ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کو محض خارجہ پالیسی کا ایک مسئلہ نہ سمجھا جائے بلکہ اسے امریکی سیاست میں ایک داخلی مسئلے کا مقام حاصل رہے۔ تاہم اس کا دوسرا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ لوگوں کو خوف و ہراس کی بنیاد پر آمادۂ پیکار کرنا بہت آسان کام ہے۔

تاہم دل میں یہ جاننے کی کرید ضرور پیدا ہوتی ہے کہ خوف و ہراس، جبر و تشدد اور کھلم کھلا عقلیت پسندانہ تشدد کی کوئی وجہ جواز بھی ہے یا یہ تقریباً ناقابلِ یقین حد تک کوتاہ اندیشی اور انجام کار کوتاہ عقلی پر مبنی مفاد کی آبیاری کرتے ہیں؟ کیا فلسطینیوں کے متعلق بحث مباحثے کا واحد متبادل یہی رہ گیا ہے کہ ایسی ایسی دھمکیاں دی جائیں کہ جنھیں اگر عملی جامہ پہنایا جائے تو وہ امریکا کی حکومت اور امریکا کے یہودی طبقے کے مابین خانہ جنگی کے مترادف ہو گا یا یہ کہ اسرائیل عربوں کے خلاف ایسی جنگ شروع کر دے جسے اخبارات کے بقول اسرائیلی اور امریکی حکام امکانی طور پر کامل تباہی و بربادی کی جنگ قرار دیتے ہیں۔ [3] آخر وہ کون سی ایسی مہیب اور ڈراؤنی چیز ہے جو اس قسم کے متشددانہ ردعمل کو انگیخت دیتی ہے؟ اور اس سے بھی اہم تر بات یہ ہے کہ کیا اس چیز کو جنگ کی دھمکیوں یا فی نفسہٖ جنگ کے ذریعے معدوم کیا جا سکتا ہے؟

میں سمجھتا ہوں کہ اگر آپ فلسطینیوں کا مسئلہ تعقلی انداز سے نپٹانا چاہتے ہیں تو پھر آپ کو جنگ یا قتلِ عام

---

① امریکی صدر کی سرکاری رہائش گاہ۔ اس عمارت کی تعمیر 1799ء میں مکمل ہوئی اور جان ایڈمز پہلے صدر تھے، جنھوں نے اس میں رہائش اختیار کی۔

② امریکا کے یہودی امریکی حکومت سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ہر طرح سے اسرائیل کی ناز برداری کرے گی اور اسرائیل جو کچھ کرے یا کہے اسے بلا چون و چرا اور غیر مشروط طور پر تسلیم کرے گی اگر اس رویے میں انھیں بال برابر بھی انحراف نظر آتا ہے، تو وہ آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں اور گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخنے چلانے لگتے ہیں کہ اسرائیل خطرات میں گھر گیا ہے۔

3 اگر آپ مثال دیکھنا چاہیں تو صفِ اول کے صحافی جم ہوگ لینڈ (Hoagland) کا وہ مضمون ملاحظہ فرمائیں جو امریکا کے مشہور روزنامے ''واشنگٹن پوسٹ'' میں 26 اکتوبر 1977ء کو شائع ہوا تھا۔ (مصنّف)

کے متعلّق باتیں کرنے سے اجتناب برتنا ہوگا اور سیاسی حقائق سے سنجیدگی کے ساتھ عہدہ برآ ہونا پڑے گا۔ حقائق چلّا چلّا کر یہ کہہ رہے ہیں کہ فلسطینی موجود ہے، فلسطینیوں کی زمینوں پر یہودیوں نے قبضہ جما رکھا ہے، ایسے بھی فلسطینی موجود ہیں جن پر اسرائیل نے بزورِ شمشیر فوجی تسلط قائم کیا ہوا ہے، ایسے فلسطینی......ساڑھے چھ لاکھ......بھی موجود ہیں جو اسرائیل کے شہری ہیں اور جو اسرائیل کی کل آبادی کے پندرہ فیصد حصے کی تشکیل کرتے ہیں۔ پھر فلسطینیوں کی اچھی بھلی تعداد جلاوطنی کی زندگی گزار رہی ہے۔ یہ وہ حقائق ہیں جنھیں امریکا اور دُنیا کے بیشتر ممالک تسلیم بالواسطہ یا بلاواسطہ کر چکے ہیں اور خود اسرائیل بھی تو انھیں قبول کرتا ہے اگرچہ اس کے قبول کرنے کا انداز انوکھا ہے۔ کبھی وہ ان کے وجود سے انکار کرنے لگتا ہے، کبھی وہ انھیں مسترد کرتا ہے، کبھی جنگ کی دھمکیاں دیتا ہے اور کبھی انھیں سزائیں دیتا ہے۔ گزشتہ چالیس برس کی تاریخ نے یہ بات بالکل واضح کر دی ہے کہ فلسطینیوں پر آپ جو بھی ظلم و تشدد کرنا چاہیں، کریں، انھیں جس قسم کی مشکلات و مصائب سے گزارنا چاہیں، گزاریں، سیاسی طور پر وہ پنپتے ہی ہیں، سکڑے نہیں۔ یہودیوں کی تاریخ نے بھی یہ حقیقت واشگاف طور پر عیاں کر دی ہے کہ فلسطین کی سرزمین کے ساتھ، جو بھرپور تاریخ کی حامل سرزمین ہے، وابستگی میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہی ہوتا ہے، اس میں کسی قسم کی کمی نہیں آتی۔ جب تک فلسطینیوں کا نام ونشان صفحۂ ہستی سے مٹا نہیں دیا جاتا، وہ موجود رہیں گے اور ان معاملات کے بارے میں کہ ان کی نمائندگی کون کرے گا، وہ کہاں آباد ہونا چاہیں گے، وہ اپنا قومی اور سیاسی مستقبل کس طرح استوار کرنا چاہیں گے، وہ اپنے خیالات اور اپنی سوچوں کے آپ مالک رہیں گے۔

چنانچہ فی زمانہ اگر کوئی شخص صیہونیوں یا صیہونیت کو ہدفِ تنقید بناتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ کسی تصور یا نظریے پر نکتہ چینی کی جارہی ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس تنقید کا ہدف وہ دیوار ہے جو ''میں نہ مانوں'' کی رٹ نے کھڑی کر رکھی ہے۔ آپ لاکھوں فلسطینیوں سے یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ دفع ہو جائیں گے یا آپ نے ان کی زمینوں پر جو قبضہ جما لیا ہے، اس پر وہ صاد کریں گے، یا ان کے مقدر، ان کی حکومت خوداختیاری'' (اٹانومی) یا یہ کہ انھیں جسمانی طور پر کہاں جانا چاہیے، کے متعلق کوئی اسرائیلی، مصری یا امریکی اپنا کوئی فیصلہ سناتا ہے، تو وہ آنکھیں بند کر کے اسے قبول کر لیں گے۔ یہ (تنقید) اس بات کا اعلان بھی ہے کہ اب وقت آگیا ہے کہ فلسطینی اور اسرائیلی باہم سر جوڑ کر بیٹھیں، اور ان کے مابین جو تصفیہ طلب امور ہیں، ان پر آپس میں گفتگو کریں۔ تصفیہ طلب امور یہ ہیں:

اپنے آبائی اوطان کو چھوڑ کر فلسطین میں آباد ہونے کا حق کن لوگوں کو حاصل ہے؟ فلسطینی عربوں کی جو جائدادیں تباہ و برباد ہوئیں یا ان سے چھین لی گئیں، ان کے معاوضے کی کیا صورت ہوگی؟ وغیرہ وغیرہ۔

مستقبل کے امن کے متعلق جو عمومی بحث ہوگی، اس کے حوالے ہی سے ان امور پر غور وفکر کیا جا سکے گا۔ اس کے ساتھ ہی صیہونیوں کو ذہنی طور پر یہ حقیقت بھی تسلیم کرنا ہوگی کہ جس چیز کو وہ بعض اوقات یہودیوں کی قومی آزادی کا نام دیتے ہیں، اس کی تعمیر کسی مجرد چیز پر نہیں بلکہ ایک دوسری قوم کے وجود کے کھنڈرات پر ہوئی تھی اور آخر میں اس (تنقید) کا مقصد یہ اعتراف کرانا ہے کہ فلسطین کا مسئلہ محض اتنا نہیں کہ صیہونی بیرونی خیالات واثرات سے بے نیاز ہو کر سادھوؤں کی طرح محض آپس میں یہ بحث کرتے رہیں کہ اس سرزمین پر جو کسی زمانے میں فلسطین کے نام سے موسوم کی جاتی تھی، صیہونیت اور اسرائیل نے نظری طور پر کیا رویہ اختیار کرنا ہے بلکہ یہ ایک انتہائی اہم سیاسی مسئلہ ہے جس میں دو فریق عرب اور یہودی شامل ہیں جو ایک ایسے خطے پر آباد ہیں جو مشترکہ طور پر دونوں کے لیے نہایت وقیع ہے۔

یہاں ہمیں یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ مسائل کو کیوں دیکھا، پرکھا اور مرتب نہ کیا جائے کہ وہ محض مشرقِ وسطیٰ کے لوگوں کے مابین مقامی نوعیت کے مسائل نظر آئیں، بلکہ جیسا کہ میں نے بیان کرنے کی کوشش کی ہے، یہ مسائل دو ایسی قوموں کے مسائل ہیں جو اپنے متعلق یہ سمجھتی ہیں کہ وہ دونوں ہی جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہی ہیں، پھر یہ وہ قومیں ہیں جن کی باہمی پرخاش اور جھگڑوں نے دُنیا کو بین الاقوامی طور پر الجھا رکھا ہے۔ جھگڑے کا ایک فریق صیہونیت، یہودی میثاق اور یہودی تاریخ کو ماننے والوں پر مشتمل ہے۔ یہ وہ فریق ہے جو اس انتہائی المناک سلوک کی، جو دُنیا کی کسی بھی قوم کے ساتھ روا رکھا گیا، بچی کھچی نشانیوں سے عبارت ہوا ہے۔ (جھگڑے کا) دوسرا فریق ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو استعمار اور نو آبادیاتی نظام کے دشمن ہیں اور اس کا تعلق تیسری دُنیا سے ہے۔ یہ فریق اپنے لائحۂ عمل کے لیے جن امور کو اساس بناتا ہے، ان میں مندرجہ ذیل شامل ہیں:

ایک قوم کی حیثیت سے ان کی اپنے گھروں اور جائیدادوں سے بے دخلی۔

ان کی طرف سے نسلی امتیاز دوسروں کے علاقوں کو زبردستی ہتھیانے اور فوجی قبضے کی مخالفت۔

یہ وہ امور ہیں جن کی نوعیت عالمگیر ہے، چنانچہ ان کی وجہ سے ساری دُنیا ہی کسی نہ کسی نوعیت کی جدوجہد میں شریک ہونے پر مجبور ہے اور اگرچہ اس بات کا ہمیشہ کھٹکا رہتا ہے کہ اگر چھوٹے چھوٹے جھگڑوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جائے تو وہ لاینحل ہو جاتے ہیں۔ تاہم یہ بات بھی درست ہے کہ بڑھا چڑھا کر پیش کرنے سے ایک فائدہ بھی ہوتا ہے کہ ہم ان تمام مسائل اور تصورات کو جو جھگڑے میں جان ڈالتے ہیں، کچھ نہ کچھ ضرور سمجھ جاتے ہیں۔

لیکن اس غالباً بھاری بھر کم تنازعے کی شدت کم کرنے کی کوئی نہ کوئی صورت تو لازماً ہوگی۔ میرا یہ

ایمان ہے کہ اگر فلسطینی اور فلسطین کے یہودی دونوں اپنی اس مشترکہ صورتِ حال کا محض اپنے ہی قومی تناظر میں ہی نہیں بلکہ اس کے برعکس انسانی حقوق کے نقطۂ نظر سے جائزہ لیں، تو (پھر جس نتیجے پر وہ پہنچیں گے اس سے) بظاہر انھیں کچھ خسارہ تو ہوگا لیکن منفعت بھی بہت زیادہ حاصل ہوگی۔ یہ امر اکثر فراموش کر دیا جاتا ہے کہ جدید مشرقِ وسطیٰ نے انیسویں صدی کی استعماریت سے خوف ناک حد تک اختلافات کو جنم دینے والا سیاسی ورثہ پایا ہے اور اس پر تقریباً کسی شخص نے بھی اعتراض کی انگلی نہیں اٹھائی۔ مسئلہ خواہ سلطنتِ عثمانیہ کا ہو یا اس کے ان علاقوں کا جو (جنگِ عظیم اول کے بعد) مغربی اقوام کے تسلط میں آ گئے تھے، یہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ ان علاقوں پر حکمرانی کا حق اصولی طور پر (صرف) اقلیتوں کو حاصل تھا، جن کے مقامی مفادات نو آبادیاتی طاقت کے ساتھ وابستہ تھے۔ آج بھی لبنان، اردن، شام، اسرائیل، کویت اور سعودی عرب میں صرف اقلیتیں حکومت کر رہی ہیں۔ (اس) علاقے کی اکثریت سنی مسلمانوں پر مشتمل ہے، تاہم ان میں سے ہر ملک کی حکومت پر یا تو کوئی غیر سنی (اقلیتی) گروہ قابض ہے یا پھر کسی ایک ہی خاندان کے افراد یا چند دوسرے گنے چنے افراد۔ ① جہاں تک عوام الناس کا تعلق ہے، انھیں ان حکومتوں کے امور و معاملات میں کوئی دخل حاصل نہیں۔

اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اکثریت کے بارے میں اس علاقے کی مرکزی حکومتوں کا رویہ جابرانہ اور متشددانہ ہے اور یہ بات واضح طور پر عرب ممالک کے متعلق ہی صحیح نہیں بلکہ اسرائیل پر بھی اس کا پوری طرح اطلاق ہوتا ہے۔ ایک طرف تو ذہن کا یہ اقلیتی سانچہ ہے، دوسری طرف مملکت کی غیر تنقیدی انداز سے توصیف برائے توصیف کی جاتی ہے۔ ان دونوں چیزوں کی شراکت نے ایک فرد کی حیثیت سے ایک عام شہری کی زندگی کو اجیرن اور غیر یقینی بنا دیا ہے اور اسے دوسروں کے رحم و کرم کا پابند کر دیا ہے۔ اسرائیل ہی کی مثال لے لیں۔ ایک تو یہ مملکت ویسے ہی یہودیوں اور غیر یہودیوں کے مابین رسّا کشی کا اکھاڑا بن چکی ہے لیکن اس سے بھی زیادہ چونکا دینے والی بات یہ ہے کہ یورپی اور مشرقی یہودیوں کے مابین امتیاز کی ایک خلیج وجود میں آ چکی ہے۔ یوں ان کے درمیان جو اختلافات پیدا ہوئے ہیں وہ ویسے ہی ہیں جیسے یہودیوں کے غیر یہودیوں کے ساتھ ہیں۔ جہاں تک اس خطے کے دوسرے ممالک کا تعلق ہے تو وہاں کے شہریوں کے حقوق کا دار و مدار اس

---

① یہاں مصنف نے انگریزی کا لفظ (Oligarchy) استعمال کیا ہے۔ یہ ایک ایسا طرزِ حکومت ہے جس میں اختیارات چند افراد یا خاندانوں کے ہاتھوں میں مجتمع ہوتے ہیں۔ ارسطو کا خیال ہے کہ یہ اشرافیہ کی گمراہ کن شکل ہے کیونکہ اس میں عوام الناس کی فلاح و بہبود کی بجائے ذاتی یا گروہی مفادات کا زیادہ خیال رکھا جاتا ہے شام کی ''دروزی'' حکومت اسی قسم کی ہے۔

بات میں نہیں کہ مملکت کے قانون میں ان کی کوئی ضمانت فراہم کی گئی ہے بلکہ ان حقوق کا سر سر انحصار مرکزی حکومت کی صوابدید پر ہے جس کے اختیارات کا نہایت چوکسی اور ہوشیاری کے ساتھ تحفظ کیا جاتا ہے۔ اس لیے اگر ہم اسرائیلیوں اور فلسطینیوں کے تنازعے کے بارے میں مخلص ہیں اور نیک نیتی سے یہ چاہتے ہیں کہ فریقین کے ساتھ انصاف ہو اور اس تنازع کا کوئی نہ کوئی حل نکل آئے، تو اس سلسلے میں جو بھی قدم اٹھایا جائے گا، اس کا تقاضا یہ ہوگا کہ دونوں فریقین کے مابین اس مسئلے پر از سرِ نو غور کیا جائے، اس کی دوبارہ اس نہج پر تشکیل کی جائے کہ یہ ایک ایسا تنازع دکھائی دے، جس میں وہ لوگ ملوث ہیں جو اس امید پر زندگی بسر کر رہے ہیں کہ کبھی تو وہ وقت آئے گا کہ جب خطے کے تمام حقیقی (سابقہ اور موجودہ) باشندوں کو ان کے (بنیادی) حقوق کی ضمانت مل سکے گی۔ ہاں، جب کبھی ایسا وقت آئے گا تو اسرائیل محض پوری یہودی قوم کا، اس کے افراد وہاں رہائش پذیر ہوں یا نہ ہوں، وطن نہیں رہ سکے گا بلکہ یہ اس کے موجودہ یہودی اور غیر عرب شہریوں کا وطن ہوگا۔ یہی بات علاقے کے دوسرے ممالک کے بارے میں بھی درست ہوگی۔ ①

تاہم فی الحال اتنا بنیادی اقدام بھی عملی طور پر ناممکن ہے۔ اسرائیلیوں اور فلسطینیوں کے مابین تعلقات اس قدر شعلہ افشاں ہو چکے ہیں کہ مسئلے کا حل اور اس میں حق و انصاف سے ملتی جلتی کسی چیز کا اختیار کیا جانا ہے، ناممکنات میں سے ہے لیکن یہ صورتِ حال صرف عارضی نوعیت کی ہے، میرے خیال میں ہر انسان کا خواہ وہ مرد ہو یا عورت، طویل المیعاد نصب العین ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ سیاسی طور پر اسے خوف، عدم تحفظ، دہشت گردی اور ظلم و تعدی سے نجات حاصل ہو اور یوں وہ ہر قسم کے خدشات سے آزاد رہ کر زندگی گزار سکے۔ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ دوسروں پر غیر مساویانہ یا غیر منصفانہ تسلط کرنے کی نوبت ہی نہ آنے پائے۔ عام انسانوں کے اس طویل المیعاد نصب العین کے معانی فلسطینی عربوں کے نزدیک کچھ ہیں اور اسرائیلی یہودیوں کے نزدیک کچھ اور۔ جہاں تک موخر الذکر کا تعلق ہے تو ان کے نزدیک اس کا مفہوم یہ ہے کہ انھیں یہود دشمنی کے خوفناک تاریخی دباؤ سے، جس کا انجام نازیوں کے ہاتھوں ان کے بھائی بندوں کے قتلِ عام پر ہوا، نجات حاصل ہو۔ انھیں عربوں سے جو خوف لاحق رہتا ہے، وہ اس سے بھی چھٹکارا چاہتے ہیں۔ پھر ایک سوچے سمجھے

---

① صیہونی اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ اسرائیل کی مملکت پوری یہودی قوم کے لیے قائم کی گئی ہے۔ چنانچہ وہ یہودی بھی جو ابھی تک دُنیا کے دوسرے ممالک میں آباد ہیں، یہ حق رکھتے ہیں کہ جب ان کا جی چاہے وہ ترکِ وطن کر کے اسرائیل آ جائیں اور اس ملک کی شہریت انھیں خود بخود حاصل ہو جائے گی۔ یہاں مصنف جو بات کہنا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کا جامع اور منصفانہ حل تلاش کیے جانے کے بعد صرف وہی یہودی اسرائیل (یا فلسطین) کے شہری رہ سکیں گے جو سمجھوتے کے وقت وہاں آباد ہوں گے۔

پروگرام کے تحت صیہونی جس طرح غیر یہودیوں کے خلاف اندھا دھند کارروائیاں کر رہے ہیں، وہ ان سے بھی چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ جہاں تک اوّل الذکر کا تعلق ہے، ان کا طویل المیعاد نصب العین یہ ہے کہ انھیں جلاوطن اور بے دخلی سے چھٹکارا حاصل ہو۔ تاریخی طور پر (یورپی باشندوں کے مقابلے میں) وہ جو فرو مانده رہ گئے ہیں اور اس فرو ماندگی کے نتیجے کے طور پر انھیں جن ثقافتی اور نفسیاتی تباہ کاریوں سے دوچار ہونا پڑا ہے، وہ ان سے بھی چھٹکارا پانا چاہتے ہیں اور وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ایذا رساں اسرائیل کے خلاف انھیں جو غیر انسانی رویے اختیار کرنا پڑتے ہیں اور ظالمانہ کارروائیاں کرنا پڑتی ہیں، ان سے بھی ان کی خلاصی ہو۔ موجودہ رکاوٹوں کے بیچ میں میری، آپ کی، ہم سب کی ان طویل المیعاد منصوبوں کے متعلق کیا رائے ہے؟

اس سلسلے میں جو اولین اور غالباً نہایت چھوٹا سا، قدم اٹھایا جانا چاہیے وہ یہ ہے کہ ہمیں سارے معاملے کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ میں کہیں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ صیہونیت کا مطالعہ اور اس پر گفتگو کچھ اس طور پر کی جاتی ہے گویا اس کا تعلق صرف اور صرف یہودیوں سے ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ صیہونیت کے لیے جو غیر معمولی انسانی قیمت چکانا پڑی ہے، اس کا بیشتر بار فلسطینیوں کو اٹھانا پڑا ہے اور یہ قیمت نہ صرف کہ بہت گراں ہے بلکہ اس کا (ابھی تک) اعتراف بھی نہیں کیا گیا۔ چنانچہ ہم پر یہ لازم آتا ہے کہ ہم صیہونیت سے کوئی تصفیہ کرنے کی کوشش کریں جس نے ایک تھیوری (نظریہ۔ اصول) ایک آئیڈیالوجی (آدرش، فکرِ حیات) اور ایک تاریخی اور سیاسی عمل کے پروگرام کی حیثیت سے فلسطینی عربوں کے لیے بھی اور اسرائیلیوں اور دوسرے یہودیوں کے لیے بھی واضح نتائج پیدا کیے۔ اگر ایک مرتبہ اس حقیقت کو بحث و تمحیص اور تعقلی تفہیم میں پذیرائی حاصل ہو جائے تو پھر ہمیں ان امور کا ادراک کرنے میں بھی کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی جو عربوں کی زندگی میں روح پھونکتے ہیں۔ یہاں میرا مقصد یہ ہے کہ اس حقیقت پر...... یعنی عرب فلسطینی، میں خود بھی ایک عرب فلسطینی ہوں...... بحث و تمحیص ہو سکے جس کو ماننے سے بہت انکار کیا گیا ہے، جس کو دبانے کی بہت کوشش کی گئی ہے۔

جب ایک مرتبہ اولین قدم اٹھا لیے جائیں تو یہ بات اتنی معمولی اور محض علمی نوعیت کی نہیں رہ جائے گی، جتنی کہ یہ ظاہراً ابتدا میں نظر آتی ہے۔ جس مقدمے (بنیادی نکتہ PREMISE) پر میں نے اپنی بحث کا دارومدار رکھا ہے، وہ یہ ہے کہ خود فلسطین اور فلسطین کے بارے میں جو بحث و تمحیص ہوتی ہے، ان کے متعلق تو بہت دلچسپی کا اظہار کیا جاتا ہے لیکن اس کامل انسانی حقیقت کے متعلق سنجیدگی سے کوئی توجہ نہیں دی جاتی کہ ایک فلسطینی عرب ایک محض بے لگام، سرکش، اڑیل یہود دشمن دہشت گرد پناہ گزیں ہی کی علامت نہیں بلکہ

ایک شہری کی حیثیت سے اس کے بھی کچھ حقوق ہیں تاہم قدرت کا یہی منشا تھا کہ ماضی میں ایسا موقع کبھی نہ آئے کہ اس قسم کی بحث وتمحیص نتیجہ خیز تو ایک طرف رہی، ممکن بھی ہو پاتی۔ اگر چہ یہ امکانات اپنی جگہ موجود ہیں کہ مشرقِ وسطیٰ میں مزید کوئی جنگ چھڑ جائے یا ''(امن کے عمل''،① کے متعلق مزید بے معنی گفتگو کا راستہ کھل جائے، پھر بھی کبھی کبھار صلح جوئی کی فضا پیدا ہو ہی جاتی ہے، ایسے میں ضرورت اس بات کی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ مسائل پر توجہ دیں، ان پر غور کریں اور انھیں (صحیح معنوں میں) سمجھنے کی کوشش کریں۔ میرا ارادہ یہ ہے کہ آئندہ کے صفحات پر دو اجزا پر مشتمل تفہیم کی کوشش کی جائے۔ اول: باب دوم میں صیہونیت کا اس انداز سے جائزہ لیا گیا ہے کہ اس نے فلسطینی عربوں کو، جو اس کے منتفع نہیں بلکہ اس کے ستم رسیدہ ہیں، کسی طرح متاثر کیا۔ دورِ جدید میں فلسطینیوں کو تجربے کی جس بھٹی میں سے گزرنا پڑا ہے۔ باب سوم میں بیانیہ انداز سے اس کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ فلسطینیوں کی حیاتِ اجتماعیہ، ثقافت، سیاسی اور معاشرتی اداروں کی موجودہ زمانے میں حقیقت کیا ہے، اس کا تجربہ بھی اسی باب میں شامل ہے۔ باب چہارم میں مشرقِ وسطیٰ کے متعلق امریکا کی گزشتہ اور موجودہ حکمتِ عملی کے متعلق مباحث کو سمیٹا جائے گا اور اس بات پر غور کیا جائے گا کہ اگر اس امر پر بالآخر سنجیدگی سے توجہ دینے پر اتفاق ہو جائے کہ وہ کون سی راہِ عمل ہے جس پر چل کر فلسطینیوں کے لیے امن کے حالات پیدا کیے جاسکتے ہیں، تو پھر کون سے مسائل سے عہدہ برآ ہونا پڑے گا۔

---

① یہاں مصنف کا اشارہ ان مذاکرات کی طرف ہے جو امریکا کے سابق صدر جمی کارٹر، مصر کے مرحوم صدر انوار السادات اور اسرائیل کے سابق وزیر اعظم بیگن کے مابین کیمپ ڈیوڈ کے مقام پر ہوئے ان مذاکرات کا یہ نتیجہ تو ضرور برآمد ہوا کہ مصر نے اسرائیل کو تسلیم کر لیا لیکن مشرقِ وسطیٰ کے مسئلہ کا کوئی حل پھر بھی ہاتھ نہ آیا۔ یوں یہ مذاکرات ''بے معنی'' ثابت ہوئے۔

دوسرا باب

صیہونیت

اس کے ستم رسیدگان کے نقطۂ نظر سے

①

صیہونیت اور یورپی استعمار کے رویے

ہر خیال یا خیالات کا نظام کہیں نہ کہیں موجود ہے۔ اس کا تانا بانا تاریخی حالات میں گندھا ہوا ہے۔ یہ اس چیز کا، جسے عام فہم الفاظ میں ''حقیقت'' کا نام دیا جاسکتا ہے، جزو ہے۔ وہ عینیت، جو محض اپنا الو سیدھا کرنے یا محض اپنی مطلب براری کے لیے وضع کی جائے، اس کا ایک زندہ جاوید وصف یہ تصور ہے کہ خیالات، محض خیالات ہیں اور یہ کہ وہ محض خیالات کی قلم رو میں ہی موجود ہوتے ہیں۔ خیالات کے متعلق یہ سمجھ لینے کا رجحان، کہ ان کا تعلق محض تجریدات کے عالم سے ہوتا ہے، ان لوگوں میں اور بھی فزوں تر ہو جاتا ہے جن کے نزدیک خیال بنیادی طور پر کامل، بے عیب، نفیس اور انسانی خواہش یا ارادے کی آلائشوں سے پاک صاف ہوتا ہے۔ اس نقطۂ نظر کی تطبیق اس وقت بھی ہوتی ہے جب خیالات کے متعلق یہ باور کرلیا جاتا ہے کہ وہ قبیح ہیں، اپنی قباحت میں بالکل کامل ہیں اور علیٰ ہٰذا القیاس۔ جب کوئی خیال مؤثر بن جاتا ہے...... یعنی اسے اتنی قبولیتِ عامہ حاصل ہو جاتی ہے کہ اس کے طفیل اس کی قدر و قیمت حقیقتاً ثابت ہو جاتی ہے...... تو اس پر کچھ نہ کچھ نظرِ ثانی کی ضرورت کا احساس ہونے لگے گا کیونکہ خیال کا اس نقطۂ نظر سے جائزہ لینا چاہیے کہ اس نے

بے رحم حقیقت کے کچھ نہ کچھ خصائص ضرور اپنے اندر جذب کر لیے ہوں گے۔ چنانچہ یہ دلیل اکثر دی جاتی ہے کہ ایک ایسا خیال، جیسا کہ صیہونیت ہے، اس امر کے قطع نظر کہ اس کی خاطر لوگوں کو سیاسی طور پر بیشمار آلام و مصائب میں سے گزرنا پڑا اور اس کی خاطر انھیں (جان لیوا) جدّ وجہد کرنا پڑی، بنیادی طور پر ایک غیر متبدل خیال ہے، جو یہودیوں کی اس آرزو کا مظہر ہے کہ وہ اپنی قومی شخصیت کی تعمیر کریں گے اور اس مقصد کے لیے وہ ارضِ موعود پر سیاسی اور مذہبی طور پر خود فیصلہ کریں گے۔

بظاہر تو یہی نظر آتا ہے کہ اسرائیل کی تخلیق کے ساتھ صیہونیت اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی ہے، پھر بھی یہ دلیل دی جاتی ہے کہ چونکہ تاریخی اعتبار سے خیال کو عملی جامہ پہنچایا جا چکا ہے، اس سے یہ ثابت ہوا کہ اس کی روح نا قابلِ تبدیل ہے اور اس (خیال) کی تکمیل کے لیے جو ذرائع استعمال میں آئے، ان کی اہمیت بھی کوئی کم نہیں ہے۔ لیکن غیر یہودیوں کے لیے، جنھیں اس کا سامنا کرنا پڑا، صیہونیت کے نتائج کیا نکلے، اس کے متعلق خاموشی اختیار کر لی جاتی ہے اور شاذ ہی کبھی کوئی بات کہی جاتی ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ صیہونیت کا ورود کہاں ہوا[1] اور انیسویں صدی کے یورپ کے تاریخی سیاق و سباق میں اس نے کہاں سے قوت حاصل کی، تو ان باتوں کو بھی گول کر دیا جاتا ہے اور ان کا مطلقاً ذکر نہیں کیا جاتا۔ جہاں تک فلسطینیوں کا تعلق ہے، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ صیہونیت (ان کے نہیں بلکہ) کسی اور کے خیال کی پیداوار ہے، جسے فلسطین میں درآمد کیا گیا اور جس کی خاطر ہر فلسطینی مرد و زن کو قیمت چکانا پڑی اور مصائب و آلام کی بھٹی میں سے گزرنا پڑا۔ چنانچہ وہ یہ تصور کرتے ہیں کہ صیہونیت کے متعلق یہ بھولی بسری باتیں (جن کا ذکر اوپر آیا ہے) ہی اصل چیزیں ہیں اور انھی کی اصل اہمیت ہے۔

قصہ مختصر، ضرورت اس بات کی ہے کہ صیہونیت جیسے مؤثر سیاسی خیالات کو کھنگالنے اور ان کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے دو طریقے استعمال کیے جائیں۔ ان میں سے پہلا طریقہ نسبیاتی[2] ہے۔ اس طریقے کے ذریعے ہم یہ واضح کر سکیں گے کہ ان خیالات کی اصل یا ماخذ (Origin) کیا ہے، ان سے ملتے جلتے خیالات کون سے ہیں اور ان خیالات نے کن دوسرے خیالات کو جنم دیا ہے۔ پھر دوسرے خیالات اور سیاسی اداروں دونوں کے ساتھ یہ کس طرح ملحق ہیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ ان

---

① یہودی تاریخ میں صیہونیت کا ذکر ضرور کیا جاتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس نے عملاً شکل کہاں اختیار کی۔ ظاہر ہے اس کا جواب انیسویں صدی کا یورپ ہے۔

② نسبیاتی (Geneology): وہ علم جس کے ذریعے کسی شخص، جانور یا پودے کا حسب نسب معلوم کیا جا سکتا ہے۔

خیالات کی بنا پر وہ کون سے عملی نظام وجود میں آئے جن کی اعانت سے قوت و اختیار کا ارتکاز ممکن ہوا، یکے بعد دیگرے دوسروں کی زمینوں پر قبضہ ہوا اور اپنے آدرش کو صحیح ثابت کرنے میں آسانیاں فراہم ہوئیں۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے لوگوں اور دوسری قسم کے خیالات کی بے دخلی عمل میں آئی اور جو چیز پہلے جائز طور پر موجود تھی، اسے بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکا گیا۔ موجودہ زمانے کے سیاسی اور ثقافتی حقائق نے اس قسم کے جائزے کے کام کو غیر معمولی طور پر دشوار بنا دیا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مغرب کے صنعتی طور ترقی کرنے کے بعد صیہونیت نے وہاں کے لبرل حلقوں میں ایک ایسا بالادست مقام حاصل کر لیا ہے کہ کوئی اسے چیلنج کرنے کی ہمت نہیں پاتا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اپنی ایک بنیادی نظریاتی خصوصیت سے ہم آہنگ ہو کر صیہونیت نے ان باتوں پر یا تو پردہ ڈال دیا ہے اور یا پھر انھیں نظروں سے اوجھل کر دیا ہے کہ وہ کون سے حقیقی تاریخی عوامل تھے جو اس کی نمو میں کارفرما ہوئے، یہ کہ فلسطین کے مقامی باشندوں کو اس کی وجہ سے سیاسی طور پر کتنی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی ہے اور یہ کہ یہودیوں اور غیر یہودیوں کے مابین کن تشدد آمیز ظالمانہ طریقوں سے امتیاز برتتی ہے۔

میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، اس کی ایک متوحش اور چونکا دینے والی مثال پر غور فرمائیں۔ یہ مثال مناچم بیگن کی ہے۔ صیہونیت کیا ہے اور کیا چاہتی ہے، بیگن کو اس کی علامت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ بیگن (کچھ عرصہ قبل اسرائیل کا وزیر اعظم بھی رہ چکا ہے) کسی زمانے میں یہودیوں کی ایک دہشت گرد تنظیم ارگن (Irgun) کا سربراہ تھا۔ اس تنظیم کے ارکان نے ماضی میں بے شمار شقاوت اور سنگدلی سے بھرپور قتل و غارت گری کی وارداتوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا (ان میں اکثر وارداتیں ایسی تھیں جن کا اعتراف خود یہ تنظیم بھی کر چکی ہے۔) ایک طرف تو بیگن کا یہ (مکروہ) ماضی تھا۔ دوسری طرف امریکا میں اس کی یوں قدر و منزلت کی جاتی ہے کہ مئی 1978ء میں نارتھ ویسٹرن یونیورسٹی اسے اسرائیل کے وزیر اعظم کی حیثیت سے قانون کی ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے نواز دیتی ہے۔ حالانکہ یہ وہ ''رہنما'' تھا جس کی فوجوں نے صرف ایک ماہ قبل جنوبی لبنان پر بھرپور حملہ کیا اور چشم زدن میں تین لاکھ لوگوں کو بے گھر اور بے در بنا دیا تھا اور یہ وہی شخص تھا جو بتکرار چلا چلا کر کہہ رہا تھا کہ ''جودیہ اور سماریہ''[1] مملکت یہود کے ''جائز'' حصص ہیں۔ لیکن امریکا

---

[1] اسرائیل جن علاقوں کو ''جودیہ اور سماریہ'' کہتا ہے، یہ اصل میں فلسطین کا وہ علاقہ ہے جو دریائے اردن کے مغربی کنارے کے ساتھ ساتھ واقع ہے اس لیے عموماً اسے ''مغربی کنارہ'' ہی کہا جاتا ہے۔ اسرائیل نے اس علاقے پر 1967ء کی جنگ کے دوران میں قبضہ کیا تھا۔ اب اکثر اسرائیلی یہ کہتے ہیں کہ یہ اسرائیل کا ''اٹوٹ انگ'' ہے۔ وہ یہ دعاوی ''عہد نامہ عتیق'' کی بنیاد پر کرتے ہیں لیکن اس سرزمین پر جو لوگ (یعنی فلسطینی) آباد ہیں، ان کا قطعاً ذکر نہیں کرتے گویا یہ لوگ وہاں موجود ہی نہیں اور یہ علاقہ بالکل بے آباد ہے۔

کے اخبارات اور دانشوروں کے طبقے بھی خوب ہیں، وہ مطلقاً یہ ظاہر ہونے نہیں دیتے کہ

① مناچم بیگن کو جو باعزت مقام حاصل ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب کی ''خیالات کی منڈی'' میں عربوں کی قطعاً شنوائی نہیں ہوتی (یعنی نہ ان کا نقطۂ نظر منظرِ شہود پر آتا ہے اور نہ کسی کو یہ معلوم ہونے دیا جاتا ہے کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ یوں مناچم بیگن، اس کے چیلے چانٹوں بلکہ تمام یہودیوں کے لیے میدان صاف ہے، وہ جو چاہتے ہیں، چھپواتے اور نشر کراتے ہیں اور اس طرح یک طرفہ پراپیگنڈے سے امریکیوں کو گمراہ کرتے رہتے ہیں۔)

② یہ کہ 1948ء سے قبل فلسطین میں جو یہودی مملکت وجود میں آئی تھی، وہ واقعہ آج سے دو ہزار سال قبل پیش آیا تھا اور یہ کہ اس کی مدّت صرف ساٹھ سال تھی۔

③ اور یہ کہ فلسطینیوں کو جس طرح منتشر ہونا پڑا۔ وہ کوئی خدائی تقاضا نہیں تھا بلکہ یہ سب کچھ ایک مخصوص قسم کی طاقت اور حیلوں کا شاخسانہ تھا۔ صیہونی اپنی تاریخ کی جس طرح پردہ پوشی کرتے ہیں، وہ اب محض ان کی ہی عادتِ ثانیہ نہیں بن چکی بلکہ دوسرے بھی اس حرکت کے ارتکاب میں کچھ پیچھے نہیں رہتے، مشرقِ وسطیٰ میں ''ہمہ گیر اور جامع امن'' کے حصول و قیام کے سلسلے میں جو گفتگوئیں، مذاکرات اور بحث مباحثے ہوتے رہے اور ہو رہے ہیں، ان کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو (صیہونیوں کا) اپنی تاریخ کو اس انداز سے پیش کرنا، ان کی طرف سے ایک مخصوص قسم کی ذہنی اور سیاسی کارروائی ہے حالانکہ اس تاریخ کو فلسطین اور فلسطینیوں سے بزور ہتھیایا گیا ہے کیونکہ یہی وہ ستم رسیدگان ہیں جن کی تاریخ اور حالات و کوائف کو پردۂ اخفا میں رکھا گیا ہے اور اسی امر پر صیہونیت اور اسرائیل نے اپنی بقا کا انحصار کیا ہے۔

قسم قسم کی وجوہات کے پیشِ نظر اس بحث و تمحیص میں امریکا کو جو خصوصی بلکہ امتیازی مقام حاصل ہے، وہ بہت مرعوب کن ہے۔ امریکا کے علاوہ دُنیا کا کوئی اور ملک ایسا نہیں جہاں صیہونیت کو تبرک کا درجہ دیا جاتا ہو، یعنی اسے ایک ایسی چیز سمجھا جاتا ہو، جس کی پاکیزگی، تقدس اور نفاست کی خود دیوتا بھی قسم اٹھاتے ہوں اور جس پر معمولی سے معمولی اعتراض کو بھی بے ادبی گردانا جاتا ہو۔ پھر پوری دُنیا گھوم جائیے، آپ کو کوئی ایسا ملک نظر نہیں آئے گا جہاں طاقتور اداروں اور مفادات...... اخبارات و جرائد، لبرل دانشوروں، فوجی اور صنعتی کارخانوں اور اداروں، اعلیٰ تعلیمی اداروں کے اساتذہ اور منتظمین، مزدوروں کی تنظیموں......کا اتنا زبردست گٹھ جوڑ دیکھنے کو ملے۔ یہ ادارے، تنظیمیں اور اشخاص یہ باور کرتے ہیں (اور اس کا ذکر میں باب اوّل میں بھی کر چکا ہوں) کہ وہ جس قدر آنکھیں بند کر کے صیہونیت اور اسرائیل کی حمایت کریں گے اندرون ملک اور بیرون ملک ان کا وقار اتنا ہی بلند ہوگا۔ اگرچہ حالیہ برسوں کے دوران میں اس مہتم بالشان اتفاقِ رائے میں تبدیلی

کے کچھ خفیف سے آثار دکھائی دینے لگے ہیں① لیکن اسرائیل کی طرف جو واضح جھکاؤ موجود ہے، وہ ابھی تک پوری طرح جاری و ساری ہے۔ یہ جھکاؤ کیوں موجود ہے؟ اس کی وجہ محض یہ نہیں کہ ثقافتی طور پر اس (جھکاؤ) کی جڑیں یورپ میں بالعموم اور امریکا میں بالخصوص بہت گہری ہیں کہ کلی تاریخی حقیقت کے مقابلے میں اس نے جو منفی، ممانعتی② کردار اختیار کر رکھا ہے، وہ بہت منظم اور مربوط ہے۔

تاہم اس زبردست تاریخی حقیقت سے آنکھیں نہیں چرائی جاسکتیں کہ آپ جب فلسطینی عوام کے متعلق ان حقائق سے، جنھیں صیہونیت نے اخفائے راز میں رکھا ہے، عہدہ برآ ہونے کی کوشش کریں گے تو آپ کی ان کوششوں کے ڈانڈے ایک طرف تو یہود دشمنی کے پورے تباہ کن مسئلے سے جاملیں گے اور دوسری طرف ان باہمی پیچیدہ تعلقات کے ساتھ جو فلسطینیوں اور عرب مملکتوں کے مابین پائے جاتے ہیں، ہر وہ شخص جس نے 1978ء کے موسم بہار کے دوران میں ٹیلیویژن پر امریکا کی نیشنل براڈکاسٹنگ کارپوریشن (این بی سی) کی فلم ''قیامتِ صغریٰ''③ دیکھی تھی، اس بات سے آگاہ تھا کہ اس فلم کے پیش کرنے کا کم از کم جزوی مقصد یہ تھا کہ اس کے ذریعے صیہونیت کا جواز ڈھونڈا جائے اور ناظرین کو اس کا قائل کیا جائے...... حالانکہ جس زمانے میں یہ فلم دکھائی جارہی تھی، عین انھی ایام کے دوران میں خود اسرائیلی فوجوں نے لبنان میں ایک قیامتِ صغریٰ برپا کر رکھی تھی، وسیع و عریض علاقے تباہ و برباد کر دیے گئے، ہزاروں شہری باشندوں کو یا تو موت کی نیند سلا دیا گیا یا گھائل کر دیا گیا اور لاکھوں کو بے پناہ مصائب و آلام جھیلنا پڑے۔ یہ تباہی اتنی ہمہ گیر اور اتنی شدید تھی کہ بعض

---

① یہ تبدیلی کیوں آئی ہے، اس کی وجوہ مختلف ہیں۔ اس میں کچھ تو عرب تیل کا ہاتھ ہے۔ پھر مصر اور سعودی عرب جیسی قدامت پسند مملکتوں کے ظہور نے بھی کچھ کردار ادا کیا ہے۔ یہ مملکتیں امریکا کی حلیف ہیں اور اسرائیل مخالف پلڑے میں ان کا وزن پڑنے سے اسرائیل کے خلاف فضا سازگار کرنے میں کچھ مدد ملی ہے۔ پھر فلسطینی عوام اور ان کی نمائندہ جماعت، پی ایل او نے سیاسی اور فوجی اعتبار سے اپنی جو زبردست ساکھ منوائی ہے، وہ بھی سب پر عیاں ہے۔ (مصنف)

② اصل میں یہاں مصنف نے انگریزی زبان کا لفظ (Interdictory) استعمال کیا ہے۔ اس لفظ کے ساتھ کچھ تاریخی یادیں وابستہ ہیں۔ رومن کیتھولک کلیسا جس شخص یا مقام کے متعلق ناراضی کا اظہار کرنا چاہتا تھا اسے مذہبی فرائض کی بجا آوری کے حق سے محروم کر دیا جاتا تھا۔ اس شخص کا مردہ بھی خراب ہوتا تھا کیونکہ اس کی تدفین پر مذہبی رسوم ادا نہیں کی جاسکتی تھیں۔ اس فعل کو (Interdict) کہا جاتا تھا۔ چونکہ مغرب کے لوگ بھی صحیح تاریخ کو نہیں مانتے اور فلسطینیوں کے متعلق ایک منفی رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح رومن کیتھولک کلیسا کی نظروں میں وہ شخص ''معدوم'' ہو جاتا تھا جس کو یہ سزا دیتا تھا، اسی طرح مغرب کے لوگوں کی نظروں میں فلسطینیوں کا شاید کوئی وجود نہیں۔

③ انگریزی میں اس فلم کا نام ''Holocaust'' ہے اس میں اس ''قتلِ عام'' کا ذکر ہے جو کہا جاتا ہے کہ جنگِ عظیم کے دوران میں جرمن نازیوں کے ہاتھوں یہودیوں کا ہوا تھا۔

بعض جرأت مند رپورٹرز اس کا موازنہ اس تباہی و بربادی کے ساتھ کیے بغیر نہ رہ سکے جو امریکا نے ویت نام میں روا رکھی تھی ① اسی طرح 1978ء کے اوائل میں جس پیکج ڈیل ② کے تحت اسرائیل، مصر اور سعودی عرب کو امریکی جنگی طیارے فروخت کرنے کی راہ ہموار ہوئی، اس پر وہ ہنگامہ کھڑا کیا گیا کہ عربوں کی آزادی کے لیے کام کرنے والی تحریکوں کی اس مشکل میں اور بھی شدّت پیدا ہوگئی کہ وہ دائیں بازو والی عرب حکومتوں کے ساتھ اپنا رشتہ کیسے استوار کریں؟ ایسے معاملات میں تنقید کا کام یا بالفاظِ دیگر تنقیدی شعور کا کردار ہونا چاہیے کہ جہاں پہلے امتیازات اور اختلافات موجود نہیں، وہاں وہ امتیازات ڈھونڈے، اختلافات پیدا کرے۔ فلسطین میں صیہونیت نے جو گل کھلائے ہیں، اگر کوئی شخص ان کا تنقیدی جائزہ پیش کرتا ہے تو اس کا مطلب نہ کبھی یہ تھا اور نہ کبھی یہ ہے کہ وہ شخص یہود دشمن ہے۔ اس کے برعکس فلسطینیوں کے حقوق اور ان کے حقِ رائے شماری کی بازیابی کے لیے جو جدّوجہد کی جاتی ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوسکتا کہ اس قسم کی جدّوجہد میں حصہ لینے والا شخص سعودی شاہی خانوادے کی تائید وحمایت کر رہا ہے اور نہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ شخص اکثر عرب ممالک کے فرسودہ اور جابرانہ مملکتی ڈھانچوں کو مضبوط بنا رہا ہے۔

تاہم ہمیں اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیے کہ صیہونیوں کی یہ جو عادت ہے کہ وہ ہر اس شخص کو جو صیہونیت کی مخالفت کرتا ہے، یہود دشمن قرار دے دیتے ہیں۔ (مغرب کے) تمام لبرل بلکہ بڑے بڑے انتہا پسندوں (RADICALS) کی کثیر تعداد بھی اسی علت میں گرفتار ہے اور وہ اس سے چھٹکارا نہیں پا سکے۔ چنانچہ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہر نیک نیت شخص جنوبی افریقہ یا خود امریکا کی نسل پرستی کی بھی مخالفت کرسکتا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ زبان کو جنبش دیے بغیر اس نسلی امتیاز کی حمایت بھی کر سکتے ہیں جس کا ارتکاب فلسطین میں صیہونی غیر یہودیوں کے خلاف کر رہے ہیں۔ حال یہ ہے کہ غیر صیہونیوں نے تاریخ کے متعلق جو کتابیں تحریر کی ہیں، امریکا میں وہ کہیں بھی آسانی سے دستیاب نہیں ہوتی۔ ذرائع ابلاغ کا رویہ یہ ہے کہ وہ پیچیدہ اور گنجلک مسائل (مثلاً یہودی بمقابلہ عرب) کو سہل اور آسان تر بنا کر پیش کرنے کی روش پر گامزن

---

① اس قسم کی امریکی اخبارات میں جو رپورٹیں شائع ہوئی، ان میں سے ایک رپورٹ ایک صحافی ایچ ڈی ایس گرین وے نے مرتب کی تھی اور یہ ''واشنگٹن پوسٹ'' کے 25 مارچ 1978ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ اس کا عنوان تھا:

Vietnam-style Raids Gut South Lebanon: Israel leaves a path of destruction

② Package Deal: مختلف اشیا پر مشتمل پیشکش۔ پیش کرنے والا جن اشیا کی پیشکش کرتا ہے، ان میں سے کچھ وصول کنندہ کے لیے ضروری ہوتی ہیں اور کچھ غیر ضروری۔ کوالٹی کے اعتبار سے بھی بعض اچھی ہوتی ہیں اور بعض واجبی لیکن وصول کنندہ کو سبھی کی وصولی کے متعلق اتفاق کرنا پڑتا ہے، ورنہ پیشکش منسوخ کیے جانے کا خطرہ رہتا ہے۔

ہیں۔ دباؤ ڈالنے کے لیے یہودیوں نے جو مختلف گروپ تشکیل کیے ہوئے ہیں، وہ تنگی موقع پرستی سے کام لیتے ہیں۔ یونیورسٹیوں اور اعلیٰ تعلیمی اداروں کے ساتھ جو دانش ور وابستہ ہیں، ان میں یہ رجحان عام پایا جاتا ہے (اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ رجحان ان کی طبیعتوں کا خاصہ ہے) کہ وہ جانچے پرکھے بغیر پیش پا افتادہ جملوں اور فرسودہ سیاسی نعروں کی جگالی کرتے رہتے ہیں۔[1] ایک ایسے زمانے میں جب یہودیوں کا نام ونشان تک مٹا دینے کے لیے ان کا ''قتلِ عام'' کیا جارہا تھا، خود یہودی ان لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کر رہے تھے، جو ان کے زخم خوردہ اور ستائے ہوئے تھے، اس کا ذکر تک نہیں کیا جاتا اس بات کو انتہائی حساس تسلیم کیا جاتا ہے کہ لوگ ان کا ذکر کرتے ہوئے بھی خوف محسوس کرتے ہیں...... ان تمام امور نے مل جل کر ایسے اسباب فراہم کر دیے ہیں جن کی مدد سے لوگوں کے ذہنوں میں کوڑا بھرا جاسکتا ہے اور ان کے دماغوں پر قفل لگائے جاسکتے ہیں اور یوں ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت ہر کس و ناکس کو مجبور کیا جاسکتا ہے کہ وہ بلاچون و چرا اسرائیل کی حمایت کرتا رہے اور اس کا دم بھرتا ہے لیکن جیسا کہ آئی ایف سٹون نے حال ہی میں یہ تبصرہ کیا ہے کہ جس اتفاقِ رائے سے صیہونیت کی حمایت وتائید کی جاتی ہے، خود اکثر اسرائیلی بھی اس (صیہونیت) کی اتنی حمایت نہیں کرتے ہوں گے۔

یہاں تصویر کا دوسرا رخ بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے۔ ایک خیال کی حیثیت سے یہودیوں کے لیے صیہونیت میں جو قوت و طاقت ہے، اسے نظر انداز کرنا ناانصافی ہوگا۔ پھر صیہونیت کی خوبیاں بیان کرنے، اس کے صحیح معانی متعین کرنے، اس کے مسیحائی مقدر پر زور دینے اور اسی قسم کی دوسری باتیں کرنے کے لیے صیہونی جو آپس میں مباحث کرتے ہیں، ان کی اہمیت کو گھٹا کر پیش کرنا بھی زیادتی ہوگیا۔ صیہونیت کیا ہے؟ اس کی ''تعریف'' کیا ہوسکتی ہے، ان سوالوں کے جوابات تلاش کرنا تو بہت دور کی بات ہے، عربوں کے لیے اس موضوع کا ذکر چھیڑنا بھی بہت تکلیف دہ امر ہے۔ تاہم اس کا دیانتداری سے جائزہ لینا ایک ناگزیر معاملہ بن چکا ہے۔ یہاں میں اپنے آپ کو ہی بطور مثال پیش کرتا ہوں۔ میری بیشتر تعلیم اور اساسی طور پر میری تمام ذہنی اور تعقلی ساخت مغربی سانچوں کی مرہونِ منت ہے۔ جو کچھ میں پڑھتا ہوں، جو کچھ میں لکھتا ہوں، بلکہ سیاسی طور پر بھی جو کچھ میں کرتا ہوں، میں ان تمام امور میں ان رویوں سے شدید طور پر متاثر ہوں جو مغرب والوں نے بحیثیت مجموعی یہودیوں کی تاریخ، یہود دشمنی اور یورپی یہودیوں کی تباہی و بربادی کے متعلق اپنا رکھے ہیں۔ بیشتر عرب دانشوروں کے برعکس، ظاہر ہے کہ ان کی اکثریت کا پس منظر وہ نہیں جو میرا ہے، مجھے

[1] یہ وہی رول ہے جو گرامشی نے روایتی دانش وروں کے کھاتے میں ڈالا تھا یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو کسی چیز کو جائز بنانے یا اس کا جواز ڈھونڈنے کے ماہر ہیں۔ (مصنف)

یہودی تاریخ اور تجربے کے ان پہلوؤں کا براہِ راست مشاہدہ کرنے کا موقع ملا ہے جو یہودیوں اور مغرب کے ان غیر یہودیوں کے لیے، جو یہودی تاریخ کا مطالعہ کرتے اور اس کے متعلق سوچ بچار کرتے رہتے ہیں، غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ مغرب کے کسی بھی تعلیم یافتہ شخص کی طرح میں بھی یہ بات بہ خوبی جانتا ہوں کہ یہودیوں کے لیے ''یہود دشمنی''[1] خاص طور پر موجودہ صدی میں، کیا نتائج لے کر آئی تھی۔ چنانچہ میں اس دہشت اور انبساط کو جو (یہودیوں کے معاملے میں) آپس میں گتھے ہوئے ہیں اور جن کے ملغوبے سے صیہونیت نے نشوونما پائی ہے، سمجھ سکتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ میں اس بات کا بھی ادراک کر سکتا ہوں کہ یہودیوں، بلکہ مغرب کے روشن خیال لبرل طبقے کی نگاہوں میں بھی، اسرائیل کیا معنی رکھتا ہے۔ پھر بھی، چونکہ میں ایک عرب فلسطینی ہوں، میں دوسری چیزیں بھی دیکھ اور محسوس کر سکتا ہوں......اور یہ وہ باتیں ہیں جو معاملات کو اس قدر پیچیدہ اور گنجلک بنا دیتی ہیں کہ وہ میرے لیے اس امر کا موجب بن جاتی ہیں کہ میں صیہونیت کے دوسروں پہلوؤں پر بھی اپنی توجہ مرکوز کروں، اس سے جو نتیجہ برآمد ہوا ہے، میرے خیال کے مطابق وہ اس قابل ہے کہ اسے (کھول کر) بیان کیا جائے۔ بیان کرنے کی وجہ یہ نہیں کہ جو کچھ میں سوچتا ہوں وہ کوئی بہت اہم ہے بلکہ میرے اندازے کے مطابق اس کی وجہ یہ بنتی ہے کہ فائدہ اس میں ہے کہ ہر معاملے کو اس طور دیکھنا پرکھنا چاہیے کہ اس کے دو پہلو ہیں۔ یہ دونوں پہلو ایک دوسرے کی تکمیل تو ضرور کرتے ہیں لیکن عام حالات میں ان کا آپس میں کوئی ربط ضبط نہیں ہوتا۔

ہم اپنی بات کا آغاز ایک ادبی مثال......جارج ایلیٹ[2] کے آخری ناول ڈینیل ڈرونڈا...... سے کر سکتے ہیں۔ اگرچہ جس شخص نے بھی ایلیٹ کے اس سے پہلے لکھے گئے ناولوں کا مطالعہ کیا ہے، وہ اس ناول میں بھی نہایت آسانی کے ساتھ اس کے اصل اور بڑے موضوعات کی پہچان کر سکتا ہے، تاہم اس کتاب کا ایک

---

[1] Anti-Semitism

[2] جارج ایلیٹ (1819ء۔1880ء): جارج ایلیٹ کا اصل نام میری این ایونز (Mary Ann Evans) تھا۔ اس نے جب اپنا پہلا ناول تحریر کیا تو ناکامی کا خوف اتنا زیادہ تھا کہ اس نے ایک مردانہ نام قلمی نام کی حیثیت سے اختیار کر لیا اور اسی نام سے اس نے شہرت پائی۔ وہ انگریزی کے عظیم ترین ناول نگاروں میں شمار ہوتی ہے۔ انگریز زبان و ادب کے ایک ماہر نقاد ایف......تو اسے ان چار ناول نگاروں میں شمار کرتا ہے جن سے انگریزی ناول نگاری کی عظیم روایت قائم ہوئی ہے اس کے مشہور ترین ناولوں میں-------- The Mill on the Floos, Silas Marner, Adam Bede Middle شامل ہیں اس کا ناول ''Daniel Deronda'' 1876ء میں شائع ہوا تھا۔ پاکستان کی تقریباً تمام یونیورسٹیوں میں اس کا کوئی نہ کوئی ناول ایم اے (انگریزی) کے نصاب میں شامل ہے۔

غیر معمولی وصف یہ ہے کہ اس کا اصل موضوع صیہونیت ہے۔ ایلیٹ کو عینیت میں جو عمومی دلچسپی تھی اور روحانی تشنگی کو دور کرنے کی وہ جس قدر آرزو مند تھی، ان کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ انیسویں صدی کے باشعور طبقے نے، جو ابھی تک یہ امیدیں لگائے بیٹھا تھا کہ ایک سیکولر مذہبی معاشرے کی تعمیر و تشکیل ممکن ہے، دُنیا کی فلاح و بہبود کے متعلق جو منصوبے تراشے تھے، صیہونیت انھی منصوبوں کی ایک کڑی تھی اور خود ایلیٹ اس معاملے میں اس طبقے سے متفق تھی۔ مختلف منصوبوں کے لیے مختلف لوگوں میں جو جنوں اور اشتیاق پایا جاتا تھا، جارج ایلیٹ نے اپنی سابقہ کتابوں میں ان میں سے کئی ایک کا مطالعہ پیش کیا تھا۔ ان منصوبوں کا مقصد و مدعا یہ تھا کہ انھیں منظم مذہب کی جگہ مروج کیا جائے۔ ایسے منصوبوں میں ان لوگوں کے لیے بہت کشش کا سامان تھا جو اگر مربوط عقائد کے زمانے میں پیدا ہوئے ہوتے تو (اپنے کارناموں اور قربانیوں کے طفیل) اپنے زمانے کے سینٹ تریسا① کا درجہ حاصل کر لیتے۔ ایلیٹ نے سینٹ ٹریسا کا حوالہ اولین بار اپنے ایک ابتدائی ناول ''مڈل مارچ'' میں دیا تھا۔ اپنے اس ناول کی ہیروئن ڈروتھیا بروک کے خدّوخال ابھارنے کے لیے جارج ایلیٹ نے اسے (سینٹ تریسا کو) استعمال کیا تھا لیکن اس عمل کے ذریعے وہ درحقیقت اس امر کی تحسین کرنا چاہتی تھی کہ باوجودیکہ دُنیائے جدید میں ان ضمانتوں اور یقین دہانیوں کا فقدان تھا جو عقیدے اور علم کی ترویج کے لیے ضروری ہوتی ہیں، خود اس نے اپنی بصیرانہ② اور اخلاق

---

① سینٹ ٹریسا (Saint Terasai): سینٹ ٹریسا (1515ء-1582ء) ایک ہسپانوی راہبہ اور مصلح تھی۔ وہ ہسپانیہ کے شہر اویلا (Avila) میں پیدا ہوئی۔ وہ بچپن سے ہی مذہب کی طرف مائل تھی چنانچہ اس نے ترکِ دُنیا اختیار کی اور ایک خانقاہ سے وابستہ ہوگئی۔ جب یورپ میں مارٹن لوتھر کے زیر اثر پروٹسٹنٹ طبقہ فروغ حاصل کرتا جا رہا تھا تو رومن کیتھولک فرقے نے اس کے آگے بند باندھنے کی کوشش کی مگر ہسپانیہ میں اس نئے طبقے کے راستے میں جو لوگ مزاحم ہوئے، ان میں ٹریسا کا نام سب سے اوپر آتا ہے، اس نے پینسٹھ خانقاہیں خود قائم کیں، اور سترہ دوسروں سے قائم کرائیں۔ اس نے بے شمار لیکچر دیے اور کئی کتابیں تصنیف کیں۔ 1622ء میں اسے سینٹ کا رتبہ دیا گیا۔

② ترجمے میں جو الفاظ ''بصیرانہ اور خواب'' استعمال کیے گئے ہیں، وہ دراصل انگریزی کے الفاظ Visionary اور Vision کا غیر تسلی بخش ترجمہ ہیں۔ انگریزی میں Vision مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ بعض اوقات صوفیائے کرام کی طرح کسی شخص پر جذب وکیف کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے اور وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں فوق الفطرت ہستیوں یا اشیا کو ایسے ہی دیکھ رہا ہوں جیسے عام انسان اپنی آنکھ سے کسی مادی اشیا کو دیکھتے ہیں، تو اس فعل کو اس کا Vision کہا جائے گا۔ یہاں Visionary انھی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ آپ کسی مثالی شے یا مثالی صورتِ حال کا نقشہ اپنے تصور میں باندھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ آپ کے آپ، آپ کے معاشرے اور ملک وقوم کے لیے اس سے بہتر شے اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ یہ بھی ''ویژن'' ہے۔ ویژن والے لوگ ہی قوموں اور ملکوں کی تقدیر تبدیل کرتے ہیں۔ متن میں اس کا ترجمہ ''خواب'' کیا گیا ہے۔

قوتوں کو برقرار رکھا تھا۔ ناول کے اختتام پر ڈوروتھیا ایک ایسی خاتون کے روپ میں ظہور کرتی ہے جس کا مختلف النوع عذاب اور سختیاں جھیلنے کے بعد تزکیۂ نفس ہو چکا ہے، جو اس بات پر مجبور ہو جاتی ہے کہ اس نے ''بھرپور'' زندگی گزارنے کے متعلق جو عظیم الشان خواب بنے تھے، ان سے دستبردار ہو جائے اور اس کے عوض ایک ایسی گھریلو زندگی قبول کرلے جس میں بیوی اور ماں کی حیثیت سے اسے نسبتاً معمولی قسم کی کامیابی کی ضمانت مل سکتی تھی۔ حالات و واقعات کے متعلق یہاں جو پست نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے، جسے ''ڈینئل ڈرونڈا'' (بحیثیت ایک ناول) اور خاص طور پر صیہونیت نے، نظرِثانی کے بعد بلندی کی طرف اٹھا دیا ہے۔ اس نظرِثانی شدہ نقطۂ نظر کا مقصود یہ ہے کہ ایک ایسا پُرامید معاشرتی اور مذہبی منصوبہ پیش کیا جائے کہ ایک فرد کی قوتیں اور صلاحیتیں ایک اجتماعی خواب میں ضم ہو جائیں اور وہ اپنی شناخت محض اسی کے حوالے سے کرنا شروع کر دے۔ اس سارے منصوبے نے یہودیت کی کوکھ سے جنم لینا تھا۔

ناول کی کہانی باری باری دو اجزا کے گرد گھومتی ہے۔ جزو اول میں برطانیہ کے اونچے بورژوا طبقے کے، جو حیران کن حد تک اپنی جڑوں سے محروم ہے، آداب و شعائر کا تلخ انداز سے مضحکہ اڑایا گیا ہے۔ جزو دوم میں ناول کے ہیرو، ڈینئل ڈرونڈا...... جو ایک بدیسی قوم کا نوجوان فرد ہے اور جس کے متعلق کوئی نہیں جانتا کہ اس کے ماں باپ کون تھے لیکن جو ایک برطانوی اسٹوکریٹ، ① سر ہوگو میلنگر کی تولیت میں ہے...... کو بہ تدریج اپنی یہودی شناخت سے آگاہ کیا جاتا ہے اور جب وہ مورڈیکائی ایزرا کوہن کا روحانی مرید بن جاتا ہے تو اسے یہ باور کرایا جاتا ہے کہ ایک یہودی کی حیثیت سے اس کا مقدر کیا ہے۔ ناول کے اختتام پر ڈینیل مورڈیکائی کی ہمشیرہ سے شادی کر لیتا ہے اور اپنے آپ کو اس بات کا پابند کر لیتا ہے کہ مورڈیکائی نے یہودیوں کے مستقبل کے بارے میں جو امیدیں اس سے وابستہ کی تھیں، وہ ان کی تکمیل کرے گا۔ جب نوجوان جوڑا شادی کے بندھنوں میں بندھ چکتا ہے، مورڈیکائی انتقال کر جاتا ہے۔ تاہم اس کے انتقال سے بہت قبل ہی یہ بات بالکل واضح ہو چکی ہوتی ہے کہ اس کے صیہونی خیالات ڈینیل کے دماغ اور روح میں پوری طرح سرایت کر چکے ہیں۔

---

① ارسٹوکریٹ: برطانیہ اس لحاظ سے دُنیا کا غالباً انوکھا ملک ہے جہاں دو قسم کے طبقے پائے جاتے ہیں۔ ایک تو عوام الناس کا طبقہ ہے لیکن دوسرا طبقہ ''اشرافیہ'' یا ''ارسٹوکریسی'' کے افراد پر مشتمل ہے۔ اگرچہ اس طبقے میں شامل ہونے کے لیے دولت مند ہونا مفید ہے لیکن محض دولت ہی کافی نہیں۔ بادشاہ جس شخص سے خوش ہوتا تھا، اسے خطاب اور اکثر اوقات جاگیر دے دیتا تھا۔ مدتیں گزرنے کے بعد اس شخص یا اس کی اولاد کی چال ڈھال، آداب، طرزِ عمل، بود و باش وغیرہ میں ایک خاص قسم کا وقار پیدا ہو جاتا، تب وہ صحیح معنوں میں ''طبقۂ اشرافیہ'' میں داخل ہوتا۔ ''دارالامرا'' کے ارکان جج کلیسا کے اعلیٰ عہدے دار، بڑے بڑے فوجی افسر، بادشاہ کے درباری اور بڑے بڑے جاگیردار، اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور اب بھی رکھتے ہیں۔

ڈینیل ان خیالات سے کس حد تک متاثر ہو چکا ہے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ نو بیاہتا جوڑے کو شادی کے موقع پر جو ''زبردست تحائف'' ملتے ہیں، ان میں سے ایک تحفہ ''مکمل سفری سامان'' پر مشتمل ہے۔ انھیں یہ تحفہ سر ہوگو اور لیڈی میلنگر نے دیا ہے۔ اب ڈینیل اور ان کی زوجہ فلسطین کے سفر پر روانہ ہوں گے اور اس سفر کا مقصد غالباً صیہونی منصوبے پر عمل درآمد کی راہ ہموار کرنا ہے۔ ناول میں صیہونیت کو جس انداز سے پیش کیا گیا ہے، اس کے متعلق اہم ترین بات یہ ہے کہ اس میں جس ماحول اور گردو پیش کی نقشہ کشی کی گئی ہے، وہ بے وطنی اور بے خانمائی کی عمومی کیفیت ہے۔ ناول میں نہ صرف یہودیوں بلکہ متموّل، صاحبِ حیثیت اور عالی نسب انگریز مردوں اور عورتوں کی بھی کچھ اس طور پر تصویر کشی کی گئی ہے، جیسے ان کا نہ کوئی گھر ہو نہ بار، نہ دوست ہو نہ سنگی، جو بس ایک اجنبی ماحول میں بھولے بھٹکے پھر رہے ہیں۔ اگر ناول میں ایک طرف مسز دیوی لو اور اس کی بیٹیوں جیسے مفلس و نادار انگریزی کردار ہیں جنھیں ہمیشہ کرائے کے ایک مکان سے دوسرے مکان کی تلاش میں خوار ہوتے دکھایا گیا ہے، تو متموّل اور کھاتے پیتے اونچے طبقے کے لوگ بھی اپنے مستقل گھروں سے کچھ کم کٹے ہوئے نہیں ہیں، چنانچہ ایلیٹ نے یہودیوں کی حالتِ زار کو اپنے مقصد کے لیے بھی استعمال کیا ہے۔ وہ دکھانا یہ چاہتی ہے کہ انیسویں صدی کے لوگوں کو ایک مستقل گھر اور ٹھکانے کی شدید ضرورت ہے اور یہ بات عالمگیر طور پر درست ہے، چنانچہ وہ ہمیں بتاتی ہے کہ نفسیاتی اور روحانی طور پر ان لوگوں کی کوئی جڑیں نہیں۔ یہ لوگ جس طرح اپنی جڑوں سے محروم ہو چکے ہیں، اس کا انعکاس اس کے کرداروں کی اس جسمانی بے چینی سے ہوتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ (جسمانی بے چینی) ان کے وجود کا لازمی جزو ہو۔ ایلیٹ کو صیہونیت میں جو دلچسپی تھی، اس کا سراغ اس کی اس سوچ سے لگایا جاسکتا ہے، جس کا ذکر ناول کے ابتدائی حصے میں ملتا ہے:

> میں سمجھتی ہوں کہ انسانی زندگی کی جڑیں آبائی وطن کے کسی گوشے میں پیوست ہونا چاہییں۔ یہی وہ گوشہ ہے جہاں اسے اس نرم، ملائم اور کومل رشتے کی محبت مل سکتی ہے، جو اس کا روئے زمین کے ساتھ، اس محنت و مشقت کے ساتھ، جو انسان جھیلتے ہیں، ان آوازوں اور لہجوں کے ساتھ، جن کی گونج ہر وقت وہاں سنائی دیتی ہے، اور ہر اس چیز کے ساتھ جو اس کے ابتدائی گھر کو مستقبل میں حاصل ہونے والے وسعت پذیر علم کے مابین، جانے پہچانے اور مغالطے سے پاک انداز سے (دوسروں کے گھروں یا اوطان سے) مختلف بنا دیتی ہے، استوار ہوتا ہے۔ ①

① ''ڈینیل ڈرونڈا'' از جارج ایلیٹ۔ مطبوعہ پینگوئن بکس، لندن (1967ء) صفحہ نمبر: 50

''ابتدائی گھر'' تلاش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک ایسی جگہ تلاش کی جائے جہاں ابتداً انسان کو وہی سکون حاصل تھا، جو ہو بہو گھر میں ملتا ہے۔ یہ وہ کام ہے جو کبھی تو افراد کرتے ہیں اور کبھی ایک ''قوم'' یا ''گروہ''۔ چنانچہ تاریخی اعتبار سے مناسب بات یہی ہے کہ اس کام کا بیڑا اٹھانے اور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے جو افراد اور ''قوم'' موزوں ترین ہیں، وہ یہودی ہوں۔ صرف یہودی ہی وہ لوگ ہیں جن میں ایک قوم کی حیثیت سے (اور نتیجتاً افراد کی حیثیت سے) یہ دو باتیں ابھی تک موجود ہیں۔ ایک تو یہ کہ انھیں احساس ہے کہ ان کا ابتدائی (اور اصلی) گھر صیہون ہے، دوسرے وہ ہر دور میں اور ہمیشہ اپنے اس نقصان کو شدّت کے ساتھ محسوس کرتے رہے اور کر رہے ہیں۔ اس بات کے باوجود ہر جگہ ''یہود دشمنی'' کے جذبات کا چلن ہے، یہودی ''غیر یہودیوں''[1] کے منہ پر ایک طمانچا ہیں کیونکہ ان غیر یہودیوں نے مدّتوں سے ان اجتماعی عقائد پر ''عمل کرنا'' چھوڑ رکھا ہے، جو انسانوں کی تربیت کرتے ہیں اور انھیں شائستہ و متمدن بناتے ہیں۔ چنانچہ مورڈیکائی ان جذبات کو موجودہ زمانے کے یہودیوں کے لیے ایک واضح پروگرام کے طور پر قطعی انداز سے پیش کرتا ہے۔

> یہ (غیر یہودی) ہمارے لوگوں کو بنظرِ حقارت دیکھتے ہیں کیونکہ ان کے خیال کے مطابق ہم جاہلانہ رسوم و قیود کی پابندی کرتے ہیں لیکن (ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ) بدترین جہالت وہ ہے جس میں کوئی عمل یا پابندی نہیں...... یہ اتنی اسفل ترین چیز ہے کہ اس کا درجہ گھٹ کر لومڑی کے مکارانہ حرص و طمع کی سطح تک پہنچ جاتا ہے جس کے نزدیک تمام قوانین کی حیثیت کسی پھندے یا کسی پریشان کرنے والے شکاری کتے کی چیخ چنگھاڑ سے زیادہ نہیں۔ حافظے کی عمیق گہرائیوں میں ایک ایسی رذالت بھی موجود ہوتی ہے جو مرجھا کر توہم کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ تین براعظموں میں جہلا کے اس انبوہِ کثیر کے عین درمیان، ان لوگوں میں جو ہماری رسوم کی پابندی کرتے ہیں اور الوہی وحدت کا اعتراف کرتے ہیں، یہودیت کی روح مردہ نہیں ہوئی۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم نامیاتی مرکز کا احیا کریں، وحدت اسرائیل کو، جس نے ہمارے مذہب کی نشوونما کی اور اسے ایک صورت عطا کی، ایک خارجی حقیقت کا روپ پہنائیں۔ ہمارے لوگ جو دُنیا کے کونے کونے میں منتشر ہو چکے ہیں، جب ان کا دھیان اس امر کی طرف منعطف ہوگا کہ ہمیں ایک وطن، ایک منظم معاشرے اور ایک منظم سیاسی نظام کی تشکیل کرنا چاہیے تو وہ ایک

---

[1] ضمیمہ ملاحظہ ہو

ایسی پُر وقار قومی زندگی میں شریک ہوسکیں گے جس کی آواز مشرق اور مغرب کی اقوام میں سنائی دے گی۔ جب یہ نیا نظام وجود میں آئے گا تو وہ ہماری نسل کی عقل وخرد، دانشمندی اور مہارت کی اس طور آبیاری کرے گی کہ وہ عہدِ عتیق کی مانند ابلاغ اور تفہیم کا ذریعہ بن جائے گی (یعنی ہماری آواز ہر جگہ پہنچ سکے گی اور ہر کوئی ہمارے نقطۂ نظر کو سمجھ سکے گا۔) ہم ایسا وقوع پذیر ہونے تو دیں، پھر تم دیکھو گے کہ جیتی جاگتی حرارت نے اسرائیل کی کمزور ناتواں انتہاؤں کو بھی چھولیا ہے (یعنی کمزور سے کمزور یہودی بھی اس نظریے سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے گا) اور پھر ہر قسم کے توہمات معدوم ہو جائیں گے۔ یہ مرتدین اور منحرفین کی لاقانونیت اور مادر پدر آزادی کے ذریعے نہیں ہوگا بلکہ ان عظیم حقیقتوں کی درخشانی کے ذریعے ہوگا، جو احساسات کو وسعت بخشتے ہیں اور تمام علم کو، محبوب یادداشتوں کو نوخیز کلیوں کی طرح زندہ بنا دیتی ہیں۔ ①

''عظیم حقائق کی درخشانی، جو احساسات کو وسعت بخشتے ہیں۔'' ایلیٹ کی ایک مخصوص ترکیب ہے اور اس بات میں قطعاً کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ وہ اپنے صیہونیوں کو بنظرِ تحسین و پسندیدگی دیکھتی ہے اور لاریب اس کی تحسین و پسندیدگی کا سبب یہ ہے کہ اسے اس بات کا کامل یقین ہے کہ یہ لوگ ایک ایسے گروہ کی تشکیل کرتے ہیں جو احساسات کی وسعت پذیر زندگی کے متعلق خود اس کے اپنے بلند و بالا خیالات کی عکاسی کرتا ہے۔ تاہم یہاں ''مغرب کی اقوام'' کا جس انداز سے ذکر ہوا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی حقیقت ہیں جو محسوس ہوتی ہے لیکن ''مشرق کی اقوام'' کے متعلق جو رویہ اختیار کیا گیا ہے اس سے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ کوئی ایسی حقیقت نہیں جو محسوس ہوتی ہو۔ یہ درست ہے کہ ان کا نام لیا گیا ہے لیکن ان کی حیثیت ایک لفظی ترکیب سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ ''ڈینیل ڈرونڈا'' میں مشرق کے متعلق جو چند ایک حوالے دیے گئے ہیں، ان سے ہمیشہ مراد انگلستان کی ہندوستانی نوآبادیاں (مقبوضات) میں ان مقبوضات کے باشندوں...... باشندوں کی حیثیت سے ان کی بھی اپنی کچھ آرزوئیں، کچھ قدریں، کچھ امنگیں ہوں گی...... کے متعلق ایلیٹ نے مطلق خاموشی کے ذریعے کامل بے نیازی کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہ حقیقت کہ ''صیہون کا پودا'' مشرق میں لگایا جائے گا، ایلیٹ کی نظروں میں کوئی خاص اہمیت کی حامل نہیں تھی، اس لیے وہ اس کا تفصیل سے ذکر نہیں کرتی۔ گویا کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ''مشرق و مغرب کی اقوام'' کی ترکیب میں وہ چیز شامل ہے جو کم از کم علاقائی طور پر ایک ناوابستہ افتتاحی حقیقت ہوگی اور جب نئی مملکت کا قیام عمل میں آجائے گا اور وہ ''ترسیل اور تفہیم'' کا ذریعہ

① ''ڈینیل ڈرونڈا'' صفحہ نمبر 594

بن جائے گی تو وہ وقت آ جائے گا جب یہی ''ناوابستہ افتتاحی حقیقت'' ایک مستقل کارنامے کا روپ دھار لے گی (اور کوئی اس میں تبدیلی نہیں لا سکے گا) اور اگر ایلیٹ یہ تصور نہ کر سکی کہ اتنے عظیم فوائد کے حامل منصوبے جو بظاہر سب کی بھلائی کے لیے بنائے جا رہے تھے، مشرقی لوگوں کی نگاہوں میں بھی کھٹکنے لگیں گے اور وہ ان پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر دیں گے، تو اس میں بھلا اس بے چاری کا کیا قصور؟

موَرڈیکائی کی تقریر ابھی ختم نہیں ہوئی۔ تاہم وہ ان امور پر جس انداز سے بار بار اصرار کرتا ہے، وہ پریشان کن ہے۔ اس کے نزدیک صیہونیت کا مطلب یہ ہے کہ ''ہماری نسل ایک مرتبہ قومیت کی خصوصیات اور امتیازی نشانات اختیار کرے گی...... یہ کاوش اس طویل کرب کا قابلِ قدر ثمر ہوگی، جو ہمارے آبا و اجداد کو بھگتنا تو ضرور پڑا لیکن اس کے ذریعے انھوں نے دروغ گوئی اور ریاکاری کی سہولت اور عافیت کو تج کر اپنے علیحدہ تشخص کو برقرار رکھا۔ صیہونیت نے بنی نوعِ انسان کے لیے ایک ''ڈرامائی'' سبق بننا ہے۔ موَرڈیکائی اپنے نظریے کی وضاحت کے لیے جو طریقہ استعمال کرتا ہے، اس میں جس چیز پر قاری کو خاص طور پر توجہ دینا چاہیے، وہ اس کی وطن کی نقشہ کشی ہے۔

یہودیوں کے پاس اتنی کافی دولت ہے کہ وہ نہایت آسانی سے اس دھرتی کو عیاش اور کنگال حکمرانوں کے قبضے سے چھڑا سکتے ہیں۔ ① ترکیبیں نکالنے اور منصوبے وضع کرنے کے لیے وہ صاحبان تدبیر و تدبر کی حکمت اور مہارت سے بہرہ ور ہیں۔ دوسروں سے اپنی بات منوانے کے لیے اس کے پاس شعلہ بیان مقرر کی زبان ہے اور کیا ہمارے مابین کوئی ایسا پیمبر یا شاعر موجود نہیں جو عیسائی مغرب کو اس بھیانک بات پر شرم دلا سکے کہ تم تو آپس میں تو تکار کر رہے ہو ایک دوسرے پر سب و شتم بھیج رہے ہو جب کہ ''ترک جنھوں نے تمھیں درندوں کی طرح آپس میں لڑنے بھڑنے کے لیے ایک اکھاڑا مہیا کر دیا ہے۔ تمھیں دیکھ رہے ہیں اور تماشے سے محظوظ ہو رہے ہیں۔ ②

> ہمارے پاس عقل و خرد اتنی وافر مقدار میں موجود ہے کہ ہم ایک نیا منظم یہودی معاشرہ اور مملکت قائم کر سکیں جو اتنی ہی رفیع الشان اور عظیم ہوگی جتنی کہ عہدِ عتیق میں تھی...... ہم ایک ایسی جمہوری مملکت کا قیام عمل میں لائیں گے جہاں ہر شخص کو مساوی طور پر عافیت حاصل ہوگی، یہ مساوات بالکل اسی قسم کی ہوگی جو جھومر بن کر ہماری قدیم قوم کی پیشانی پر ستارے کی مانند چمکتی

---

① یہاں کنگال اور عیاش حکمرانوں سے مراد خلافتِ عثمانیہ کے عمال ہیں کیونکہ انیسویں صدی میں فلسطین سلطنتِ عثمانیہ کا ایک حصہ تھا۔

② یہاں اشارہ مقدس سرزمین کے متعلق یورپی مناقشات کے طویل تاریخ کی طرف ہے۔

تھی۔ حالانکہ (ہماری) یہ (قدیم قوم) چاروں طرف سے مستبد اور مطلق العنان حکومتوں میں گھری ہوئی تھی۔ عافیت کی مساوات نے اس کے افراد کی آزادی کو وہ چمک دمک عطا کر دی تھی کہ جو (آج) اہلِ مغرب کی آزادی میں بھی نظر نہیں آتی پھر ہماری نسل کے پاس ایک نامیاتی مرکز، ایک قلب و دماغ ہوگا، جو ہماری خبر گیری کرے گا، ہماری رہنمائی کرے گا اور منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے گا۔ پھر ان یہودیوں کو جن کے حقوق پامال کیے گئے ہوں، قوموں کی عدالت میں صفائی کا حق حاصل ہوگا۔ بالکل اسی طرح جس طرح ان انگریزوں اور امریکیوں کو حاصل ہیں، جن کے حقوق پامال کیے گئے ہوں۔ جوں جوں اسرائیل ترقّی کی طرف قدم بڑھائے گا دُنیا بھی اسی رفتار سے آگے بڑھے گی۔ چونکہ مشرق کے ہراول میں ایک ایسی قوم ہوگی جس کا سینہ ہر عظیم قوم کی ثقافت اور ہمدردیوں سے لبریز ہوگا، چنانچہ اس کی سرزمین ایک ایسی سرزمین ہوگی جہاں ہر قسم کی دشمنیاں اور عداوتیں دم توڑ دیں گی۔ مشرق کے لیے یہ ایک اسی قسم کا غیر جانبدار میدان فراہم کرے گی۔ جیسے مغرب کے لیے بلجیئم ہے۔ مشکلات؟ میں جانتا ہوں کہ منزل کے راستے میں مشکلات ضرور آئیں گی، لیکن ہمارے مابین جو عظیم ہستیاں موجود ہیں، انھیں اس جذبے سے سرشار ہوجانا چاہیے کہ (ایک نہ ایک روز) رفیع و برتر کامیابی ان کے قدم چومے گی (ایک مرتبہ یہ جذبہ پیدا ہوگیا، پھر) کام کا آغاز ہوجائے گا۔ [1] (بعض عبارتیں مصنّف نے خط کشیدہ کی ہیں۔)

سرزمین زیرِ بحث کی خصوصیات دو مختلف طریقوں سے گنوائی گئی ہیں ایک طرف تو اسے عیاش اور کنگال حکمرانوں کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے۔ اسے ایک ایسا اکھاڑا بنا کر پیش کیا گیا ہے جو ترکوں نے عاریتاً متحارب درندوں کی تحویل میں دے رکھا ہے اور یہ سرزمین اس مشرق کا حصہ ہے جہاں استبدادی اور مطلق العنان حکمرانوں کا سکہ رواں دواں ہے۔ دوسری طرف اس کا سلسلہ ''مغربی آزادی کی چمک دمک'' انگلستان اور امریکا جیسی اقوام اور غیر جانبداری کے تصور (بلجیئم) کے ساتھ جوڑا گیا ہے۔ قصہ مختصر مشرق و مغرب کے ساتھ اس کے روابط اور رشتے جس انداز سے استوار کیے گئے ہیں، ان میں مشرق کی حیثیت یہ بنتی ہے کہ وہ رزیل اور ناقابلِ اعتبار ہے جب کہ اس کے مقابلے میں مغرب فضیلت مآب اور روشن خیال ہے۔ مشرق و مغرب کے ان دو متحارب فریقین کے مابین پل کا فریضہ صیہونیت سرانجام دے گی۔

---

[1] ''ڈینیل ڈرونڈا'' صفحات: 594-95

دلچسپ بات یہ ہے کہ اگرچہ ایلیٹ کے دل میں صیہونیت کے لیے تحسین وتوصیف کے جذبات موجزن ہیں، لیکن اپنے ان جذبات کو وہ ہمیشہ برقرار نہیں رکھ سکتا، وہ اس کی تحسین وتوصیف صرف اسی وقت کرتا ہے جب اسے یہ مشرق کو مغرب کے سانچے میں ڈھالنے کا ذریعہ نظر آتا ہے۔ لیکن ایسا کہنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اسے صیہونیت یا خود صیہونیوں کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ اسے یہ ہمدردی ہے لیکن یہودی تجربے اور تگ وتاز کا میدان بہت وسیع وعریض ہے۔ اس کے ایک سرے پر تو ان کی یہ شدید خواہش موجزن ہے کہ وہ اپنے لیے ایک وطن حاصل کریں (اور یہ ایک ایسی خواہش ہے جسے یورپ کے غیر یہودی باشندوں سمیت ہر شخص محسوس کرتا ہے)۔ میدان کے دوسرے سرے پر جو چیز موجود ہے، وہ اس خواہش کا (عملی) حصول ہے۔ اس خواہش کا عملی حصول یا تکمیل کیسے ممکن ہوگی، اس کے متعلق ایلیٹ کا ذہن واضح نہیں، چنانچہ اس ضمن میں اس کے خیالات بہت دھندلے ہیں۔ ورنہ وہ اتنی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہے کہ یہ سمجھ سکے کہ صیہونیت ایک ایسا تصور ہے جسے مغربی افکار (جو مشرقی افکار کی ضد ہیں۔) کی مختلف صورتوں کے ساتھ ہم آہنگ کیا جاسکتا ہے۔ مغربی افکار کے بعد اہم پہلوؤں کے مطابق مشرق قعرِ مذلت میں گر چکا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ سیاست کے متعلق مغرب نے جو روشن خیال تصورات وضع کیے ہیں، ان کے مطابق اس کی تعمیرِ نو کی جائے۔

مشرق کے جس خطے کی اس طرح تعمیرِ نو ہوگی، وہ چند ایک معمولی استثناؤں کے ساتھ اپنے باشندوں کے لیے بعینہٖ ''اتنا ہی انگلستان بن سکے گا جس قدر کہ خود انگلستان انگریزوں کے لیے انگلستان ہے۔ تاہم ایک بات جو ہمارے ذہن میں کھٹکتی ہے، وہ یہ ہے کہ اس قسم کے افکار میں مشرق، بالخصوص فلسطین کے اصل باشندوں کے متعلق کسی قسم کے تصور کا قطعی فقدان پایا جاتا ہے۔ جہاں تک ڈینیل ڈرونڈا کے صیہونی اور انگلش کرداروں کا تعلق ہے، ان دونوں کے لیے یہ (فلسطین کے اصل باشندے) قطعی غیر متعلق ہیں، جہاں تک چمک دمک، آزادی اور شفاعت کا تعلق ہے، اگرچہ ایلیٹ کے نزدیک یہ کلیدی امور ہیں، لیکن وہ ان کا دائرہ صرف یورپی باشندوں اور یہودیوں تک محدود کر دیتی ہے۔ یہاں یہودیوں کو اس لیے شامل کیا گیا ہے کیونکہ جہاں مشرق کو نوآبادی بنانے کا تعلق ہے وہ (یہودی خود بھی یورپی نمونے ہیں یہ عجیب بات ہے کہ ایلیٹ جب یہودیوں کا ذکر کرتی ہے تو وہ اپنا سارا زورِ بیان ان کی زندگی کے ان پہلوؤں پر صرف کر دیتی ہے کہ وہ ''مشرقی'' ہیں اور یورپی ماحول میں اجنبی۔ لیکن جب کبھی کسی غیر یورپی (یہودیوں سے قطع نظر) کو زیرِ غور لانے کی ضرورت پیش آتی ہے، تو وہ زبردست ناکامی کا شکار ہو جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انائیت اور ہمدردی ایسے اوصاف اور محاسن ہیں جن سے صرف مغربی ذہنیت ہی مزین ہے۔ باقی رہا استبدادی اور مطلق العنان

مشرق، وہاں ایسے اوصاف ومحاسن کا دستیاب ہونا تو دور کی بات ہے، انھیں تلاش کرنا بھی سعی لاحاصل اور اپنا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے۔

یہاں دو باتوں کا فوری ذکر ہونا چاہیے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ایلیٹ کا رویہ ہمدردی انسانیت اور تفہیم کے دوسرے پیمبروں کے رویے سے قطعی مختلف نہیں۔ ان تمام پیمبروں کے نیک جذبات اور خواہشات یا تو یورپ تک ہی محدود ہو کر رہ جاتی ہیں یا پھر (ان کے خیال کے مطابق) لائحہ عمل کے طور پر ان کا یورپ سے باہر اطلاق نہیں ہوسکتا۔ جان سٹوارٹ مل [1] اور کارل مارکس کی سبق آموز مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ [2] ان دونوں مفکرین کی عام شہرت یہی ہے کہ دونوں ناانصافی اور جبر واستبداد کے اس حد تک مخالف ہیں کہ ان کی یہ مخالفت عقیدے کی تقدیس کا درجہ اختیار کر گئی ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دونوں کا اس بات پر ایمان تھا کہ حریت، نمائندۂ حکومت اور انفرادی مسرّت جیسے تصورات کا اطلاق مشرق پر ہرگز نہیں ہونا چاہیے، کیوں؟ اگر آپ وجوہ جاننا چاہیں گے تو معلوم ہوگا کہ یہ تو وہی ہیں جنھیں آج کل ہم ''نسل پرستی'' کہتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ انیسویں صدی کا یورپ کلچر نسل پرستانہ تھا۔ یہ نسل پرستی کس حد تک زہر آلود اور کینہ پرور تھی۔ اس میں کمی بیشی کا انحصار ہر شخص کی انفرادی سوچ پر تھا (اس نسل پرستی کا مظاہرہ کوئی کم کرتا تھا اور کوئی زیادہ، لیکن اس سے محفوظ کوئی بھی نہیں تھا) مثلاً ارنست رے نان [3] کھلم کھلا یہود دشمن تھا اور جہاں تک ایلیٹ کا تعلق ہے تو ان نسلوں کے متعلق جنھیں یورپی افکار کے سانچے میں نہیں ڈھالا جاسکتا تھا، اس کا رویہ بے نیازی اور بے اعتنائی کا تھا۔

یہاں ہم دوسرے نکتے کی طرف آتے ہیں۔ ''ڈینیل ڈرونڈا'' میں ایلیٹ نے صیہونیت کی جو تصویر کشی کی ہے، اس کا مقصد یہ تھا کہ اس زمانے میں یہودی، صیہونی سوچ کی جو لہریں چل رہی تھیں، ان کے متعلق یہ عندیہ دیا جائے کہ ان کے بارے میں (مغرب کے) غیر یہودیوں کا ردِعمل مثبت ہے اور وہ یہودیوں کی سوچ سے اتفاق کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ ناول اس عندیے کے اظہار کا فریضہ سرانجام دیتا ہے کہ (یہودیوں کو یہ بتایا جائے کہ) صیہونیت کے وہ کون سے عناصر ہیں، جو یورپی فکر کے مطابق جائز ٹھہرائے جاسکتے ہیں بلکہ

---

[1] مل (John Stuart Mill) (96-1829) انگریز فلسفی اور ماہر معاشیات۔

[2] جان سٹوارٹ مل اور کارل مارکس کے ان رویوں کے متعلق میں نے اپنی کتاب ''اورینٹلزم'' کے صفحات نمبر 57-228,214,153 پر بحث کی ہے (مصنف)

[3] Joseph Ernest Renan (1833ء-1892ء) فرانسیسی فلسفی مؤرخ اور ماہر لسانیات

ایک لحاظ سے ان کا ڈھنڈورا بھی پیٹا جا سکتا ہے۔ یہودی اور غیر یہودی صیہونیت کی جو اپنی اپنی تعبیر کرتے تھے، ان دونوں میں ایک اہم نقطۂ نظر یہ تھا کہ مقدس سرزمین مکینوں سے لازمی طور پر خالی ہے۔ وہ ایسا کیوں سمجھتے تھے؟ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہاں واقعی کوئی مکین نہیں تھے...... مکین تو وہاں موجود تھے اور بے شمار سفرناموں، بنجمن ڈیزارائیلی کے Tencred جیسے ناولوں اور سیاحوں کی رہنمائی کے لیے جو کتابچے[1] تحریر کیے جاتے تھے، ان سب میں ان مکینوں کا اکثر ذکر ہوتا رہتا تھا...... بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس بات کو ماننے سے منظم طریقے سے انکار کیا جاتا تھا کہ انھیں خود مختار اور انسانی مکینوں کا کوئی درجہ حاصل ہے۔ اگرچہ اس نکتے کے بارے میں یہودی صیہونیوں اور غیر یہودی صیہونیوں (یہ غیر یہودی صیہونی عرب مکینوں کو مختلف وجوہ کی بنا پر نظر انداز کرتے تھے) کے (نقطہ نظر کے) مابین اختلاف تلاش کرنا ممکن ہے، پھر بھی یہ حقیقت اپنی جگہ پر موجود تھی کہ فلسطینی عربوں کو بہر حال نظر انداز کیا جاتا تھا۔ وہ نکتہ جس پر زور دیا جانا چاہیے، یہ ہے کہ یہودی اور غیر یہودی صیہونیت کی جڑیں کس حد تک بلند پایہ لبرل اور سرمایہ دارانہ نظام کے کلچر میں پیوست ہیں اور یہ کہ جارج ایلیٹ جیسے صف اول کے لبرل مفکرین نے اس کلچر کے نسبتاً کم دلکش رجحانات کو کیسے توانا و مضبوط بنایا بلکہ غالباً پروان بھی چڑھایا۔

اب تک میں نے جو کچھ عرض کیا ہے، اس میں سے کسی بات کا بھی مناسب طور پر اطلاق اس امر پر نہیں ہوتا کہ خود یہودیوں کے نزدیک صیہونیت سے کیا مراد ہے اور نہ اس امر پر کہ جوشیلے غیر یہودیوں کے لیے ایک ترقی یافتہ فکر کی حیثیت سے یہ کن امور کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس کا اطلاق صرف ان بدنصیب انسانوں پر ہوتا ہے جو بدقسمتی سے اس سرزمین پر موجود تھے اور جن کی کوئی پروا نہیں کی جاتی تھی۔ جس امر کو کافی طویل عرصے سے فراموش کیا جاتا رہا ہے کہ جب سرکردہ یورپی مفکرین اس بات پر سوچ بچار کر رہے تھے کہ فلسطین کا خاطر خواہ اور بعد ازاں امکانی مقدر کیا ہو سکتا ہے، اس سرزمین پر کھیتی باڑی ہو رہی تھی، دیہات اور قصبات کی تعمیر جاری تھی اور اس پر لاکھوں مقامی باشندے زندگی بسر کر رہے تھے جو اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ یہ سرزمین ان کا وطن ہے۔ دریں اثنا جہاں تک ان کے حقیقی جسمانی وجود کا تعلق ہے، اسے مسلسل نظر انداز کیا جاتا

---

[1] انیسویں صدی کے دوران میں مختلف ممالک کی سیاحت پر روانہ ہونے والوں کی رہنمائی کے لیے کتابیں اور کتابچے شائع کرنے کا کام کا آغاز ایک جرمن باشندے کارل بیڈی کر (Karl Baede Ker) (1801ء-1859ء) نے کیا۔ یہ سلسلہ اتنا مقبول ہوا کہ یورپ کی زبانوں میں ایک نئے لفظ Baedeker کا اضافہ ہو گیا اور اس کے معنی ''گائیڈ بک'' (کتاب رہنمائی) قرار پائے۔ ڈکشنری بھی اس کے معنی یہی بتاتی ہے اور مصنف نے بھی متن میں یہی لفظ استعمال کیا ہے۔

کیا جاتا رہا۔ بعد ازاں یہ ایک تکلیف دہ فرض بن گیا۔ چنانچہ یہ بات نمایاں طور پر ابھر کر ہمارے سامنے آتی ہے کہ ایلیٹ بھی ہو بہو انھی خیالات کا اظہار کرتی ہے جس کا پرچار موز ز ہیس (1) (Moses Hess) جیسے ایک اوائلی عینیت پسند نے کیا تھا اور جس نے اپنی کتاب ''روم و یروشلم'' (1862ء) میں بالکل وہی نظری زبان استعمال کی ہے جو بعد ازاں مورڈیکائی کوہن کے منہ میں ڈالی جانا تھی۔

''یہودی قوم کے احیائے نو کے سلسلے میں فی الحال ہمیں جو کچھ کرنا ہے، وہ یہ ہے۔

اول: اپنی قوم کی سیاسی نشاۃِ ثانیہ کی امید زندہ رکھی جائے۔

دوم: جن لوگوں کے دلوں میں یہ امید خوابیدہ ہو چکی ہے، ان میں اسے دوبارہ بیدار کیا جائے۔

''جب مشرق میں سیاسی حالات ایسی صورت اختیار کر لیں کہ یہودی مملکت کی تجدید و بحالی کے کام کے آغاز کو منظم کرنا ممکن ہو جائے تو اس کارِ خیر کی ابتدا اپنے آباواجداد کی سرزمین پر یہودی بستیوں کی تاسیس سے ہوگی۔ اس مہم میں فرانس یقیناً ہمارا ہاتھ بٹائے گا۔ محبوب دوست فرانس وہ نجات دہندہ ہے جو تاریخ عالم میں ہماری قوم کو اس کا کھویا ہوا مقام دوبارہ دلائے گا۔ جس طرح ایک زمانے میں ہم نے مغرب کی جانب ہندوستان کا راستہ دریافت کرنا چاہا تھا، تو حُسنِ اتفاق سے ہم نے ایک نئی دُنیا دریافت کر لی۔ چنانچہ اسی طرح آج ہندوستان اور چین کا سفر اختیار کرنے کے لیے جس نئے راستے کی تعمیر ہو رہی ہے، اس پر چل کر ہم اپنی گم گشتہ مادرِ وطن کو دوبارہ دریافت کر لیں گے۔ (2)

ہیس نے یہ جو فرانس کی قصیدہ گوئی کی ہے، وہ ابھی جاری ہے (چونکہ ہر صیہونی کسی نہ کسی استعماری طاقت کو اپنا مربی گردانتا تھا، اس لیے اسے مکھن لگانا اپنا فرض سمجھتا تھا۔) چنانچہ وہ ارنست لاہارانے (3) کی کتاب ''نیا مشرقی مسئلہ'' The New Eastern Problem سے تفصیلی حوالے دیتا ہے۔ اس نے لاہارانے کے مندرجہ ذیل پیراگراف کی بالخصوص تعریف کی ہے اور اپنی کتاب کا اختتام بھی اسی پر کیا ہے:

''منشائے ربی یہی ہے کہ یہودیوں سے ایک بڑا کام لیا جائے اور وہ کام یہ ہے کہ وہ تین براعظموں

---

(1) موز ز ہیس (1812ء۔1875ء) ایک جرمنی سوشلسٹ۔ اسی نے اینگلز کو سوشلسٹ بنایا تھا اور خود مارکس کو بھی اسی نے معاشرتی اور سیاسی مسائل کے مطالعہ پر آمادہ کیا تھا۔ اپنی کتاب ''روم اینڈ یروشلم'' میں اس نے فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام پر زور دیا تھا۔

(2) حوالے کے لیے آرتھر ہرٹزبرگ Hertzberg کی مرتبہ کتاب The Zionist Idea: A Historical Analysis and Reader کا صفحہ نمبر 132 ملاحظہ فرمائیں۔ اس کے ناشر Athseneum نیویارک ہیں۔

(3) ایک فرانسیسی ادیب اور مفکر

کے مابین ابلاغ کا ذریعہ بن جائیں آپ ان اقوام تک، جو ابھی ناتجربہ کار اور ناکندہ تراش ہیں، تہذیب پہنچانے کا فریضہ سرانجام دیں گے اور یورپی علوم میں، جن کے فروغ میں آپ کی نسل نے قابلِ قدر حصہ لیا ہے، ان کے اساتذہ بنیں گے۔ آپ یورپ اور مشرقِ بعید کے مابین مصالحت کنندہ کا کردار ادا کریں گے۔ ان راستوں کی تعمیر کریں گے جو ہندوستان اور چین کو جاتے ہیں...... ہندوستان اور چین، ہاں، وہی نامعلوم اور انجانے خطے، جنھیں بالآخر تہذیب کا درس دینا ہی ہوگا۔ صدیوں کی شہادتوں کے زرنگار تاج اور تمغے اپنے سروں اور سینوں پر سجائے آپ اپنے آبا و اجداد کی سرزمین پر قدم رکھیں گے اور بالآخر اپنے تمام مصائب و آلام سے مکمل نجات حاصل کرلیں گے۔ آپ کا سرمایہ ویران و بنجر اراضی کے وسیع و عریض قطعات پھر ایک مرتبہ زیرِ کاشت لے آئے گا۔ آپ کی محنت و مشقت اور جفاکشی ارضِ قدیم کو صحرائی ریت کی دستبرد سے چھڑالے گی اور اسے ایک مرتبہ پھر سرسبز شاداب اور ثمر بار وادیوں میں تبدیل کردے گی اور دُنیا ایک مرتبہ پھر اپنی قدیم ترین قوم کو نذرانۂ عقیدت پیش کرے گی۔ ①

ہیس اور ایلیٹ باہمی طور پر اس بارے میں متفق الرائے ہیں کہ صیہونیت کے منصوبوں کی تکمیل یہودیوں کو یورپ کی عظیم طاقتوں کی مدد سے کرنا ہوگی اور یہ کہ صیہونیت ''گم گشتہ مادرِوطن'' کی تجدید و بحالی کا کام سرانجام دے گی اور یوں وہ مختلف تہذیبوں کے مابین مصالحت کنندہ کا کردار ادا کرے گی۔ یہ کہ موجودہ زمانے کے فلسطین کو مزارعت، تہذیب اور تعمیر نو کی ضرورت ہے۔ یہ کہ صیہونیت اپنی جلو میں بالآخر ان مقامات کو روشن خیالی اور ترقّی سے روشناس کرائے گی۔ وہ تین تصورات، جن کا ہیس اور ایلیٹ کے ہاں...... اور بعدازاں ہر صیہونی مفکر یا نظریے کی ترویج کرنے والے کے ہاں ایک دوسرے پر انحصار تھا، یہ ہیں:

① ناپید عرب مکیں۔

② ایک ''خالی'' سرزمین کے متعلق مغرب اور یہودیوں کا رویہ۔ ان میں سے ایک کا رویہ دوسرے کے رویے کی تکمیل کرتا ہے۔

③ بحالی نو کا صیہونی منصوبہ، جو ایک گم شدہ یہودی مملکت کی تعمیرِ نو کر کے اسے دوبارہ بروئے کار لائے گا اور اسے علیحدہ علیحدہ لیکن منضبط بستیوں اور حصولِ اراضی کے خصوصی ادارے جیسے جدید عناصر سے مربوط کردے گا۔

① حوالے کے لیے ہرٹز برگ کی مرتبہ محوالہ بالا کتاب ہی کا صفحہ نمبر 34 ملاحظہ فرمائیں۔

تاہم ان میں سے کسی ایک تصور کو بھی اس وقت تک نہ تو قانونی جواز فراہم کیا جا سکتا تھا اور نہ اس کا عملی نفاذ ممکن تھا جب تک اسے ایک بین الاقوامی[1] سیاق و سباق میں رکھ کر پیش نہ کیا جاتا۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ ان تصورات کا سانچہ بھی اسی سیاق و سباق میں ڈھالا جاتا اور وہ (تصورات) رجوع بھی اسی کی طرف کرتے۔ یہ سیاق و سباق ایک حقیقت تھا اور یہ سیاق و سباق حقیقت محض اس بنا پر نہیں تھا کہ اس سارے منصوبے کو بروئے کار لانے اور اسے پروان چڑھانے کے لیے جس استدلالی حکمت کا سہارا لیا جا رہا تھا، اس کی اساس نسلی تفاخر پر تھی، بلکہ اس کے پیچھے یہ زبردست حقائق بھی کام کر رہے تھے کہ یہودی مختلف مقامات پر بکھرے ہوئے تھے[2] اور وہ کہیں بھی اکثریت میں نہ تھے) اور یورپی ثقافت پر کلی طور پر سامراجی بالادستی اور سیادت کی چھاپ لگ چکی تھی۔ تاہم یہاں اس بات کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت ہے کہ صیہونیت نے فلسطین پر قبضہ جمانے کا جو خواب دیکھا تھا، اس کا انداز استعماری تھا۔[3] اس کا یہ رویہ انیسویں صدی کی یورپی طاقتوں کے رویے سے قطعی مختلف تھا کیونکہ وہ ان اپنے مقبوضات کے باشندوں کے متعلق یہ سمجھتی تھیں کہ وہ جو دُنیا کو مہذب بنانے اور یوں اس کی نجات کا فریضہ سرانجام دینے نکلے ہیں، ان میں (ان کے مقبوضات کے) یہ باشندے بھی شامل ہیں۔

اپنے جدید ارتقا کے دوران میں صیہونیت کو مختلف مراحل میں سے گزرنا پڑا ہے۔ تاہم تحریک کے آغاز سے لے کر اس وقت تک جب اس کا نقطۂ عروج اسرائیل کے قیام کی صورت میں سامنے آیا، صیہونیت یورپی باشندوں کے لیے ہمیشہ باعثِ کشش رہی جن کے نزدیک سمندر پار مقبوضات اور ان مقبوضات کے مقامی باشندوں کی مختلف غیر مساوی طبقوں میں تقسیم ایک مذہبی تقدیس کا درجہ رکھتی تھی اور بالکل ''فطری'' تھی۔ یہی وجہ ہے کہ (مثال کے طور پر) آج افریقہ اور ایشیا کے سابقہ نوآبادیاتی خطوں کی ہر مملکت یا تحریک فلسطینی

---

① یہاں مصنف کے خیال کے مطابق لفظ ''بین الاقوامی'' محض دھوکے کی ٹٹی ہے۔ ورنہ اس لفظ کا مطلب ''غیر مشرقی'' یعنی ''یورپی'' ہے۔ یورپ جس بات پر صاد کر دے، وہ ''بین الاقوامی'' حیثیت اختیار کر جائے گی۔

② جب بخت نصر نے، جو بابل کا حکمران تھا، بیت المقدس پر قبضہ کر لیا، تو اس نے یہودیوں کو فلسطین سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ یہودیوں کی بیشتر تعداد مغربی ایشیا، شمالی افریقہ اور یورپ کے مختلف ممالک کی طرف کوچ کر گئی۔ چنانچہ یہ یہودی جو انتشار کی حالت میں غیر یہودیوں کے مابین زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے، انھیں اور ان کی اس حالت کو Diaspora کہا جاتا ہے۔

③ صیہونی فلسطین کو اس طرح غیر آباد تصور کرتے تھے، جس طرح ابتدائی گورے آباد کار امریکا کو غیر آباد تصور کرتے تھے۔ (مصنف)

جدّو جہد کی ہم خیال ہے۔ اس کی پوری طرح حمایت کرتی ہے اور اس کا ادراک رکھتی ہے۔ بہت سی مثالیں ایسی مل جائیں گی...... مجھے امید ہے کہ میں ابھی ان کا ذکر کر پاؤں گا...... جہاں آپ کو ان تجربات میں، جو ایک طرف عرب فلسطینیوں کو صیہونیت کے ذریعے ہوئے اور دوسری طرف ان تجربات میں، جو سیاہ، زرد اور گندمی رنگت کے باشندوں کو ہوئے جنھیں انیسویں صدی کے سامراجی حقیر اور انسانی درجے سے کم تر مخلوق گردانتے تھے، ایک صریحی اور مغالطے سے پاک مماثلت ملتی ہے۔ کیونکہ اگرچہ صیہونیت کو فروغ ایک ایسے عہد میں ہوا جب مغرب میں یہود دشمنی کی انتہائی زہریلی لہر چل رہی تھی لیکن یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ یہی وہ عہد ہے کہ جب ایک طرف تو صیہونیت فروغ پذیر تھی، تو دوسری طرف افریقہ اور ایشیا میں یورپی اقوام کی مقبوضات کے حصول میں بے مثال کامیابی حاصل ہو رہی تھی۔ حصول اور قبضے کی یہی وہ عمومی فضا تھی جب تھیوڈور ہرزل نے صیہونیت کی داغ بیل ڈالنے کے لیے اولین اقدامات کیے۔ اپنی نو آبادیات کو توسیع دینے کے لیے جب یورپ اپنے عظیم ترین دور میں سے گزر رہا تھا، تو اسی دور کے آخری حصے میں صیہونیت نے بھی پر پُرزے نکالے اور ایشیا کے ایک خاصے بڑے رقبے پر قبضہ جمانے کے سلسلے میں اہم ابتدائی کارروائیاں کیں۔ یہاں یہ یاد رکھنا بہت ضروری ہے کہ سمندر پار مقبوضات کے حصول کے ضمن میں اہلِ یورپ میں جو جوش و خروش پایا جاتا تھا، صیہونی اس میں پوری طرح شریک تھے اور انھوں نے کبھی یہ غیر مبہم طور پر نہیں کہا تھا کہ صیہونیت کی تحریک کا مقصد یہودیوں کی آزادی ہے بلکہ وہ ہمیشہ اس بات پر اصرار کرتے رہے کہ وہ مشرق میں نو آبادیاں تعمیر کرنا اور وہاں آباد ہونا چاہتے ہیں۔ ان ستم رسیدہ فلسطینیوں کے نزدیک، جنھیں صیہونیوں نے بے دخل کر کے خود ان کی جگہ لے لی، یہ کوئی معقول وجہ نہ تھی کہ صیہونی یورپ کی یہود دشمنی کی روایت کے شکار تھے (اس لیے وہ فلسطینیوں کو بے گھر کرنے اور ان کی زمینوں پر قبضہ کرنے میں حق بجانب تھے) اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اسرائیل جس تسلسل کے ساتھ فلسطینیوں کے درپے آزاد ہے تو یہ بات ہماری سمجھ میں آ جائے گی کہ ایسا فلسطینی ڈھونڈے سے بھی کیوں نہیں ملتا جو اپنی موجودہ حقیقت سے ماورا دیکھ سکتا ہو کیونکہ اس کا تو یہی تجربہ ہے کہ مغربی یہودی جو خود کبھی ستم رسیدہ تھے، اب ستم شعار بن چکے ہیں (اور ان کے ستم کا نشانہ صرف فلسطینی عرب ہی نہیں بلکہ مشرقی یہودی بھی بنتے ہیں۔)

ان معروضات کا مقصد یہ نہیں کہ ہم محض ماضی کی طرف دیکھتے رہیں اور (اس میں کیڑے نکالتے رہیں) ان بھولے بسرے واقعات کا تذکرہ اس لیے ضروری ہے کیونکہ یہ ان واقعات کی، جو آج کل مشرقِ وسطیٰ میں ظہور پذیر ہو رہے ہیں، توضیح بلکہ تعین کرتے ہیں۔ یہ حقیقت کہ اسرائیل کی آبادی کا کوئی قابلِ ذکر طبقہ ابھی تک یہ اہلیت حاصل نہیں کر سکا کہ وہ اس خوفناک معاشرتی اور سیاسی ناانصافی کا سامنا کر سکے جو مقامی فلسطینیوں

سے روا رکھی گئی ہے، اس بات کی علامت ہے کہ استعماری تناظرات جن پر صیہونیت کی اساس رکھی گئی ہے۔① دُنیا کے متعلق ان (اسرائیلیوں) کا مخصوص نقطۂ نظر اور ان کا یہ احساس کہ ان کے مقابلے میں دوسرا مقامی فریق حقیر اور فروتر ہے، کس قدر ان کے ذہنوں میں راسخ ہو چکا ہے۔ یہ حقیقت بھی کہ ایک بھی فلسفی، اس بات سے قطع نظر کہ سیاسی اعتبار سے وہ کس مکتبِ فکر کا پیروکار ہے، ابھی تک اپنے آپ کو اس بات پر آمادہ نہیں کر سکا کہ وہ صیہونیت کو کسی نہ کسی صورت میں قبول کر لے، اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ اس (فلسطینی) کے نزدیک یہ (صیہونیت) ایک ایسے دستور العمل کا روپ اختیار کر چکی ہے جو مزاج کے اعتبار سے خالصتاً استعماری ہے، جو اپنوں اور غیروں کے مابین سختی سے تفریق کرتے ہے اور جو بےلوچ انداز کے صرف یہودیوں کی فلاح و بہبود کے لیے ہے اور دوسروں کو اپنے دائرۂ عمل سے خارج کر دیتا ہے۔ فلسطین میں مراعات یافتہ یہودیوں اور ہر قسم کی مراعات سے محروم غیر یہودیوں کے مابین صیہونیت جو انتہا پسندانہ امتیاز روا رکھتی ہے، وہ اس قدر زبردست اور قوی ہے اور اسے اس قدر بلا جھجک اور اتنی مستعدی سے روبہ کار لایا جاتا ہے کہ وہاں کوئی دوسری چیز ظہور پذیر نہیں ہو سکی اور اس طریقے سے وہاں جو دو فریق وجود میں آئے ہیں وہ اس المیے کا صحیح معنوں میں ادراک نہیں کر سکے جس کا مصیبت زدہ انسانوں کو سامنا کرنا پڑا ہے۔② اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ نہ تو یہودیوں کے لیے یہ ممکن ہوا ہے کہ وہ اس انسانی المیے کو سمجھ سکیں جس کا فلسطینیوں کے لیے صیہونیت موجب بنی اور نہ ہی یہ فلسطینیوں کے لیے ممکن رہا ہے کہ وہ صیہونیت کو اس کے علاوہ بھی کچھ اور سمجھ سکیں کہ یہ محض ایک ایسا نظریۂ حیات اور ایک ایسا دستور العمل ہے جس کا مقصدِ وحید انھیں اور اسرائیلی یہودیوں کو پابندِ سلاسل کرنا اور محبوس رکھنا ہے۔ تاہم تذلیلِ انسانیت کے اس آہنی دائرے کو توڑنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم یہ جائزہ لیں کہ یہ دائرہ وجود میں کیسے آیا؟ یہاں ہمیں یہ نظر آئے گا کہ یہ افکار اور کلچر ہی ہیں جو اس ضمن میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

ہرزل ہی کو لیں۔ اگر یہ درے فوس③ کا معاملہ تھا جس نے اولین طور پر اس کے اندر یہودی شعور پیدا

---

① اور اب تو یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ استعماری تناظرات بذاتِ خود غیر طبعی اور بے ضابطہ اشیا ہیں۔ (مصنف)

② تفصیل کے لیے صابری جریس کی تصنیف ''اسرائیل کے عرب'' (The Arabs in Israel) ملاحظہ کریں۔ یہ کتاب 1976ء میں منتھلی ریویو پریس نیویارک نے شائع کی تھی۔ اس سلسلے میں ایک یہودی مصنف اسرائیل شہاک (Shahak) نے بھی اپنی کتاب (The Non-Jew in a Jewish State: A Collection of Documents) میں زبردست دلائل دیے ہیں۔ شہاک نے یہ کتاب نجی طور پر نمبر بار طے نور اسٹریٹ یروشلم سے 1975ء میں شائع کی تھی۔ (مصنف)

③ الفرد درے فوس (Drefus) ایک معمولی فرانسیسی فوجی سپاہی تھا۔ اس کی وجہ شہرت یہ تھی کہ 1894ء میں ......

کیا تو یہ کہنا بھی درست ہوگا کہ تقریباً اسی زمانے میں یہ خیال بھی اس کے ذہن میں جاگزین ہوا کہ یہود دشمنی کا تریاق یہ ہے کہ یہودیوں کو استعماری انداز سے سمندر پار آباد کیا جائے۔ فی نفسہٖ یہ تصور، ایک تصور کے طور پر ہی سہی، یہودیوں میں انیسویں صدی کے اختتام تک مقبول ہو چکا تھا۔ ہرزل نے اولین اہم رابطہ جس شخص کے ساتھ قائم کیا، اس کا نام نواب (Baron) مورس ڈی ہرش تھا۔ ہرش ایک متموّل اور مخیّر شخص تھا۔ وہ کچھ عرصے سے اس یہودی جماعت ① کا سرپرست تھا، جس کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ مشرق کے یہودیوں کو ترکِ وطن کرنے اور ارجنٹائن اور برازیل میں آباد ہونے کے لیے امداد فراہم کی جائے۔ بعدازاں خود ہرزل یہ سوچتا رہا کہ اگر جنوبی امریکا یا افریقہ میں یہودیوں کی بستیاں تعمیر ہو جائیں اور وہاں وہ اپنی ایک نوآبادی قائم کرلیں، تو مناسب رہے گا۔ یہ دونوں علاقے ایسے تھے جو یورپی نوآبادکاری کے لیے عام طور پر قابلِ قبول تسلیم کیے جاتے تھے اور اگر ہرزل کے ذہن میں بھی یہ خیال آیا کہ اپنے زمانے کے قدامت پسندانہ استعماری طور طریقے اپنائے جائیں تو بات سمجھ میں آتی ہے۔ تاہم ''مقامی باشندوں'' اور ان کے ''علاقوں'' کے متعلق جو استعماری تناظر ظہور میں آیا تھا، اسے جس طرح ہرزل نے اپنے ذہن و روح میں جذب کیا اور جس طرح اپنی ذات کا ایک حصہ بنالیا، وہ بہت متاثر کن ہے۔

ہرزل کے ذہن میں اس بارے میں قطعاً کوئی شبہ نہیں ہو سکتا تھا کہ انیسویں صدی کے اواخر میں فلسطین قطعاً غیر آباد نہیں تھا بلکہ اس میں انسان رہتے بستے تھے۔ یہ درست ہے کہ یہ خلافتِ عثمانیہ کے زیرِ نگیں تھا (اور اس سے پہلے ہی ایک نوآبادی تھا) لیکن اسے بے شمار سفرناموں کا موضوع بنایا جا چکا تھا۔ ان سفرناموں کے

......اس پر اس الزام میں مقدمہ چلایا گیا کہ اس نے بعض حساس راز جرمنوں کے حوالے کر دیے اور یوں اپنے وطن سے غداری کا ارتکاب کیا ہے۔ الزام ثابت ہو گیا اور اسے حبسِ عبور دریائے شور کی سزا سنائی گئی۔ اس نے یہ سزا جنوبی امریکا کے ایک ملک فرانسیسی گی آنا کے ساحل کے قریب ایک سنسان اور بے آباد جزیرے ''جزیرہ شیطان'' (Devil,s Island) کی جیل میں کاٹنا تھی۔ اس سزا کے خلاف تمام یورپی ممالک کے یہودیوں نے واویلا بپا کر دیا اور الزام لگایا کہ درے فوس بے گناہ ہے اور اسے یہ سزا محض اس لیے دی گئی ہے کیونکہ وہ یہودی ہے اور تو اور فرانس کا شہرت یافتہ ناول نگار ایمیل زولا بھی ان کے بھرے میں آگیا اور اس نے اس سزا کے خلاف ایک طویل مضمون ''I Accuse'' لکھ مارا۔ مضمون لکھنے کی پاداش میں زولا خود تو جیل چلا گیا لیکن فرانسیسی حکومت کو مجبور کر گیا کہ چار سال کے بعد درے فوس کے مقدمے پر نظرِ ثانی کا حکم دے۔ درے فوس پر دوبارہ مقدمہ چلایا گیا اور ایک بار پھر اسے مجرم ٹھہرایا گیا۔ تاہم دس دن بعد فرانس کے صدر نے اسے معاف کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ بعد کی تحقیقات میں اسے بے گناہ قرار دے دیا گیا۔ درے فوس 1859ء میں پیدا ہوا تھا اور اس نے 1935ء میں انتقال کیا۔

① اس یہودی جماعت کا نام Jewish Coloniazation Association تھا۔

مصنّفین کے سرفہرست نام لامارتین، شاتو بری آں، فلوبیر[1] اور چند دوسرے لوگوں کے تھے۔ اگر اس نے ان مصنّفین کی تصانیف کا مطالعہ نہیں بھی کیا تھا، تب بھی یہ یقین دہانی کرنے کے لیے کہ (1880ء کی دہائی میں) فلسطین میں واقعی ساڑھے چھ لاکھ باشندے، جن کی غالب تعداد عربوں پر مشتمل تھی، آباد ہیں ایک صحافی کی حیثیت سے بیڈی کر کی شائع کردہ کوئی نہ کوئی گائیڈ بک تو ضرور پڑھی ہوگی۔ تاہم اس بات نے اسے وہ طریقے سوچنے سے باز نہیں رکھا جن کی مدد سے ان (فلسطینیوں) کی موجودگی سے نپٹا جاسکتا تھا۔ اس نے جو طریقے سوچے اور بعد میں جو کچھ حقیقتاً فلسطین میں پیش آیا، اس نے انھیں قدرے خون کو منجمد کردینے والی پیش بینی کے ساتھ اپنی ڈائری میں بہت صراحت اور درستی سے بیان کردیا ہے۔ اسی نے یہ تجویز پیش کی کہ غریب اور مفلوک الحال مقامی باشندوں کو اپنی جائدادوں سے بے دخل کردیا جائے (بعد میں صیہونیوں نے اس پر حرف بحرف عمل کیا) اور ان جائدادوں پر زبردستی قبضہ کرلیا جائے۔ اس نے مزید تحریر کیا کہ ''مفلوک الحال (مقامی باشندوں) کی بے دخلی اور ان کی جائدادوں پر قبضے کی کارروائی لازماً بہت سوجھ بوجھ، احتیاط اور ہوشیاری سے ہونا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے اس نے جو طریق کار تجویز کیا، وہ یہ تھا کہ ''مفلوک الحال (مقامی) باشندوں کو سرحد پار دھکیل دیا جائے۔ انھیں پڑوسی ممالک میں روزگار دلایا جائے لیکن، ہمارے اپنے ملک میں ان پر ہر قسم کے روزگار کے دروازے بند کردیے جائیں۔'' ایک ایسی کلبیت کے ساتھ جو ناقابلِ یقین حد تک صحیح ثابت ہوئی، ہرزل نے یہ پیشین گوئی کی کہ ''جہاں تک جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کے چھوٹے سے طبقے کا تعلق ہے، تو انھیں بآسانی قیمت دے کر خریدا جاسکتا ہے۔''......اور واقعی انھیں خرید لیا گیا۔ افریقہ کے وسیع و عریض قطعات پر قبضہ جمانے کے لیے اس زمانے میں جو منصوبے ترویج پا رہے تھے، فلسطین کی مقامی آبادی کو بے دخل کردینے میں یہ ساری سکیم ان سب پر بازی لے گئی اور ان سے کہیں آگے نکل گئی۔ جیسا کہ ڈیزمنڈ سٹیوارٹ[2] نے بالکل بجا کہا ہے کہ:

> ''معلوم ہوتا ہے کہ ہرزل نے یہ نکتہ بھانپ لیا تھا کہ اس وقت تک استعمار پسند اور آباد کار افریقہ میں جو کچھ کر چکے تھے، اس نے اگر اس سے ذرا بھی قدم آگے بڑھایا تو عارضی طور پر وہ مہذب دُنیا (یعنی یورپ) کو برگشتہ کردے گا (اور یوں ان کی ہمدردیوں سے ہاتھ دھو بیٹھے گا) (اپنی ڈائری کے) ان صفحات پر جہاں اس نے ''غیر ارادی بے دخلیوں اور سلبی جائداد'' کا ذکر

---

① گستاو فلوبیر (1821ء۔1880ء) فرانس کا شہرہ آفاق ناول نگار ''مادام بواری'' کا مصنّف

② Desmond Stewart ہرزل کا سوانح نگار

کیا ہے، وہاں وہ رقم طراز ہے کہ سرراہے میں یہ عرض کردوں کہ ابتداً لوگ ہم سے دور دور رہیں گے۔ ہم فی الحال معتوب ومقہور ہیں اور ہماری ہوا بھی ابھی اچھی نہیں بندھی لیکن جب تک عالمی رائے عامہ کو ہمارے اپنے حق میں تشکیل کرنے کا کام مکمل ہوگا، ہم اپنے وطن میں اپنے قدم مضبوطی سے گاڑ چکے ہوں گے۔ اس وقت ہمیں غیر ملکیوں کی جوق در جوق آمد سے کوئی اندیشہ نہیں رہے گا بلکہ ہم اپنے مہمانوں (سیاحوں) کا نوابانہ فیاضی اور پر تمکنت تلطف وشفقت کے ساتھ خیر مقدم کریں گے۔''

یہ کوئی ایسا نقشہ نہیں تھا جو ارجنٹائن کے کسی مزدور یا فلسطین کے کسی فلاح کے لیے مسحور کن ہوتا (اور وہ اس پر واری صدقے ہو جاتا) لیکن ہرزل کا یہ قطعی کوئی ارادہ نہیں تھا کہ اپنی ڈائری کو فوراً شائع کر دیا جائے۔ ①

ہرزل اور سٹیوارٹ کے لہجوں میں جو سازش جھلک رہی ہے ضروری نہیں کہ ہم اس پر آمنّا و صدقنا ہیں۔ تاہم ہمیں ویسے ہی یہ تسلیم کر لینے میں کوئی باک نہیں ہونا چاہیے کہ فلسطین پر قبضہ کرنے اور فلسطینیوں کی جائدادوں کو ہڑپ کر جانے کے لیے صیہونیوں نے جتنے بھی منصوبے بنائے اور انھیں پروان چڑھانے کے لیے انھوں نے جتنی کوششیں بھی کیں، عالمی رائے عامہ ان کے متعلق عام طور پر بے نیازی اور لاتعلقی کا مظاہرہ کرتی رہی ہے۔ صورتِ حال میں تبدیلی صرف اس وقت آئی جب فلسطینیوں نے موجودہ صدی کے ساٹھ اور ستر کے عشروں کے دوران میں عالمی سیاست میں بزورِ بازو اپنا وجود منوالیا۔ میں پیشتر ازیں یہ عرض کر چکا ہوں کہ اس ضمن میں صیہونیوں کی سب سے بڑی کامرانی یہ تھی کہ انھوں نے جو کچھ کر دکھایا، بین الاقوامی طور پر اسے جائز اور صحیح تسلیم کرالیا۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ صیہونیوں کے کارناموں کی تکمیل کے لیے فلسطینیوں کو جو قیمت چکانا پڑی، وہ غیر متعلق دکھائی دینے لگی لیکن ہرزل کی سوچ سے یہ بات بالکل عیاں ہے کہ صیہونی اپنے ان مقاصد میں کبھی کامیاب نہ ہو پاتے۔ اگر اہلِ یورپ میں یہ پیشتر رجحان نہ ہوتا کہ وہ ابتدا ہی سے مقامی باشندوں کو غیر متعلق عنصر سمجھنے لگے تھے۔ بہ الفاظِ دیگر، یہ مقامی باشندے اس قابلِ قبول منظم درجہ بندی کے چارٹ میں صحیح بیٹھتے تھے جس کے مطابق وہ بے شمار طور پر مغربی یا سفید فام باشندوں سے کم تر ٹھہرتے تھے اور درجہ بندی کا یہی وہ چارٹ (نقشہ) ہے جسے ہرزل جیسے صیہونیوں نے چرا کر اپنا بنا لیا۔ ہرزل اور اس کے پیروکاروں کا کمال یہ ہے کہ ان کے زمانے میں ثقافت کی جو عمومی فضا قائم تھی، اس کے اندر انھوں نے اس درجہ بندی کی کچھ اس طرح تراش خراش کی کہ وہ ایک ترقّی پذیر یہودی قومیت کی بے نظیر ضرورتوں کے مطابق

① ''تھیوڈر و ہرزل'' مؤلف: ڈیزمنڈ سٹیوارٹ، ناشر: ڈبل ڈے اینڈ کمپنی نیویارک، سن اشاعت 1974ء صفحہ: 192

ڈھل گئی۔ یہاں اس بات کا ایک مرتبہ پھر اعادہ کر دینا چاہیے کہ صیہونیت یہودی روایت کے جائز اور برحق مقاصد کے حصول میں ممد و ثابت ہوئی۔ مقاصد یہ تھے: یہودیوں کو ایک قوم کی حیثیت سے بے خانمانی اور یہود دشمنی سے بچانا اور ان کی قومیت بحال کرانا۔

اس کے ساتھ یہ اس (صیہونیت) کا غالب مغربی ثقافت (جس میں صیہونیت بطور ایک ادارہ سانس لیتی تھی) کے ان پہلوؤں کے ساتھ پورا گٹھ جوڑ تھا، جو اہلِ یورپ کے لیے یہ سمجھنا ممکن بنا دیتے تھے کہ غیر یورپی (ان کے مقابلے میں) کمتر، گھٹیا، حقیر اور غیر متعلق ہیں۔ چنانچہ یہی وہ گٹھ جوڑ ہے جو فلسطینی عربوں کے لیے بہت اہم ثابت ہوا، نہ کہ وہ فوائد جو اس گٹھ جوڑ کے نتیجے میں یہودیوں کو حاصل ہوئے۔ شفیق اور مہربان صیہونیت کا جس کے فوائد صرف یہودیوں تک محدود رہے...... عربوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوا، البتہ انھیں مغرب کے کلچر کی...... جو بنیادی طور پر ناروا تفریق کا قائل ہے اور نہایت طاقتور ہے اور جس کی صیہونیت فلسطین میں ایجنٹ ہے...... مار ضرور سہنا پڑی۔

یہاں مجھے موضوع سے ذرا ہٹ کر یہ بات واضح کر دینا چاہیے کہ صیہونیت کے نتیجے کے طور پر فلسطینیوں کو جو کچھ بھگتنا پڑا، اس کے متعلق کوئی چیز رقم کرتے وقت جو بڑی مشکل پیش آتی ہے، وہ یہ ہے کہ صیہونیت کو اپنے مقاصد میں زبردست کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں۔ مثال کے طور پر، میرے ذہن میں اس بارے میں قطعاً کوئی شبہ نہیں کہ یہودیوں کی اکثریت صیہونیت اور اسرائیل کو لازمی طور پر یہودی زندگی کے انتہائی اہم حقائق گردانتی ہے، خاص طور پر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ موجودہ صدی کے دوران میں یہودیوں کے ساتھ کیا کچھ پیش نہیں آیا تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں عناصر (صیہونیت اور اسرائیل) ان (یہودیوں) کے لیے دو چند اہمیت اختیار کر جاتے ہیں۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ مہتم بالشان فوجی فتوحات سے قطع نظر، جو اب تک اسے حاصل ہوتی رہی ہیں، اسرائیل کے کھاتے میں زبردست سیاسی اور ثقافتی کامرانیاں بھی آئی ہیں اور پھر (مغربی نقطہ نظر سے) اسرائیل ایک ایسا موضوع ہے جس کے متعلق مثبت رویہ اختیار کیا جا سکتا ہے اور اس سلسلے میں ہمیں (مغربی باشندوں کو) اتنا اگر مگر سے کام نہیں لینا پڑتا، جس کا تجربہ عربوں کے متعلق سوچ بچار کرتے وقت ہوتا ہے جو (عرب) کہ بہرحال انجانے، پرائے اجنبی، عجیب الوضع اور پُرعناد مشرقی ہیں۔ یقیناً اس شخص کے لیے جو مغرب کا باسی ہے، یہ حقائق کھلی کتاب کی طرح واضح اور روشن ہیں۔ صیہونیت کی کامیابیوں اور کامرانیوں کی جلو میں جو نقطۂ نظر ابھر کر سامنے آیا ہے اور جس کا آج کل چلن ہے، مکمل طور پر فاتح کے حق میں جاتا ہے اور ستم زدگان سے قطعی انداز سے آنکھیں پھیر لیتا ہے۔ یہاں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ ستم زدگان، جب صیہونیوں کو فلسطین میں وارد ہوتے دیکھتے تھے، تو کیا محسوس کرتے تھے؟ آج

جو صیہونیت کی توضیح و تشریح کی جاتی ہے، اس کو جب وہ پڑھتے اور دیکھتے ہیں تو کیا محسوس کرتے ہیں؟ صیہونیت کی جڑیں تلاش کرنے اور خود ان (فلسطینی عربوں) کے ساتھ اس (صیہونیت) نے جو برتاؤ روا رکھا ہے، اس کے ماخذ تلاش کرنے کے لیے وہ اس (صیہونیت) کی تاریخ کے کون سے اوراق کا مطالعہ کرتے ہیں؟ یہ وہ سوالات ہیں جو (مغرب میں) کبھی اٹھائے نہیں جاتے......اور بالکل یہی وہ سوالات ہیں جنھیں میں صیہونیت اور یورپی استعمار کے مابین روابط کی کڑیوں کا جائزہ لینے کے دوران میں اٹھانے کی جسارت اور ان کے جوابات فراہم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میری دلچسپی صرف اتنی ہے کہ میں ان اثرات کا ایک خاکہ پیش کروں جو صیہونیت نے اپنے ستم زدگان پر مرتب کیے ہیں۔ نسبی طور پر ان اثرات کا مطالعہ انھیں صرف اسی چوکھٹے (فریم ورک) میں رکھ کر کیا جا سکتا ہے جو انیسویں صدی میں بھی استعمار نے صیہونیت کو، جب وہ ابھی محض ایک تصور تھی اور اس نے اسرائیلی نام کی ایک مملکت کا روپ نہیں دھارا تھا، فراہم کیا تھا۔ ان فلسطینی مردوں اور عورتوں کے لیے جو یہ دیکھنے کے لیے کہ ان کی اپنی تاریخ ان کے لیے کن معانی کی حامل ہے، ناقدانہ انداز سے کچھ تحریر کرتے ہیں اور جو یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں...... جیسا کہ اس وقت میں یہ کوشش کر رہا ہوں......کہ فلسطینیوں کے لیے صیہونیت کیا معانی رکھتی ہے، انتونیو گرام شی کی یہ رائے بڑی باموقع اور برمحل ہے کہ ''اگر آپ اس بات کا شعور حاصل کرنا چاہتے ہیں تو'' آپ کو اپنے متعلق یہ سمجھنا'' پڑے گا کہ آپ اس تاریخی عمل کی پیداوار ہیں، جواب تک وقوع پذیر ہو چکا ہے اور جس نے آپ کی ذات پر لاتعداد اثرات ثبت کر دیے ہیں لیکن آپ کو اتنا موقع بھی نہیں دیا کہ آپ یہ معلوم کر سکیں کہ ان اثرات کی کل تعداد اور ان کی نوعیت کیا ہے۔'' وہ مزید رقمطراز ہے کہ پہلا ضروری کام یہ ہے کہ (ان اثرات کی) ''مکمل فہرست'' تیار کی جائے۔ چنانچہ یہاں بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ صیہونیت کے ہاتھوں اس کے ستم رسیدگان (یہاں بات ان لوگوں کی نہیں جو اس سے فیضیاب ہوئے) نے جو کچھ برداشت کیا، اس کی ایک مکمل فہرست تیار کی جائے، کیونکہ اس قسم کی فہرست شاید ہی کبھی عوام کے سامنے پیش کی گئی ہوگی۔ ①

فکریات (آئیڈیالوجی) یا نظریے (تھیوری) اور عمل (پریکٹس) کے مابین جو باریک فرق پایا جاتا

---

① Antonio Gramsci: The Prison Note books: Selections, ed and trans by Quintin Hoare and Geoffrey Huwell Smith (New York: International Publishers Co. 1971) اہم متن گرام شی کی اصل اطالوی کتاب Quaderni del Carcere (Prison Notebooks) by Antonio Gramsci مطبوعہ Turin Einandi Editore کی جلد دوم صفحہ نمبر 1363 پر مل سکے گا۔ (مصنف)

ہے، اگر ہم اسے سمجھنے کے عادی ہو گئے ہوں تو بھی تاریخی اعتبار سے درست بات یہ ہے کہ ہم اس یورپی استعمار کے بارے میں، جس نے انیسویں صدی کے دوران میں واقعتاً دُنیا کے بیشتر حصے پر اپنا قبضہ اور تسلط قائم کر لیا تھا، فرق کی ان باریکیوں کا چرب زبانی کے ساتھ ذکر نہ کریں، استعمار یا سامراجیت ایک ایسا سیاسی فلسفہ (فکر) تھا اور اب بھی ہے جس کا بنیادی مقصد اور ہدف علاقائی توسیع اور توسیع کے اس عمل کو جائز اور واجب ٹھہرانا ہے۔ تاہم لفظ ''علاقے'' کو اگر بالکل ہی لغوی معانی میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ استعمار کو اسی طرح نہیں جو وہ حقیقتاً ہے، بلکہ اسے گھٹا کر پیش کر رہے ہیں۔ استعمار یا سامراج کے لیے انگریزی زبان میں لفظ ''امپیریلزم'' (Imperialism) استعمال ہوتا ہے۔ یہ لفظ لاطینی لفظ (جس کے اصل معنی ''حکم'' ہیں) سے مشتق ہے۔ لغت کے مطابق اس کے معانی ہیں ''مطلق العنان حکومت'' یا ''اختیاراتِ کلی اور وہ علاقہ یا خطہ جس پر کسی شخص یا گروہ کو اختیاراتِ کلی حاصل ہوں۔'' چنانچہ ''امپیریم'' Imperium کو حاصل کرنے اور اس پر اپنا قبضہ جمائے رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ ایک خطۂ زمین کو اپنا زیر نگین بنا رہے ہیں اور اس پر اپنا تسلط قائم کر رہے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے آپ جو کارروائیاں کرتے ہیں، منجملہ دیگر باتوں کے، ان میں یہ امور بھی شامل ہیں۔

آپ اس خطۂ زمین کی تشکیل کرتے ہیں (اور مختلف انتظامی وحدتوں کا قیام عمل میں لاتے ہیں۔) اس کے باشندوں کا ارتکاز کرتے ہیں۔

اس خطۂ زمین، اس کے عوام اور ان کے خیالات پر اپنا تسلط قائم کرتے ہیں۔

اس خطے کی زرعی اور دوسری زمین، یہاں کے عوام اور ان کے خیالات میں اس قسم کی تبدیلیاں لاتے ہیں جن سے ان منصوبوں کو پروان چڑھانے اور ان کے مقاصد کو حاصل کرنے میں مدد مل سکے، جو سامراج اپنی بالادستی اور سیادت کے لیے وضع کرتا ہے۔

اور یہ سب کچھ اس بات کے نتیجے کے طور پر ہوگا کہ سامراج حقیقت سے مناسب طور پر عہدہ برآ ہونے کی اہلیت سے بہرہ ور ہو۔ چنانچہ ایک خیال، جس کے متعلق آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ آپ کا اپنا خیال ہے، اور اس قطعہ زمین کے مابین، جس پر آپ محض اس بنا پر اپنا دعویٰ جتاتے ہیں کہ اس پر آپ کا حق بنتا ہے (حالانکہ اس قطعۂ زمین پر کام کرنے والے وہاں کے مقامی باشندے موجود ہیں۔) خطِ امتیاز حقیقتاً معدوم ہو جاتا ہے۔ کم از کم انیسویں صدی والے (مغربی) کلچر کی دُنیا میں یہی کچھ ہوا اور یہی وہ کلچر ہے جس میں استعمار کو فروغ حاصل ہوا۔ کسی خیال پر یہ دعوے جتلانا کہ یہ میرا خیال ہے اور کسی علاقے پر یہ دعویٰ جتلانا کہ یہ میرا علاقہ ہے...... انیسویں صدی میں یہ باتیں اس لیے ممکن تھیں کیونکہ یورپ میں اس تصور کو غیر معمولی

پذیرائی حاصل ہو چکی تھی کہ یورپ سے باہر جو دُنیا ہے، وہ بس اس انتظار میں ہے کہ اہل یورپ آئیں، اس پر اپنا دعویٰ جتائیں، اس پر قبضہ کریں اور اس پر حکومت کریں...... ایک ہی کارروائی کے، جو بنیادی طور پر تشکیلی کارروائی تسلیم کی جاتی تھی اور جس کے پیچھے سائنس کی فراہم کردہ قوت، وقار اور اختیار کام کر رہا تھا، مختلف پہلو تصور کیے جاتے تھے۔ مزید برآں چونکہ حیاتیات، لسانیات اور ارضیات جیسے علوم میں سائنسی شعور کا عمل دخل زیادہ تر تشکیل نو، بحالی اور استحالہ سے متعلّق تھا اور یوں علوم کا پرانا قالب اتار کر انھیں نئے قالب میں پیش کیا جا رہا تھا، اب ایک طرف تو کھلم کھلا استعماری رویہ تھا جو مشرق کے دور دراز علاقوں کے متعلّق اپنا لیا گیا تھا، اور دوسری طرف یہ بات کہ مختلف نسلوں کے مابین جو ''عدم مساوات'' موجود ہے، اس کے متعلّق سائنسی رویہ کیا ہونا چاہیے۔ چنانچہ سائنسی ترقّی کے اس دور میں طے یہ پایا کہ ان دونوں رویوں کے مابین کڑی یہ ہوگی کہ ان دونوں رویوں کا انحصار یورپی ''منشا'' پر ہوگا۔ کیونکہ یورپی ''منشا'' ہی وہ طاقت تھی جس نے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ وہ پرانی حقیقتیں، جو ذہن میں محض انتشار پیدا کرتی ہیں اور جو اپنی افادیت کھو کر بیکار ہو چکی ہیں، کس طرح نئی درجہ بندیوں کے منظم، منضبط اور مربوط نظام میں ڈھالی جائیں اور انھیں یورپ کے لیے مفید بنایا جائے چنانچہ کیرولس لیناس [1] ژارژ بوفان [2] اور ژاژر کوویئر [3] کے افکار میں سفید فام اقوام، سرخ، زرد، سیاہ اور بھوری رنگت کی اقوام سے سائنسی طور پر مختلف ہو گئیں اور اس کے نتیجے کے طور پر وہ علاقے جو ان اقوام کے زیر قبضہ تھے، نئے نئے خالی ہو گئے تا کہ اہل مغرب وہاں اپنی نو آبادیاں بنا سکیں، (اپنی مرضی کے مطابق) وہاں تعمیر و ترقّی کے کام کر سکیں، انھیں زیرِ کاشت لا سکیں اور آباد کار وہاں جا کر آباد ہو سکیں۔ مزید برآں ان کم مساوی نسلوں کو یوں سود مند بنا لیا گیا کہ ان کے اس طریقے سے کایا پلٹ کر دی گئی اور انھیں وہ کچھ بنا دیا گیا جس کے متعلّق سفید فام قوم پہلے ہی سوچ بچار کر چکی تھی اور اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ یہ (کایا پلٹ) اس کی نسلی اور ثقافتی بالادستی کا جزو ہے (جوزف ذی ژوبینو [4] اور آسولڈ سپنگر [5] کی تحریروں میں یہی رویہ ملے

---

① لیناس Carolus Linnaeus۔(1707-78) سویڈن کا ماہر نباتیات

② بوفان (Comte George Buffon)(1707-88) فرانسیسی سائنسدان۔ فطرت کے مطالعے کے لیے مشہور تھا۔

③ کوویئر (Baron George Cuvier)(1769-1832) ایک اور فرانسیسی سائنسدان، یہ بھی مطالعہ فطرت کے لیے مشہور ہوا۔

④ دی ژوبینو (Joseph Arthur de Gobineau)(1816-82ء) فرانسیسی سفارتکار، ناول نگار اور مؤرخ۔ اس نے ایرانیوں کی تاریخ بھی لکھی۔

⑤ سپنگلر (Oswald Spengler)(1880-1936ء) جرمنی کا ایک فلسفی اور فلسفہ تاریخ کا ماہر۔ اس کی کتاب ''زوال مغرب'' ایک تہلکہ خیز تصنیف تھی۔ اس کے خیال کے مطابق مغربی تہذیب نقطہ عروج پر پہنچ چکی ہے اور اب اس کا زوال لازمی ہے۔

گا) یا پھر پوری ڈھٹائی سے کام لے کر کھلم کھلا استعماری ہتھکنڈے اور طور طریقے اختیار کیے جانے لگے اور ان کم تر نسلوں کو سلطنت (ایمپائر) کے مقاصد حاصل کرنے کے لیے براہِ راست استعمال کیا جانے لگا اور جب 1918ء میں ژارژ کلیمنسو ① نے یہ اعلان کیا کہ ''میرا یہ ایمان ہے کہ اگر مستقبل میں جرمنی نے فرانس پر حملہ کیا تو مجھے یہ لامحدود حق حاصل ہے کہ میں یورپ میں فرانسیسی علاقے کے دفاع کے لیے سیاہ فام فوجیں جھونک دوں؟ تو درحقیقت اس کے اس اعلان کا مطلب یہ تھا کہ کسی سائنسی حق کی بنا پر فرانس کے پاس یہ علم اور طاقت ہے کہ بقول رے مال پون کارلے ② کہ وہ سیاہ فام باشندوں کو سفید فام فرانسیسیوں کے لیے توپ کے چارے کی معاشی صورت میں تبدیل کر دے۔ ③ یہ درست ہے کہ استعماریت کا الزام سائنس کے کندھوں پر نہیں دھرا جاسکتا لیکن دیکھنے اور سمجھنے کی بات یہ ہے کہ سائنس کو اس کی شکل بگاڑ کر نسبتاً نہایت آسانی کے ساتھ سامراجی تسلط و غلبے کی عقلی طور پر توضیح کرنے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

فطرت میں حیوانات اور نباتات کی جو انواع بندی پائی جاتی ہے، اس کی شکل بگاڑ کر اسے معاشرتی بشریات ④ میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس عمل کا اصل مقصد معاشرے پر اختیار حاصل کرنا تھا اور اس کام میں لسانیات کی انواع بندی نے پورا پورا ہاتھ بٹایا۔ فرانز بوپ، ⑤ ولیم جونز ⑥ اور فریڈرخ وان شلیگل ⑦ جیسے

---

① کلیمنسو (Georges Clemenceau)(1841-1929ء) اس نے تعلیم طب میں پائی لیکن طب کو بطور پیشہ نہ اپنایا۔ وہ ایک مصنف، صحافی اور مدیر کی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا لیکن اس نے اصل شہرت بحیثیت سیاستدان حاصل کی اور متعدد مرتبہ فرانس کا وزیر اعظم رہا۔ دوسری جنگِ عظیم کے اختتام پر امن کانفرنس کی صدارت اسی نے کی تھی۔

② پون کارے (Raymond Poincare)(1860-1934) تین مرتبہ فرانس کا وزیر اعظم رہا۔ جنگِ عظیم اول کے دوران میں ملک کا صدر تھا۔ جنگ کے اختتام پر وہ جرمنی کو سخت سزا دینے کے حق میں تھا لیکن معاہدہ وارسائی میں اس کی ایک نہ سنی گئی اور وہ 1920ء میں عہدۂ صدارت سے مستعفی ہوگیا لیکن 1923ء سے 1929ء تک وزیر اعظم رہا۔ اس نے جرمنی کے علاقے روہر پر قبضے کے لیے فوجیں بھی بھیجیں۔

③ تفصیل کے لیے حنا ارنت (Hanna Arendt) کی کتاب ''The Origins of Tolalitarianism'' مطبوعہ بار کورٹ براس'' نیویارک کا صفحہ 129 ملاحظہ کریں۔

④ یعنی انسانی معاشروں کو بھی اسی قسم کی انواع میں تقسیم کر دیا گیا۔

⑤ فرانز بوپ (1791ء۔1867ء) جرمن ماہر لسانیات۔ اس نے اپنی کتاب تقابلی گرامر میں ہندوستانی اور یورپی زبانوں کے مابین رشتے تلاش کیے۔

⑥ ولیم جونز (Sir William Jones)(1746ء۔1794ء) لسانیات اور قانون کا ماہر، وہ گیارہ سال تک کلکتہ سپریم کورٹ کا جج رہا۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے ثابت کیا کہ سنسکرت، یونانی اور لاطینی زبانوں کا ماخذ ایک ہی ہے۔......

لسانی ماہرین نے السنہ (زبانوں) کے مختلف خاندانوں یا گروپوں کے مابین جب ساخت کی مماثلت دریافت کی تو لسانی گروپوں کے متعلق اس تصویر کو ناجائز اور ناروا طور پر گھسیٹ گھساٹ کر انواعِ انسانی کے نظریوں میں تبدیل کرنے کا عمل شروع ہوگیا اور دعویٰ کیا جانے لگا کہ ہر نوعِ انسانی طے شدہ گروہی، ثقافتی اور نسلی خصوصیات کی حامل ہوتی ہے۔ ایک مثال پیش خدمت ہے۔ 1808ء میں شلیگل کو ایک طرف ہندو جرمن (یا آریائی) زبانوں اور دوسری طرف سامی، افریقی زبانوں کے مابین ایک واضح اختلاف نظر آیا۔ اس نے یہ دعویٰ کیا کہ اول الذکر زبانیں تخلیقی، تجدیدی (Regenerative) زندگی سے بھرپور اور جمالیاتی طور پر مسرّت آگیں ہیں جب کہ مؤخر الذکر زبانیں اپنے عمل کے اعتبار سے میکانکی، تجدیدی فعل سے عاری اور مجہول ہیں۔ اسی قسم کے امتیاز و تفریق سے پہلے شلیگل اور بعد ازاں ریناں نے یہ عمومی اصول وضع کرنا شروع کردیے کہ اعلیٰ آریائی اور ادنیٰ غیر آریائی دماغ، ثقافت اور معاشرے میں بہت بعد پایا جاتا ہے۔

سائنس کو مسخ کرکے یا اس کی قلبِ ماہیت کرکے اسے ایک ایسی صورت میں ڈھالنے کا عمل، تاکہ وہ صحیح طور پر سیاسی نظم و نسق سے مشابہ ہوجائے ایسے شعبوں میں خاص طور پر رونما ہوا، جن کی کوئی واضح شکل متعین نہیں کی جاسکتی اور جن میں اصولِ قانون (فقہ) عمرانی فلسفہ اور سیاسی نظریہ سمجھی کچھ منتھی کیا جاسکتا ہے۔ سب سے پہلے فلسفیانہ تجربیت کی ایک خاصی مؤثر اور بارسوخ روایت (جس کا حال ہی میں ہیری بریکن نے مطالعہ کیا ہے)[1] نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ ایک قسم کے نسلی امتیاز کے حق میں آواز اٹھائی جو انسانوں کو برتر اور فروتر نسلی انواع میں تقسیم کرتا تھا۔ تین سو سولہ ہندوستانی ایمپائر (سلطنت) سے عہدہ برآ ہونے کے ضمن میں جو اصل مسائل (زیادہ انگلستان میں) سامنے آئے اور نئے سے نئے علاقے دریافت کرنے کے لیے جو لاتعداد بحری سفر اختیار کیے گئے، ان چیزوں نے مل ملا کر یہ ثابت کرنا ممکن بنادیا کہ بعض ثقافتیں ترقّی یافتہ اور مہذب ہیں جب کہ دوسری پسماندہ اور غیر مہذب۔ ان خیالات کا اور ان کے ساتھ ہی ان دائمی معاشرتی

...... چنانچہ اسے جدید تقابلی لسانیات کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔

⑦ شلیگل (Friedich von Schlegal) (1772ء۔1839ء) جرمن نقاد اور ماہرِ جمالیات، اسے جرمن رومانی تحریک کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس نے 1802ء میں تاریخ، زبان اور ادب پر پیرس میں جو خطبات دیے، انھیں بہت شہرت حاصل ہوئی۔ قدیم ہندو ثقافت اور سنسکرت کے مطالعے کے متعلق اس کی کتاب On Language and Wisdom of India بڑی معرکہ آرا تصنیف سمجھی جاتی ہے۔

① Harry Bracken: Essence, Acciedent and Race یہ مضمون ایک جریدے Hermathena کے شمارہ نمبر 6 زمستان 1973ء کے صفحات نمبر 116 زمستان 1973ء کے صفحات نمبر 96-81 شائع ہوا تھا۔

معانی کا جو جان لاک ① اور ڈیوڈ ہیوم ② جیسے فلسفیوں نے (انسانوں کے) رنگ (اور اس کے تحت کے طور پر نسل) کو پہنائے، نتیجہ یہ نکلا کہ انیسویں صدی کے وسط تک عام اہل یورپ اس بات کو ایک بدیہی کلیہ تسلیم کرنے لگے کہ یورپی باشندوں کو غیر یورپی باشندوں پر ہمیشہ حکومت کرتے رہنا چاہیے۔

اس اصول کو چند دوسرے طریقوں سے بھی مضبوط و توانا بنایا گیا۔ میرے خیال میں ان طریقوں میں سے چند ایک ایسے ہیں جو اس خواب پر جو صیہونیوں نے فلسطین کے متعلق دیکھا اور اس عمل پر جو انھوں نے وہاں اختیار کیا، براہِ راست اثر انداز ہوئے اور انھوں نے ان کا رخ متعین کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ مہذب اور غیر مہذب اقوام کے مابین مفروضہ قانونی بنیادوں پر جو امتیازات قائم کیے گئے، ان میں ایک زمین کے متعلق رویہ بھی تھا۔ یہ ایک ایسا رویہ ہے جس میں زمین کی تعریف و توصیف بالکل ایسے ہی کی جاتی ہے جیسے مناجات و حمد میں اللہ تعالیٰ کی ثنا کی جاتی ہے اور غیر مہذب لوگوں کے متعلق یہ مفروضہ قائم کر لیا گیا کہ وہ اس رویے (اور جذبے) سے تہی دامن ہیں۔ اس بات کو ایمان کا درجہ دیا جاتا تھا کہ ایک مہذب شخص تو زمین پر قلبہ رانی کر سکتا ہے کیونکہ یہ اس کے لیے کچھ معنی رکھتی ہے چنانچہ (مہذب شخص) نے فنون اور صنعت و حرفت کی آبیاری کی، تخلیقی کام سرانجام دیے، کچھ کارنامے سرانجام دیے، کچھ تعمیر کیا لیکن جہاں تک غیر مہذب لوگوں کا تعلق ہے، انھوں نے قلبہ رانی تو کی لیکن برے طریقے سے (یعنی مغربی معیاروں کے مطابق انھوں نے نااہلی کا ثبوت دیا) یا پھر انھوں نے اسے گلنے سڑنے کے لیے چھوڑ دیا۔ خیالات کی یہی وہ مالا تھی جن کی مدد سے ان پورے پورے مقامی معاشروں کو، جو صدیوں سے امریکا، افریقہ اور ایشیا کے خطوں میں آباد تھیں، اچانک ان زمینوں پر اپنی زندگی بسر کرنے کا حق سے محروم کر دیا گیا۔ تب جدید یورپی استعمار کی ایسی تحریکیں وجود میں آنے لگیں جن کا مقصد مقامی باشندوں کو بے دخل کرنا اور ان کی اکھاڑ پچھاڑ کرنا تھا۔ اس بے دخلی اور اکھاڑ پچھاڑ کی متعدد صورتیں تھیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کئی منصوبے بروئے کار لائے گئے۔ کہیں تو زمین کی بحالی اور اسے دوبارہ قابلِ کاشت بنانے کا کام کیا گیا، (اور یوں) مقامی باشندوں کو نئے سرے سے آباد کیا گیا۔ کہیں ان مقامی باشندوں کو "مہذب بنانے" اور ان کے "وحشیانہ رسوم و رواج" کا ڈنک نکالنے کی سعی کی گئی۔ تاہم ان تمام منصوبوں کا مقصد صرف یہی تھا کہ مقامی باشندوں کو یورپی حکمرانی کے زیرِ سایہ کارآمد انسانوں میں تبدیل کر دیا جائے۔ ایشیا، افریقہ، جنوبی امریکا اور شمالی امریکا کی زمینیں اس لیے تھیں کہ یورپی

---

① جان لاک (1632-1704) انگریز فلسفی

② ڈیوڈ ہیوم (1711-76) سکاٹش فلسفی اور مؤرخ

باشندے ان سے فائدہ اٹھا سکیں کیونکہ جس انداز سے زمین کی قدر و قیمت وہ سمجھتے تھے، وہ مقامی باشندوں کے لیے ناممکن تھا۔ انیسویں صدی کے اختتام پر جوزف کونریڈ [1] نے اس فلسفے کو اپنے ناول ''قلبِ ظلمت (Heart of Darkness)'' میں ڈرامائی صورت میں پیش کیا اور اسے اپنے ایک کردار کرٹز (Kurtz) کی شخصیت میں سمو کر اسے پُرزور انداز سے ایک ایک جیتی جاگتی چیز بنا دیا۔ کرٹز وہ شخص ہے جس نے زمین کی تاریک مقامات کے متعلّق استعماری خواب دیکھے تھے، اور اس نے یہ خواب اس لیے بنے تھے کیونکہ ''سارا یورپ'' ہی اس کام میں مصروف تھا لیکن کونریڈ نے جس چیز سے اکتساب کیا، بلکہ حقیقتاً صیہونیوں نے بھی جس سے اکتساب کیا، وہ اس قسم کا فلسفہ تھا جسے رابرٹ ناکس (Kinos) نے اپنی کتاب ''انسانی نسلیں'' [2] میں پیش کیا تھا۔ اس فلسفے کی رو سے انسانوں کی دو نسلیں بنتی ہیں۔ ایک نسل سفید فام اور ترقّی یافتہ باشندوں کی ہے۔ یہ لوگ پیداواری عمل میں مصروف ہیں۔ دوسری نسل سیاہ فاموں پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ ادنیٰ ہیں اور ان کا کام (وقت، روپیا، اشیا) محض ضائع کرنا ہے۔ بعینہٖ جان ویسٹ لیک [3] اور اس سے پہلے ایمرڈی ویٹل [4] جیسے مفکرین نے دُنیا کے مختلف علاقوں اور خطوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ ایک تو وہ خطے اور علاقے تھے (جہاں اگرچہ خانہ بدوش اور ایک قسم کے فروتر معاشرے آباد تھے، اس لیے) جو نہیں تھے۔ دوسری قسم کے علاقے اور خطے تہذیب یافتہ تھے۔ جہاں تک اوّل الذکر خطوں کا تعلق ہے، ان پر ''نظرِ ثانی'' کی گئی اور ان کے متعلّق یہ دعویٰ کیا گیا کہ چونکہ اہلِ یورپ تہذیب یافتہ اور بلند تر ہیں، اس لیے انھیں یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ

---

[1] کونریڈ (Conrad) (1857ء-1924ء) اصل میں پولینڈ میں پیدا ہوا تھا لیکن وہ اوائلِ عمر میں یہ انگلستان آ گیا تھا۔ وہ ستر سال کی عمر میں انگلستان کے تجارتی بحری جہازوں پر ملازم ہو گیا اور ترقّی کرتے کرتے کپتان بن گیا۔ اپنے مختلف سفروں کے دوران میں اسے کئی مہموں میں سے گزرنا پڑا اور اسے کئی انوکھے تجربات ہوئے۔ انھی کو بنیاد بنا کر اس نے ناول نویسی کے میدان میں قدم دھرا۔ اس کے مختلف ناول اور کہانیاں شاہکار تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ایف آر لیوس کے مطابق انگریزی ناول کی جو عظیم روایت وجود میں آئی، اس کے چار ستونوں میں کونریڈ بھی ایک ہے۔

[2] ناکس کی اس کتاب کا ایک اہم اقتباس کرٹن (Curtun) کی کتاب ''امپیریلزم'' کے صفحات نمبر 93,71,5 پر موجود ہے۔ رابرٹ ناکس (1791ء-1862ء) ایڈنبرا یونیورسٹی میں اناٹومی اور علم الانسان (Ethnology) (انسانی نسلوں کی خصوصیات کا علم) کا پروفیسر تھا۔ وہ بدنام چوروں بروک (Burke) اور ہیر (Here) سے لاشیں خریدا کرتا تھا۔ بعض لاشیں انسانوں کو قتل کر کے حاصل کی جاتی تھیں۔ یوں یہ خود بھی بدنام ہو گیا۔

[3] جان ویسٹ لیک (Westlake) (1828ء-1931ء) ویسٹ لیک کیمبرج یونیورسٹی میں بین الاقوامی قانون کا پروفیسر تھا۔ اس نے بین الاقوامی پر کئی کتابیں بھی تحریر کی تھیں۔

[4] ویٹل (Emerde Vattel)

ان (اوّل الذکر) علاقوں کو اپنی تحویل میں لے لیں۔

تناظر کی یہ جو کایا پلٹ ہوئی جس کی مدد سے ترقّی یافتہ یورپ سے باہر لاکھوں کروڑوں ایکٹر اراضی کو اس طرح خالی اور غیر قابض قرار دے دیا گیا، وہاں کی اقوام اور معاشروں کے متعلق یہ فرمان صادر کر دیا گیا کہ وہ ترقّی اور نمو کے راستے میں رکاوٹ ہیں اور ان کی زمینوں کے متعلق بڑے تیقن کے ساتھ یہ دعویٰ کیا گیا کہ وہ یورپ کے سفید فام آباد کاروں کے لیے دستیاب ہیں تا کہ وہ انھیں بہتر طریقوں سے کام میں لاسکیں اور وہاں تہذیب پھیلا سکیں۔ میں نے ان تمام امور کو کچھ زیادہ ہی عام فہم انداز سے پیش کر دیا ہے۔ اس ضمن میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ 1870ء کے عشرے کے دوران میں یورپ میں جغرافیائی انجمنوں کی بھر مار ہونے لگی اور ہر ایک انھیں قائم کرنے لگا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ لارڈ کرزن [1] کے بقول جغرافیہ تمام علوم سے آگے نکل گیا ہے اور عالم گیر دلچسپی کا حامل بن گیا ہے۔ [2] ''قلب ظلمت'' کا ایک کردار مارلو یونہی یہ اعتراف نہیں کرتا۔

میں نقشوں کے پیچھے پاگل ہو گیا تھا۔ میں گھنٹوں (نقشے پر) جنوبی امریکا، افریقہ یا آسٹریلیا کو دیکھتا رہتا اور نئے نئے علاقے دریافت کرنے میں جو شان وشکوہ میسر آتا ہے، اس کے خیال میں کھویا رہتا۔ اس زمانے میں بے شمار ایسے مقامات تھے، جو ابھی خالی تھے (یعنی وہاں صرف مقامی باشندے ہی آباد تھے) اور جب مجھے نقشے پر کوئی مقام ایسا نظر آتا ہے جو خاص طور پر جاذبِ نظر دکھائی دیتا (لیکن نقشے پر دیکھنے میں تو یہ سارے ایک جیسے ہی نظر آتے ہیں) تو میں اس پر اپنی انگلی رکھ دیتا اور کہتا کہ جب میں بڑا ہوں گا، تو وہاں جاؤں گا۔ [1]

جغرافیے اور نقشوں کے پیچھے پاگل ہونے کی کیفیت نے ایک منظم صورت اختیار کر لی۔ ان تمام لوگوں کا ایک ہی مقصد تھا کہ کسی نہ کسی سمندر پار وسیع علاقے کو اپنے قبضے میں لے لیا جائے اور کونریڈ ہی نے یہ بھی تحریر کیا

---

① لارڈ کرزن (George Nathaniel Curzon) (1859ء-1925ء) برطانوی سیاستدانوں اور نو آبادیاتی منتظم۔ 1901ء سے 1905ء تک ہندوستان کا وائسرائے رہا۔ اسی کے عہد میں تقسیم بنگال عمل میں آئی (اس لحاظ سے وہ مسلمانانِ بنگال کا محسن تھا)۔ اس کا دوسرا بڑا کارنامہ یہ تھا کہ برصغیر کے آثارِ قدیم (تاج محل، شالامار باغ وغیرہ) کی مرمتوں اور حفاظت کے لیے محکمہ قائم کیا گیا۔

② Subjects of the Day: A selection of Curzon His Speeches and Writings (London: George Allen & Unwin, 1915): pp.155-56

③ Conrad: Youth and Two other Stories, New york, Doubleday, 1925. p.52.

تحریر کیا:

زمین کی تسخیر، جس کا زیادہ تر مطلب یہ ہے کہ آپ اسے ان لوگوں سے چھین رہے ہیں جن کا رنگ ہمارے رنگ سے قدرے مختلف ہے اور یا جن کی ناکیں ہماری ناکوں سے ذرا چپٹی ہیں، جب اسے خوب کھنگال کر دیکھیں، تو یہ آپ کو اچھا کام نظر نہیں آئے گا۔ اس (حرکت) کی جو چیز تلافی کرتی ہے، وہ محض ایک خیال ہے۔ ہاں اس (حرکت) کی جو چیز تلافی کرتی ہے، وہ محض ایک خیال ہے۔ ہاں اس (حرکت) کے پیچھے ایک خیال کارفرما ہے۔ کوئی جذباتی حیلہ نہیں بلکہ صرف ایک خیال...... ایک ایسی چیز، جس کی آپ تنصیب کر سکتے ہیں، جس کے سامنے اپنا سر جھکا سکتے ہیں اور جسے بھینٹ پیش کر سکتے ہیں۔ ①

میرا خیال ہے کہ کونریڈ نے کسی دوسرے شخص کی نسبت بات زیادہ واضح اور بہتر انداز سے پیش کی ہے۔ کسی خطے کی تسخیر کے لیے جس طاقت اور قوت کی ضرورت ہوتی ہے، وہ محض جزوی طور پر طبعی طاقت وقوت ہے۔ اس کے علاوہ اخلاقی اور عقلی قوت وطاقت کا عنصر بھی ہوتا ہے۔ یہی وہ عنصر ہے جو فی نفسہٖ تسخیر کو کسی خیال کے سامنے ثانوی بنا دیتا ہے۔ یہ خیال ہے جو سائنس، اخلاقیات اور عمومی فلسفے سے دلائل کا اکتساب کر کے خالص طاقت وقوت کو پُروقار بناتا ہے (بلکہ اس کی رفتار بھی تیز کر دیتا ہے۔) مغربی ثقافت کی ہر وہ چیز جو امکانی طور پر اس قابل تھی کہ مقبوضات کے حصول کو پُروقار بنا دیتی...... مثلاً ہر نئی سائنس اپنے لیے ایک نئی تعقلی قلمرو حاصل کر لیتی ہے...... اسے نوآبادیاتی مہم جوئی کی خدمت پر مامور کیا جاتا تھا...... اور مامور کیا جاتا تھا۔ ''خیال'' ہمیشہ تسخیر کے عمل میں روح پھونک دیتا اور اسے کاملاً خوشگوار بنا دیتا۔ آج جس چیز کو استعماری جارحیت قرار دے دیا جائے گا۔ اس کو انیسویں صدی میں بالکل صحیح قرار دیا جاتا تھا اور اس کے بالکل عام جواز میں جس قسم کے ''خیال'' کو بے حجابانہ اور کھلے بندوں پیش کیا جاتا تھا، اس کی ایک مثال پال لیرائے بولیو ① کی تحریروں سے مندرجہ ذیل اقتباسات سے فراہم ہوتی ہے۔

ایک معاشرہ تبھی دوسرے علاقوں کو اپنی نوآبادیاں بنانے کے کام میں مشغول ہوتا ہے، جب یہ خود بلوغ اور پختگی کے اعلیٰ مدارج پر پہنچ جاتا ہے، یہ تولیدی سرگرمیوں میں معروف ہو جاتا ہے، یہ پاسبانی اور حفاظت کے فرائض سرانجام دیتا ہے، یہ ترقی اور نمو کے لیے سازگار ماحول اور

---

① Ibid, pp.50-51

① بولیو (Paul Leroy Beaulieu) انیسویں صدی کا ایک ممتاز فرانسیسی جغرافیہ دان

حالات پیدا کرتا ہے اور جس نئے معاشرے کو اس نے جنم دیا ہوتا ہے، اسے تندرست و توانا بنا دیتا ہے۔ نو آبادیت معاشرتی عضویات کا ایک انتہائی پیچیدہ اور نازک مظہر ہے۔

جس خطے میں ایک نئے معاشرے کو جنم دینا مقصود ہوتا ہے، وہاں کے مقامی باشندوں سے صلاح مشورے کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اہم بات صرف یہ ہے کہ جدید یورپی معاشرے میں اتنی کافی توانائی اور تعقل موجود ہے کہ ''جب وہ بیرونی ممالک میں اپنی کثیر النوع سرگرمیوں میں نہایت جوش و خروش کے ساتھ مصروف ہوتا ہے، تو پہلے سے کہیں زیادہ بڑا بن جاتا ہے۔'' اس قسم کی سرگرمیاں اپنی نوعیت کے اعتبار سے قابلِ تعریف ہی ہوں گی، تبھی تو ان پر یقین کیا جاتا ہے۔ ان کی اس لیے بھی تحسین کی جاتی ہے کیونکہ ان کے متعلق یہ باور کیا جاتا ہے کہ یہ اپنے اندر ایک مکمل ترقی یافتہ تہذیب کی لہر سموئے ہوئے ہیں۔ چنانچہ لیرائے بولیو مزید رقمطراز ہے:

> جب کوئی قوم نو آبادیاں قائم کرنا شروع کرتی ہے، تو اس سے اس کی وسعت پذیر قوت کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ (نو آبادیاں قائم کرنا) اس کی افزائش نو کی قوت ہے۔ یہ اس کا وہ فعل ہے جس کے ذریعے وہ دھرتی پر اپنی توسیع کرتی ہے اور اپنی تعداد کو پہلے سی کئی گنا بڑا بناتی ہے۔ اس کے ذریعے کائنات یا کائنات کا ایک وسیع و عریض حصہ اس قوم کی زبان، رسوم، خیالات اور قوانین کے زیرِ نگیں لایا جاتا ہے۔ ①

استعماریت ایک نظریہ تھا اور نو آبادیت ایک عمل، اس عمل کے ذریعے دُنیا کے ان خطوں کو، جو بے مصرف طور پر خالی پڑے تھے، اس انداز سے تبدیل کرنا مقصود تھا کہ وہ یورپ کے شہری معاشروں کا مفید طور پر ایک نیا روپ بن جاتے۔ ان علاقوں کی ہر اس چیز کو، جس سے یہ عندیہ ملتا تھا کہ بیکار پڑی ہے، خواہ مخواہ ضائع ہو رہی ہے، بے ترتیبی کی مظہر ہے، حالانکہ یہ لامتناہی وسائل کا ذریعہ بن سکتی ہے، اسے اس طریقے سے تبدیل کیا جانا تھا کہ وہ افزائش کا موجب بن جاتی، اس میں ترتیب پیدا ہو جاتی، اس سے ٹیکس وصول کیا جا سکتا اور اسے امکانی طور پر دولت کمانے کا ذریعہ بنایا جا سکتا۔ آپ ایسے تمام انسانوں اور حیوانوں سے نجات حاصل کر لیں جو کام کے نہ کاج کے لیکن دشمن اناج کے ہیں اور جنھیں دیکھ کر گھن آتی ہے۔ ② اور اس طرح

① Agnes Murphy: The Ideology of French Imperialism. 1817-1881. Washington: The Catholic University of America Press, 1948) pp.110.136.189.

② یہ انسان اور حیوان جن سے چھٹکارا پانا مقصود تھا، یا تو ہڈ حرام بن کر بیکار ایک جگہ پڑے رہتے تھے اور یا پھر بے مقصد اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے رہتے تھے، یہ نہ تو کسی پیداواری عمل میں شریک ہوتے تھے اور نہ ان کی کبھی گنتی ہوتی تھی (یہاں ......

جو انسان اور حیوان باقی بچ رہیں، انھیں مخصوص علاقوں، ① خاردار تاروں سے گھرے ہوئے کیمپوں، مقامی وطنوں ② وغیرہ میں دھکیل دیں اور انھیں وہیں محدود کر دیں تو پھر ان کی گنتی بھی کر سکیں گے، ان پر ٹیکس بھی لگا سکیں گے، انھیں منفعت بخش طریقے سے استعمال بھی کر سکیں گے اور یوں ان علاقوں میں، جو آپ نے اس طریقے سے خالی کرائے ہیں، ایک نئے معاشرے کی تعمیر کر سکیں گے۔ چنانچہ یہی وہ طریقے ہیں جن کی امداد سے ممالکِ غیر میں یورپ کی تشکیلِ نو کی گئی، دھرتی پر یورپی باشندوں کی تعداد میں ''کئی گنا'' اضافہ کرنے کے منصوبوں کو پروان چڑھایا گیا اور ان کا بندوبست کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ چھوٹے چھوٹے یورپیوں کے متعدد متنوع گروپ وجود میں آ گئے جو ایشیا، افریقہ، جنوبی امریکا اور شمالی امریکا کے براعظموں میں دور دراز بکھرے پڑے ہیں۔ ان میں سے ہر گروپ اپنے آبائی کلچر، اپنے اولین پیشروؤں، اپنے ہراول میں آنے والے آبادکاروں کے حالات اور ان کے مخصوص ہتھکنڈوں کا عکاس ہے۔ ③

......یہ خیال رہے کہ ان کے متعلق یہ رائے مغربی سامراجیوں کی ہے۔) (مصنف)

① امریکی اصطلاح میں ایسے علاقوں کو Reservations کہا جاتا ہے۔ امریکا کی وفاقی حکومت نے ملک کے مختلف حصوں میں ایسے بعض علاقے مقامی ریڈ انڈین باشندوں کے لیے مخصوص کر رکھے ہیں۔

② جنوبی افریقہ دُنیا کا وہ بدقسمت خطہ ہے جہاں گوروں کی ایک قلیل تعداد نے ملک کے نظم و نسق اور تمام وسائل پر قبضہ کر رکھا ہے۔ ملک کے مقامی سیاہ فام باشندے، آبادی کے لحاظ سے جن کی زبردست اکثریت ہے۔ ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔ ان کے ساتھ امتیاز اس حد تک برتا جاتا ہے کہ انھیں گوروں کی آبادیوں میں رہائش اختیار کرنا تو کجا، ان کے ساتھ بسوں، ٹرینوں وغیرہ پر سفر کرنے، ریستورانوں میں ان کے ساتھ کھانا کھانے، ان کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے اور ان کے ساتھ گرجوں میں عبادت کرنے کی بھی اجازت نہیں۔ گوروں کے علاقوں میں انھیں صرف مشقت طلب یا ادنیٰ نوعیت کے کام کرنے ہی کی اجازت ہے۔ ملک کے بعض بنجر علاقوں میں ان کی نام نہاد حکومتیں قائم کر دی گئی ہیں۔ ان علاقوں کو ان کے مقامی وطن Native homelands کہا جاتا ہے۔

③ اسرائیل کا ایک ممتاز ناول نگار (Amos Oz) اس بات کو خوب صورت انداز سے پیش کرتا ہے۔ جب تک میری سانس کی ڈوری صحیح سلامت ہے، ان لوگوں کی داستانیں مجھ میں ولولہ پیدا کرتی رہیں گی جو موعودہ سرزمین میں اس لیے آئے تا کہ وہ اسے ایک زرعی جنت میں تبدیل کر دیں یا یہاں (مشہور روسی ناول نگار) ٹالسٹائی کے اصول کے مطابق مساوات پر مبنی کمیون قائم کریں یا اسے ایک ایسے محوطے کی شکل دے دیں جہاں وسطی یورپ سے آیا ہوا اعلیٰ تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ اسے ایک نیا آسٹریا یا بویریا بنا دے۔ میں ان لوگوں کی بھی تہِ دل سے قدر کرتا ہوں جو یہاں اس لیے آئے تا کہ وہ یہاں مارکسی اصولوں کے مطابق ایک جنت ارضی تخلیق کر سکیں، جنھوں نے یہاں کتاب انجیل میں مذکور مقامات پر اجتماعی زرعی فارم (کتنبر) قائم کیے اور جن کی شدید پوشیدہ خواہش یہ تھی کہ کئی روز خود سٹالن چل کر یہاں آئے اور اعتراف کرے ''واہیات یہودیو، تم نے کمال کر دیا۔ تم ہم سے بھی بازی لے گئے ہو۔'' ہفت روزہ ''ٹائم'' مؤرخہ 5 مئی 1978ء صفحہ نمبر 61

اپنے تمام اختلافات کے باوجود، جو اچھے خاصے تھے، ان تمام گروپوں میں ایک بہت بڑی قدرِ مشترک تھی اور وہ یہ تھی کہ وہ اپنا کاروبارِ حیات یوں چلاتے تھے جیسے ہر چیز نارمل (معمول کے مطابق) ہو۔ یورپ کی مضحک ترین اور بے ہودہ ترین نقول (جنوبی افریقہ، روڈیشیا[1] وغیرہ) موزوں اور مناسب قرار پائیں۔ مقامی باشندوں کے خلاف جو بدترین امتیازات روا رکھے گئے اور انھیں جن طریقوں سے دور دور رکھا گیا، انھیں بالکل معمول کے مطابق تصور کیا گیا لیکن ''سائنسی طور پر'' ایسی حرکات جائز اور صحیح تھیں۔ ایک ایسے خطے میں جو چاروں طرف سے دوسری مملکتوں میں گھرا ہوا ہو (محوطہ) اور جو جغرافیائی اور ثقافتی اعتبار یورپ سے کوسوں دور ہو۔ ایسے مقامی باشندوں کے مابین جو آپ سے عناد بھی رکھتے ہوں اور جو آپ کے رویوں کو سمجھنے سے قاصر بھی ہوں، ایک بدیسی طرزِ حیات اختیار کرنے میں جو تضاد پایا جاتا ہے۔ اس نے تاریخ کے متعلق ایک خاص قسم کے احساس، ایک ڈھیٹ قسم کی منطق، ایک مخصوص نوع کی معاشرتی اور سیاسی کیفیت کو جنم دیا۔ ان تمام باتوں نے مل ملا کر یہ حکم لگایا کہ موجودہ نوآبادیاتی مہم نارمل ہے، جائز ہے، مفید اور کارآمد ہے۔

اگر فلسطین کے خاص حوالے سے بات کی جائے، تو مقامی فلسطینیوں کے متعلق صیہونیوں کے جو مخصوص رویے بنتا تھے اور ان صیہونیوں نے ''نارمل'' زندگی کے متعلق جو مفروضہ دعاوی کرنا تھے، ان کے بیج ان برطانوی عالموں، منتظمین اور ماہرین کے، جو انیسویں صدی سے فلسطین کے استحصال اور اس پر حکمرانی کے علم میں سرکاری طور پر شامل تھے، رویوں اور عملوں میں بوئے جا چکے تھے، ذرا غور فرمائیں کہ 1903ء میں بشپ آف سالسبری[2] نے ''پیلسٹائن ایکسپلوریشن فنڈ''[3] کے ارکان سے خطاب کرتے ہوئے کیا کہا تھا:

میرا خیال ہے کہ اب تک جو کچھ دریافت کیا گیا ہے، اس کے پیشِ نظر ہمیں اس بات پر قطعاً کوئی افسوس یا ملال نہیں ہوتا کہ اسرائیلی تہذیب نے کنعانی تہذیب[4] کو کیوں کچل ڈالا...... (جو کھدائیاں کی گئی ہیں ان

---

① روڈیشیا نام کے اصل میں دو ملک تھے: شمالی روڈیشیا اور جنوبی روڈیشا، دونوں پر اقلیتی گوری حکومتیں مسلط تھیں لیکن اب دونوں ممالک آزادی حاصل کر چکے ہیں۔ شمالی روڈیشیا کو اب ''زیمبیا'' اور جنوبی روڈیشیا کو ''زمبابوے'' کہتے ہیں۔

② سالسبری وسطی انگلستان کے ایک حلقۂ انتخاب کا نام ہے، بشپ کو اُردو اور عربی میں اسقف کہتے ہیں، عیسائیت میں مذہبی رہنماؤں کی وہی درجہ بندی ہوتی ہے جو ہمارے ہاں انتظامیہ میں ہوتی ہے۔ بشپ متعدد کلیساؤں کا انچارج ہوتا ہے۔ عہدے کے لحاظ سے اسے اپنے علاقے کا ڈپٹی کمشنر سمجھیں۔

③ Palestine Exploration Fund ایک برطانوی تنظیم، جس کا اصل مقصد فلسطین کے وسائل کا استحصال کرنا تھا اور اس کے قیام میں یہودی پیش پیش تھے۔

④ یہودی ارضِ مقدس کو کبھی ''فلسطین'' کے نام سے نہیں پکارتے، پرانے زمانے میں وہ اسے کنعان کہتے تھے......

تھے اور جن کی جگہ اس نے خود لے لی تھی، ذکر کیا ہے انھیں اس (انجیل مقدس) نے غلط انداز سے پیش نہیں کیا۔

ایک نوجوان امریکی عالم، مریم روزن، نے فلسطین کے متعلق مخصوص برطانوی رویوں کی ایک روح فرسا اور لرزہ خیز فہرست مدوّن کی ہے۔ حقیقتاً یہی وہ رویے ہیں جو مقامی فلسطینیوں کے متعلق ویزمان سے لے کر بیگن تک سرکاری یہودی رویے کی غیر معمولی انداز سے نشان دہی کرتے ہیں۔ مریم روزن نے جو اہم کارنامہ سرانجام دیا ہے، اس کے چند اقتباسات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

ٹرائی وٹ ڈریک، جس نے مغربی فلسطین کا سروے کیا تھا، تحریر کیا:

فلاحین کا یہ خوف کہ ملک کی تسخیرِ نو کے لیے ہم نے خفیہ منصوبے ترتیب دے رکھے ہیں، ہمارے راستے میں مشکلات کا پہاڑ کھڑا کر دیتا ہے۔ اگر ان کا یہ اندیشہ دور کر دیا جائے تو پھر ہمیں نری بونگی حماقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے چنانچہ وہ سیدھے سادے سوالوں کا سیدھا جواب نہیں دیتے۔ وہ ان سوالوں کا صحیح مقصد سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اُلٹا وہ خود سوال داغ دیتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ آخر ایک فرنگی کو کیا ضرورت پیش آئی ہے کہ وہ ہمارے ملک کی کسی غیر اہم وادی یا پہاڑی کا نام پوچھتا پھرتا ہے۔''

مشرق میں مجھ جس قسم کے انسانوں سے واسطہ پڑا ہے، فلاحین ان میں بدترین لوگ ہیں......
فلاحین ہر نوع کے اخلاقی احساس سے بالکل عاری ہیں۔

''پیلسٹائن ایکسپلوریشن فنڈ'' کو ملک کے سروے کے دوران میں جن ''مزاحمتوں'' کا سامنا کرنا پڑا، ان کے متعلق ڈین آف ویسٹ منسٹر (1) ارشاد فرماتے ہیں:

آپ کو اپنے کام میں یہ تمام مشقتیں جھیلنا پڑیں۔ آفرین ہے کہ پھر بھی آپ اپنے کام میں جتے رہے

......اب بھی اگر انھیں کبھی تلخ گولی نگلنا ہی پڑے اور اسے ''اسرائیل'' پکارنے سے بات نہ بنتی ہو تو اسے ''کنعان'' کہنا ہی پسند کریں گے۔ یہ صورت زیادہ تر اسرائیل کے قیام سے قبل قائم تھی۔

(1) لندن کا وہ علاقہ جہاں پارلیمنٹ کی عمارات واقع ہیں ویسٹ منسٹر کہلاتا ہے۔ ان عمارات کے قریب ہی ایک تاریخی گرجا ہے جسے ویسٹ منسٹر ایبے (Abbey) کہتے ہیں۔ یہی وہ گرجا ہے جہاں انگلستان کے حکمرانوں کی تاجپوشی کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ انگلستان کی بعض نامور ہستیاں بھی اس کے اندر مدفون ہیں۔ گرجے کے اندر داخلہ بذریعہ ٹکٹ ہوتا ہے۔ بڑے گرجوں میں کئی عہدے دار کام کرتے ہیں۔ ان کے سربراہ کو ڈین کہتے ہیں۔ ویسٹ منسٹر کے ڈین کو سرکاری طور پر اہم مقام حاصل ہوتا ہے اور وہ دارالامرا کا رکن بھی ہوتا ہے۔

لیکن ان لوگوں کی مدد سے نہیں جو موقع پر موجود تھے (یعنی وہاں آباد تھے) بلکہ ان تمام مزاحمتوں اور رکاوٹوں کے باوجود جو ان لوگوں کی عیاری، جہالت اور حماقت نے ایک عجیب طریقے سے مل جل کر آپ کے کام میں ڈالی تھیں، اس قسم کی جہالت، حماقت اور عیاری صرف مشرق کے باشندوں ہی میں ملے گی۔

الجلیل [1] کے سروے کے متعلق لارڈ کچز [2] نے کہا:

ہمیں امید ہے کہ ہم فلسطین کے ان دلچسپ ترین کھنڈرات کو جنھیں ہمارے آقائے ولی نعمت، یسوع مسیح کے قدموں نے مقدس بنا دیا تھا، ان بے درد اور سفاک تخریب کاروں یعنی غیر تعلیم یافتہ اور اُجڈ عربوں کے پنجے سے چھڑالیں گے۔ میرا اشارہ اس یہودی معبد کی طرف ہے جو کیپر نام میں واقع ہے۔ یہ معبد تیزی سے نابود ہوتا جا رہا ہے کیونکہ اس کے پتھروں کو جلا کر چونا بنایا جا رہا ہے۔

سی آر۔ کونڈر نامی ایک شخص اپنی تصنیف ''فلسطین کی موجودہ حالت'' میں رقمطراز ہے:

مقامی فلاحین صرف اس قابل ہیں کہ ان کا ذکر محض چند الفاظ میں کر دیا جائے۔ وہ وحشیانہ طور پر اجڈ، جاہل اور متعصب ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ بلا کے جھوٹے اور دروغ گو ہیں۔ تاہم ان میں چند خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ اگر ان کی مناسب تربیت کی جائے، تو وہ کام کے انسان بن سکتے ہیں۔ (اس نے ان کی جو خوبیاں گنوائی ہیں، ان میں وہ ان کی زیرکی، تیز فہمی، توانائی، مصائب و آلام گرمی وغیرہ برداشت کرنے کی ہمت شمار کرتا ہے۔)

سر فلنڈرز پیٹری [3] کے الفاظ ہیں:

عربوں کے ساتھ خواہ مخواہ اتنی رومانی داستانیں وابستہ ہو گئی ہیں، حقیقتاً دوسری وحشی اقوام کی طرح وہ اس قدر نااہل اور نکمے ہیں کہ ان سے کراہت ہونے لگتی ہے۔ جس طرح براعظم امریکا کے ریڈ انڈین یا نیوزی لینڈ کے ماؤری باشندوں کے ساتھ کوئی رومانی کہانیاں منسوب کرنا ممکن نہیں، اسی طرح یہ عرب بھی اس قابل نہیں کہ ان کے ساتھ ایسی داستانیں وابستہ کی جائیں۔ ان کے مقابلے میں مصری زیادہ سمجھ دار اور زیرک ہیں اور ان کے ہاں دوبارہ جانے میں مجھے بہت خوشی محسوس ہوگی۔

---

① الجلیل (گلیلی) فلسطین کا ایک علاقہ

② ہوریشو بریرٹ...... ارل آف خرطوم اینڈ پردم...... آئرش نژاد برطانوی فوجی افسر اور نوآبادیاتی حاکم......

③ پیٹری Sir Flinders Williom Mathew Petrie مصریات کا ماہر

''فلسطین کے عربوں'' کے معلق چارلس کلرماں ژانو ① کے تاثرات:

عرب تہذیب محض فریب اور ڈھکوسلا ہے۔.....عرب فتوحات کی ہولناکیوں کی طرح اس کا وجود بھی اب ناپید ہوتا جارہا ہے۔ یہ یونانی اور رومی تہذیب کی محض آخری لو ہے جو اسلام کے بے سکت لیکن مؤدب ہاتھوں میں آہستہ آہستہ بجھتی جارہی ہے۔

یا اس ملک کے متعلق سٹینلے کک ② کا نظریہ:

......سرعت پذیر زوال و انحطاط۔ جسے (بظاہر تو یہی نظر آتا ہے) وقتی طور پر جوشیلے اور مستعد صلیبیوں نے روک دیا تھا۔ دور جدید کے سیاحوں نے مقامی باشندوں کے کردار کی خلقی کمزوریوں کی اکثر نشاندہی کی ہے اور رابنسن کی طرح ان سب کو یہ احساس ہے کہ اگر اس خطے کو دوبارہ خوشحال بنانا مقصود ہے تو پھر ''انسانی ہاتھوں کے علاوہ، جو زمین پر ہل چلا سکیں، اور کسی چیز کی ضرورت نہیں۔''

اور آخر میں آر اے ایس میکالسٹر ③ کی رائے بھی ملاحظہ فرمائیں:

اگر یہ کہا جائے کہ ان طول طویل صدیوں کے دوران میں فلسطین کے مقامی باشندوں نے مادی تہذیب کی ترقی اور فروغ کے سلسلے میں ایک تنکا تک نہیں توڑا، تو کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔ روئے زمین پر یہ غالباً واحد ملک تھا جہاں قطعاً کسی قسم کی کوئی ترقی نہیں ہوئی۔ اس کی تہذیب سراسر خوشہ چینی پر مبنی تھی اور دوسروں کی رہینِ منت۔ ④

---

① (Chales Clermont Ganneau) (1846ء-1943ء) ایک فرانسیسی سفارت کار اور مستشرق۔ 1874ء میں برطانوی حکومت نے فلسطین میں آثارِ قدیمہ کے ماہرین کی ایک جماعت بھیجی تھی۔ یہ شخص جماعت کا سربراہ تھا۔

② کک (Stainley Arthur Cook) (1873ء-1940ء) ایک برطانوی یہودی، یہ 1904ء سے 1938ء تک کیمبرج یونیورسٹی میں عبرانی زبان و ادب کی تعلیم دیتا رہا۔ یہ آثارِ قدیمہ کا ماہر اور مقامی تہذیب و تمدن، انجیل مقدس اور تقابلی مذاہب پر سند سمجھا جاتا تھا۔

③ (R.A.S Macalister) ایک انگریز سیاح (1870ء-1950ء)

④ 1976ء میں امریکا کے ہنٹر کالج کی ایک طالبہ مریم روزن (Miriam Rosen) نے اپنے ایم اے کے امتحان کے سلسلے میں ایک مقالہ (Thesis) بعنوان (The Last crusade: British Archeology in Palestine) تحریر کیا تھا۔ یہ مقالہ بہت عمدہ اور قابلِ قدر ہے۔ میں نے اوپر جو اقتباسات دیے ہیں، وہ اسی کے صفحات نمبر 31-18 سے لیے گئے ہیں۔ (مصنف)

تو یہ چند بڑے بڑے نکات ہیں جنھیں یورپ کے استعماری یا نو آبادیاتی رویوں پر استوار صیہونیت کے پسِ منظر کے متعلق پیش کرنا ہوگا۔ صیہونیت نے یہودیوں کی فلاح و بہبود کے لیے جو کچھ بھی کیا ہو، لیکن حقیقت یہی ہے کہ وہ فلسطین کو بالکل اسی نگاہ سے دیکھتی تھی جس سے یورپ کے استعمار پسند دیکھتے تھے یعنی اس کے نزدیک یہ ایک بے آباد خطہ تھا لیکن اس سوچ میں ایک تضاد تھا اور وہ تضاد یہ تھا کہ ایک طرف تو وہ کہتے نہیں تھکتی تھی کہ یہ خطہ بے آباد ہے لیکن دوسری طرف وہ یہ بھی سمجھتی تھی کہ یہ خطہ مقامی لوگوں سے ''پُر'' تھا۔ بے شک یہ مقامی لوگ اس کی نظروں میں رذیل تھے اور ان کے متعلق وہ یہ بھی باور کرتی تھی کہ ان (مقامی لوگوں) سے غالباً جان چھڑائی جا سکے گی۔ جیسا کہ جنگِ عظیم اول کے بعد شائم ویزمان نے بالکل واضح طور پر کہا تھا، اس (صیہونیت) نے فلسطین میں ایک نئی یہودی مملکت کے قیام کے سلسلے میں اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے استعماری طاقتوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لیا تھا اور جہاں تک ''مقامی باشندوں'' کا تعلق ہے، ان کے متعلق اس کا رویہ ہمیشہ منفی رہا۔ ان ''مقامی باشندوں'' کے بارے میں یہ مفروضہ قائم کر لیا گیا کہ یہ تو بس اللہ میاں کی گائیں ہیں، چنانچہ ان کے وطن کے متعلق جو بھی منصوبے وضع کیے جائیں، وہ انھیں آنکھیں بند کر کے قبول کر لیں گے اور ذرا چوں چرا نہیں کریں گے۔ جیسا کہ یہوشوا پورتھ (Porath) اور نیول مینڈل (Mandel) جیسے یہودی مؤرخین نے بھی، جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا، اس کی بنا پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ (جنگِ عظیم اول سے کہیں قبل) فلسطین میں یہودی نو آبادکاروں کے تصورات کو بلا مغالطہ زبردست مقامی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس مزاحمت کی وجہ یہ نہیں تھی کہ مقامی باشندے یہودیوں کو ارواحِ بد سمجھتے تھے بلکہ یہ تھی کہ مقامی باشندوں کی اکثریت کو یہ بات قطعاً ناپسند تھی کہ بدیسی اور غیر ملکی لوگ ان کے سرزمین پر آباد ہوں۔ [1] مزید برآں، صیہونیت نے جب یہودی قوم کے تصور کی تشکیل کی کہ اس کا مقصد اپنے (گم گشتہ) علاقوں کی 'بازیافت'' تھی، تو اس نے نہ صرف یورپی تہذیب کے انسانی نسلوں کے متعلق اس تصور کو من و عن تسلیم کر لیا کہ اپنی خصوصیت کے اعتبار سے ہر نسل دوسری نسل سے مختلف ہوتی ہے بلکہ اس نے اس امر کو بھی بطور حقیقت قبول کر لیا کہ درحقیقت فلسطین میں جو لوگ آباد ہیں، وہ ترقی یافتہ نہیں بلکہ پسماندہ ہیں، چنانچہ (اس کا یہ حق بنتا ہے) کہ اسے ان پر تسلط و غلبہ حاصل ہو۔ چنانچہ بین السطور و غلبے کا یہ مفروضہ ہی تھا

[1] See Neville J. Mandel, The Arabs and Zionism before World War 1 (Berkcley: University of California Press 1976 and Yehoshua Porath: The Emergence of the Palestinian Arab National Movement Vol: 1918-1929 London: Frank Cass Company, 1974.

جس نے صیہونیت کو بالخصوص اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ مقامی باشندوں کو زیادہ تر اس طور پر نظر انداز کرتی رہے گویا وہ اس قابل ہی نہیں کہ ان پر سنجیدگی کے ساتھ کوئی توجہ دی جائے۔ ② چنانچہ صیہونیت نے جس نہج پر نمو پائی، اس میں اسے اپنی ذات کے متعلّق تو بے نظیر وقوف تھا لیکن جہاں تک بدنصیب مقامی باشندوں کا تعلق ہے، ان کے لیے کچھ بھی نہ بچا اور اگر کچھ بچا بھی تو وہ بھی نہ ہونے کے برابر تھا، ان مقامی باشندوں کے بارے میں صیہونیت نے جس بے نیازی کا مظاہرہ کیا، اس کے متعلّق میلسم روڈنسن نے بالکل بجا کہا ہے:

> یہ ایک ایسی بے نیازی تھی جو یورپی بالادستی سے منسلک تھی جس سے یورپ کے پرولتاری طبقے اور پسی ہوئی اقلیتیں بھی مستفید ہوئیں۔ درحقیقت اس امر کے بارے میں قطعاً کسی قسم کے شبہے کی کوئی گنجائش نہیں کہ اگر (یہودیوں کے) آبائی وطن پر ان قوموں میں سے کسی ایک قوم کا، جو صنعتی طور پر بہت مستحکم ہو چکی تھیں اور جو اس زمانے میں دُنیا پر حکومت کر رہی تھیں، قبضہ ہو جاتا اور یہ قوم اس علاقے میں پورے طور پر آباد ہو جاتی اور یہاں کے باشندوں میں زبردست قومی شعور پیدا کر دیتی، تو جاہل سے جاہل اور مفلس سے مفلس صیہونی کے شعوری ذہن میں جو مسئلہ در آتا، وہ یہ ہوتا کہ جرمنوں، فرانسیسیوں یا انگریزوں کو کیسے نکال باہر کیا جائے اور اپنے (آبائی) وطن میں ایک نیا، قومی اعتبار سے مربوط عنصر کیسے داخل کیا جائے۔ ①

قصہ مختصر، صیہونی توانائیوں کے جتنے بھی اجزائے ترکیبی تھے، ان سب کی اساس ''اخراجِ موجودگی'' پر تھی یعنی فلسطین کے ''مقامی باشندوں'' کے ساتھ کچھ اس قسم کا برتاؤ کیا جائے کہ وہ کسی بھی ایسی جگہ کے، جہاں کسی بھی نوعیت کا کوئی کام رہا ہو، قریب بھی نہ پھٹک سکیں اور یوں ثابت کر دیا جائے کہ وہ عدم موجود ہیں۔ ایسے ادارے قائم کیے گئے جن سے عمداً مقامی باشندوں کو دور رکھا گیا۔ قیامِ اسرائیل کے بعد ایسے قوانین وضع کیے گئے جن کے ذریعے اس بات کا پکا بندوبست کیا گیا کہ مقامی باشندے اپنے ''عدم مقام'' (Nonplace) پر رہیں گے اور یہودی اپنے مقام پر، وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ ہمیں اس امر پر قطعاً کسی قسم کا تعجب نہیں ہونا چاہیے

---

① ملاحظہ فرمائیں ایموس ایلون کی تصنیف (The Israelis Founders and Sons) مطبوعہ بینٹم بک نیویارک، ایڈیشن 1971ء صفحات 24-218۔ یہاں مصنف نے تاریخی حقائق کھرے کھرے انداز سے پیش کیے ہیں۔ (مصنف)

② میکسیم روڈنسن (A Colonial Settler State Rodinson Thorstat) مترجم: ڈیوڈ تھورس ٹیڈ (Thorsad) مطبوعہ: موناڈ (Monad) پریس آف دی اینکر فاؤنڈیشن نیویارک: سال اشاعت 1973ء صفحہ نمبر 39

کہ آج ایک معاشرے کی حیثیت سے اسرائیل میں جو مسئلہ ہیجانی کیفیت پیدا کر دیتا ہے، وہ فلسطینیوں کا مسئلہ ہے جن کے وجود کی نفی صیہونیت نہایت استقامت اور تسلسل کے ساتھ کرتی چلی آرہی ہے۔ غالباً صیہونیت کا یہی وہ ناگوار پہلو ہے جو اسے ناگزیر طور پر استعمار کے ساتھ نتھی کر دیتا ہے۔ کم از کم جہاں تک فلسطینیوں کا تعلق ہے وہ تو یہی سمجھتے ہیں۔ میں ایک مرتبہ پھر روڈنسن کے الفاظ کا حوالہ دے رہا ہوں۔

> وہ عنصر، جس نے رُوس اور دوسرے ممالک کے یہودی دکان داروں، خوانچہ فروشوں، کاریگروں اور دانش وروں کی امنگوں کو استعمار کے تصویری مدار کے ساتھ منسلک کرنا ممکن بنایا، محض ایک معمولی سی بات تھی جو نفسہٖ کسی خاص اہمیت کی حامل معلوم نہیں ہوتی تھی۔ بہرحال وہ بات (جو ان کے ذہنوں میں جاگزیں ہوگئی) یہ تھی کہ
>
> فلسطین میں ایک دوسری قوم آباد تھی۔ ①

① میکسم روڈنسن Rodinson A Colonial Settles State مترجم: ڈیوڈ تھورس ٹیڈ Thorstad مطبوعہ: موناڈ Monad پریس آف دی اینکر فاؤنڈیشن، نیو یارک، سال اشاعت 1973 صفحہ نمبر: 39

②

صیہونیوں کی آبادی، فلسطینیوں کی بربادی

میں اس ناہمواری (عدم مساوات) کا ذکر تصوراتی اصطلاحات میں کرتا رہا ہوں، جو صیہونیت کے رویے میں پائی جاتی ہے۔ ایک طرف تو یہودیوں کا اسے اتنا خیال ہے اور دوسری طرف وہ غیر یہودیوں یا مقامی عرب باشندوں سے تقریباً کامل اغماض برتتی ہے۔ جہاں تک مقامی رہائشی باشندوں کا تعلق ہے تو ان کے متعلق صیہونیت اور یورپی استعمار نے جو نقطۂ نظر اختیار کیا ہے اور علمیاتی اور چنانچہ تاریخی اور سیاسی طور پر بالکل یکساں ہے۔ بہ الفاظ دیگر، وہ اس معاملے میں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں لیکن یہ استعماری نقطۂ نظر، جسے آسان، سہل اور مختصر الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں لیکن جو دُنیائے سیاست اور ان لوگوں کی زندگیوں پر، جن کے نزدیک علمیات ایک غیر متعلق چیز تھی، اثر انداز ہوتا تھا، اس بات کا جواز فراہم کرتا ہے کہ ہم یہ غور کریں کہ آخر یہ علمیات ہے کیا؟ اس دُنیا میں اور ان اشخاص کی زندگیوں پر، جن میں لاکھوں فلسطینی بھی شامل تھے، استعمار اور صیہونیت جس طرح اثر انداز ہوئی، اس کے نتائج کی جزئیات وتفصیلات مرتب کی جاسکتی ہیں۔ یہ کام محض نظری اعتبار سے ہی نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس میں یہ بھی دیکھا جاسکتا ہے کہ صیہونیت کاری زخم لگانے میں کس حد تک مؤثر ثابت ہوئی۔ صیہونیت کے متعلق عام فلسطینیوں کا ردِعمل کیا تھا، میرے خیال میں اس کی ایک مکمل جھلک مندرجہ ذیل جملے میں مل جاتی ہے جو 1922ء میں سرونسٹن چرچل[1] کے قرطاسِ ابیض کے جواب میں عرب وفد نے استعمال کیا تھا:

---

[1] چرچل جو بعد میں برطانیہ کا نامور ترین وزیراعظم ثابت ہوا، 1928ء میں وزیر نوآبادیات تھا۔

یہودیوں کا قومی وطن قائم کرنے کا نتیجہ یہ برآمد ہوگا کہ عربوں کی آبادی، ثقافت اور زبان یا تو بالکل معدوم ہو جائے گی اور یا پھر یہ دوسروں کے ''رحم وکرم'' پر ہوگی، فلسطینی عرب جس چیز کا نسل در نسل مشاہدہ کر رہے تھے، وہ، وہ منصوبہ تھا جس کی گہری جڑیں یہودی تاریخ اور اس خوفناک تجربے میں جو انھیں یورپ میں ہوا، پیوستہ تھیں، جس کی گرہیں اب آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے کھلتی جارہی تھیں۔ عربوں کو اب یہ صاف صاف نظر آرہا تھا کہ صیہونی منصوبہ ایک مجسم سفاک نظریہ ہے جو خانقاہی ضبط ونفس اور ماحول سے سرد مہرانہ بے تعلقی کا حکم لگاتا ہے۔ یہودی جو اپنے آپ کو سوشلسٹ کا رکن کہلا کر اتراتے تھے، وہ اخوت کی تعبیر خالصتاً قومی یا نسلی بنیادوں پر کرتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک اخوت یہودیوں کے ساتھ ہو سکتی تھی، عربوں کے ساتھ نہیں چونکہ وہ اراضی پر کام اپنے ہاتھوں کرنے پر مُصر تھے کیونکہ دوسروں کا استحصال ان کے لیے مردود تھا، اس لیے وہ اپنی قلمرو سے عربوں کو خارج کر دیتے تھے...... وہ مساوات پر یقین تو رکھتے تھے لیکن صرف اپنے لیے۔ وہ یہودی روٹی کھاتے تھے جو یہودی اراضی سے حاصل کی جاتی تھی اور اس اراضی کا تحفظ یہودی رائفلیں کرتی تھیں۔''①

فلسطینی تجربے کی جو ''فہرست'' میں یہاں مرتب کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، وہ اس سادہ سچائی پر مبنی ہے کہ فخر وانبساط سے سرشار یا (بعد ازاں) خوف و دہشت سے مرعوب یہودی، جو فلسطین میں وارد ہوتے تھے، اصلاً غیر ملکی گردانے جاتے تھے لیکن وہ اعلان یہ کرتے تھے کہ ہمارا مقدر یہ ہے کہ ہم ایک یہودی مملکت تخلیق کریں لیکن عربوں کا، جو وہاں موجود تھے، کیا بننا تھا؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو اب ہمیں اپنے آپ سے لازماً پوچھنا ہوگا۔ (اس سول کے جواب میں) ہمیں جو کچھ معلوم ہوگا، وہ یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو صیہونی نقطۂ نظر سے مثبت تھی مقامی عرب فلسطینیوں کے تناظر میں کاملاً منفی تھی۔

اس کی وجہ؟ صیہونیوں نے جو عظیم خواب بُنا تھا، اس میں ان کا کبھی کہیں مقام نہیں بن سکتا تھا۔ محض اس لیے نہیں کہ یہ ''خواب'' ایک محض نظری معاملہ تھا، یہ تو وہ تھا، لیکن چونکہ اس (''خواب'') نے بعد ازاں مقامی عرب فلسطینیوں کے متعلق اسرائیلی حکومت کی حکمتِ عملی کے خدوخال ہی نہیں بلکہ اس کی تفصیلات بھی طے کرنا تھیں۔ یہ ''خواب'' وہ انداز بھی فراہم کرتا تھا جس سے صیہونی رہنما عرب فلسطینیوں کو دیکھتے تھے تاکہ بعد ازاں (اور اس زمانے میں یقیناً) ان سے نپٹا جاسکے۔ چنانچہ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، میرے

① ایضاً صفحہ نمبر 213

ذہن میں وہ ساری جدلیات موجود ہے جو نظریے (تھیوری) اور روزمرہ کے حقیقی مؤثرات کے مابین پائی جاتی تھی۔ میرا مقدمہ یہ ہے کہ ایک منظم معاشرے (polity) کی حیثیت سے اسرائیل نے اس صیہونی دعوے ① (Thesis) سے نُمو پائی کہ فلسطین میں جو نوآبادکاری ہوگی، وہ یہودیوں کی ہوگی اور یہودیوں کے لیے ہوگی، یہ نوآبادکاری فلسطینیوں کی اکھاڑ پچھاڑ سے ہوگی اور یہ دونوں کام بہ یک وقت سرانجام دینا ہوں گے۔ مزید برآں، فلسطین کے متعلق صیہونیت نے جو خیالات شعوری طور پر اپنائے یا جن خیالات کا اس نے ڈنکے کی چوٹ اعلان کیا، ان کے مطابق اس کا ارادہ یہ تھا کہ کوشش یہ کی جائے کہ (فلسطین میں) مقامی باشندوں کی تعداد کم سے کم ہو جائے اور بعد میں انھیں بالکل ہی نکال باہر کیا جائے۔ تاہم اگر کوئی بات بنتی نظر نہ آئے تو انھیں (مقامی باشندوں کو) مطیع و محکوم بنالیا جائے تاکہ اس امر کی ضمانت مل سکے کہ اسرائیل محض اپنے شہریوں (جن میں عرب بہرحال شامل تھے) کی مملکت نہیں ہوگا بلکہ یہ ''پوری یہودی قوم'' کی مملکت ہوگا۔ یوں اسے سرزمین اور اقوام پر اس طرح کا اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہوجائے گا جو کسی دوسری قوم کو نہ تو کبھی حاصل ہوا اور نہ اب حاصل ہے۔ یہی وہ بے ضابطگی (anomaly) ہے، جس کے خلاف عرب فلسطینی اس زمانے سے مزاحمت کر رہے ہیں اور اس کا ایک متبادل پیش کرنے میں مصروف ہیں۔

وہ صیہونی رہنما، ہرزل کے بعد جن کا کام منصوبے کو عملی جامہ پہنانا تھا اور جنھیں حکمتِ عملی کے اعتبار سے اہم مقام حاصل ہوا، مختلف مواقع پر اپنے جن خیالات کا اظہار کرتے رہے، ہم ان سے بہت کچھ سیکھ سکتے اور معلوم کر سکتے ہیں۔ اس ضمن میں جس شخص کا نام فوراً ذہن میں آتا ہے، وہ شائم ویزمان ہے۔ اس کی ایک وجہ تو اس کی غیر معمولی اور بھاری بھرکم شخصیت ہے لیکن اس کی ایک دوسری وجہ بھی ہے اور وہ یہ کہ اسے صیہونیت کو ایک تصور سے ایک فاتح سیاسی ادارے میں تبدیل کرنے میں زبردست کامرانیاں حاصل ہوئیں۔ فلسطین کی سرزمین کے متعلق اس نے جو تھیسس پیش کیا، وہ اس لحاظ سے انکشاف انگیز ہے کہ اس میں ہرزل کی رُوح بول رہی ہے:

> معلوم ہوتا ہے کہ خداوند نے فلسطین کی سرزمین کو اس لیے چٹانوں اور دلدلوں اور ریت سے ڈھانپ دیا ہے تاکہ اس کے حُسن کی نقاب کشائی (صرف) وہ لوگ کر سکیں جو اس کی محبت و

① یہاں تھیسس کا ترجمہ نظریہ یا اصول بھی ہو سکتا ہے۔ یہ ایک مفروضہ ہوتا ہے جو بحث کا آغاز کرنے اور اسے آگے بڑھانے کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔ مقدمہ منطق کی اصطلاح ہے۔ منطق کی بحث تین قضیوں پر مشتمل ہوتی ہے، ان میں پہلے دو کو تو مقدمات اور تیسرے کو نتیجہ کہتے ہیں۔

الفت سے سرشار ہیں اور جو اس کے (رستے) زخموں کا مداوا کرنے کے لیے اپنی زندگیاں وقف کردیں گے۔ ①

تاہم یہ کلمات ایک ایسے موقع پر کہے گئے تھے، جب ایک متموّل غیر حاضر جاگیردار (لبنان کا سرسک ② خاندان) نے ایک ویران، اجاڑ دلدلی قطعۂ زمین کو، جس کے سرسبز ہونے کی کوئی توقع نہیں کی جاسکتی تھی، صیہونیوں کے ہاتھ فروخت کردیا۔ ویزمان اقرار کرتا ہے کہ یہ مخصوص قطعۂ زمین فلسطین کا کچھ حصہ تو ضرور تھا لیکن کسی بھی اعتبار سے یہ اس کا کوئی بڑا حصہ نہیں تھا لیکن جو تاثر وہ دیتا ہے، اس سے یہ احساس ہوتا ہے کہ گویا یہ سارے کا سارا علاقہ بیکار پڑا تھا، کوئی اس کی قدر نہیں کرتا تھا اور جسے کسی نے صحیح انداز سے سمجھا ہی نہیں تھا۔ چنانچہ ان لوگوں کے باوجود جو فلسطین میں آباد تھے، اسے (فلسطین کو) کارآمد بنانا تھا، اس کی قدر کرنا تھا، اور اسے اس قابل بنانا تھا کہ اسے صحیح انداز سے سمجھا جاسکے۔ کسی عجیب وغریب طریقے سے یہ باور کرلیا گیا کہ وہ تاریخ کے ہم رکاب نہیں رہے اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کرلیا گیا کہ وہ حقیقتاً وہاں موجود ہی نہیں۔ اگر آپ ویزمان کی مندرجہ ذیل عبارت پر جس میں اس نے فلسطین کے 1907ء کے کوائف بیان کیے ہیں، جب اس نے پہلی مرتبہ وہاں کا سفر اختیار کیا تھا، ذرا غور فرمائیں گے کہ اس نے گزشتہ عدم توجہی، بہل انگاری اور بے چارگی کا موجودہ (وہ یہ عبارت 1941ء میں تحریر کررہا تھا) ''فضا اور ترقّی پسندانہ جذبے'' کے ساتھ جس طرح موازنہ پیش کیا ہے، تو آپ کو معلوم ہوجائے گا کہ اس کا مقصد غیر ملکی نو آبادیوں اور بستیوں کی تعمیر کا جواز ڈھونڈنا ہے۔

مجموعی طور پر یہ وحشت ناک اور تیرہ وتاریک ملک تھا، یوں تو ساری کی ساری ترکی سلطنت کے (امور وسائل کے) متعلق بے توجہی اور اغماض برتا جاتا ہے لیکن یہ خطۂ زمین تو اس سلطنت کا ایک ایسا گوشہ تھا، جس پر سرے سے کوئی توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ ③ اس کی کل آبادی چھ لاکھ

---

① شائم ویزمان Trial and Error ویزمان کی خودنوشت، سوانح حیات مطبوعہ ہارپر اینڈ رو نیویارک 1959ء صفحہ 371

② سرسک خاندان، یہ بیروت کا ایک نہایت ہی متموّل خاندان ہے۔ بیروت کا ایک خاصا بڑا بازار اسی کے نام پر ہے۔ لبنان کے کئی دوسرے خاندانوں (ان میں عیسائی اور مسلمان دونوں شامل تھے) کی طرح اس خاندان کی بھی فلسطین میں کافی زمینیں تھیں جو انھوں نے صیہونیوں کے ہاتھ فروخت کردیں اور یوں بالواسطہ صیہونیت کے فروغ میں ممد ثابت ہوا۔ مسلمانوں میں صائب سالم (لبنان کا ایک سابق وزیر اعظم) اور کئی دوسرے سیاسی خاندانوں نے بھی یہ حرکت کی تھی۔

③ ویزمان یہاں ''بے توجہی اور اغماض'' کے الفاظ مقامی باشندوں کے سلسلے میں استعمال کرتا ہے۔ ان باشندوں کا فلسطین میں رہائش پذیر ہونا اس امر کا کافی ثبوت نہیں تھا کہ یہ کوئی آباد خطۂ زمین تھا۔ ویزمان کی نظروں میں تو یہ محض ایک غیر آباد علاقہ ہے جو نہایت صبر وتحمل کے ساتھ ایک ایسی قوم کی آمد کا منتظر تھا جو اس کی مناسب انداز سے دیکھ بھال کرسکے۔ (مصنف)

سے کچھ زیادہ تھی، اس میں تقریباً اَسّی ہزار یہودی تھے، موٴخر الذکر زیادہ تر شہروں میں رہائش پذیر تھے لیکن جہاں تک توانائی، فضا، رنگ و روپ اور ترقی پسندانہ جذبے کا تعلق ہے، تو نہ تو نوآبادیاں اور نہ شہری بستیاں ہمارے زمانے کی نوآبادیوں اور بستیوں سے کوئی میل کھاتی تھیں۔ ①

ایک مختصر المیعاد فائدہ یہ ہوا کہ ''صیہونیت'' نے زمین...... کی قیمت میں اضافہ کر دیا۔'' اور اگرچہ سیاسی اعتبار سے زمین عربوں کے پاؤں تلے سے کھسکائی جا رہی تھی، (وقتی طور پر) وہ خوب منافع کما سکتے تھے۔

ویزمان یہودیوں کو تلقین کرتا ہے کہ عربوں کی بے توجہی، درماندگی، پیرانہ سالی اور خستہ حالی کے مقابلے میں، یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ ہمت اور قوت ارادی کو بروئے کار لائیں، اپنے آپ کو منظم کریں تاکہ زمین کی بحالی کی جا سکے اور اسے (غاصبوں کے قبضے سے) ''چھڑایا'' جا سکے۔ اس کا اندازِ بیان خطیبانہ تھا اور اس میں سارا زور اس بات پر صرف کیا جاتا تھا کہ یہودی ہر کام رضاکارانہ طور پر کریں۔ وہ قوتِ ارادی اور نئے خون کی جو آئیڈیالوجی پیش کر رہا تھا، اس کے پرچار کے لیے اس نے صیہونیت کے لیے وہی زبان (اور بعدازاں حکمتِ عملیاں) ہتھیالی تھی جو یورپی نوآبادکار مقامی پسماندگی سے عہدہ برآ ہونے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ''اس ملک میں نیا خون لانا پڑا تھا۔ مہم جوئی کا نیا جذبہ متعارف کرانا پڑا تھا۔'' یہودیوں نے نوآبادیوں کے تصورات درآمد کرنے اور آبادکاروں کے فرائض سرانجام دینا تھے ان آبادکاروں کا کام محض یہ نہیں تھا کہ وہ ایک علاقے کو اپنی تحویل میں لے لیں بلکہ انھیں یہودیوں کے اپنے قومی احیا کی درسگاہیں بھی بننا تھا۔ چنانچہ اگر فلسطین ایک ایسا خطہ تھا جو ''عظیم امکانات سے بھرپور تھا۔'' تو پھر سوال پیدا ہوا کہ اس حقیقت کا کیا کیا جائے کہ (یہودیوں میں) ''قوتِ ارادی کا فقدان تھا۔'' مسئلہ یہ تھا کہ ''اس قوتِ ارادی کو بیدار کیسے کیا جائے؟ ایک ایسے عمل کو جس میں سبھی شریک ہوں، کیسے شروع کیا جائے؟'' قریب تھا کہ صیہونی ہمت ہار بیٹھتے لیکن انھیں جس چیز نے قطعی حوصلہ شکنی سے بچایا، وہ ویزمان کے بقول محض ''ہمارا یہ احساس تھا کہ قوت و توانائی کا ایک عظیم سرچشمہ موجود ہے، جو اس بات کا منتظر ہے کہ کوئی آئے اور اسے صحیح مصرف میں لائے۔ یہ سرچشمہ ایک قوم کی یہ اضطراری آرزو تھی کہ وہ واقعی ایک قوم کی حیثیت اختیار کرے لیکن تاریخی طریقہ کار کی گم کردہ راہِ تعبیر و تشریح نے اس آرزو کو عارضی طور پر پابہ زنجیر کر رکھا تھا۔'' ② جس طریقہ کار کی طرف یہاں اشارہ کیا

---

① شائم ویزمان: Trial and Error صفحہ نمبر 125

② شائم ویزمان Trial and Error صفحات نمبر 29-128, 253

گیا ہے وہ صیہونیوں کا یہ میلان تھا کہ وہ روتھ چائلڈ جیسے عظیم غیر ملکی محسنوں پر زیادہ انحصار کرتے تھے (کہ وہ اپنے اثر ورسوخ سے کام لے کر یورپی طاقتوں کو اس بات پر آمادہ کر لیں گے کہ فلسطین یہودیوں کا وطن قرار دے دیا جائے اور یوں ان کے حوالے کر دیا جائے) اور خود سرزمین (فلسطین) پر خود کفیل نو آبادیاتی اداروں کی تعمیر اور نشو ونما سے "اغماض" برتتے تھے۔

اس مقصد کے حصول کے لیے یہ ضروری تھا کہ پہلے تو ایک سکیم وضع کی جائے اور پھر اس سکیم پر صحیح معنوں میں عمل کی صورت نکالی جائے تا کہ فلسطین کو "اغماض" کی موجودہ کیفیت سے نکال کر ایک یہودی مملکت میں تبدیل کیا جائے۔ اس سکیم کے تحت ارضِ فلسطین پر نئے حقائق کا ایک جال...... ایک زبان، نئی بستیوں کا ایک پُر پیچ سلسلہ، نئی تنظیموں کا ایک سلسلہ...... بچھایا جانا تھا۔ نئے حقائق کے اس جال نے موجودہ "حقائق" کو اتنا اپنی یلغار میں نہیں لینا تھا جتنا کہ انھیں نظر انداز کرنا تھا، ان کے دوش بدوش پھلنا پھولنا تھا اور (یوں جب اس کے پنجے پھیل جاتے) پھر ایک دن انھیں صفحۂ ہستی سے ناپید کر دینا تھا، بالکل ایسے ہی جیسے عظیم الجثہ درختوں کا ایک جنگل گھاس پاس کے ایک چھوٹے سے قطعے کو نیست ونابود کر دیتا ہے۔ اس قسم کے پروگرام (کو پایہ تکمیل تک پہنچانے) کے لیے ایک بڑی نظریاتی ضرورت یہ تھی کہ اس کا کوئی (قانونی) جواز تلاش کیا جائے۔ (چنانچہ اس کے لیے سوچا یہ گیا کہ) اسے اثریات [1] اور غائیت [2] کے غلافوں میں لپیٹ دیا جائے تا کہ مقامی ثقافت کو جو ابھی تک فلسطین میں مضبوطی سے پاؤں جمائے ہوئے تھی، مکمل طور پر نرغے میں لے لیا جائے اور ایک لحاظ سے اسے فرسودہ اور دقیانوسی قرار دے دیا جائے۔ اعلان بالفور جس تصور کے پیشِ نظر منظرِ عام پر لایا گیا تھا، اس کی غایت یہ تھی کہ یہودیوں کا ایک قومی وطن تشکیل دیا جائے۔ ویزمان نے اس تصور میں یہ ترمیم کی کہ "تشکیل" کی جگہ "قیامِ نو" اس کا مقصد ٹھہرایا۔ اس نے یہ جن وجوہ کی بنا پر کیا، ان میں سے ایک بلاکم وکاست یہ تھی کہ اس علاقے کو ایسی امکانی حقیقتوں میں محصور کر دیا جائے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے قدیم ترین اور انتہائی دور تک پہنچنے والی ہوں۔ فلسطین کو جس انداز سے نو آبادی بنایا جا رہا تھا، اس کے پیچھے یہ فکر کام کر رہا تھا کہ "ہم" تو محض ایک "حقیقت کی تکرار" کر رہے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یوں

---

(1) اثریات (Archaeology): عہدِ عتیق کے آثار، از قسم قبور، عمارات آلات، ظروف وغیرہ کی تلاش اور ان کا مطالعہ، تا کہ اس زمانے کی تہذیب، ثقافت، رسم ورواج کے متعلق حتمی رائے قائم کی جا سکے۔

(2) غائیت (Teleology): علم کی وہ شاخ جو یہ مطالعہ کرتی ہے کہ کائنات کے تمام تغیرات کس غایت یا مقصد سے واقع ہوتے ہیں۔ اس غایت کی مدد سے خود مظاہرِ فطرت کی بھی تشریح کی جاتی ہے۔

سمجھیں کہ یہودی (ان کے اپنے مؤقف کے مطابق) ایک دیسی معاشرے کی اکھاڑ پچھاڑ کرنے، اسے نیست و نابود کرنے یا اسے تتر بتر کرنے اور یوں اس کی جگہ خود قابض ہونے کی کوشش نہیں کر رہے تھے۔ (ان کی نظروں میں تو) یہ معاشرہ بذاتِ خود ایک عجوبہ تھا کہ اس نے فلسطین پر ساٹھ سالہ یہودی اقتدارِ اعلیٰ کے سانچے کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی اور یوں دو ہزار سال تک یہ اقتدارِ اعلیٰ معطل رہا تھا۔ تاہم یہودیوں کے دل و دماغ میں یہ بات سمائی ہوئی تھی کہ اسرائیل ہمیشہ وہیں (یعنی فلسطین میں) قائم چلا آ رہا ہے اور یہ ایک ایسی واقعیت تھی جس کا ادراک مقامی باشندوں کے لیے دشوار تھا۔ چنانچہ یہودیوں نے ارضِ فلسطین کی اصل شکل و صورت بحال کی، اسے (غیروں اور غاصبوں کے) پنجے سے چھڑایا، اپنے عہدِ رفتہ کی تکرار کی، اسے دوبارہ سرسبز و شاداب کیا، اس کے پوشیدہ امکانات کو پھلنے پھولنے کے مواقع فراہم کیے اور اس میں یہودی سیادت قائم کی۔ اسرائیل کے قیام کی غایت یہ تھی کہ یہاں ان حالات کو بحال کر دیا جائے جو کسی زمانے میں یہاں موجود تھے۔ یہ اور بات ہے کہ یہاں جو نئے حالات پیدا کیے گئے وہ یہودیوں کے ان پُراسرار آباؤ اجداد کی نسبت جو پہلی صدی میں بقیدِ حیات تھے، اپنے طریقوں اور کامرانیوں میں انیسویں صدی کے یورپی سامراجیوں سے زیادہ مشابہت رکھتے تھے۔

یہاں یہ ضروری ہے کہ ایک بات کی بالخصوص وضاحت کر دی جائے۔ فلسطین پر یہودی اقتدارِ اعلیٰ کی ''بحالی'' کے لیے جتنے بھی منصوبے بنائے گئے، وہ ہمیشہ دو بنیادی عناصر پر مشتمل رہے ہیں۔ ان میں سے ایک تو یہ پُراحتیاط عزم تھا کہ یہودیوں نے اپنی حالت بہتر بنانا ہے۔ اس کے متعلق لامحالہ دُنیا بہت کچھ سن چکی ہے۔ یہودیوں کو اپنی شناخت کا نیا احساس دلانے، ان کا دفاع کرنے، شہریوں کی حیثیت سے انھیں حقوق دلانے (علی زر بن یہودہ [1] کی کوششوں کے ذریعے) ایک قومی ''وطنی'' زبان کا احیا کرنے، تمام دُنیائے یہود کو اپنی نمو اور اپنے تاریخی مقدر کا اہم احساس دلانے کے لیے زبردست اقدامات کیے گئے۔ چنانچہ ''صیہونیت''

---

[1] قدیم یہودیوں کی زبان عبرانی تھی۔ انجیل مقدس کی زبان بھی یہی تھی۔ تاہم امتدادِ زمانہ کے ساتھ اس زبان کا استعمال متروک ہو گیا اور یہ دُنیا کی مردہ زبانوں میں شمار ہونے لگی۔ انیسویں صدی کے دوران میں جب صیہونیوں کو اپنی قومیت کا احساس ہوا تو ضروری سمجھا گیا کہ اس زبان کو دوبارہ زندہ کیا جائے۔ اس کے احیا کے لیے جن لوگوں نے کوششیں کیں، ان میں سرفہرست نام علی زر بن یہودہ کا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شخص اپنے نظریات و عقائد میں اتنا متشدد تھا کہ اس نے اپنے بیوی بچوں کو بھی یہ حکم دے دیا کہ وہ ان سے عبرانی کے علاوہ کسی دوسری زبان میں کلام نہیں کرے گا۔ یوں اس زبان کے احیا کی تحریک شروع ہو گئی اور آہستہ آہستہ بے شمار یہودیوں کو اپنے دائرے میں شامل کرتی گئی۔ آج کل عبرانی نہ صرف اسرائیل کی سرکاری زبان ہے بلکہ ادنیٰ اور اعلیٰ تعلیمی درسگاہوں میں ذریعۂ تعلیم بھی ہے۔

ان کے لیے ایک ایسا وسیلہ تھی جس کی طرف وہ رجوع کر سکتے تھے، وہ ایک ایسا وسیلہ تھی جو انھیں ایک نئی زندگی (کے تصور) میں منہمک کر سکتا تھا۔"[1] صیہونیت یہودیوں کے لیے ایک درس گاہ تھی......اور اس کا معلمانہ فلسفہ مدام بالکل واضح، ڈرامائی اور ذہانت سے بھرپور دکھائی دیتا تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود صیہونیت کا ایک عنصر اور بھی ہے اور جدلیاتی طور پر یہ پہلے عنصر کا حریف ہے۔ یہ عنصر صیہونیت کے عین قلب میں موجود ہے لیکن (اس امر کے باوجود کہ فلسطینیوں کو اس کا بلاواسطہ تجربہ ہوا ہے) اس کے وجود سے ہمیشہ آنکھیں چرائی گئی ہیں۔ یہ وہ عنصر ہے جس نے یہودیوں اور فلسطین کے غیر یہودیوں کے مابین ایک دیوار کھڑی کر دی ہے۔ یہ دیوار مضبوط بھی ہے اور اس کی تعمیر میں بڑی ذہانت اور دانائی کا بھی مظاہرہ کیا گیا ہے۔ اس دیوار کے ایک طرف جو یہودی ہیں وہ تمام فوائد سے مستفید ہو رہے ہیں اور دوسری طرف جو غیر یہودی ہیں، ان کے حصے میں فائدہ تو ایک بھی نہیں آیا (البتہ بعد میں عقوبت وسزا کے چکر میں انھیں ضرور ڈال دیا گیا۔)

صیہونی پروگرام کی (اس) دوشاخی تقسیم کے نتائج وعواقب فلسطین اور بالخصوص ان عربوں کے حق میں، جنھوں نے سنجیدگی کے ساتھ اسرائیل سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی ہے، نہایت بھیانک انداز سے مترتب ہوئے ہیں۔ فلسطین کے متعلق صیہونیوں کے خیالات یہودیوں کے حق میں......ان معنوں میں کہ ان کی غرض وغایت یہودیوں کی خبرگیری کرنا اور غیر یہودیوں کو نظر انداز کرنا تھی......اتنے مؤثر ثابت ہوئے ہیں کہ عربوں کے نزدیک ان خیالات کا جو مفہوم بنتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کے ذریعے عربوں کو محض مسترد کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ (انھیں) اسرائیل بذاتِ خود ایک منفی وجود نظر آتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس کی تعمیر اس لیے کی گئی ہے تاکہ عربوں کو یا تو بالکل بے دخل کر دیا جائے اور یا پھر انھیں مطیع ومحکوم بنا لیا جائے۔ چنانچہ ایک قوم اور ایک معاشرے کی حیثیت اسرائیلی اور اسرائیلیوں کی داخلی مرصوصیت، استواری اور پیوستگی ایسی چیزیں ہیں جو عام طور پر عربوں کے پلے نہیں پڑتی۔ چنانچہ صیہونیت نے جو دیواریں چنی تھیں، ان میں مزید اضافہ یہ ہوا ہے کہ خود عربوں نے بھی اپنے اور یہودیوں کے مابین ایسی دیواریں تعمیر کر لی ہیں جن کی اساس عربیت کے تصور پر رکھی گئی ہے اور اس تصور پر وہ مذہبی عقیدے کی سی پختگی کے ساتھ یقین رکھتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بنیادی طور پر اسرائیل لفاظی کا وہ آلہ ہے جو مغرب نے عربوں کو عاجز کرنے کے لیے فراہم کیا ہے۔ (عربوں کے) اس ادارک کا عرب ممالک میں یہ نتیجہ برآمد ہوا ہے کہ وہاں جبر کی پالیسیاں اپنائی گئی ہیں اور ایک طرح سے لوگوں کے خیالات پر پہرے بٹھا دیے گئے ہیں۔ سالوں ادیبوں، صحافیوں اور مصنفین پر یہ پابندی رہی کہ وہ

---

[1] شائم ویزمان Trail and Error صفحہ نمبر:128

اپنی نگارشات میں اسرائیل کا نام بھی نہیں لے سکتے۔ قدرتی طور پر اس قسم کی سنسر شپ کا انجام یہ ہوا کہ پولیس ریاستیں ① مستحکم ہوگئیں۔ آزادیِ اظہار کا فقدان رہا، حقوقِ انسانی کی مٹی پلید ہوئی اور انھیں پاؤں تلے کچل ڈالا گیا۔ مفروضہ طور پر ان تمام خرابیوں اور برائیوں کا جواز یہ پیش کیا جاتا تھا کہ ''ہم اسرائیلی جارحیت کے خلاف جنگ کر رہے ہیں۔'' سیدھے الفاظ میں اس کا مطلب یہ تھا کہ اندرون ملک ہر قسم کا ظلم و جور قابلِ قبول ہے کیونکہ اس سے ''قومی سلامتی'' کے ''مقدس فریضہ'' کو ادا کرنے میں مدد ملتی تھی۔

صیہونیت جس نسلی علیحدگی کی پالیسی پر گامزن ہے، اس کے نتائج و عواقب (خود) اسرائیل اور اسرائیلیوں کے لیے بھی ہر جگہ مساوی طور پر تباہ کن ثابت ہوئے ہیں۔ ہر وہ شے جو رذیل ہے، ڈراؤنی ہے، خلافِ عقل ہے، اجڈ یا گنوار ہے عربوں کو اس کا مترادف قرار دیا گیا۔ وہی ادارے...... اجتماعی زرعی فارم (کبتز) قانونِ واپسی، تارکین وطن کے لیے اپنے آپ کو نئے ماحول اور نئی ثقافت میں ڈھالنے کی سہولتیں...... جن کی انسانیت پسندانہ اور معاشرتی (بلکہ سوشلسٹ بھی) خوبیاں یہودیوں پر آشکار تھیں اور جو انھیں فلسطین (یا بعد میں اسرائیل) آنے کی تحریک دیتے تھے، عربوں کے معاملے میں صحیح معنوں میں اور بڑی استقامت کے ساتھ سنگدلی اور شقاوت کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اپنے جسم اور وجود میں، ان جذبات اور نفسیات میں، جو مبینہ طور پر ان سے منسوب کیے جاتے تھے، عرب ہر اس چیز کی نمائندگی کرتے تھے، جس کا صیہونیت سے کوئی تعلق نہیں بنتا تھا، جو اس سے بعید تھی، اور جو اس کی رسائی سے دور تھی۔

میرا خیال ہے کہ عربوں نے اسرائیل کو تسلیم کرنے سے جو انکار کیا، اس میں وہ سوفسطائیت اور پیچیدگی نہیں تھی جتنی کہ اس انکار میں...... جو بعد میں اس کوشش میں تبدیل ہوگیا کہ عربوں کی موجودگی کو زیادہ سے زیادہ گھٹا کر پیش کیا جائے...... پائی جاتی ہے جو اسرائیل نے عربوں کے وجود کو تسلیم کرنے کے سلسلے میں کیا۔ نہ صرف یہ کہ صیہونیت انیسویں صدی کے یورپی استعمار کی صورتِ نو تھی کیونکہ اپنے تمام افکار کے معاملے میں ان دونوں میں زبردست مماثلت تھی، بلکہ اس کی غرض و غایت ایک ایسے معاشرے کی تخلیق بھی تھا جو ''مقامی'' تو ہوسکتا ہے ② اور کچھ نہیں لیکن ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ یہ اس بات پر تُلی ہوئی تھی کہ جن مقامیوں کی یہ

---

① پولیس ریاست یا پولیس سٹیٹ، اس قسم کی استبدادی مملکت کو کہتے ہیں جہاں ایسی پولیس کو کنٹرول حاصل ہو جو سیاست میں ملوث ہو۔ صدر فیلنسیو باتستا کے تحت کیوبا میں ایسا ہی نظام حکومت قائم تھا۔ اسے 1959ء میں فیدل کاسترو نے ختم کیا۔

② کسی ملک کی ثقافت کے اصل مراکز اس کے بڑے بڑے شہر Metropolitan تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ملک کے باقی علاقوں کی ثقافت کو قصباتی یا دیہاتی قرار دے کر اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ صیہونیت نے جو منصوبہ بنایا تھا، ....

اکھاڑ پچھاڑ کر رہی تھی اور ان کی جگہ نئے ''مقامیوں'' (جو بنیادی طور پر یورپی تھے) کو آباد کر رہی تھی، ان (یعنی اصلی مقامی) کے ساتھ کسی قسم کا سمجھوتا نہیں کیا جائے گا۔ اس (صیہونیت) نے یہ ٹھان رکھی تھی کہ اصلی مقامیوں کی جگہ بیرونی ''مقامیوں'' کی آبادکاری کا کام کفایت شعارانہ انداز سے کیا جائے گا اور عربوں کو یہ قطعاً موقع نہیں دیا جائے گا کہ وہ اسرائیلی معاشروں میں کسی طرح بھی نفوذ کر سکیں اور اگر عربوں نے راہِ فرار اختیار نہ کی اور فلسطین میں ہی مقیم رہے تو انھیں فرمانبردار، اطاعت شعار محکوموں کی طرح رہنا ہوگا اور وہ چیز یا شخص جو وہاں اس لیے مقیم رہا کہ وہ اسرائیل کو للکار سکے، تو اس کے متعلق یہ رائے قائم نہیں کی گئی کہ وہ وہاں موجود ہے بلکہ اسے ایک ایسی چیز کی علامت تصور کیا گیا جس کا اسرائیل سے کوئی تعلق نہیں بنتا، جو اسرائیل سے باہر ہے اور صیہونیت اسے باہر سے نیست و نابود کرنے پر تلی رہی۔ یہاں پر صیہونیت نے لغوی طور پر اس علم انواع ① کو اختیار کر لیا جو یورپی ثقافت نے استعمال کی تھی کہ مغرب کو ایک بھیانک اور ڈراؤنے مشرق کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اس میں صرف ایک استثنیٰ تھا اور وہ یہ کہ صیہونیت ایک پیش قدم ② نجات بخش مغربی تحریک کی حیثیت سے مشرق کا مشرق میں سامنا کر رہی ہے۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ ''تکمیل شدہ'' صیہونیت عربوں کے متعلق بالعموم اور فلسطینیوں کے متعلق بالخصوص کیا کہتی تھی، اس کی ایک جھلک مندرجہ ذیل تحریر میں نظر آ جاتی ہے جو معارف ③ کے 7 اکتوبر 1955ء کے شمارے میں مطبوعہ مضمون سے اخذ کی گئی ہے۔ اس مضمون کے مصنف کا نام ڈاکٹر اے کارل باغ ہے۔ یہ شخص کوئی دریدہ دہن اور کندہ ناتراش شعلہ بیان اور فتنہ انگیز مقرر نہیں تھا، بلکہ (اسرائیل کا) ایک ممتاز شہری تھا۔ اس کا استدلال یہ ہے کہ اسلام صیہونیت کا مخالف ہے۔ اپنے اس استدلال میں وہ فلسطینیوں کی گنجائش نکال لیتا ہے۔

> یہ عرب اسلامی ممالک نہ تو غربت کے نخچیر ہیں، نہ بیماری کے، نہ ناخواندگی کے اور نہ استحصال کے۔ وہ تو صرف بدترین عذابِ الٰہی ④ ......اسلام...... میں مبتلا ہیں۔ جہاں کہیں اسلامی

......اس کے مطابق ہر جگہ کے، خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو، باشندوں کو اپنی تعمیر و ترقی اور اپنی ثقافت کی ترویج کے لیے ''مقامی'' طور پر مواقع فراہم کرنا تھا۔ ان ''مقامی'' جگہوں کا بڑے شہروں سے تعلق واسطہ کم سے کم ہونا تھا۔ یہاں مصنف صیہونیت کے یہی خد وخال بیان کر رہا ہے۔

① علم انواع (Typology): انواع، بالخصوص ان انواع کا مطالعہ جن کا ذکر انجیل میں کیا گیا ہے۔

② پیش قدم (Avant Garde) ادیبوں، فن کاروں، فنونِ لطیفہ یا کسی بھی دوسرے علم سے وابستہ اشخاص کا وہ گروہ جو اپنے زمانے میں جدت آمیز اور نئے نئے خیالات پیش کرنے میں مہارت اور شہرت رکھتا ہو۔

③ اسرائیل کا ایک اخبار

④ نقل کفر، کفر نہ باشد (مترجم)

نفسیات کا سکہ چلتا ہے، وہاں ناگزیر طور پر استبداد اور مجرمانہ جارحیت کا چلن ہے۔ خطرہ اسلامی نفسیات میں مضمر ہے کہ یہ اپنے آپ کو اعلیٰ کارکردگی اور ترقی کی دُنیا کے ساتھ مربوط نہیں کر سکتی کہ یہ التباس اور فریبِ نظر کی دُنیا میں رہتی ہے کہ اس پر احساسِ کمتری اور خبطِ عظمت ① کے دورے پڑتے رہتے ہیں اور یہ دورے اس کا ذہنی سکون برباد کیے رکھتے ہیں کہ یہ مقدس شمشیر کے خوابوں میں گم رہتی ہے۔ وہ چیزیں جو خطرے کی گھنٹیاں بجاتی رہتی ہیں، یہ ہیں: دُنیا کے متعلق مسلمانوں کا تصور یہ ہے کہ یہاں ہمہ گیر آمرانہ ② طرزِ حکومت رائج کیا جائے۔ قتل و غارت گری کا جذبہ ان کے خون میں رچا بسا ہے۔ ان میں منطق کا فقدان ہے۔ عرب نہایت آسانی سے آگ بگولہ ہو جاتے ہیں اور معاً ان کا پارہ چڑھ جاتا ہے۔ شیخی خور ہیں اور بہت کمینگی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور ان سے بڑھ کر یہ کہ ان تمام چیزوں کو، جو مہذب دُنیا کے نزدیک مقدس ہیں، نہایت بے حرمتی کے ساتھ نظر انداز کر دیتے ہیں..... کوئی چیز کوئی بات لے لیں، ان کا ردِّعمل ہمیشہ عقل اور شعور سے تہی دامن ہوگا۔ سبھی کے سبھی مسلمان جذباتی، ذہنی اعتبار سے غیر متوازن، فوری ردِّعمل کا اظہار کرنے والے، کور عقل اور کند ذہن ہیں۔ وہ اپنے حلق سے جو باتیں نکالتے ہیں، ایسی باتیں صرف پاگل اور جنونی ہی ہمیشہ کر سکتے ہیں۔ آپ ہر شخص یہاں تک کہ شیطان سے بھی کام کی بات کر سکتے ہیں، لیکن اللہ (تعالیٰ) سے نہیں ③ اس ملک کا ایک ایک ذرہ پکار پکار کر یہی کہہ رہا ہے۔ یہاں بڑی ثقافتیں ظہور پذیر ہوئی اور ہر قسم کے حملہ آور یہاں وارد ہوئے، ان سب نے یہاں تک کہ صلیبیوں نے بھی یہاں اپنی ثقافت کی نشانیاں چھوڑیں اور ان کی یہ ثقافتیں یہاں پروان بھی چڑھیں لیکن جہاں جہاں اسلام نے قدم دھرے، وہاں درخت بھی سوکھ گئے۔ ④

---

① خبطِ عظمت (Megalomania): ایک نفسیاتی کیفیت جس میں انسان دولت، اختیارات اور عظمت کے خواب دیکھتا ہے۔

② ہمہ گیر آمرانہ طرزِ حکومت (Totalitarian Rule) ایک ایسی حکومت جو آمرانہ طرز پر کام کرے اور اسے آئینی، قانونی، سیاسی، اقتصادی، ذہنی، اخلاقی اور ہر قسم کی دیگر سرگرمیوں کے متعلق لامحدود اختیارات حاصل ہوں۔

③ نقل کفر، کفر نہ باشد (مترجم)

④ فلسطین کے متعلق "اغماض" کا جو مشاہدہ ویزمان نے کیا تھا، کارل باخ کا قارورہ اسی سے جا ملتا ہے۔ برائے بحث ہم یہ مفروضہ قائم کر سکتے ہیں کہ اگر ویزمان کبھی بعد میں اپنے خیالات قلم بند کر رہا ہوتا، وہ بھی تقریباً اسی قسم کی باتیں کہتا جو کارل باخ نے کہی ہیں۔ (مصنف)

جب ہم تصویر بگاڑ دیتے ہیں اور موضوعِ زیرِ بحث کو محض اسرائیل اور اس کے ہمسایوں کے مابین سرحدی جھڑپوں تک محدود کر دیتے ہیں، تو ہم جرم کے ساتھ گناہ کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ سچائی ہے ہی نہیں۔ آویزش کا مرکزی نقطہ سرحدوں کا مسئلہ نہیں بلکہ یہ مسلم نفسیات کا مسئلہ ہے...... مزید برآں مسئلے کو اس طرح پیش کرنا گویا کہ یہ دو مماثل اجزا کے مابین آویزش کا مسئلہ ہے، عربوں کو دعویٰ کا ایک ایسا ہتھیار فراہم کرنا ہے، جو ان کا ہے ہی نہیں۔ اگر ان کے ساتھ بحث حقیقتاً سیاسی نوعیت کی ہو تو دونوں فریقین کو اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ پھر ہم یوں دکھائی دیں گے گویا ہم ایک ایسے ملک میں چلے آئے ہیں جو کہ سراسر عرب تھا۔ گویا کہ ہم نے اسے فتح کیا اور ایک غیر ملکی قوم کی حیثیت سے ان کے مابین اپنے پنجے گاڑ لیے، ہم نے ان پر پناہ گزینوں کا بوجھ لاد دیا اور عسکری اعتبار سے ان کے لیے خطرہ بن گئے وغیرہ وغیرہ...... اس یا اس فریق کو حق بجانب ٹھہرایا جا سکتا ہے...... اور مسئلے کو اگر اس سوفسطائی اور سیاسی اندازے سے پیش کیا جائے، تو یورپی اذہان کے لیے قابلِ فہم بن جاتا ہے...... لیکن اس کی قیمت ہمیں چکانا پڑتی ہے۔ عرب اپنے دعاوی کو ایک قانونی تنازع کی شکل میں پیش کرتے ہیں اور یوں ان کا نقطۂ نظر آسانی سے اہلِ مغرب کے پلے پڑ جاتا ہے لیکن درحقیقت ہم سے بہتر کون اس بات سے آگاہ ہے کہ انھوں (عربوں) نے جو مخاصمانہ رویہ اختیار کر رکھا ہے، اس کا ماخذ یہ نہیں؟ وہ جو سیاسی اور معاشرتی تصورات پیش کرتے رہتے ہیں، ان کے کبھی بھی اپنے نہیں تھے اور نہ ہیں۔ وہ قبضہ، جو ہتھیاروں کے بل بوتے پر کیا جائے، اسے نہ ان کی اپنی نظروں میں اور نہ اسلام کی نظروں میں کبھی ناانصافی کے ساتھ وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے برعکس یہ تو اس بات کا عملی مظاہرہ ہے اور اس بات کی سند ہے کہ قبضہ مستند اور قابلِ اعتبار ہے۔ ان کے ہاں اس امر کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں کہ پناہ گزینوں کے ساتھ، اپنے ان بھائیوں کے ساتھ جنھیں بے دخلیوں سے دوچار ہونا پڑا، افسوس کا اظہار ہی کر دیا جائے، ہمدردی کے دو بول ہی کہہ دیے جائیں۔ یہ تو اللہ کی مرضی تھی، اسی نے انھیں نکالا اور وہی ان کی نگہداشت کرے گا۔ اسی قسم کی چیزوں سے کوئی مسلمان سیاست دان کبھی ٹس سے مس نہیں ہوا اور نہ کبھی اس کا دل پسیجا ہے (ہاں اس قسم کی مصیبتِ عظمیٰ اس کے اپنے ذاتی مقام و مرتبہ کو خطرے میں ڈال دے تو دوسری بات ہے) اگر کوئی پناہ گزین نہ بھی ہوتے اور ہم نے کوئی فتوحات حاصل نہ بھی کی ہوتیں تب بھی وہ اسی طرح ہماری مخالفت پر کمربستہ ہوتے۔ ایسے سفاک اور تندخو لوگوں کے

ساتھ مغربی تصورات کی اساس پر بات چیت کر کے ہم انھیں انصاف کا یورپی لبادہ پہنا دیں گے۔

''عرب رویوں'' کے متعلق جو اسرائیلی مطالعات......ایک مثال جنرل ہرکابی کی ہے، جس نے سرکاری طور پر منظور شدہ ایک ''مستند'' مطالعہ پیش کیا① تھا......شائع ہوتے رہتے ہیں، ان میں اس قسم کے تجزیوں (جس قسم کا تجزیہ کارل باغ نے سپردِ قلم کیا ہے) پر کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی۔ کارل باغ جیسے لوگوں کے تجزیے اتنے طلسمی اور نسل پرستانہ ہیں کہ فلسطینیوں کا شاذ و نادر ہی ان سے واسطہ پڑتا ہے۔ تاہم عربوں کو تمام انسانی خصائص سے محروم کرنے کی روش، جس کا آغاز اس نقطۂ نظر سے ہوا کہ اوّل تو فلسطینی (فلسطین میں) سرے سے موجود ہی نہیں اور اگر موجود بھی ہیں، تو پھر وہ بالکل تندخو اور سفاک ہیں یا پھر یہ دونوں ہی باتیں صحیح ہیں، اسرائیلی معاشرے کے رگ و پے میں پوری قوت کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ 1973ء کی جنگ کے دوران میں فوجی دستوں میں ایک کتابچے (جسے مرکزی کمان کے ربّی ابراہام ایویدان نے تحریر کیا تھا اور جس کا دیباچہ اسی کمان کے جنرل یونا ایفراتی نے رقم کیا تھا) کی تقسیم کو کوئی غیر معمولی بات تصور نہیں کیا گیا۔ منجملہ دیگر باتوں کے، اس کتابچے میں مندرجہ ذیل کلیدی عبارت بھی شامل ہے۔

> جنگ، تعاقب یا حملے کے دوران میں جب بھی ہمارے فوجی دستوں کا سامنا شہری باشندوں سے ہو اور اس بات کے متعلق یقین سے کچھ نہ کہا جا سکتا ہو کہ وہ ہمارے خلاف جوابی کارروائی کے معاملے میں معذور ہیں، تو انھیں ہلاک کیا جا سکتا ہے بلکہ ہلاخا② معیاروں کے مطابق تو انھیں لازماً ہلاک کر دینا چاہیے۔ کسی صورت میں بھی کسی عرب باشندے پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے خواہ وہ اپنے متعلق یہ تاثر ہی کیوں نہ دے کہ وہ بہت مہذب اور شائستہ انسان ہے۔③

① ہرکابی (Yohoshafat Harkabi) اسرائیل کے متعلق عرب رویے۔ مطبوعہ: کی ٹر پریس، یروشلم 1972ء۔ ہرکابی فوجی جاسوسی ادارے کا سربراہ تھا۔ وہ 1959ء تک اس عہدے پر فائز رہا کہ وزیر اعظم بن گوریان نے اسے برطرف کر دیا۔ بعد ازاں وہ عرب امور کے ماہر کی حیثیت سے عبرانی یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر ہو گیا اور اسرائیل میں عربوں اور خاص طور پر فلسطینیوں کے خلاف جو پراپیگنڈہ کیا جاتا تھا، وہ اس کا سب سے بڑا پرچارک تھا۔ اس نے اس ضمن میں ''فلسطینی اور اسرائیلی'' (کی ٹر پریس، یروشلم 1974ء) کے عنوان سے ایک زہر آلود کتاب لکھی اور مدتوں اسرائیلی سفارت خانہ اسے امریکا میں مفت تقسیم کرتا رہا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ہرکابی نے حال ہی میں ایک زبردست قلابازی کھائی ہے اور وہ ان لوگوں میں شامل ہو گیا ہے جنھیں ''امن کی فاختائیں'' کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اس حیثیت سے وہ اب اس تحریک کا حامی بن گیا ہے جو اسرائیل میں Peace now کے نام سے بعض لوگوں نے چلا رکھی ہے۔ (مصنف)

② ہلاخا (HALAKAH): یہودی قوانین و روایات کا مکمل مجموعہ اس میں توریت اور زبانی روایات بھی شامل ہیں۔

③ یہ عبارت اسرائیل کے جریدے (Haolam Hazeth) نے اپنی 15 مئی 1974ء کی اشاعت میں نقل کی تھی۔......

بچوں کا ادب جری اور دلیر یہودیوں کے (کارناموں) پر مشتمل ہوتا ہے جو انجام کار فروتر، دغاباز اورنا قابلِ اعتبار عربوں کو، جن کے نام مجنون (مخبوط الحواس) بندورہ (ٹماٹر) یا بگرہ (فردا) جیسے ہوتے ہیں، ''جہنم واصل'' کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ روزنامہ ''ہاریتز'' (مؤرخہ 20 ستمبر 1974ء) کے ایک مصنف نے تحریر کیا تھا، بچوں کی کتابیں ''ہمارے اپنے موضوعات کے متعلق ہوتی ہیں، یعنی ان میں ان عربوں کا ذکر ہوتا ہے جو یہودیوں کو اپنی تفریح کے لیے قتل کرتے ہیں اوران میں خالص یہودی لڑکوں کے کارناموں کی تفصیل دی جاتی ہے جو بزدل خنزیر کو شکست دیتے ہیں۔'' اس قسم کے جوشیلے خیالات صرف انفرادی مصنفین تک محدود نہیں جو کثیر الاشاعت کتابیں تحریر کرتے ہیں بلکہ جیسا کہ میں بعدازاں یہ ثابت کروں گا کہ اس قسم کے خیالات منطقی طور پر کم وبیش ان اداروں (کی سوچ) کے مرہونِ منت ہیں جنھیں خود مملکت نے قائم کر رکھا ہے۔ ان اداروں کا دوسرا کام یہ ہے کہ (اور یہ کام یہودیوں کے لیے بہت فیض رساں ہے) کہ وہ یہودیوں کی زندگیوں میں انسان دوستی کے تقاضوں کے مطابق باقاعدگی پیدا کریں۔

اس ثنویت ① کی کامل مثالیں خود ویزمان کی تحریروں میں بکثرت موجود ہیں جس نے اس قسم کے معاملات کو فوری طور پر اپنی پالیسی، عمل اور تفصیلی نتائج میں اہم مقام دیا۔ وہ سیموئیل پیفس نز (Pevsner) ② کی تحسین کرتا ہے اور کہتا ہے کہ پیفس نز ''عظیم صلاحیتوں سے مالا مال، پُرجوش توانا، باعمل، باتدبیر اوراپنی اہلیہ کی مانند انتہائی تعلیم یافتہ انسان تھا۔'' اس تعریف وتوصیف سے ہمیں کوئی سروکار نہیں اور نہ ہمیں اس پر کوئی اعتراض ہے لیکن ویزمان دم لیے بغیر، اس کے فوراً بعد اچانک یہ جملے تحریر کرتا ہے: ''اس قسم کے لوگوں کا فلسطین کی طرف کوچ کرنا درحقیقت ایک معاشرتی ویرانے کی طرف رُخ کرنا تھا اور یہ وہ بات ہے جسے ان لوگوں کو ذہن نشین کر لینا چاہیے جو آج فلسطین کا رخ کر رہے ہیں اور جب وہ وہاں پہنچتے ہیں تو انھیں یہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی ہے کہ وہاں کے تعلقی، ثقافتی اور معاشرتی وسائل یورپی دُنیا کے وسائل سے کسی لحاظ سے بھی کم تر نہیں۔'' ③ پیش منظر میں صرف صیہونیت تھی اور باقی ہر چیز پس منظر میں۔ چنانچہ لازم یہ تھا کہ (صرف

......اس جریدے کی مدیر یوری ایونیری (Avnery) نے ایک کتاب بعنوان (Aplea:Israel Without Zionism for Peace in the Middle East) (میکملن پبلشنگ کمپنی نیویارک 1968ء) کی تحریر کی ہے۔ یہ کتاب دلچسپ بھی ہے اور قدرے فتنہ انگیز بھی لیکن اس قابل ضرور ہے کہ اس کا مطالعہ کیا جائے۔ اس کتاب میں موشے دیان جیسے لوگوں پر بڑی زہریلی تنقید کی گئی ہے۔ موشے دیان کے متعلق ایونیری کا نظریہ یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر ''عرب جنگجو'' ہے، سبحان اللہ

① ثنویت (Duality) دورنگی
② پیفس نز: ایک روس نژاد یہودی رہنما
③ ویزمان Trial and error صفحہ نمبر 130

صیہونیت کی تعریف و تحسین کی جائے اور) جو چیزیں پس منظر میں تھیں، انھیں مطیع و محکوم کیا جائے۔ انھیں سات پردوں میں چھپا کر رکھا جائے اور کسی صورت بھی منظرِ عام پر نہ آنے دیا جائے، ان کی تحقیر کی جائے، تا کہ ثقافتی تحصیل کا پیش منظر (یعنی صیہونیت) یوں نظر آئے کہ "تہذیب سے روشناس کرنے والی اولین کوشش صرف یہی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مقامی عربوں کو نا قابلِ علاج حریف بنا کر پیش کیا جائے، وہ ایک ایسی چیزیں ہیں جو سفا کی و خونخواری اور ما فوق الفطرت انسانیت کا ملغوبہ ہے، اور کچھ نہیں تو بہر حال وہ ایک ایسی ہستی ضرور ہیں جس کے ساتھ سمجھوتا کرنا ناممکن (چنانچہ لا حاصل) ہے۔[1]

> عرب مناظرے کے ماہر اور مجادلے کے بادشاہ ہیں اور اس حد تک کہ اس معاملے میں ایک عام تعلیم یافتہ یورپی ان سے قطعاً کوئی لگا نہیں کھا سکتا اور جب تک فریقِ مخالف اس تکنیک پر پوری طرح دسترس حاصل نہیں کر لیتا، وہ بڑے خسارے میں رہتا ہے۔ عربوں کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ انھیں آپ کے اپنے خیالات کے قطعاً برعکس خیالات کو گھما پھرا کر نہایت نفاست اور شائستگی سے ادا کرنے کا اتنا زبردست ملکہ حاصل ہے کہ آپ کو یہ یقین ہونے لگتا ہے کہ وہ آپ کے ساتھ پوری طرح متفق ہیں اور فوری طور پر آپ کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے آمادہ۔
> عربوں کے ساتھ بات چیت اور مذاکرات کا ڈول ڈالنا صحرا میں سراب کے پیچھے بھاگنے سے کسی طور مختلف نہیں۔ سراب جو دیکھنے میں جاذبِ نظر اور دلفریب، امیدوں اور امنگوں سے بھرپور نظر آتا ہے، لیکن امکان یہی ہے کہ وہ انجام کار آپ کو پیاسا ہلاک کر دے گا۔
> براہِ راست سوال پوچھنا خطرے سے خالی نہیں۔ اس سے عرب کو نہایت مہارت کے ساتھ پیچھے ہٹنے اور موضوع کو مکمل طور پر تبدیل کرنے کی ترغیب ملے گی۔ پھر آپ لاکھ سر پٹکیں، موضوع کے قلب تک رسائی آپ کے لیے ناممکن ہو جائے گی اور اگر آپ یہ ساری حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو گئے تو آپ کو اس کے لیے لامتناہی عرصہ درکار ہو گا۔[2]

ایک دوسرے موقع پر وہ اپنے ایک تجربے کا ذکر کرتا ہے اور حقیقتاً یہی وہ تجربہ ہے جو تل ابیب کی تولید کا موجب بنا۔ ایک یہودی مرکز کی حیثیت سے اس نے زیادہ تر حیثیت اس بنا پر حاصل کی ہے کہ اس سے متصل (لیکن کہیں قدیم) عرب قصبے جافہ کو بالکل بے اثر اور بے وقعت بنا دیا گیا ہے۔ تاہم ویزمان اپنے

---

① ایضاً صفحہ نمبر:188

② ویزمان صفحہ نمبر:215-16

قاری کو جو کچھ بتاتا ہے، اس میں اس حقیقت کی طرف ایک بالکل خفیف سا اشارہ ملتا ہے کہ عرب اس مقام پر، جس کے متصل مستقبل میں تل ابیب کو بسایا جانا تھا، پہلے ہی موجود تھے۔ (اس کے نقطۂ نظر کے مطابق) اہم بات یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح یہودیوں کی موجودگی وجود میں لائی جائے۔ اس موجودگی کا جو فائدہ ہے، اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں، وہ خود ہی اظہر من الشمس ہے:

میں جافہ میں قیام پذیر تھا کہ ایک روز رُوپال مجھ سے ملنے چلا آیا۔ وہ مجھے گھمانے پھرانے قصبے کے شمال میں ریت کے ٹیلوں کی طرف لے گیا۔ جب ہم پوری طرح اس علاقے میں داخل ہو گئے جہاں ہر طرف ریت ہی ریت تھی...... مجھے یاد ہے کہ ہمارے پاؤں پنڈلیوں تک ریت میں دھنسے جا رہے تھے...... تو وہ رک گیا اور نہایت سنجیدگی سے کہنے لگا کہ ہم یہاں ایک یہودی شہر بسائیں گے۔ اس کی بات سن کر میرا دل بیٹھنے لگا اور میں اس کے منہ کی طرف تکنے لگا۔ اس ویرانے میں جہاں گھاس کی ایک پتی بھی نہیں اگتی۔ لوگ رہائش کرنے کیوں آئیں گے؟ میں نے اس پر تکنیکی نوعیت کے سوالات کی بھرمار کر دی، وہ نہایت تحمل اور بردباری کے ساتھ میرے ان سوالات کے صحیح صحیح جوابات دینے لگا، اس نے مجھے بتایا کہ تکنیکی اعتبار سے ہر چیز ہے۔ اگرچہ چند ابتدائی سالوں کے دوران میں نئی بستی کے ساتھ مواصلات کا سلسلہ قائم کرنے اور برقرار رکھنے میں چند در چند دشواریاں پیش آئیں گی لیکن بہت جلد وہاں کے مکین مالی اور اقتصادی طور پر خود کفالت حاصل کر لیں گے اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں گے۔ جافہ کے یہودی ایک نئے اور جدید شہر میں منتقل ہو جائیں گے اور قرب و جوار کی یہودی بستیوں کو اپنی زرعی پیداوار اور صنعتی مصنوعات کے لیے ایک مرکزی مارکیٹ میسر آ جائے گی۔ شہر کے عین مرکز میں ایک جمنازیم (1) تعمیر کیا جائے گا اور فلسطین کے دوسرے علاقوں سے طالب علم یہاں کشاں کشاں چلے آئیں گے، بلکہ وہ یہودی ماں باپ بھی، جو غیر ممالک میں رہائش پذیر ہیں لیکن اپنے بچوں کو ایک یہودی شہر کے ایک یہودی سکول میں تعلیم دلانے کے خواہش مند ہیں، انھیں یہاں بھیجنے میں کوئی عار محسوس نہیں کریں گے۔

---

(1) ہمارے ملک میں جمنازیم اس عمارت یا کمرے کو کہتے ہیں جہاں جمناسٹک اور بعض دوسری کھیلیں منعقد کی جاتی ہیں۔ تاہم بعض یورپی ممالک بالخصوص جرمنی میں، جمنازیم اس ہائی سکول کو بھی کہتے ہیں جو یونیورسٹی میں تعلیم پانے کی خواہش مند طلبہ تیار کرتا ہے۔

چنانچہ یہ روپال تھا جس نے سب سے پہلا تل ایب کا خواب [1] دیکھا۔ ہاں وہی تل ابیب جس کے مقدر میں یہ لکھ دیا گیا تھا کہ وہ اتنی وسعت اختیار کرے گا اور اقتصادی اعتبار سے اتنی ترقی کرے گا کہ جافہ کا قدیم قصبہ اس سے کوسوں پیچھے رہ جائے گا اور یہی وہ شہر تھا جس نے بحیرۂ روم کے مشرقی ساحل پر واقع خطے میں ایک اہم مرکزی شہر بننا تھا۔ [2]

البتہ امتدادِ زمانے کے ساتھ ساتھ تل ابیب کی اہمیت اس لیے بھی دو چند ہو جانا تھی کہ جافہ کو فوجی تسخیر کا نشانہ بننا تھا۔ یہ خیالی منصوبہ بعد ازاں پورے ملک کی عسکری تسخیر کے لیے پہلی سیڑھی ثابت ہوا۔ نوآبادی کے تصور نے بعد ازاں جب عملی صورت اختیار کی اور اس میں حقیقت کے رنگ بھرے گئے تو حقیقتاً ایک نوآبادی وجود میں آ گئی۔ پھر آبادکار بھی آ دھمکے اور جن لوگوں کو نوآبادیات کے شکنجے میں جکڑے جانا تھا، وہ بھی وہاں پہنچ گئے۔

بجا کہ ویزمان اور روپال اپنے گفتار و کردار میں پہل قدمی قائدین کی پُرجوش عینیت سے سرشار تھے۔ تاہم ان کی گفتار اور ان کے کردار میں ان اہلِ مغرب کا تحکم بھی پایا جاتا تھا جو ایک ایسے خطے اور اس کے مقامی باشندوں کا سروے کرنے پر مامور تھے جو ان کے خیال کے مطابق ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئے تھے اور اب یہ ان (اہل مغرب) کا کام تھا کہ ان (مقامی باشندوں اور ان کے وطن) کے مستقبل کے خاکے بھی مرتب کریں۔ ویزمان محض یہ نہیں سوچتا تھا کہ یہ فیصلے کرنے کے لیے کہ مقامی باشندوں کے بہترین مفادات [3] کیا ہیں؟ وہ (ان کی نسبت) بہتر صلاحیتوں اور بہتر علم سے بہرہ ور ہے بلکہ اسے اس بات کا بھی پختہ یقین تھا کہ وہ یہ بھی خوب اچھی طرح ''سمجھتا'' ہے کہ عرب اصل میں ہیں کیا؟ جب وہ یہ کہتا تھا کہ ''درحقیقت'' عربوں کی ''بے پایاں صلاحیت'' بس اتنی ہے کہ وہ کبھی سچی بات نہیں بتائیں گے، تو دراصل ان خیالات کی جگالی کر رہا تھا جو دُنیا کے بعض دوسرے ممالک کے مقامی باشندوں کے متعلق دوسرے اہلِ یورپ ظاہر کرتے رہتے تھے کہ صیہونیوں کی طرح ان اہلِ یورپ کا بھی مسئلہ یہی تھا کہ نسبتاً مٹھی بھر نڈر، پہل قدم پر وسیع اکثریت کی حامل مقامی آبادی کو کس طرح اپنے قابو میں رکھ سکتے ہیں۔

---

(1) تل ابیب کی تعمیر 1906ء میں عمل میں آئی۔ یہ اسرائیل کا نہ صرف سب سے بڑا شہر ہے بلکہ کافی عرصہ ملک کا صدر مقام بھی رہا۔ 1973ء کی جنگ کے بعد اسرائیلی حکومت تو بیت المقدس منتقل ہو گئی لیکن عربوں کے احتجاج کے پیشِ نظر اکثر ممالک کے سفارتخانے اب بھی اس شہر میں کام کر رہے ہیں۔ یہ شہر اسرائیل کا تجارتی اور صنعتی مرکز ہے۔ آبادی چار لاکھ کے قریب ہے۔

(2) ویزمان Trial and Error صفحہ نمبر: 130

(3) مثلاً وہ یہ سمجھتا تھا کہ جافہ پر ایک جدید یہودی شہر کو سبقت حاصل ہونا چاہیے۔ (مصنف)

یہاں آپ یہ سوال پوچھ سکتے ہیں کہ احمقانہ حد تک ناکافی فوجوں کی مدد سے ہم آخر کس طرح ان نسلوں کو، جو اتنی توانا اور قابل ہیں، جو اس قدر ذہنی اور جسمانی خوبیوں سے لیس ہیں کس طرح اپنے قابو میں رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں؟ میرے خیال میں اس کا جواب یہ ہے کہ ایک عام افریقی کی ذہنی اور اخلاقی صلاحیتوں میں دو خامیاں پائی جاتی ہیں۔ میں یہ دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان کی پہلی بڑی خامی یہ ہے کہ ان میں دیانت کا خلقی فقدان ہے......مقابلتاً شاید ہی کبھی کسی افریقی کو کسی دوسرے افریقی پر اتنا اعتبار ہوگا کہ وہ اپنا وعدہ ایفا کرے گا...... چند بہت ہی نایاب مثالوں سے قطع نظر، یہ ایک حقیقت ہے اگرچہ قابلِ افسوس ہے کہ یورپی تہذیب کے ساتھ روابط قائم ہونے کے بعد اس خامی میں اضافہ ہی ہوا ہے، تخفیف نہیں آئی۔ ان کی دوسری خامی یہ ہے کہ ذہنی طور پر اس قابل ہی نہیں کہ کسی بھی معاملے میں پہل کر سکیں، بس یوں سمجھیں کہ لکیر کے فقیر ہیں...... جب تک انھیں باہر سے مجبور نہ کیا جائے، مقامی باشندے اپنے جانے پہچانے اور گھسے پٹے طور طریقوں سے سرِ مو انحراف نہیں کرتے۔ یہ ذہنی کام چوری اور کاہلی ان کے اذہان کی خصوصیت ہے۔ ①

مندرجہ بالا اقتباس ایک کتاب ''مقامی نسلیں اور ان کے حکمران'' (1918ء) سے لیا گیا ہے۔ اس کا مصنف سی ایل ٹمپل نائیجیریا پر حکومت کرنے میں فریڈرک لوگارڈ کا ایک معاون تھا۔ ویزمان کی طرح وہ بھی اپنے نقطۂ نظر کی رو سے لبرل فیبین ② زیادہ تھا اور نسل پرست نازیوں کا نمونہ کم۔

ویزمان کی طرح ٹمپل کے نزدیک بھی اصل حقائق یہ تھے کہ جس ثقافت سے مقامی باشندوں کا تعلق تھا، وہ ساکت تھی، جامد تھی۔ جس دھرتی پر وہ رہتے تھے، چونکہ وہ اس کی قدر و قیمت پہچاننے سے قاصر تھے، چنانچہ ایک ترقی یافتہ پوری ثقافت کو پہل قدمی کرنا پڑتی تھی اور ان مقامی باشندوں کو مہمیز کرنا پڑتی تھی بلکہ شاید ان کی اکھاڑ پچھاڑ بھی کرنا پڑتی تھی۔ ادھر ویزمان کو یقیناً اضافی فائدہ حاصل تھا۔ اسے ایک یہودی مملکت کی تشکیل نو

① سی ایل ٹمپل The Native Races and their Rulers طبع ثانی فرینک کیس (Cass) اینڈ کمپنی، لندن 1968ء

② جارج برناڈ شا اینی بیسنٹ، سڈنی ویب اور چند دوسرے مفکرین نے ایک جماعت فیبین (Fabian) سوسائٹی کے نام سے قائم کی تھی۔ یہ لوگ ایک قسم کا شوشلسٹ نظام نافذ کرنا چاہتے تھے لیکن انقلابی نہیں تھے۔ انھیں یہ تو پسند نہیں تھا کہ دولت اور صنعتوں کا ارتکاز چند ہاتھوں میں ہو لیکن سرمایہ دارانہ نظام کی مذمت نہیں کرتے تھے اور نہ اسے ''استحصال'' کے مترادف خیال کرتے تھے۔

کرنا تھی، یہودیوں کو یہود دشمنی سے بچانا تھا، وغیرہ وغیرہ اور ان مقاصد کے حصول کے لیے اس کی پشت پر عقلی توجیہات کا ایک انبار تھا لیکن جہاں تک مقامی باشندوں کا تعلق ہے، ان کے لیے ابتداً یہ بات اتنی اہم نہیں تھی کہ نو آبادی میں ان کا واسطہ جن یورپیوں سے پڑا تھا، وہ انگریز تھے یا یورپی یہودی۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ جہاں تک فلسطین میں صیہونیوں کا یا افریقہ میں انگریزوں کا تعلق ہے، دونوں ہی حقیقت پسند تھے۔ وہ حقائق کو دیکھتے تھے اور ان سے نپٹتے تھے، وہ سچائی کی قدر و قیمت سے آگاہ تھے۔ اس ''حقیقت'' کے باوصف کہ غیر یورپی مدّتِ مدید سے اپنے آبائی اوطان میں مقیم تھے، وہ سچائی سے ہمیشہ آنکھیں چراتے رہے۔ یورپی بصیرت کا مفہوم یہ بنتا تھا کہ اسے یہ کمال حاصل تھا کہ وہ نہ صرف جو کچھ وہاں موجود تھا، اسے دیکھ لیتی تھی، بلکہ جو کچھ وہاں ''موجود ہو سکتا تھا'' اسے بھی بھانپ سکتی تھی۔ اسی بنا پر تو ویزمان اور رُوپال کے مابین جافہ اور تل ابیب کے متعلق مکالمہ ہوا۔ فلسطین میں صیہونیوں کو جو خصوصی ترغیب ملتی تھی، وہ یہ تھی کہ وہ اس امکان پر یقین کرنے لگتے تھے اور اس امکان کو بروئے کار لانے کے لیے انھوں نے منصوبہ بندی کا آغاز بھی کر دیا تھا...... کہ مقامی باشندے وہاں حقیقتاً موجود نہیں ہوں گے اور لاریب اس امکان کا روبہ عمل اس وقت ثابت ہو گیا۔

1۔ جب مقامی باشندوں نے فلسطین پر یہودیوں کی حاکمیت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور

2۔ 1948ء کے بعد وہ اپنے ہی وطن میں خارجی (Outsider) قرار پائے۔

تاہم صیہونیوں کو جو کامیابی ہوئی، وہ محض اس بنا پر نہیں ہوئی کہ انھوں نے اس مستقبل کی مملکت کے بارے میں ایک دلیرانہ خاکہ تشکیل دے لیا تھا یا ان میں یہ اہلیت تھی کہ وہ بھانپ گئے تھے کہ مقامی باشندے اتنے قلیل التعداد ہیں یا قلیل التعداد بنائے جا سکتے ہیں کہ انھیں آسانی سے نظر انداز کر دیا جائے بلکہ میرا خیال یہ ہے کہ عرب فلسطینیوں کی مزاحمت کے خلاف صیہونیوں کو جو اتنی مؤثر کامیابیاں حاصل ہوئیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے استعماری طاقتوں کی طرح محض ایک عمومی خواب (ویژن) پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنی پالیسی کو جزئیات سمیت بغور و فکر طے کیا۔ چنانچہ فلسطین صرف موعودہ سرزمین ہی نہیں تھا۔ (اگر موعودہ سرزمین صرف ایک تصور ہی ہوتی تو ہر دوسرے تصور کی طرح یہ تصور بھی محض ایک مجرد شے ہوتا اور یوں آسانی سے ذہنی گرفت میں نہ آسکتا) بلکہ فلسطین (ان کی نظروں میں) ایک مخصوص علاقہ تھا اور بطور علاقہ اس کی اپنی مخصوص خصوصیات تھیں۔ چنانچہ اس کے ایک ایک انچ رقبے کی پیمائش کی گئی۔ پورا جائزہ لیا گیا، اس پر بستیاں بسائی گئیں، اس کے لیے منصوبے وضع کیے گئے۔ اس پر تعمیرات کھڑی کی گئیں، وغیرہ وغیرہ اور یہ ہر کام جزئیات کی گہرائیوں تک کیا گیا۔ صیہونی نو آبادکاری کا عمل جب شروع ہوا تو آغاز ہی سے یہ بات بالکل واضح تھی کہ عربوں کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں اور نہ ان کے پاس کوئی ایسی جوابی تجاویز تھیں جن کی تمام تفصیلات اور

جزئیات طے کر لی گئی ہوں وہ یہ فرض کیے بیٹھے تھے (اور اپنے اس رویے میں وہ غالباً صحیح تھے) کہ چونکہ وہ اس سرزمین پر سکونت پذیر ہیں اور قانوناً اس کے مالک بھی ہیں، اس لیے یہ انھی کی ہے۔ تاہم جو بات وہ سمجھنے سے قاصر رہے۔ وہ یہ تھی کہ ان کی مڈبھیڑ ایک ایسے شعبۂ نظم سے تھی جو کسی چیز کے متعلق کسی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے اس کی تمام تفصیلات اور جزئیات کو پوری طرح کھنگالتا ہے اور یہ وہ شعبہ نظم تھا جس کی مدد سے ارضِ فلسطین پر ایک ایسی مملکت کا قیام عمل میں لایا جاسکتا تھا جو ابھی تک محض اذہان میں قائم تھی اور جس کی حیثیت محض خیالی تھی۔ کیسے؟ جزئیات طے کر کے اور ان پر صحیح معنوں میں عمل کر کے انچ انچ چلتے ہوئے، قدم قدم بڑھتے ہوئے، اور جیسا کہ ویزمان نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ ''ایک اور ایکڑ، ایک اور بکری۔'' (یعنی صیہونیوں نے چھوٹی سی چھوٹی چیز کو بھی نظر انداز نہیں کیا، جو شے بھی ان کے ہاتھ آئی، خواہ وہ کتنی ہی حقیر اور معمولی تھی، انھوں نے اس پر قبضہ کیا اور پوری تندہی سے اپنے مقصد کے حصول میں لگے رہے۔) (اس کے برعکس) فلسطینی عرب ایک عمومی پالیسی کے عمومی اصولوں سے مخالفت کرتے رہے۔ وہ یہ کہتے تھے کہ صیہونیت ایک غیر ملکی استعمار ہے (اور صحیح پوچھیں تو یہ واقعی ایک غیر ملکی استعمار تھا، خود اولین صیہونی اس کا اقرار کرتے تھے۔) مقامی باشندوں کے متعلق اس کا رویہ غیر منصفانہ ہے (احد ہائم جیسے اولین صیہونیوں نے اس کا بھی اقرار کیا ہے) اور وہ (فلسطین عرب) یہ سمجھتے رہے کہ اپنی مختلف نظری کمزوریوں کے پیش نظر اس (صیہونیت) کا انجام فنا ہے۔ آج تک فلسطینیوں کا سیاسی مؤقف عام طور پر صرف انھی منفی رویوں کے گرد مجتمع رہا ہے اور ابھی تک انھوں نے صیہونی مہم جوئی کی جزئیات کا ترکی بہ ترکی جواب دینے کے سلسلے میں کوئی خاص کوشش نہیں کی۔ مثلاً اب تک مغربی کنارے پر صیہونیوں کی ستتر (77) غیر قانونی بستیاں تعمیر ہو چکی ہیں اور اسرائیل مغربی کنارے پر عربوں کی ملکیتی اراضی کا ستائیس فیصد ضبط کر چکا ہے۔ تاہم اسرائیلی بستیوں کا یہ سلسلہ جو زلفِ یار کی طرح درازتر ہوتا جا تا رہا ہے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں میں عملی طور پر اتنی جسمانی سکت بھی نہیں رہی کہ وہ اسے روک سکیں۔

فلسطینی یہ بات سمجھ نہیں پائے کہ صیہونیت محض ایک غیر منصف مزاج نوآبادیاتی آقا ہی نہیں (اس آقا کے خلاف تو آپ ہر نوع کی اعلیٰ عدالتوں میں اپیل کر سکتے تھے خواہ اس کا نتیجہ کچھ بھی برآمد ہوتا) بلکہ اس سے کہیں کچھ زیادہ ہے۔ صیہونیت نے جو چیلنج پیش کیا ہے، وہ بھی ان (عربوں) کی سمجھ میں نہیں آپایا۔ اس صیہونی چیلنج کی مختلف صورتیں ہیں۔ وہ جزئیات کی پالیسی اختیار کرتے ہیں، ادارے قائم کرتے ہیں۔ تنظیمیں کھڑی کرتے ہیں، ان کی معاونت سے (آج تک) لوگ غیر قانونی طور پر اس سرزمین پر وارد ہو رہے ہیں، وہاں مکانات تعمیر کر رہے ہیں، وہاں آباد ہو رہے ہیں اور دعویٰ کر رہے ہیں کہ یہ سرزمین ہماری ہے.....کل

عالم ان کی مذمت کر رہا ہے (لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہو رہے اور اپنا کام کیے جا رہے ہیں۔) ایک یہودی سرزمین پر آباد ہونے، بلکہ ایک لحاظ سے اسے تخلیق کرنے کے جذبے کے پیچھے جو محرک قوت کام کر رہی ہے۔ اس کی ایک جھلک اس دستاویز میں دکھائی دیتی ہے، جس کے متعلق ویزمان کہتا ہے اور ٹھیک ہی کہتا ہے کہ ''معلوم ہوتا تھا کہ اس میں آئندہ پیش آنے والے واقعات کی پیش بینی کی گئی ہے اور سچ پوچھیں تو ہوا بھی یہی کچھ۔ اس دستاویز کا جس کا یہاں ذکر ہو رہا ہے۔ عنوان تھا۔ ''صیہونی تحریک کی امنگوں کے مطابق فلسطین میں یہودی نوآبادکاری کے پروگرام کا اجمالی خاکہ۔'' یہ دستاویز 1917ء کے اوائل میں منظرِ عام پر آئی اور اس قابل ہے کہ اس کا ایک اقتباس یہاں پیش کیا جائے۔

سیادتی حکومت ① (یعنی کوئی بھی حکومت، خواہ وہ اتحادیوں کی ہو یا دوسروں کی لیکن جس کا حکم یہاں چلتا ہو) فلسطین میں یہودیوں کی نوآبادکاری کے کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ایک یہودی کمپنی کی تشکیل کی اجازت دے گی۔ مذکورہ کمپنی براہِ راست سیادتی حکومت کے زیرِ تحفظ ہوگی (یعنی فلسطین میں جو کچھ بھی ہوگا، اس کے جائز ہونے کی سند مقامی باشندے نہیں بلکہ کوئی بیرونی طاقت عطا کرے گی۔) اس کمپنی کے مقاصد مندرجہ ذیل ہوں گے:

① ہر ممکن طریقے سے فلسطین میں یہودیوں کی موجودہ بستیوں کی دستگیری کرنا، انھیں تقویت پہنچانا اور انھیں پروان چڑھنے میں مدد فراہم کرنا۔

② دوسرے ممالک کے ان یہودیوں کی، جو فلسطین میں آباد ہونے کے آرزومند ہوں اور اس کام کے لیے موزوں بھی، امداد، حمایت اور حوصلہ افزائی کرنا۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر ترکِ وطن کے کام کو منظم کیا جائے گا (ضروری) معلومات فراہم کی جائیں گی اور ہر قسم کی مادی اور اخلاقی امداد مہیا کی جائے گی۔

کمپنی کو ایسے تمام اختیارات حاصل ہوں گے جن کے ذریعے ملک کو زرعی، تجارتی، ثقافتی، صنعتی، غرضیکہ ہر لحاظ سے ترقّی دی جا سکے، ان اختیارات میں اراضی کی خرید، بالخصوص سرکاری اراضی کے حصول اور اس کی ترقّی و نمو کا اختیار، شاہراہوں، ریلوے لائنوں، اور بندرگاہوں کی تعمیر کے حقوق، فلسطین میں مسافروں اور تجارتی سامان کو لانے اور انھیں باہر بھیجنے کے لیے جہاز راں

---

① سیادتی (Suzerain) حکومت، ایک غیر ملکی حکومت، جو مقامی امور کے متعلق اختیارات تو مقامی حکومت کے سپرد کر دیتی ہے لیکن دفاعی اور خارجی امور اپنی تحویل میں رکھتی ہے۔

کمپنیوں کے قیام کا اختیار، بلکہ ہر وہ اختیار شامل ہوگا، جو اس ملک کے دروازے یہودیوں کے لیے کھولنے کے سلسلے میں ضروری ہوگا۔ ①

اس غیر معمولی عبارت سے جن بین السطور عزائم کی نشاندہی ہوتی ہے، وہ ایسی تنظیموں کا قیام ہے جن کے فرائض بالکل وہی ہیں جو کسی ملک کے مسلّح افواج کے ہوسکتے ہیں، کیونکہ صرف مسلّح افواج ہی وہ تنظیم ہوتی ہیں جو آبادکاری کے لیے کسی ملک کا ''دروازہ کھولتی ہے۔'' جو غیر ملکی علاقے میں بستیوں کے قیام کو منظم کرتی ہے، جو ترکِ سکونت، جہاز رانی، رسد (کی فراہمی) جیسے امور میں امداد پہنچاتی ہے اور ان کی ترقّی و نمو میں ہاتھ بٹاتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ محض شہریوں کی کچھ اس طرح ماہیت قلب کرتی ہے کہ وہ نظم و ضبط کے خوگر ''موزوں'' ایجنٹوں میں تبدیل ہوجاتے ہیں جن کا کام عین سرزمین پر عین موقع پر موجود ہونا اور وہاں اپنے مطلب کے ڈھانچے، تنظیمیں اور ادارے قائم کرنا ہوتا ہے۔ جس طرح افواج عام شہریوں کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اپنے اندر جذب کر لیتی ہیں...... وہ انھیں یونیفارم میں ملبوس کر دیتی ہیں، چالوں گھاتوں اور حربوں کی مشق کراتی ہیں اور اپنے ہر رکن کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے تربیت دیتی ہیں اور اس میں نظم و ضبط پیدا کرتی ہیں...... صیہونیت نے بھی یہی کچھ کیا۔ اس نے یہودی نوآبادکاروں کو یہودی مزدوروں اور یہودی کسانوں کی تنظیموں میں پرو دیا، انھیں جو یونیفارم پہنائی گئی (یعنی انھیں جس رنگ میں رنگا گیا) اس کا یہ تقاضا تھا کہ ان تنظیموں میں صرف یہودی ہی قابل قبول ہوسکتے ہیں اور وہی ان میں بار پا سکتے ہیں۔ صیہونی فوج کی قوت نہ اس کے رہنماؤں کی رہینِ منت تھی اور نہ ان ہتھیاروں کی جو یہ اپنی فتوحات اور اپنے دفاع کے لیے جمع کرتی تھی، بلکہ یہ اس سارے نظام کے روبہ عمل ہونے، مختلف مقامات کو اپنے قبضے میں لینے اور اس قبضے کو برقرار رکھنے اور ویزمان کے الفاظ میں زراعت، ثقافت، تجارت اور صنعت کے میدانوں میں تھی۔ قصہ مختصر، صیہونیت نے جو یہ ''جماعت'' تشکیل کی، اس کا مقصد یہ تھا کہ مختلف ذرائع کی امداد سے ایک نظریے اور ایک خواب کو عملی شکل دی جائے۔ یہ نظریہ، یہ خواب کیا تھا، یہی کہ عربوں کے اس علاقے کے عین قلب میں، جس کی پیمائش اور تعمیر و ترقّی کا کام نیم دلی سے کیا گیا تھا، ایک یہودی نوآبادی قائم کی جائے، اس کی ترقّی و نمو کی جائے اور اسے اپنے قبضے میں رکھا جائے۔

صیہونیت نے اپنی ترویج کے لیے جو آلہ کار جماعت تشکیل کی، اگرچہ اس کی تاریخ بہت مسحور کن ہے لیکن یہاں ہم اس پر زیادہ خامہ فرسائی نہیں کرسکتے تاہم اس کے طریقہ کار کے متعلق کم از کم چند باتیں ضرور

① ویزمان Trail and Error صفحہ نمبر: 157-156

توجہ کی مستحق ہیں۔ دوسری صیہونی کانگریس نے، جس کا اجلاس اگست 1898ء میں سوئٹزر لینڈ کے شہر بیزل میں منعقد ہوا تھا، ایک ادارہ ''جیوش کولونیئل ٹرسٹ لمیٹڈ'' کے نام سے قائم کیا۔ اس ادارے نے 1903ء میں فلسطین کے شہر جافہ میں اپنا ایک ذیلی ادارہ قائم کیا اور اس ذیلی ادارے کا نام ''اینگلو پیلسٹائن کمپنی'' تجویز ہوا۔ چنانچہ اس طرح ایک ایسی ایجنسی نے اپنے کام کا آغاز کیا، فلسطین کی کایا پلٹ کرنے میں جس کا کردار غیر معمولی طور پر اہم ثابت ہوا۔ 1901ء میں ''جیوش کولونیئل فنڈ لمیٹڈ'' کے بطن سے ایک اور ادارے ''جیوش نیشنل فنڈ'' نے جنم لیا تھا۔ اس فنڈ کو اراضی خریدنے اور اسے ''یہودی قوم'' کی امانت کے طور پر اپنی تحویل میں رکھنے کا اختیار تھا۔ ابتدائی تجویز کے الفاظ یہ تھے۔ جیوش نیشنل فنڈ یہودی قوم کی امانت ہوگا۔ اس کا سرمایہ صرف فلسطین اور شام میں اراضی خریدنے پر صرف ہوگا۔'' جیوش نیشنل فنڈ ہمیشہ عالمی صیہونی تنظیم [1] کی تحویل میں رہا اور اس کے ذریعے 1905ء میں اراضی خریدنے کے اولین سودے طے پائے۔

ایک کارگر ادارے کی حیثیت سے جیوش نیشنل فنڈ اپنے قیام کے روزِ اول ہی سے اراضی خریدنے، اسے پٹے پر لینے اور اسے ترقی دینے...... صرف یہودیوں کے لیے...... کے لیے موجود رہا ہے۔ جیسا کہ والٹر لہن [2] نے بڑے باوثوق انداز سے یہ ثابت کیا ہے کہ صیہونیوں کی منزل یہ تھی کہ اراضی حاصل کی جائے تاکہ اس پر آبادکاروں کو بسایا جا سکے۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لیے پہلے تو ''جیوش نیشنل فنڈ'' کی ایک ایجنسی کی حیثیت سے ''پیلسٹائن لینڈ ڈویلپمنٹ کمپنی'' کا قیام عمل میں لایا گیا اور اس کے بعد 1920ء میں ایک اور

---

① عالمی صیہونی تنظیم: World zionist Orgnization

② میں نے والٹر لہن (Lehn) کے حوالے سے اوپر جو تفصیلات دی ہیں، وہ اس کے ایک مضمون ''دی جیوش نیشنل فنڈ'' سے اخذ کی گئی ہیں۔ یہ مضمون ایک جریدے ''جرنل آف پیلسٹائن سٹڈیز'' کی جلد سوم شمارہ نمبر 4 (گرما 1974ء) میں صفحات نمبر 92-74 پر شائع ہوا تھا۔ لہن کی تحقیقات نہایت اعلیٰ درجے کی ہیں اور اسی لیے میں نے ان سے استفادہ کیا ہے۔ یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ 78-1977ء میں لسانیات کا پروفیسر والٹر لہن مقبوضہ مغربی کنارے پر اعلیٰ تعلیم کے واحد عرب ادارے بیرزیت یونیورسٹی میں مہمان پروفیسر کی حیثیت سے تعینات تھا۔ اس سال کے دوران میں لہن نے جیوش نیشنل فنڈ کے متعلق اپنی تحقیقات کا سلسلہ جاری رکھا۔ ایک چشم دید گواہ کی حیثیت سے اس نے 6 جنوری کو ایک کھلے خط پر دستخط بھی کیے۔ اسرائیلی فوجیوں نے دو فلسطین طالب علموں کی بڑے ظالمانہ انداز سے زبردست پٹائی کی تھی اور بعد میں ایک طالب علم کو، جو اس پٹائی کے دوران میں بے ہوش ہو گیا تھا، ہسپتال میں داخل کرانا پڑا تھا۔ اس خط میں اسی پٹائی کے خلاف احتجاج کیا گیا تھا۔ مئی 1978ء میں دوسرے چھ پروفیسروں کے ساتھ مغربی کنارے کے فوجی حکام نے لہن کو بھی ورک پرمٹ دینے سے انکار کر دیا۔ کسی امریکی اخبار نے یہ خبر شائع نہ کی، تاہم جرنل آف پیلسٹائن سٹڈیز کی جلد ہفتم شمارہ نمبر 4 (گرما 1978ء) میں یوری ڈیوس اور والٹر لہن کا مضمون پڑھا جا سکتا ہے۔ (مصنف)

ادارے ''پیلسٹائن فونڈیشن فنڈ'' کی تاسیس رکھی گئی۔ اس فنڈ کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ دوسرے ممالک کے یہودیوں کو ترکِ وطن کی ترغیب دی جائے اور انھیں فلسطین میں بسایا جائے اور یہ دونوں کام بڑے منظم انداز سے کیے جانے تھے۔ اس کے ساتھ ہی زور اس بات پر دیا گیا کہ اراضی افراد کے نام پر نہیں خریدی جائے گی اور نہ وہ افراد کی ملکیت ہوگی بلکہ اراضی کی خرید ایک ادارے کی حیثیت سے پوری ''یہودی قوم'' کے نام پر ہوگی اور ایک ادارے کی حیثیت سے پوری ''یہودی قوم'' اس کی مالک ہوگی۔ اس صراحت سے یہ بات بھی یقینی ہوگئی کہ صیہونی مملکت ان معنوں میں دوسری تمام مملکتوں سے مختلف ہوگی کہ یہ اپنے ہی شہریوں کی مملکت نہیں ہوگی بلکہ یہ ایک پوری قوم کی مملکت ہوگی۔ جس کے بیشتر افراد دُنیا کے مختلف حصوں میں بکھرے پڑے تھے۔ اس رویے نے نہ صرف یہ کہ مملکت کے غیر یہودی باشندوں کو دوسرے درجے کے شہری قرار دے دیا بلکہ اس نے یہودی تنظیموں اور بعد ازاں مملکت کو اس قابل بنا دیا کہ انھیں اہم علاقائی مقبوضات کے علاوہ جن پر کسی مملکت کو اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہوتا ہے، ان علاقوں کے (یہودی) باشندوں پر بھی، جو ان کی دسترس سے باہر تھے، اختیار حاصل ہوگیا جیسا کہ جان ہوپ سمپسن ① نے 1930ء میں کہا تھا۔ وہ زمینیں بھی جو ''جیوش نیشنل فنڈ'' نے حاصل کی تھیں، ملکی قانون کی دسترس سے باہر (Extra Temarialized) قرار دے دیں گئیں۔ اب ان زمینوں سے عرب نہ تو اب اور نہ آئندہ کبھی مستقبل میں کوئی فائدہ اٹھا سکتے تھے۔'' جہاں تک عربوں کا تعلق ہے، انھوں نے یہودیوں کی طرح ایسی کوئی کوشش نہیں کی کہ وہ بھی زمین کو افراد کی ملکیت سے نکال کر قوم کی ملکیت میں دے دیتے اور یوں ثابت کر دیتے کہ زمین پر حق صرف ادارے کا ہے افراد کا نہیں۔ انھوں نے یہ تک نہ سوچا کہ شاید ایک ایسے ادارے کے قیام کی ضرورت پیش آجائے جو اراضی کو ''عرب قوم'' کے استعمال کے لیے ''دائمی طور پر'' اپنے قبضے میں رکھ سکے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ (مختلف طبقوں، فریقوں اور قوموں کی) حمایت حاصل کرنے کے لیے نہ تو معلومات اکٹھی کی گئیں اور نہ سرمایہ جمع کرنے کا کوئی بندوبست کیا گیا، جس طرح کہ صیہونی امریکا اور یورپ میں کر رہے تھے تا کہ وہ ''یہودی'' علاقے کو وسعت دے سکیں اور متناقض طور پر اسے ایک یہودی موجودگی اور ایک بین الاقوامی، قریب قریب مابعد الطبیعیاتی درجہ بخش سکیں۔ عربوں کا خیال تھا کہ زمین کا مالک ہونا اور اس پر موجود رہنا ہی کافی ہے اور یہ کتنا غلط خیال تھا۔

اس باریک بین اور دور اندیشانہ کوشش کے باوجود ایک مملکت کے طور پر اسرائیل کے قیام تک ''جیوش نیشنل فنڈ'' تقریباً پچاس سالوں کے دوران میں صرف نو لاکھ چھتیس ② ہزار دنم اراضی حاصل کر سکا۔ یہ زیرِ انتداب

---

① Sampson

② ایک دونم کوئی چوتھائی ایکڑ کے برابر ہوتا ہے۔

فلسطین کا مجموعی رقبہ دو کروڑ تریسٹھ لاکھ تیئس ہزار دونم تھا۔ کچھ قلیل رقبہ یہودی مالکوں کے نجی قبضے میں بھی تھا۔ چنانچہ مل ملا کر فلسطین میں صیہونیوں کی زیرِ ملکیت اراضی کا کل رقبہ 1947ء کے اواخر تک سترہ لاکھ چونتیس ہزار دونم یعنی ملک کے کل رقبے کا محض 59.6 فیصد تھا۔ 1940ء کے بعد جب مسلط حکام نے فلسطین میں یہودیوں کی ملکیت اراضی کو چند مخصوص خطوں تک محدود کر دیا، تب بھی ملک کے پینسٹھ فیصد علاقے میں جو عربوں کے لیے محدود کر دیا گیا تھا، اراضی کی غیر قانونی خرید (وفروخت) جاری رہی۔ چنانچہ جب 1947ء میں تقسیم کے منصوبے کا اعلان کیا گیا، تو وہ اراضی بھی، جو غیر قانونی طور پر یہودیوں کے قبضے میں تھی، اسے امر واقع شدہ (Fait Accompli) کے طور پر یہودی مملکت کی حدود میں شامل کر دیا گیا اور جب اسرائیل نے یہ اعلان کیا کہ اس نے ایک مملکت کی حیثیت اختیار کر لی ہے، تو خیرہ کن قوانین کے نفاذ کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان قوانین کے تحت عرب زمینوں کے وسیع وعریض قطعات (جن کے مالک پناہ گزیں بن چکے تھے اور جنھیں ''غیر حاضر زمیندار'' قرار دے دیا گیا تھا تا کہ ان کی زمینوں کو ہتھیایا جاسکے اور ان کی واپسی کے تمام امکانات کو ختم کیا جاسکے) کو ہڑپ کر لیا گیا اور انھیں ''نیشنل جیوش فنڈ'' کی تحویل میں دے دیا گیا۔ (عربوں کے نقطۂ نظر سے) انتقالِ اراضی کا کام مکمل ہو چکا تھا۔

''جماعت'' کو جو ''علاقائی کامیابیاں'' حاصل ہوئی تھیں، ان کے نظریاتی اور انتہائی سیاسی معانی اس نزاعی بحث پر روشنی ڈالتے ہیں جو 1967ء کی جنگ کے بعد اس بارے میں شروع ہوئی تھی کہ اسرائیل کے زیرِ قبضہ عربوں کی اراضی کیسے ٹھکانے لگائی جائے۔ اسرائیلی آبادی کا ایک خاصا بڑا حصہ یہ یقین کرتا نظر آتا ہے کہ عربوں کی اراضی کو یہودی اراضی میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

1 کیونکہ آج سے دو ہزار سال قبل یہ اراضی (ارتیز اسرائیل کے جزو کے طور پر) یہودی اراضی تھی۔

2 کیونکہ جن زمینوں کے متعلق ''لاپروائی'' برتی گئی ہو یا انھیں ''نظر انداز'' کر دیا گیا ہو، ان کی ماہیت تبدیل کر کے انھیں یہودی قوم کی ملکیت بنانے کے لیے ''جیوش نیشنل فنڈ'' میں طریق کار موجود ہے۔① جس

① مثلاً ایک خاصے بڑے عرب گاؤں ''ام الفہم'' میں جو کچھ پیش آیا، اس پر غور فرمائیں۔ یہ گاؤں روڈز معاہدے کے تحت اردن کے شاہ عبداللہ نے 1949ء میں اسرائیل کے حوالے کر دیا تھا۔ 1948ء سے قبل اس گاؤں کا کل ملکیتی رقبہ ایک لاکھ چالیس ہزار دونم تھا اور آبادی پانچ ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ 1978ء میں ام الفہم کے عرب باشندوں کی تعداد بیس ہزار تک پہنچ گئی لیکن ان کے زیرِ ملکیت رقبہ صرف پندرہ ہزار دونم رہ گیا اور یہ رقبہ بھی زیادہ تر چٹانی اور یوں کاشتکاری کے اعتبار سے بے کار تھا۔ گاؤں کی بہترین اراضی مختلف ''قانونی'' فرامین بشمول ''قانونی اراضی، بیمہ و معاوضہ کے تحت ضبط کر لی گئی۔ عظیم ترین ستم ظریفی غالباً یہ ہے کہ یہاں ''معید ڈ'' اور ''جیوات اوز'' کے نام سے دو ''سوشلسٹ'' کبتز (اجتماعی زرعی فارم) عربوں کی ضبط شدہ اراضی پر قائم کیے گئے......

زمین پر ایک مرتبہ یہودی بستیاں تعمیر ہو جائیں اور ان بستیوں میں لوگ آباد ہو جائیں، اور ایک مرتبہ یہ بستیاں مملکتی نظام میں پرو دی جائیں، تو وہ اپنی مناسب حیثیت کے اعتبار سے علاقائی قوانین کی دسترس سے باہر ہو جاتی ہیں، وہ پُر زور طریقے سے یہودی بن جاتی ہیں اور یوں اس زمین کی حیثیت بھی تبدیل ہو جاتی ہے اور وہ اب عرب زمین نہیں رہتی۔ اس نئی اراضی پر قبضہ جمائے رکھنے کے لیے چند اور عقلی توجیہات کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ ان توجیہات کا تعلق حربی تقاضوں سے ہوتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ اراضی اسرائیل کی سلامتی کے لیے ضروری ہے۔ تاہم اگر یہ باتیں محض داخلی اسرائیلی تشویش کا مسئلہ ہوتیں اور ان باریک بین دلائل کا مقصد محض اسرائیل کے رائے دہندگان کو متاثر کرنا ہوتا تو جذبات سے بالاتر ہو کر ان کا تجزیہ کیا جا سکتا تھا اور انھیں محض عجیب اور نرالے کہہ کر ان سے صرفِ نظر کی جا سکتی تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ باتیں ان علاقوں کے عرب باشندوں کے مفادات سے ٹکراتی ہیں...... جیسا کہ وہ ہمیشہ ٹکراتی رہیں ہیں اور تب انھیں ان (عرب باشندوں کے مفادات) پر واضح تفوق حاصل ہو جاتا ہے۔ تاہم نظری اور عملی اعتبار سے ان کی مؤثریت اس نکتے میں ہے کہ وہ اس علاقے کو کس طرح یہودی اور اس کے ساتھ ساتھ غیر عرب صفات سے متصف کرتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ اس حقیقت کی ایک ناقابلِ تردید شہادت اس تحریر میں موجود ہے جو جوزف ویٹز (Weitz) نے اس ضمن میں سپردِ قلم کی تھی۔ ویٹز 1932ء سے ''جیوش نیشنل لینڈ فنڈ'' کا ڈائریکٹر چلا آ رہا تھا، 1965ء میں اس کے روزنامچے اور دوسری تحریریں ''میری ڈائری اور بچوں کے نام خطوط'' کے عنوان سے شائع ہوئیں۔ اس کتاب کے مطابق اس نے 19 دسمبر 1940ء کو لکھا:

> جنگ (جنگ عظیم دوم) کے بعد ارضِ اسرائیل کا مسئلہ اور یہودیوں کا مسئلہ بھی اٹھایا جائے گا۔ اب تک یہ دونوں مسائل ''ترقی و نمو'' کے بنیادی سانچے کے اندر اٹھائے جاتے رہے ہیں لیکن جنگ کے بعد ان کی نوعیت تبدیل ہو جائے گی اور ہمیں ''ترقی و نمو'' سے کچھ آگے بڑھ کر سوچنا ہوگا۔ یہ بات بالکل واضح ہو جانا چاہیے کہ اس ملک میں دونوں قوموں کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔ ہمیں اس چھوٹے سے ملک میں ایک آزاد قوم کی حیثیت اختیار کرنا ہے اور کوئی ''ترقی و نمو'' ہمیں اپنے اس مقصد کے قریب نہیں لا سکے گی۔ اگر عرب اس ملک سے کوچ کر جائیں تو پھر یہی ملک ہمارے لیے وسیع و عریض بن جائے گا اور اس کی آغوش ہمارے لیے وا ہو جائے

......اور جو اراضی ان کی دستبرد سے بچ گئی وہ ''موشاف'' یا ''امدادی باہمی کی زرعی انجمن'' کے حوالے کر دی گئی۔ (مصنف)

گی لیکن اگر عرب یہیں ڈٹے رہے تو پھر یہی ملک تنگ اور فلاکت زدہ بن جائے گا۔ جب جنگ ختم ہو جائے گی اور انگریز فتح کے پھریرے لہراتے پھریں گے اور جب منصفین قانون و انصاف کی کرسیوں پر براجمان ہوجائیں گے تو ہماری قوم کو ان کے سامنے اپنی درخواستیں، التجائیں اور دعاوی پیش کرنا چاہییں۔ مسئلے کا واحد حل یہ ہے کہ ارضِ اسرائیل یا کم از کم مغربی ارضِ اسرائیل کا قیام عمل میں لایا جائے اور اس اسرائیل میں ایک بھی عرب باشندہ نہیں ہوگا۔ اس نکتے پر کسی قسم کے سمجھوتے کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ ارضِ اسرائیل پر یہودی مملکت کی تخلیق کے لیے زمین ہموار کرنے اور فضا سازگار بنانے کے ضمن میں صیہونیوں نے جو جان توڑ مہم شروع کر رکھی ہے، وقت کے لحاظ سے اس کے نتائج نہایت شاندار اور عمدہ رہے ہیں، اس مہم کا ایک جزو "اراضی کی خرید" بھی تھا اور اس ضمن میں ہمیں جو کامیابی ہوئی ہے، اس پر ہم بغلیں بھی بجا سکتے ہیں...... تاہم محض "اراضی کی خرید" سے اسرائیل کا قیام عمل میں نہیں لایا جاسکے گا۔ جس طرح (گناہوں سے) نجات فوری طور پر ملتی ہے۔ (تصورِ مسیحا① کا راز یہی ہے) اس طرح یہ کام (تخلیق اسرائیل) بھی فوراً ہونا چاہیے لیکن اس کام کو اس وقت تک پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچایا جاسکتا جب تک عربوں کو یہاں سے ہمسایہ ممالک میں منتقل نہیں کر دیا جاتا اور یہ منتقلی بھی ان سب کی ہونی چاہیے اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں۔ بیت اللحم، الناصرہ اور قدیم بیت المقدس کو چھوڑ کر ہمیں ایک بھی (عرب) گاؤں اور ایک بھی (عرب) قبیلہ یہاں رہنے نہیں دینا چاہیے۔ اس منتقلی کا رخ عراق، شام، مشرق اردن کی طرف ہونا چاہیے، اس مقصد کے حصول کے لیے ہم روپیا بے حساب روپیا اکٹھا کریں گے، ہم صرف اسی صورت میں کہ یہ منتقلی عمل میں آجائے اپنے لاکھوں کروڑوں بھائیوں کو یہاں کھپا سکیں گے اور یہودی مسئلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حل ہوجائے گا۔ اس کے علاوہ اس مسئلے کے حل کی کوئی دوسری صورت نہیں ہے۔②

① مسیحا (مسیح) عہد نامۂ عتیق میں اس مفہوم کی متعدد پیش گوئیاں مندرج ہیں کہ خداوند ایک بادشاہ کو بھیجے گا جو یہودیوں کو نہ صرف ان کے گناہوں سے بلکہ ان لوگوں سے بھی جو ان پر ظلم و ستم روا رکھتے ہیں، نجات دلائے گا۔ اس بادشاہ کو "مسیح"، "مسیحا" یا بحقوق "ظلِ الٰہی" کہتے ہیں...... وہ بادشاہ داؤد (علیہ السلام) کی آل میں سے ہوگا۔ وہ اپنی قوم کی خاطر مصائب جھیلے گا، لیکن اسے قوت و دولت سے بھی سرفراز کرے گا۔ سچے یہودی اب بھی اس کا انتظار کرتے ہیں۔ عیسائی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو مسیح مانتے ہیں۔ وہ انھیں "کرائسٹ" کہتے ہیں جو دراصل "مسیح" کا یونانی ترجمہ ہے۔ (السٹریٹڈ ورلڈ انسائیکلو پیڈیا)

② جوزف ویٹز، مائی ڈائریز اینڈ لیٹرز ٹو چلڈرن (مساوا، تل ابیب) جلد دوم صفحات نمبر 82-181

بعد میں جو کچھ پیش آنا تھا، یہ عبارت اس کے متعلق محض الہامی طور پر ہی پیش گوئی نہیں کرتی بلکہ یہ ایک پالیسی بیان بھی ہے جو اگرچہ پیش تو ویٹز کر رہا ہے لیکن درحقیقت تمام یہودیوں کا اجماع بھی اسی پر ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ صیہونیوں کے اس قسم کے بیانات اور تحریریں جن کا آغاز ہرزل سے ہوتا ہے، سیکڑوں کی تعداد میں دستیاب ہیں اور جب ''نجات'' کی گھڑی آ پہنچی تو یہی وہ خیالات تھے، جن کو پیشِ نظر رکھ کر صیہونیوں نے فلسطین اور عربوں کے اخراج کے منصوبوں پر عمل کیا۔ جنگِ عظیم دوم کے اختتام اور اواخر 1948ء کے مابین فلسطین میں جو شورشیں برپا ہوئیں اور جو ہنگامے ہوئے، ان کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ کیا پیش آ سکتا تھا اور کیا نہیں پیش آ سکتا تھا، اس کی پیچیدگیوں کے بغیر ہی ویٹز کے خیالات روشنی کی ایک کرن فراہم کرتے ہیں اور ہمیں ان واقعات کو سمجھنے میں آسانی فراہم کرتے ہیں جو اس بات کی طرف کھلا کھلا اشارہ کر رہے تھے کہ ایک ایسی یہودی مملکت کا قیام عمل میں آنے والا ہے جس کے اصل عرب باشندوں کی بیشتر تعداد کو پناہ گزیں بنا دیا جائے گا۔ یہ درست ہے کہ اس قسم کے عظیم واقعات کو، جس میں ایک نئی مملکت کی تولید شامل ہے اور مملکت بھی وہ جو ناقابلِ یقین حد تک پیچیدہ اور کثیر الجہتی جدوجہد اور ایک بڑے پیمانے کی جنگ کے طفیل وجود میں آئی ہو، سیدھے سادے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا اور نہ ان کے متعلق کوئی عام فہم کلیے یا اصول گھڑے جا سکتے ہیں۔ میرا اس قسم کا کوئی ارادہ نہیں کہ میں یہ کام کرنے کا بیڑا اٹھاؤں، تاہم اس جدوجہد کا جو نتیجہ برآمد ہوا، میں اس سے بھی آنکھیں چرا نہیں سکتا اور نہ میں ان فیصلہ کن عناصر سے پہلوتہی کر سکتا ہوں جو اس جدوجہد میں شریک تھے اور یا جو قیامِ اسرائیل کے روزِ اول ہی سے وہاں پالیسیاں بنانے پر مامور ہیں۔ وہ حقیقت جو فلسطینیوں......اور صیہونیوں کے لیے......اہم ہے، یہ ہے کہ وہ خطہ زمین جہاں کسی زمانے میں عربوں کی بھرمار تھی، جنگ (1948ء) کے بعد اس کی یہ کیفیت ہوگئی کہ

1۔ وہ اپنے اصلی باشندوں سے خالی ہوگیا۔

2۔ فلسطینیوں کا وہاں دوبارہ آنا ناممکن بنا دیا گیا۔

صیہونیوں نے فلسطین کے حصول کے لیے جو نظریاتی اور تنظیمی تیاریاں کیں اور اس ضمن میں جو فوجی حکمتِ عملی اور حربے اختیار کیے، ان میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا کہ انھوں نے ایک خطے کو اپنی تحویل میں لینا اور اس میں نئے باشندوں کو بسانا ہے۔ جیسا کہ صیہونی مؤرخین، جون اور ڈیوڈ کم شے نے بیان کیا ہے ''ویلت منصوبے'' کا مقصد یہ تھا کہ فوجی اہمیت کی حامل ان چوٹیوں پر، جو حملہ آور عرب فوجوں کی پیش قدمی کے امکانی راستوں پر واقع تھیں، قبضہ کر لیا جائے اور برطانوی فوجوں کی واپسی کے بعد جو خلا پیدا ہوگا، اسے اس طرح پورا کیا جائے کہ شمالاً جنوباً ایک ایسا علاقہ وجود میں لایا جائے جہاں یہودی بستیاں ایک دوسرے کے

قریب قریب واقع ہوں۔ ① الجلیل جیسے مقامات، جافہ سے عکہ تک کا ساحلی علاقہ، بیت المقدس کے بعض حصے، حیفہ کے عرب محلوں کا تو ذکر ایک طرف رہا، اور رام اللہ کے شہروں تک، سبھی مقامات اور علاقے صیہونیوں کی زد میں تھے۔ جہاں پہلے انگریزوں کی چوکیاں تھیں، وہاں اپنی چوکیاں قائم کر رہے تھے بلکہ وہ تو ان مقامات پر بھی پہنچ رہے تھے جہاں خالصتاً عرب باشندے رہائش پذیر تھے۔ ویٹز کے الفاظ میں ان عرب باشندوں کی ''منتقلی'' کی جا رہی تھی۔

یہ جو اس قسم کے دعاوی بار بار لڑھکائے جاتے ہیں کہ فلسطین کے باشندوں نے اس لیے ترکِ سکونت اختیار کی کہ کیونکہ ان کے قائدین نے انھیں ایسا کرنے کا حکم دیا تھا یا یہ کہ اسرائیل نے مئی 1948ء میں اپنی آزادی کا جو اعلان کیا تھا، حملہ آور عرب افواج نے اس میں دخل در معقولات کیا تھا تو ان کے متعلق میں یہ نہایت وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ آج تک ایک شخص بھی اس قسم کے احکام کے بارے میں ذرہ برابر شہادت پیش نہیں کر سکا جن کے نتیجے میں اتنا وسیع اور قطعی خروج عمل میں آیا۔ ② دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ نکلا کہ اگر ہم واقعی یہ سمجھنا چاہتے ہوں کہ 1948ء میں سات لاکھ اسّی ہزار فلسطینیوں نے ترکِ وطن کیوں کیا تو پھر ہمیں اپنی توجہ کا مرکز کسی دوسری چیز کو بنانا ہوگا تا کہ ہم ان واقعات کی نہیں جو 1948ء میں معناً پیش آئے، بلکہ ان سے آگے جو امور آتے ہیں، ان کی بھی تہ تک پہنچ سکیں بلکہ ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ خروج اس

---

① جون اینڈ ڈیوڈ کم شے The Arab-Jewish War and the A Clash of Desti..es (Kimche) The Founding of the State of Israel ۔ ناشر پریگر (Praeger) پبلشرس، نیویارک، سال اشاعت 1960ء صفحہ نمبر 92، یہاں ولید خالدی کے دو اہم مضامین بھی پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سے سقوطِ حیفہ (The Fall Of Haifa) مڈل ایسٹ فورم جلد نمبر 35، شمارہ نمبر 10، دسمبر 1959ء کے صفحات نمبر 22 تا 32 پر اور Plan Dalet: The Zionist "Blue print for the Conquest of Palestine." اسی جریدے کی جلد نمبر 9 (نومبر 1961ء) کے صفحات نمبر 22 تا 28 پر شائع ہوا تھا۔

② فلسطینی خروج کے متعلق اس زمانے کے ایک ایک عربی اخباروں اور ایک ایک ریڈیو نشریہ جس کے عمیق مطالعہ کے بعد جس بات کا انکشاف ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ فلسطینیوں کو کسی شخص نے بھی یہ حکم نہیں دیا تھا کہ وہ اپنا ملک چھوڑ دیں۔ زور جس بات پر دیا گیا، وہ یہ تھی کہ وہ اپنے وطن میں مقیم رہیں اور ترکِ سکونت بالکل نہ کریں۔ بدقسمتی سے انھیں جس خوف و ہراس کا نشانہ بنایا گیا وہ اتنا شدید تھا کہ غیر مسلح آبادی اس کے مقابلے میں ٹھہر نہ سکی۔ ابراہیم لغود کی مرتبہ کتاب The Transformation of Palestine میں ارسکن چائلڈرز کا مضمون The Workless Wish Form Citizens to Refugees کا مطالعہ بھی فرمائیں۔ چائلڈرز (Childers) کا تعلق آئر لینڈ سے ہے۔ جس زمانے میں اس نے تحقیقات کا کام کیا، وہ ایک آزاد منش (فری لانس) صحافی تھا۔ اس نے جو کچھ دیکھا اور پایا، وہ صیہونیت کے منہ پر زناٹے کا تھپڑ ہے۔ (مصنف)

لیے ممکن ہوا کیونکہ صیہونیوں کا مؤثر کارروائیوں کے جواب میں فلسطینیوں نے اپنے جس ردِعمل کا اظہار کیا، اس میں سیاسی اور تنظیمی سطحوں پر خاصی کمزوری پائی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان پر ناکامی، دہشت اور خوف و ہراس کی نفسیاتی کیفیت بھی طاری تھی۔ اپریل 1948ء میں مناچم بیگن اور اس کی دہشت پسند تنظیم ''ارگن'' کے ارکان نے جس بربریت کا مظاہرہ کیا اور بالخصوص دیر یاسین گاؤں کے اڑھائی سو معصوم عرب باشندوں کے قتلِ عام جیسی جو بہیمانہ کارروائیاں سرانجام دیں، انھوں نے یقیناً اپنا اثر دکھایا لیکن اپنی تمام تر بہیمیت اور سفاکی کے باوجود دیر یاسین کا سانحہ اس قسم کے قتل عام کے بے شمار سانحات میں صرف ایک سانحہ تھا جو جنگِ عظیم اوّل کے فوراً بعد وقوع پذیر ہونا شروع ہو گئے تھے اور جنھوں نے شعوری طور پر ایسے صیہونیوں کو جنم دیا جو اپنے آپ کو ان امریکیوں کے ہم پلہ قرار دیتے تھے جو مقامی ریڈ انڈین باشندوں کا قتلِ عام کیا کرتے تھے اور اس پر اپنی مسرّت کا اظہار کیا کرتے تھے۔ [1] لیکن اغلباً اہم تر وہ تراکیب اور تنظیمیں تھیں جو ان غیر مسلّح عرب باشندوں کو دور باش رکھنے کے لیے وضع کی اور تشکیل دی گئیں، جو (اکثر و بیشتر صورت میں) ایک مرتبہ جنگ کی تباہ کاریوں اور سفاکیوں سے بچنے کے لیے اپنے گھروں کو خیر باد کہہ گئے تھے۔ [2] ان کی روانگی سے قبل بھی اور ان کی روانگی کے بعد بھی صیہونیوں کے پاس عملی طور پر ان کی موجودگی کو صفحۂ ہستی سے معدوم کرنے کے ذرائع تھے۔ 1940ء میں ویٹز کیا سوچتا تھا، اس کی ایک جھلک میں پہلے پیش کر چکا ہوں۔ یہاں اس کی کتاب کا ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔ اس اقتباس میں وہ اس گفتگو کو پیش کر رہا ہے جو 18 مئی 1948ء کو اس کے اور اسرائیلی وزارتِ خارجہ کے ایک اہل کار موشے شرتوک (بعد ازاں اس نے اپنا نام موشے شیرت رکھ لیا تھا) کے مابین ہوئی۔

کیا ہمیں کوئی ایسی کارروائی کرنا چاہیے تاکہ ملک سے عربوں کا خروج ایک حقیقت میں تبدیل ہو جائے اور وہ کبھی بھی یہاں دوبارہ واپس نہ آسکیں۔

شرتوک: اس ضمن میں جو بھی پہل ہو گی، اسے میری اشیر باد حاصل ہو گی۔ میرا خیال یہ بھی ہے کہ ہمیں اس طریقے سے کارروائی کرنا چاہیے کہ عربوں کا خروج ایک مسلمہ حقیقت میں تبدیل ہو جائے۔ [3]

---

[1] ملاحظہ فرمائیں ایونیری کی تصنیف: Israel Without Zionism

[2] یہاں مصنف اس جنگ کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو قیامِ اسرائیل کے بعد 1948ء میں یہودیوں اور عربوں کے مابین ہوئی تھی۔

[3] ویٹز: مائی ڈائری، جلد سوم، صفحہ نمبر 293

بعدازاں اسی سال ویٹز نے ایک عرب گاؤں کا، جو خالی ہو چکا تھا، دورہ کیا۔ اس نے جو کچھ وہاں دیکھا اس کے متعلق وہ اپنے تاثرات اور خیالات کا اظہار یوں کرتا ہے:

میں ''معار'' گاؤں گیا۔ ٹریکٹر اس کو نیست و نابود کرنے کی کارروائی مکمل کر رہے تھے۔ اس تباہی و بربادی کو دیکھ کر مجھے نہ تو حیرت ہوئی اور نہ میں اس سے ذرہ برابر متاثر ہوا۔ میرے دل میں نہ تو کوئی تاسف تھا اور نہ نفرت بلکہ میں نے سوچا کہ دُنیا کا دستور بس یہی ہے، ہم اسی دُنیا کے مزے لوٹنا چاہتے ہیں، نہ کہ کسی آنے والی دُنیا کے۔ ہم تو یہاں محض رہائش اختیار کرنا چاہتے ہیں اور اس بستی کے کچے مکانوں کے مکین قطعاً یہ نہیں چاہتے تھے کہ ہم یہاں زندہ رہیں۔ وہ نہ صرف ہم پر تسلط و تغلب حاصل کرنے کے آرزومند ہیں بلکہ وہ ہمیں صفحۂ ہستی سے بھی مٹا دینا چاہتے ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ آپ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلے جائیں۔ ہر جگہ ہمارے بچے بچے کی زبان پر یہی الفاظ ہوں گے۔ ①

وہ ان واقعات کا ذکر تو کرتا ہے جو فلسطین کے چپے چپے پر رونما ہوئے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس حقیقت کا ادراک کرنے میں ناکام رہا کہ اس بدنصیب گاؤں میں ذی روح انسان...... مانا کہ وہ بہت مسکین، عاجز اور غریب تھے...... فی الواقع رہائش پذیر تھے اور یہ بدنصیب گاؤں ان کے لیے کچھ معانی رکھتا تھا۔ ویٹز دیہاتیوں کی حقیقت تسلیم کرنے سے تو انکار نہیں کرتا، اس کی کوشش بس یہ ہے کہ وہ یہ ثابت کر دے کہ ان (دیہاتیوں) کی تباہی و بربادی کے معانی صرف اتنے سے ہیں کہ یہاں اب ''ہم'' رہائش پذیر ہو سکتے ہیں۔ اسے اس خیال سے ذرا بھی وحشت نہیں ہوتی کہ مقامی فلسطینیوں کے نزدیک وہ محض ایک اجنبی پردیسی ہے جو انھیں اکھاڑنے یہاں چلا آیا ہے۔ وہ یہ بھی نہیں سوچتا کہ اگر کوئی شخص مقامی باشندوں کو اکھاڑنے کی کوشش کرے گا، تو ان کا اس کی اس کوشش کی مخالفت کرنا ایک بالکل فطری بات ہے۔ اس کی بجائے وہ اور اس کے ''بچے'' نہایت ڈھٹائی سے یہ مؤقف اختیار کر لیتے ہیں کہ فلسطینی ''ہمیں نیست و نابود کر دینا چاہتے تھے۔'' ...... اور اس مؤقف نے گویا انھیں یہ کھلی چھٹی دے دی ہے کہ وہ جس طرح چاہیں، مکانوں اور دیہاتوں کی اینٹ سے اینٹ بجاتے پھریں، (اور ان سے کوئی نہیں پوچھے گا کہ تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟ اور واقعتاً پوچھا بھی کس نے ہے؟) کئی دہائیوں تک عربوں کے ساتھ اس قسم کا سلوک کرنے کے بعد گویا کہ وہ وہاں موجود ہی نہیں تھے، صیہونیت نے اپنا اصلی چہرہ دکھانا شروع کر دیا اور نہایت جوش و خروش کے ساتھ جس قدر ممکن ہوا،

---

① ویٹز: مائی ڈائری، جلد سوم صفحہ نمبر 293

عربوں کے آثار مٹانے کے کام کا آغاز کر دیا۔ فلسطینی عرب پہلے نظری طور پر لاشے (non-entity) تھے، اب انھیں قانونی طور پر بھی لاشے قرار دے دیا گیا۔ پہلے بھی ان کی حالت قابلِ رحم تھی اور تبدیلی کے بعد بھی ان کی حالت قابلِ رحم ہی رہی۔ فلسطین میں وہ اپنے اعدام کا تماشا اپنی آنکھوں سے ضرور دیکھ رہے تھے۔ لیکن وہ اس کا مؤثر انداز سے ابلاغ نہیں کر پا رہے تھے۔

پہلے تو ایک فلسطینی باشندے کو ایک بے حیثیت اور بے وقعت شخص قرار دیا گیا، پھر وہ ایک غیر حاضر شخص بن گیا۔ پھر 1947ء کے بعد اندرون اسرائیل اسے ایک ایسے شخص کے مقابلے میں، جس کا تعلق ''یہودی قوم'' سے تھا، اس بات سے قطع نظر کہ یہ شخص اسرائیل میں موجود تھا یا نہیں، قانونی اعتبار سے ایک کم حقیقی فرد کا درجہ دیا گیا۔ وہ فلسطینی، جو خوف و ہراس کے عالم میں اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئے تھے ''پناہ گزیں'' کہلائے۔ لفظ ''پناہ گزیں'' محض ایک تجرید ہے۔ اقوامِ متحدہ ہر سال اس پر توجہ بھی دیتی ہے اور ایک قرارداد بھی منظور کر دیتی ہے جس میں اسرائیل سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ...... جیسا کہ اسرائیل نے وعدہ کیا تھا۔ ① ...... وہ ان ''پناہ گزینوں'' کو یا تو واپس لے لے یا پھر ان کے نقصانات کی تلافی کرے، لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات رہتا ہے۔ بچے کچھے فلسطینیوں کے ساتھ اسرائیل نے جو اہانت آمیز برتاؤ کیا ہے، انھیں جن جن ذلتوں سے گزارا ہے اور کسی بھی غیر جانبدارانہ معیار کے مطابق اس نے انھیں محکوم و مطیع رکھنے کے لیے جو غیر اخلاقی حرکات کی ہیں، ان کی فہرست اتنی طویل ہے کہ چنگے بھلے آدمی کا خون کھول اٹھتا ہے لیکن اس وقت تو آدمی کا پارہ اور بھی چڑھ جاتا ہے جب ایک طرف تو وہ اسرائیل کا یہ شرمناک ریکارڈ دیکھتا ہے اور اس کے مقابلے میں وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ اسرائیل جمہوریت کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے جا رہا ہے اور ایک آدھ شخص نہیں بلکہ تقریباً سارا مغرب ہی اس معاملے میں اسرائیل کی مداحی میں سر دھن رہا ہے۔ 1922ء سے 1948ء تک اپنے تسلط کے دور کے دوران میں یہودیوں اور عربوں سے نپٹنے کے لیے برطانیہ نے جن ہنگامی دفاعی قوانین (ایمرجنسی ڈیفنس ریگولیشنز) کا سہارا لیا تھا، اسرائیل نے انھیں من و عن اختیار کر لیا گویا کہ اپنے اس اقدام سے وہ ایک لاکھ بیس ہزار (اور اب ساڑھے چھ لاکھ) بدقسمت عرب باشندوں کو ان کی اس گستاخی کا مزہ چکھانا چاہتا ہو کہ انھوں نے وہاں (فلسطین میں) ہی رہنے کی جرأت کیسے کی۔ انگریزوں کے زمانے میں صیہونی جب سیاسی ہنگامہ آرائی کرتے تھے تو بجا طور پر وہ ان دفاعی قوانین کو اپنی تند و تیز تنقید کا من بھاتا نشانہ بناتے تھے لیکن 1948ء کے بعد خود اسرائیل ان قوانین کو مسلسل عربوں کے خلاف استعمال

---

① ایسا ہی ایک وعدہ بھارت نے کشمیر میں رائے شماری کرانے کے متعلق بھی کیا تھا۔

کر رہا ہے اور اس نے ان میں ایک نکتے کی ترمیم بھی نہیں کی۔

مثلاً اسرائیل کے ان علاقوں کو جہاں ابھی تک عرب اکثریت میں ہیں، ''یہودی رنگ میں رنگنے'' کے لیے ایک ایسی پالیسی پر عمل کیا جا رہا ہے جو بظاہر تو گئے زمانے کی چیز[1] معلوم ہوتی ہے لیکن وہ کس طرح بھی کم تفصیلی اور کم موثر نہیں ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، صیہونیت کے ابتدائی ایام میں روپال اور ویزمان نے یہ پیش گوئی کی تھی کہ ایک دن وہ آئے گا جب تل ابیب عرب جافہ پر سبقت لے جائے گا اور اس سے بہت آگے نکل جائے گا۔ بعینہٖ آج کی اسرائیلی حکومت ایک نئے الناصرہ کی تخلیق و تعمیر میں مصروف ہے جو قدیم عرب قصبے پر ''سبقت لے جائے گا اور اس سے کہیں آگے نکل جائے گا۔'' یہ منصوبہ کیا ہے؟ اس پر ایک اسرائیلی نے 1975ء میں بدیں الفاظ روشنی ڈالی تھی:

> بالائی الناصرہ جو تقریباً پندرہ سال قبل ''اس لیے تخلیق کیا گیا تھا تاکہ وہ عرب الناصرہ کی کاٹ کر سکے۔'' الجلیل کے خطے کو ''یہودی رنگ میں رنگنے'' کی پالیسی کا بنیادی ستون ہے۔ بالائی الناصرہ اس لیے ان پہاڑوں پر تعمیر کیا گیا ہے۔ جنھوں نے قدیم الناصرہ کو تقریباً چاروں طرف سے محصور کر رکھا ہے، تاکہ وہ اس کے اردگرد سلامتی کا ایک حصار بن سکے۔ اس کی تعمیر ہزاروں ایکڑ پر مشتمل اس اراضی پر ہوئی جو عرب بستیوں، بالخصوص قدیم الناصرہ اور رعنا کے قصبوں کے مکینوں سے بزورِ شمشیر ہتھیائی گئی تھی۔ ''بالائی'' الناصرہ کے نام کا محض انتخاب ہی (یہاں زور لفظ ''بالائی'' پر ہے،) اس رویے کی نشاندہی کرتا ہے جو حکام نے اختیار کر رکھا ہے۔ وہ جدید شہر کو ہر قسم کی سہولیات اور مراعات سے نوازتے ہیں اور انھوں نے پرانے شہر کو قطعاً نظر انداز کر رکھا ہے۔ انھوں نے (یہودیوں اور عربوں کے مابین) امتیازات برتنے کی جو پالیسی اپنا کر رکھی ہے۔ اس سے وہ یہاں سرِ مو انحراف نہیں کرتے۔ قدیم الناصرہ کے متعلق وہ جو بے اعتنائی برتتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اسے ایک اسفل ترین چیز سمجھتے ہیں۔ قدیم الناصرہ کی ترقی کے سلسلے میں جس لاپروائی اور غفلت کا مظاہرہ کیا گیا ہے ہر سیاح اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کر سکتا ہے اور وہ یہ تسلیم کرے گا کہ واقعی یہاں کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ لیکن یہی سیاح

---

[1] یہاں مصنف نے انگریزی زبان کا لفظ Anachoronistic استعمال کیا ہے جو Anachoronism سے مشتق ہے۔ موخر الذکر لفظ ایک ایسی چیز کی نمائندگی کرتا ہے جو تاریخی اعتبار سے اپنے صحیح یا مناسب وقت پر وجود میں آنے یا پیش آنے کی بجائے کسی دوسرے وقت پر وجود میں آ جائے یا پیش آ جائے۔

جب بالائی الناصرہ جائے گا تو وہاں اسے نئی تعمیرات، وسیع وعریض شاہراہیں، سڑکوں اور گلیوں میں روشنیاں، سیڑھیاں، کثیر المنازل عمارتیں، صنعتی کارخانے، کاریگروں کی ورکشاپیں، غرضیکہ سبھی کچھ نظر آئے گا اور یوں ان دونوں شہروں کے مابین جو تضاد پایا جاتا ہے، وہ واضح طور پر اسے دکھائی دے گا۔ ''اوپر'' ترقی اور ''نیچے'' اعتنا اور ذمہ داری کا فقدان۔ ''اوپر'' سرکاری طور پر ہمہ قسم کی تعمیرات کا کام ہو رہا ہے اور ''نیچے'' تعمیرات نام کی کوئی چیز بھی نہیں پائی جاتی۔ 1966ء سے (اسرائیلی) وزارتِ تعمیرات (ہاؤسنگ) نے قدیم الناصرہ میں ایک بھی رہائشی مکان تعمیر نہیں کیا۔ (جوزف الغازی، روزنامہ جوحدارث، مؤرخہ 30 جون 1975ء)

حکمران اقلیت کا ڈراما نہایت واضح انداز سے الناصرہ میں جاری ہے۔ بالائی...... یعنی کہ یہودی...... الناصرہ کے سولہ ہزار مکینوں کو زندگی کی تمام سہولیات اور فوائد میسر ہیں۔ زیریں الناصرہ کے پینتالیس ہزار عرب باشندے ہلاکت وزبوں حالی کی منہ بولتی تصویر ہیں۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ یہودی شہر یہودیوں کے لیے مخصوص وسائل سے پوری طرح مستفید ہو رہے ہیں۔ غیر یہودیوں کو چن چن کر ان فوائد سے محروم رکھا جا رہا ہے۔ ان کے اور یہودیوں کے مابین جو اختلاف پیدا ہو گیا ہے، صیہونی اس بات پر تلے ہوئے ہیں کہ اسے دونوں فرقوں کے مابین ایک مکمل اختلاف بنا کر پیش کیا جائے نہ کہ محض درجے کا اختلاف۔ اسرائیل کا ہر یہودی ''پوری یہودی قوم'' کی نمائندگی کرتا ہے...... یہ ''یہودی قوم'' کیا ہے، اس میں نہ صرف وہ یہودی شامل ہیں جو اس وقت اسرائیل میں موجود ہیں بلکہ اس میں یہودیوں کی وہ نسلیں بھی شامل ہیں جو کبھی روئے زمین پر موجود تھیں (جن کے موجودہ یہودی بچے کھچے آثار ہیں) اور وہ بھی جو آئندہ موجود ہوں گی۔ پھر وہ یہودی بھی جو دُنیا کے دوسرے خطوں اور ممالک میں آباد ہیں، اسی قوم کا ایک جزو ہیں...... اس کے برعکس اسرائیل میں ایک غیر یہودی شخص ایک ایسی چیز کی نمائندگی کرتا ہے جسے نہ صرف اسرائیل میں اپنے بلکہ ماضی حال اور مستقبل کے ان دیگر فوائد سے بھی جو اسے فلسطین میں (بشرطیکہ وہ قائم رہتا) حاصل ہو سکتے تھے، مستقلاً محروم کر دیا گیا ہے کیونکہ اس فلسطین سے اسے ہمیشہ کے لیے دیس نکالا دے دیا گیا ہے۔ اسرائیل کے غیر یہودی جو دیہاتوں میں رہائش پذیر ہیں، ایک قسم کی تشنہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ عرب دیہاتوں میں نہ کتب خانے ہیں اور نہ یوتھ سنٹر، نہ تھیٹر ہیں اور نہ ثقافتی مراکز۔ الناصرہ کے عرب میئر کے بقول، جسے اسرائیل میں ایسا فقید المثال اختیار حاصل ہے، جس سے عام طور پر فلسطین میں غیر یہودی محروم ہیں، عرب دیہاتوں میں بجلی، ٹیلی فون، صحت کے مراکز، سبھی کچھ عنقا ہے۔ الناصرہ کے علاوہ کہیں بھی نکاسی آب کی سہولتیں موجود نہیں ہیں اور الناصرہ میں بھی یہ سہولتیں صرف جزوی طور پر میسر ہیں۔ ایک بھی گاؤں میں نہ پختہ سڑکیں ہیں

اور نہ پختہ گلیاں، وجہ؟ یہودیوں کو زیادہ سے زیادہ سہولتوں سے، جو ایک مملکت اپنے شہریوں کو فراہم کرسکتی ہے، متمتع ہونے کا حق حاصل ہے جب کہ غیر یہودیوں کو کم سے کم پر ٹرخا دیا جاتا ہے۔ اسرائیل میں عرب کارکنوں کی کل تعداد اسّی ہزار ہے، ان میں سے ساٹھ ہزار ان منصوبوں پر کام کرتے ہیں جن کا انتظام و انصرام یہودیوں کے قبضے میں ہے۔ ''ان کارکنوں کے نزدیک خود اپنے قصبوں اور دیہات کی کوئی اہمیت نہیں سوائے اس کے کہ وہاں وہ رہائش پذیر ہیں۔ ان کی واحد صنعت جو خوب فروغ پا رہی ہے، وہ افرادی قوت کی تولید اور فراہمی ہے۔''[1] پھر یہ افرادی قوت بھی کچھ اس قسم کی ہے کہ نہ تو اس کی کوئی سیاسی اہمیت ہے اور نہ اس کے پاس کوئی ایسا علاقہ ہے جسے وہ اپنا کہہ سکے اور جس میں وہ اپنی جڑیں استوار کرسکے۔ یہ افرادی قوت تو اپنے ثقافتی تسلسل سے بھی محروم ہو چکی ہے۔ 1948ء کے بعد اگر کسی غیر یہودی نے اتنی جرأت دکھا دی کہ وہ نئی یہودی مملکت میں ٹکا رہا تو اس کا اسے یہ خمیازہ بھگتنا پڑا کہ اب وہ صرف اتنی ہی روزی کما سکتا ہے جس سے وہ بمشکل جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھ سکتا ہے۔ وہ قطعی طور پر اتنا بے دست و پا ہو چکا ہے کہ کچھ بھی تو نہیں کرسکتا۔ البتہ وہ کچھ کرنے پر قادر ہے، وہ صرف یہ ہے کہ اپنے جیسے انسانوں کو جنم دیتا رہے اور اپنی نامختتم غربت و نکبت ان تک منتقل کرتا رہے۔

1966ء تک اسرائیل کے عرب شہریوں پر فوجی حکومت کا حکم چلتا رہا۔ یہ فوجی حکومت محض اس لیے موجود تھی تا کہ مہد سے لحد تک عملاً عربوں کی زندگی کے ہر پہلو پر تسلط قائم کیا جاسکے، ان کا سر خم کیا جاسکے، ان کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا جاسکے، انھیں ہراساں کیا جاسکے، غرضیکہ وہ کسی اعتبار سے بھی پنجۂ یہود سے نکل نہ سکیں۔ جیسا کہ عوام کے ہنگاموں اور مظاہروں سے، جو ختم ہونے کا نام نہیں لیتے۔ عیاں ہے کہ 1966ء کے بعد بھی حالات میں کوئی خاص تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ عربوں کی ہزار ایکڑ زمین کو ہتھیانے کے لیے ہنگامی دفاعی قوانین کا سہارا لیا گیا۔ اس مقصد کے لیے طرح طرح کے بہانے تراشے گئے۔ کبھی کہا گیا کہ یہ اراضی سلامتی کے منطقے (سکیورٹی زون) میں واقع ہے (اس لیے دفاعی نقطۂ نظر سے اس پر سرکاری قبضہ کرنا ضروری ہے۔) کبھی کہا گیا کہ ان کے مالک غیر حاضر ہیں (اس لیے حکومت ان کی اراضی کو اپنی تحویل میں لے سکتی تھی۔ کئی معاملات میں تو بہت مضحکہ خیز صورت پیدا ہوگئی، اراضی کے اصل مالک موجود تھے لیکن ان کی کوئی شنوائی نہ ہوئی اور قانونی موشگافیوں کے ذریعے انھیں خواہ مخواہ غیر حاضر قرار دے دیا گیا۔) کسی

---

① توفیق زیاد Fate of the Arabs in Israel مضمون: جرنل آف پیلسٹائن سٹڈیز کی جلد ششم، شمارہ نمبر 1 (خزاں 1976ء) کے صفحات 99-98 پر شائع ہوا۔

فلسطینی سے پوچھ لیں۔ وہ آپ کو بتائے گا کہ غیر حاضر مالکوں کی جائداد کا قانون مجریہ 1950ء قانون حصولِ جائداد بوقت ہنگامی صورت حال مجریہ 1949ء قبضہ وتصرف کے ذریعے حق کا قانون مجریہ 1958ء اور قانون حصولِ اراضی مجریہ 1953ء کے معانی کیا ہیں۔ مزید برآں عربوں پر پابندیاں لگا دی گئیں اور ابھی تک وہ ان پابندیوں کے نخچیر چلے آ رہے ہیں کہ وہ اندرون اور بیرون ملک آزاد سفر نہیں کر سکتے، یہودیوں سے اراضی پٹے پر حاصل نہیں کر سکتے، ایجی ٹیشن نہیں کر سکتے اور اپنی مرضی کی تعلیم نہیں پا سکتے۔ آپ کو ایسی مثالیں آسانی سے مل جائیں گی کہ اچانک دیہات پر کرفیو نافذ کر دیا گیا اور ستم بالائے ستم یہ کہ جب کھیت مزدوروں کے لیے یہ معلوم کرنا کہ ان کے گاؤں یا گاؤں پر کرفیو لگا دیا گیا ہے، بظاہر ناممکن تھا، ''مجرم'' کسانوں کو موقع پر ہی گولیوں سے بھون دیا گیا۔ اس ضمن میں ایک انتہائی گھناؤنا اور سفاک واقعہ، جس میں جان بوجھ کر درندہ صفتی سے کام لیا گیا، اکتوبر 1956ء میں ایک گاؤں ''کفر قاسم'' میں پیش آیا۔ اس واقعہ کے دوران میں سرحدی دستوں نے، جو اسرائیلی فوج کے خصوصی استعداد کے حامل سیکشن پر مشتمل تھے، غیر مسلح اشخاص کو نہایت شقاوت اور بے رحمی کے ساتھ گولیوں کا نشانہ بنا ڈالا۔ جب اسرائیلی حکومت کو احساس ہوا کہ اس واقعے سے اس کو رسوائی کا خطرہ ہے، تو جس افسر کے ذمے یہ کارروائی لگائی گئی تھی، خانہ پُری کے طور پر اس پر مقدمہ چلایا گیا، اسے مجرم بھی قرار دے دیا گیا لیکن سزا؟ اسے ایک پیاسٹر (1) جرمانہ کیا گیا۔

جب 1967ء کی جنگ کے دوران میں اسرائیل نے مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی پر قبضہ کیا تو تقریباً دس لاکھ مزید عرب باشندے اس کی رعایا بن گئے۔ یہاں بھی اس کا ریکارڈ کوئی بہتر نہیں لیکن یہ کوئی تعجب خیز بات بھی نہیں۔ (2) مقبوضہ عرب علاقوں میں جو کچھ پیش آ رہا ہے، اس سے اگر آپ متعارف ہونا چاہتے ہیں تو

---

(1) پیاسٹر ایک اسرائیلی سکہ ہے۔ اس کی مالیت ایک امریکی سینٹ (تقریباً اٹھارہ بیس پیسے) سے بھی کم ہے۔

(2) اس کے باوجود ''نیو یارک ٹائمز'' نے 19 مئی 1976ء کو اپنے ایک اداریے میں تحریر کیا کہ مغربی کنارے اور غزہ پر اسرائیلی قبضے کو دونوں قوموں کے مابین ''آئندہ تعاون کے لیے ایک نمونہ'' قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسرائیلی جس طرح عربوں کے مکانات کو مسمار کرتے ہیں، انھیں اذیتیں دیتے ہیں، ملک سے باہر نکال دیتے ہیں، انھیں قتل اور ہلاک کرتے ہیں، مقدمہ چلائے بغیر انتظامی حکم کے تحت نظر بند کرتے ہیں، ان سب باتوں کی ایمنسٹی انٹرنیشنل اور ریڈ کراس نے ہی مذمت نہیں کی بلکہ انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے متعلق خود امریکا کے محکمۂ خارجہ نے 1978ء میں جو رپورٹ شائع کی تھی، اس میں بھی ان پر تنقید کی گئی تھی۔ اس کے باوجود جبر وتشدد ہے کہ رُکنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ بھونڈے اور غیر شائستہ طریقوں سے جن میں کچھ کا میں نے ذکر کیا ہے اور کچھ کا نہیں، سفاکانہ کارروائیاں مسلسل جاری ہیں۔ اجتماعی سزائیں اور جرمانے روزمرہ کا معمول ہیں، 1929ء میں رام اللہ کے فوجی گورنر نے شہریوں کو یہ سزا دی کہ گوشت کی فروخت ہی بند کر دی۔ 1970ء میں جب انگوروں کا موسم آیا تو ان کے.....

اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان اسرائیلی عربوں کی شہادتوں کا مطالعہ فرمائیں جنھیں 1967ء سے قبل اسرائیل کی قانونی سفاکیوں سے واسطہ پڑا اور یوں مصائب جھیلنے پڑے۔ مثال کے طور پر آپ مندرجہ ذیل کتابیں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

1۔ ''اسرائیل کے عرب''① از صابری حریس

2۔ ''اسرائیل میں بحیثیت عرب رہنما''② از فوزی الاثمار

3۔ ''اسرائیل کے فلسطینی: داخلی نوآبادیات کا مطالعہ''③ از ایلیاٹی زُریک

اسرائیل کا سیاسی ہدف یہ ہے کہ اس کی سرزمین پر جو عرب آباد ہیں، وہ پُرامن رہیں۔ وہ کبھی یہ نہیں چاہے گا کہ اسے ان پر تواتر سے جو تسلط و تغلب حاصل ہے، وہ کبھی اس سے چھٹکارا پانے میں کامیاب ہو جائیں۔ جب کوئی (فلسطینی) قوم پرست اپنا قدوقامت قدرے بڑھا لیتا ہے تو اسے یا تو جلا وطن کر دیا جاتا ہے۔④ یا پھر (مقدمہ چلائے بغیر) اسے حوالۂ زندان کر دیا جاتا ہے، یا پھر وہ نظروں سے ہی اوجھل ہو جاتا ہے۔ قوم پرست مجرموں کو سبق سکھانے کے لیے اسرائیلی فوج ان کے گھروں کو بم برسا کر منہدم کر دیتی ہے (اس طرح جن مکانوں کو مسمار کیا گیا۔ 1980ء تک ان کی تعداد سترہ ہزار تک پہنچ چکی تھی) خواہ عرب خود کچھ لکھیں یا کوئی دوسرا ان کے متعلق کچھ تحریر کرے، دونوں سنسر شپ کی زد میں آ جاتے ہیں۔ ہر عرب براہِ راست فوجی ضوابط کے تابع ہے۔ جبر و تشدد کی پردہ پوشی کرنے اور اسے اسرائیلی شعور کے سکون میں خلل ڈالنے سے روکنے کی غرض سے ایسے اسرائیلی یہودیوں کی ایک پوری جماعت وجود میں آ گئی ہے جو اپنے آپ کو عرب امور کے ماہر گردانتے ہیں اور جو یہ دعویٰ کرتے نہیں تھکتے کہ ''ہم عرب ذہنیت'' کو خوب سمجھتے ہیں۔ ایسے ہی ایک ماہر کا ''اسم گرامی'' ایمنون لن ہے۔ اس نے 1968ء میں تحریر کیا کہ لوگ ہم پر اعتبار کرتے تھے اور انھوں نے ہمیں عمل کی وہ آزادی دی جو ملک کے کسی بھی دوسرے گروپ کو کسی میدان میں

...... چننے اور فروخت کرنے کی ممانعت کر دی گئی اور یہ پابندی اس وقت تک جاری رہی جب تک رہنماؤں نے تنظیم آزادی فلسطین کی علانیہ مذمت نہیں کی۔ 1978ء میں نبلوس پر اس لیے سات دن تک کرفیو نافذ رہا کیونکہ شہریوں نے پولیس کے ساتھ تعاون نہیں کیا تھا۔ (مصنف)

① The Arabs in Israel

② To Be An Arab in Israel

③ The Palestinians in Israel: A study in Internal Colonialism

④ نبلوس اور بعض دوسرے شہروں کے میئروں کے ساتھ یہی کچھ ہوا۔

حاصل نہیں ہوسکی۔" چنانچہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ہمیں مملکت میں ماہرین کی حیثیت سے ایک فقید المثال مقام حاصل ہوگیا ہے اور کسی شخص میں اتنی جرأت نہیں کہ وہ ہماری آرا یا ہمارے افعال کو جھٹلا سکے، حکومت کے تمام اداروں، ہستادروت ① اور سیاسی جماعتوں میں ہمیں نمائندگی حاصل ہے۔ حکومت کے ہر محکمے، ہر شعبے اور ہر دفتر میں عرب امور کے ماہرین موجود ہیں اور یہی وہ ماہرین ہیں جو عربوں کے مابین اپنے وزیر کی طرف سے کوئی کارروائی کرنے کے مجاز ہیں۔ ②

یہ "نیم حکومت" خصوصی مہارت کے پردے میں عربوں کے رویوں کی تشریح کرتی ہے، ان پر حکم چلاتی ہے اور جیسا کہ میں باب اول میں تحریر کر چکا ہوں، ان لبرل امریکیوں کو، جو اسرائیل کی سیاحت پر آئے ہوتے ہیں اور جھونگے کے طور پر عربوں کے متعلق بھی کچھ جاننے کے خواہش مند ہوتے ہیں، انھیں یہی نام نہاد ماہر مناسب آرائشی تصویر تھما دیتے ہیں۔ ③ دریں اثنا مقبوضہ عرب علاقوں میں اسرائیلی بستیوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے (1967ء اور 1980ء کے دوران میں ایسی نوے بستیاں تعمیر ہو چکی تھیں۔) 1967ء کے بعد بھی نو آبادیاں تعمیر کرنے کے لیے اسی منطق کا سہارا لیا جارہا ہے جس کا 1948ء سے قبل لیا جاتا تھا۔ نتیجہ؟ عرب اب بھی اسی طرح اپنی جائدادوں اور گھروں سے بے دخل ہو رہے ہیں، جیسے پہلے ہوتے تھے۔ ④

---

① ہستادروت: اسرائیل کے مزدوروں کی فیڈریشن، اس کا قیام 1962ء میں عمل میں آیا۔ اسرائیل کے نوے فیصد کسان، مزدور اور دکاندار کسی نہ کسی اعتبار سے اس فیڈریشن سے منسلک ہیں۔ 1948ء میں اسرائیل کی لیبر پارٹی اسی جماعت کے بل بوتے پر برسرِ اقتدار آئی تھی۔

② جریس نے اپنی کتاب The Arabs Israel کے صفحہ نمبر 70 پر اس کا حوالہ دیا ہے۔

③ ملاحظہ فرمائیں سال بیلو کی کتاب To Jerusalem and Back مطبوعہ وائی کنگ پریس، نیو یارک، سال اشاعت: 1976ء صفحات نمبر 61-152

④ جان کولی (Cooley) نے امریکا کے روزنامہ "کرسچین سائنس مانیٹر" کے 25 جولائی 1978ء کے شمارے میں اپنے مضمون Settlement Drive Lies Behind Israeli Notes میں یہ بات واضح کردی ہے کہ اسرائیل کا سرکاری منصوبہ یہ ہے کہ مغربی کنارے پر اتنے یہودی آباد کر دیے جائیں کہ 2000ء تک وہاں انھیں اکثریت (ساڑھے بارہ لاکھ) حاصل ہوجائے اور مقبوضہ سینائی کے قصبے "یامیط" کو ترقی دے کر اسرائیل کا ایک بڑا شہر بنا دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے وہاں تعمیرات کا کام زور شور سے جاری ہے۔ "جیوش ایجنسی" کے چیئرمین ارائی ڈوزمین کے بقول صیہونی یہ چاہتے ہیں کہ یامیط پر ہمیشہ یہودی حاکمیت قائم رہنا چاہیے کیونکہ "صیہونی ایگزیکٹو نے 1903ء میں یہی پیش گوئی کی تھی۔ اسرائیل مغربی کنارے اور یامیط میں جن یہودیوں کو بسانا چاہتا ہے۔ ان میں بیشتر جنوبی افریقہ، امریکا اور روس سے آئیں گے (اسرائیل کی حکومت فوجی اور ایٹمی شعبوں میں جنوبی افریقہ کی حکومت کے ساتھ جو تعاون کر رہی ہے اور اس نے وہاں کے سزا یافتہ نازی وزیر اعظم جان فارسٹر کے ساتھ جو دوستانہ مراسم قائم کر رکھے ہیں، ان کے پیچھے یہی اغراض کام کر رہی ہیں۔) (مصنف)

صیہونیت اور اسرائیل یہودیوں کے لیے بھی ہے اور صیہونیت اور اسرائیل غیر یہودیوں کے لیے بھی۔ صیہونیت نے یہودیوں اور غیر یہودیوں کے مابین ایک واضح لکیر کھینچ رکھی ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ تھلگ رکھنے کے لیے اسرائیل نے ایک مکمل نظام وضع کیا۔ اس نظام میں اجتماعی کاشت کا نظام (Kibbutzim) بھی شامل ہے جس کی تحسین و تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے جاتے ہیں (لیکن حقیقتاً جس کی اساس خالص نسل پرستی کے جذبات پر استوار ہے۔) آج تک ایک بھی عرب باشندہ اس کا رکن نہیں بن سکا۔ عملی طور پر عربوں پر ایک بالکل علیحدہ حکومت کا حکم چلتا ہے۔ اس حکومت کی اساس اس مقدمے پر قائم کی گئی ہے کہ یہودیوں اور غیر یہودیوں کے لیے ایک ایسی حکومت کا قیام، جو دونوں کو مساوی معاشی اور سیاسی حقوق (Isonomic Rule) کی ضمانت دے، ناممکنات میں سے ہے۔ اس انتہا پسندانہ تصور کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ عرب اپنے چھوٹے چھوٹے جزیروں میں مقید ہو گئے ہیں۔ ان کے لیے یہ بات بالکل فطری ہے کہ اپنے محدود اور باقی دُنیا سے کٹے ہوئے علاقوں میں وہ اپنے ہی اندر کی زندگی بسر کریں۔ اپنی صوابدید کے مطابق اس کی نُمو کریں، اس کی تفصیلات طے کریں اور خود ہی یہ فیصلہ کریں کہ غلط کیا ہے اور صحیح کیا ہے۔ یوری ایونیری نے اسرائیلی پارلیمنٹ [1] کے سامنے اس صورتِ حال کو یوں پیش کیا:

> عرب خطے میں ایک نئی حکومت......ایک خفیہ حکومت جس کے قیام کی قانونی طور پر کوئی منظوری نہیں دی گئی تھی، وجود میں لائی گئی۔ کوئی نہیں جانتا کہ اس (حکومت) کے ارکان کون ہیں اور اس کے (کام کرنے کے) طریقے کیا ہیں......اس کے ایجنٹ شعبہ انتظامی امور برائے اراضیات سے لے کر وزارتِ تعلیم اور وزارتِ مذاہب تک اسرائیل کے تمام سرکاری اداروں اور وزارتوں میں گھسے ہوئے ہیں۔ یہ حکومت ان عربوں کے متعلق، جو غیر معروف بستیوں میں رہتے ہیں، نہایت دور رس اور اہم فیصلے کرتی ہے۔ یہ فیصلے ان عربوں کی زندگیوں پر بری طرح اثر انداز ہوتے ہیں لیکن ان فیصلوں کو نہ ضبطِ تحریر میں لایا جاتا ہے اور نہ ان کا کوئی ریکارڈ رکھا جاتا ہے بلکہ ان فیصلوں کو خفیہ گفتگوؤں یا ٹیلیفون کے ذریعے (متعلقہ اشخاص تک) پہنچایا جاتا ہے۔ یہ ہے وہ طریقہ جو اس قسم کے فیصلے کرنے کے لیے اختیار کیا جاتا ہے کہ اساتذہ کے سیمینار میں کون شریک ہوگا۔ ٹریکٹر کسے ملے گا، کس سرکاری عہدہ پر کس کا تقرر ہوگا، امدادی رقم (سب سڈی) کسے فراہم کی جائے گی، اسرائیلی پارلیمنٹ یا مقامی بلدیاتی ادارے کا، اگر اس

---

(1) اسرائیلی پارلیمنٹ کو انگریزی میں Knesset کہتے ہیں جو بذاتِ خود عبرانی لفظ ''کنیست'' (اجتماع، مجلس) سے مشتق ہے۔

قسم کا کوئی ادارہ موجود ہے، رکن کے منتخب کیا جائے گا۔'' اس قسم کی ایک ہزار ایک وجہ گنوائی جاسکتی ہیں۔ ①

اسرائیل نے اپنے عرب باشندوں کے لیے جس قسم کی حکومت قائم کر رکھی ہے اور وہ جس طریقے سے کام کر رہی ہے، اس کے متعلق بعض اوقات چوکس اور ہوشیار مبصروں کو غیر ارادی طور پر ایسی باتیں بھی بتادی جاتی ہیں جو ان دونوں کی قلعی کھول دیتی ہیں۔ اس قسم کی بے احتیاطی اور غفلت کی ایک انتہائی مثال وہ رپورٹ پیش کرتی ہے جو ضلع شمالی الجلیل کے کمشنر نے اس زمانے کے وزیر اعظم تیز حاک رابن کے لیے اس بارے میں تحریر کی تھی کہ ''اسرائیل میں عربوں کے ساتھ کیسے نپٹا جاسکتا ہے (بعد میں یہ رپورٹ ایک جریدے ''الھمیش مار'' کو چوری چھپے فراہم کردی گئی اور اس نے 7 ستمبر 1967ء کو اسے شائع بھی کر دیا۔) اس رپورٹ میں جو مواد پیش کیا گیا ہے، اس کو پڑھ کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، تاہم یہ مواد ان مفروضات کی، جو صیہونیوں نے اپنے غیر یہودی نخچیروں کے متعلق قائم کر رکھے تھے، تکمیل کرتا ہے۔ کمشنر کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر یہ اعتراف کرتا ہے کہ عربوں نے افزائش آبادی کا مسئلہ کھڑا کر رکھا ہے کیونکہ یہودیوں کے برعکس، جن کی فطری افزائش ڈیڑھ فیصد سالانہ ہے، عربوں کی تعداد میں سالانہ 5.9 فیصد کے حساب سے اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ وہ یہ مفروضہ بھی قائم کرتا ہے کہ اگرچہ عرب فطری طور پر قومی بے چینی کا شکار ہوسکتے ہیں۔ ان کے متعلق قومی پالیسی یہی ہونی چاہیے کہ انھیں سماجی اور معاشی اعتبار سے کمتر حیثیت پر رکھا جائے اور ''ہم'' اسی پالیسی پر عمل کر رہے ہیں۔ تاہم بڑا مسئلہ یہ ہے کہ الجلیل جیسے علاقوں میں عربوں کی آبادی کو، جو بے حد گھنی ہے اور نتیجتاً شورش برپا کرنے کے امکانات کی حامل ہے، کس طرح کم کیا جائے، حدود کے اندر رکھا جائے، کم زور بنایا جائے۔ چنانچہ وہ تجویز کرتا ہے کہ ضروری امر یہ ہے کہ

''ان علاقوں میں جہاں عرب آبادیاں تسلسل کے ساتھ ایک دوسرے سے متصل ہیں، یہودی بستیاں کثیر تعداد میں اور دور دور تک قائم کی جائیں۔ اس امکان کا بھی جائزہ لیا جانا چاہیے کہ جہاں جہاں عرب آبادیوں کا ارتکاز موجود ہے، وہاں اسے کیسے کم سے کم کیا جاسکتا ہے۔ ملک کے شمال مغربی سرحدی علاقوں اور الناصرہ کے خطے کی طرف خاص طور پر توجہ مبذول کی جانا چاہیے۔ اس سلسلے میں اب تک جو معمول کی کارروائیاں کی گئی ہیں، صورتِ حال کا تقاضا یہ ہے کہ مزید کارروائی اس معمول سے ہٹ کر کی جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ سرکاری طور پر ایک

① جریس: ''اسرائیل کے عرب'' صفحہ نمبر 70

قانون نافذ کیا جانا چاہیے جس کے تحت ملک کے مختلف علاقوں میں عربوں کی نئی آبادیاں اور بستیاں بسانے کی تحدید کردی جائے۔''

ان تجاویز کے پیچھے جو نیم فوجی حکمتِ عملی کارفرما ہے، وہ کوئی زیادہ ڈھکی چھپی بات نہیں۔ ہمیں جس بات پر دھیان دینے کی ضرورت ہے، وہ کمشنر کا صیہونی تقاضوں کے متعلق نقطۂ نظر ہے جنھیں وہ بلا چون و چرا تسلیم کرتا ہے اور جن پر وہ عملدرآمد کرنے کی سعی کر رہا ہے۔ اس کی تجاویز واضح طور پر جن نسلی مقاصد کی آبیاری کر رہی ہیں، اپنی رپورٹ میں وہ کہیں بھی یہ عندیہ نہیں دیتا کہ وہ ان پر شرمسار ہے یا اسے ضمیر کی کوئی کسک محسوس ہوئی ہے۔ اسے اس بارے میں قطعی کوئی شبہ نہیں کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے وہ صیہونی پالیسی کی تاریخ کے عین مطابق ہے، جو غیر یہودیوں کے متعلق، جن کی تعداد اگرچہ پریشان کن حد تک بہت زیادہ ہے، لیکن ان کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ یہودیوں کے زیرِ تسلط علاقے میں موجود ہیں، وضع کی گئی تھی۔ چنانچہ وہ...... منطقی طور پر...... دلائل کے انبار لگاتا جاتا ہے کہ جو عرب رہنما کوئی مصیبت کھڑی کرتے نظر آئیں تو ان کی جگہ نئے عرب رہنما ''تخلیق''[1] کیے جائیں'' جو اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں کے مالک ہوں، جو اپنے رویے کے اعتبار سے منصف مزاج ہوں، جن کے اذہان کھلے ہوں، جن کی شخصیتیں کرشمہ ساز ہوں اور وہ لوگوں کو اپنے ساتھ بہالے جانے کا گر جانتے ہوں۔'' اور اسرائیلی حکمرانوں کے لیے سراسر قابلِ قبول ہوں۔ مزید برآں، ان بے چین قوم پرست رہنماؤں کو، جن کا واحد گناہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوسرے مقامی باشندوں کو اپنی کمتری پر جو ان پر زبردستی مسلّط کی گئی ہے۔ پیچ و تاب کھانے کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں، ''تحلیل'' کرنے کے بعد حکومت کو ''ایک خاص ٹیم تشکیل دینا چاہیے...... جو (عرب) رہنماؤں اور دوسرے مقامی باشندوں کے عادات و خصائل کا مطالعہ و معائنہ کرے اور یہ اطلاعات رائے دہندگان تک پہنچائی جانا چاہیے۔''

کمشنر اسرائیل کے عرب باشندوں کی ''تقلیل'' کرنے اور انھیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ وہ ایسے طریقے بھی تجویز کرتا ہے جن کی مدد سے انھیں معاشی اعتبار سے ''اپاہج اور بے اثر'' بنایا جاسکتا ہے اور ''ان کے راستے میں روڑے اٹکائے'' جاسکتے ہیں۔ تاہم ان تجاویز پر اس وقت تک صحیح معنوں میں عمل نہیں ہوسکتا جب تک کوئی ایسا طریقہ وضع نہ کرلیا جائے جس کی مدد سے ''ان بے شمار مایوس اور دل شکستہ دانشوروں کو جن کی ذہنی ضرورت انھیں تسکین ڈھونڈنے پر مجبور کرتی ہے، کسی نہ کسی طرح شہ مات نہیں دی جاتی۔'' کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جو تسکین کی خاطر ملک کے اسرائیلی ڈھانچے کے خلاف

---

① یہ لفظ تقریباً مذہبی لب و لہجہ کا حامل ہے اور عربوں کے متعلق یہودی پالیسی سے عین مطابقت رکھتا ہے۔ (مصنف)

لب کشائی کرتے رہتے ہیں۔'' معلوم ہوتا ہے کہ کمشنر کی سوچ یہ ہے کہ عربوں کو ''مایوس اور دل شکستہ'' رکھنا ایک بالکل فطری امر ہے کیونکہ اس کی تجاویز کا مطالعہ کرنے کے بعد قاری کو یہ قطعاً یاد نہیں رہتا کہ عرب بھی ایک قوم ہیں اور نہ یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کی رپورٹ جنگِ عظیم دوم کے دوران میں کسی نازی نے یہودیوں کے متعلق تحریر نہیں کی بلکہ 1976ء میں ایک یہودی نے اپنے عرب ہم وطنوں کے متعلق سپرد قلم کی ہے۔ کمشنر کے منصوبے کی غضب کی چال (MASTER STROKE) اس وقت سامنے آتی ہے جب وہ اس امر کو زیرِ بحث لاتا ہے کہ عربوں کے پسماندہ ''لیوانتی کردار''① کو خود ان کے خلاف استعمال کرنے کے لیے معاشرتی طور پر کیا زیر وزبر کرنا چاہیے۔ چونکہ اسرائیل کے عرب مراعات سے سراسر محروم طبقہ ہیں، کمشنر یہ چاہتا ہے کہ صورتِ حال کی سنگینی میں مزید اضافہ کر دیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ مندرجہ ذیل اقدامات تجویز کرتا ہے۔

الف: یونیورسٹیوں میں داخلے کے خواہشمند طلبہ کے لیے وہی معیار مقرر کیا جائے جو یہودی طلبہ کے لیے معین ہے۔ تقسیمِ وظائف میں بھی اسی اصول کو مدنظر رکھا جائے۔

ان ضوابط کو من وعن اختیار کرنے اور ان پر سختی سے عمل کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ (طلبہ کا) انتخاب فطری انداز سے ہوگا۔ یوں عرب طلبہ کی تعداد کافی کم ہو جائے گی۔ چنانچہ گھٹیا معیار کے حامل گریجویٹوں کی تعداد بھی بہت تھوڑی رہ جائے گی۔ اس طرح حصول علم کے بعد انھیں مختلف اسامیوں پر کھپانا بھی آسان ہو جائے گا۔②

(ب) طلبہ کی یہ حوصلہ افزائی ہونا چاہیے کہ ان کی زیادہ سے زیادہ تعداد ٹیکنیکل فنون اور طبعی اور فطری علوم کی تعلیم حاصل کرے۔ اس قسم کی تعلیم کے دوران میں قوم پرستانہ تحریکوں میں جھک مارنے کے لیے

---

① وہ ممالک جو بحیرۂ روم کے مشرقی ساحل پر واقع ہیں، انھیں ''لیوانت'' کہا جاتا ہے۔ یہاں غالباً نکتہ یہ ہے کہ یہاں کے لوگ چونکہ یہودی نہیں تھے، اس لیے وہ ان کو غیر مہذب، اجڈ اور گنوار سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ''لیوانت'' نام کا جو چمڑا ہوتا ہے، وہ بہت کھردرا ہوتا ہے اور کتابوں کی جلدیں باندھنے کے کام آتا ہے۔

② یہاں ڈارون کی اصطلاحات اپنے منہ سے آپ بول رہی ہیں (مصنف) ڈارون کے نقطۂ نظر کے مطابق صرف وہی حیوانات اور نباتات زندہ بچ سکتی ہیں جو جہد للبقا میں بہت مضبوط اور توانا ثابت ہوں۔ کمزور اور نااہل ہمیشہ فنا ہو جاتے ہیں۔ یہاں کمشنر یہ کہہ رہا ہے کہ یہودیوں کے مقابلے میں عرب ذہنی اعتبار سے بہت کمتر ہیں اس لیے ان میں سے بہت کم ایسے ہوں گے جو تعلیمی میدان میں یہودیوں کا مقابلہ کر سکیں گے۔ چنانچہ اعلیٰ تعلیم یافتہ عربوں کی تعداد بھی بہت کم رہ جائے گی۔ چنانچہ حکومت انھیں مدد فراہم کر سکے گی اور یوں شاید ان کے خیالات پر پہرے بھی بٹھا سکے گی لیکن جہاں تک عربوں کی بہت بڑی اکثریت کا تعلق ہے وہ اعلیٰ تعلیم سے محروم رہ جانے کے باعث ہمیشہ گھٹیا اور ادنیٰ نوعیت کے کام کرنے پر مجبور ہوں گے اور یوں انھیں ذہنی اعتبار سے خصی بنانے کا عمل یقینی ہو سکے گا۔

وقت نہیں بچتا اور ایسے طلبہ کی تعداد میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے، جو اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ ①

(ج) تحصیل علم کی خاطر غیر ممالک کا سفر آسان تر بنا دیا جائے لیکن واپسی کے عمل کو مشکل کر دیا جائے اور روز گار کے مواقع محدود کر دیے جائیں...... اس پالیسی کا فائدہ یہ ہوگا کہ وہ خود ہی ترکِ وطن پر آمادہ ہو جائیں گے۔

(د) کالجوں اور یونیورسٹیوں کے مختلف مدارج کے طلبہ میں جو شوریدہ سر عناصر (ایجی ٹیٹر) موجود ہیں، ان کے خلاف سخت اقدامات کیے جائیں۔

(ہ) گریجویٹوں کی بیشتر تعداد کو ان کی قابلیت کے مطابق مختلف اسامیوں پر کھپانے کے لیے پیشگی منصوبے بنائے جائیں چونکہ حکام کے پاس اس قسم کے منصوبے بنانے اور اقدامات کرنے کے لیے کافی وقت (کئی سال) ہے، اس لیے اس پالیسی کو عملی جامہ پہنایا جا سکے گا۔

اگر اس قسم کے خیالات کا اظہار سٹالن ② کے پیروکار، آرویل ③ مدرسۂ فکر کے سوشلسٹ یا عرب قوم پرست ہی کرتے تو (مغرب کے) لبرل طبقے وہ شور و غوغا مچاتے کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ تاہم (انھیں) ایک اسرائیلی کمشنر کی تجاویز عام طور پر صحیح اور جائز دکھائی دیتی ہیں کیونکہ یہاں جو منطق کارفرما ہے وہ یہ ہے کہ واقعات و حالات نے مغربی یہودیوں کی ایک مختصر لیکن دلیر و شجیع آبادی کو عربوں کی کثیر اور بے ہنگم آبادی کے، جو ہر دم اپنا رویہ تبدیل کرتی رہتی ہے اور تباہ کن حد تک عقل و دانش سے عاری ہے، بالمقابل لا کھڑا کیا ہے۔ کمشنر کی رپورٹ میں جن باتوں کی نشاندہی کی گئی ہے، ان میں سے ایک بات بھی اس بنیادی ثنویت ④

---

① سائنس اور انسانی اقدار کے مابین عدم موافقت کے متعلق یہودی کمشنر اپنے خیالات میں سی پی سنو (ایک انگریز ناول نگار، جس کا بنیادی فلسفہ ہی یہ ہے کہ سائنس اور انسانی اقدار آپس میں نباہ نہیں کر سکتیں۔ چارلس پر سی سنو کا انتقال 1900ء میں ہوا) سے دو قدم آگے نکل گیا ہے۔ یہ کہ سائنس اور سائنسی علوم کو سیاسی تعزیر کے طور پر بھی استعمال کیا جا سکتا ہے، یہ اس کی نہایت بھیانک اور پُر از خباثت مثال ہے۔ استعمار نے اسے کاہے کو سوچا ہوگا، یہ اس کے لیے بھی بالکل نئی چیز ہوگی۔ (مصنف)

② جوزف سٹالن۔ روس کا مردِ آہن (1879ء۔1953ء) کمیونسٹ نظام میں جو جبر اور سختی پائی جاتی ہے۔ اس کی ذمہ داری زیادہ تر اسی پر ڈالی جاتی ہے۔

③ آرویل George Orwell (1903ء۔1950ء) اینگلو انڈین انگریز مصنف و ناول نگار۔ اس نے اپنے ناولوں اور 1984ء میں کمیونزم پر طنز کیا ہے۔

④ ثنویت: اصل میں یہاں مصنف نے انگریزی لفظ Dichotomy استعمال کیا ہے۔ Dichotomy وہ تقسیم ہوتی ہے جو دو اجزا پر مشتمل ہوتی ہے لیکن عام طور پر یہ دونوں اجزا آپس میں اس کے دوسرے کے متضاد ہوتے ہیں اور باہم برسرِ پیکار۔ بعض اوقات یہ تقسیم خیالات میں بھی در آتی ہے

سے متصادم نہیں جو صیہونیت کا خاصہ ہے کہ یہ (صیہونیت) یہودیوں کے لیے تو سراسر خیر و برکت ہے تاہم عربوں کے معاملے میں اس کا طرزِ عمل لازماً پدرانہ① طور پر مخاصمانہ ہے۔ مزید برآں، یہودی کمشنر اپنے خیالات نہ صرف ایک عینیت پسند اور نظریہ ساز شخصیت کی حیثیت سے بلکہ ایک ایسے شخص کے نقطۂ نظر سے بھی جسے اسرائیلی معاشرے میں ایک مقتدر اور با اختیار مقام حاصل ہے، قلم بند کر رہا ہے۔ اسرائیلی عربوں کے ایک حاکم کی حیثیت سے کمشنر صیہونیت کے دونوں پہلوؤں کا اظہار کرتا ہے کہ سرکاری طور پر یہودیوں کی فلاح و بہبود پر ہر ممکن توجہ دی جاتی ہے (وہ خود بھی یہودیوں کے مفادات کو برقرار رکھتا ہے اور ان کا تحفظ کرتا ہے) لیکن فروتر مقامیوں کے بارے میں پدرانہ اور انتظامی تسلط وتغلب سے کام لیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس نے جو موقف اختیار کیا ہے، یہودی مملکت کے اداروں نے اسے ایک تقدیس بخش دی ہے۔ چونکہ اس نے انھی اداروں سے اذن اور پروانہ حاصل کیا ہے، چنانچہ وہ ہمیشہ ان اصطلاحات میں سوچتا ہے کہ ایسا طرزِ عمل اختیار کیا جائے کہ مستقبل میں یہودیوں کو تو زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل ہو سکیں اور عربوں کو کم سے کم۔ اس کی رپورٹ کے مندرجہ ذیل پیراگراف میں ان تمام تصورات کی بھرپور نقشہ کشی کی گئی ہے۔

ایک ایسی مملکت میں جہاں اسرائیلیوں جیسا معاشرہ موجود ہو، نفاذِ قانون کا مسئلہ ایسا ہے جسے لچک، احتیاط اور بہت دانائی کے ساتھ حل کرنا چاہیے۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ عاملہ اور انتظامیہ کے ان حکام کو، جو عربوں کے خطے میں تعینات ہیں، قانون کی موجودگی اور اس کے نفاذ کے متعلق آگاہ ہونا چاہیے تاکہ قانون کا منشا پورا ہو اور غیر ارادی طور پر بھی کسی سے رُو رعایت نہ کی جاسکے۔②

ویز مان اور اس کمشنر کے مابین کئی عشروں کا عرصہ حائل ہے۔ اوّل الذکر جن باتوں کا محض خواب دیکھا کرتا تھا کہ ایسا ہو گا یا ایسا ہونا چاہیے، وہی باتیں مؤخر الذکر کے لیے قانونی سیاق کی حیثیت اختیار کر گئی ہیں۔ ویز مان کے عہد سے لے کر اس یہودی کمشنر کے عہد تک فلسطین کے مقامی عربوں کے لیے صیہونیت میں یہ تبدیلی آئی ہے کہ پہلے یہ ان کی زندگیوں میں اس طرح دراندازی ہو رہی تھی جیسے کوئی شخص آپ کی جائداد پر

---

① پدرانہ Paternalistic (پدرانہ حکومت یا سرپرستی) بعض اوقات حکومت ایسے امور میں بھی دخل دینا شروع کر دیتی ہے جن کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ نجی دلچسپی کے حامل ہیں یا وہ اس نظریے پر معاشی اور معاشرتی خدمات بہم پہنچانے لگتی ہے کہ وہ نجی تحریک پر بالکل مہیا نہیں کی جاسکتیں۔ ایسی حکومت کو پدرانہ حکومت کہتے ہیں۔ چونکہ اسرائیل کی حکومت عربوں کے ہر معاملے میں دخیل ہوتی ہے اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ اس کا اندازِ فکر "پدرانہ" ہے۔

② کمشنر کی اس رپورٹ کا مکمل انگریزی متن جریدے SWASIA نے اپنی جلد سوم شمارہ نمبر 41 میں پندرہ اکتوبر 1974ء کو شائع کیا تھا۔

تجاوزات تعمیر کر رہا ہو لیکن اب اس نے ایک طے شدہ حقیقت...... ایک قومی مملکت کا روپ دھار لیا تھا اور یہ چاروں طرف سے ان کے گرد اپنا گھیرا تنگ کرتی جا رہی تھی۔ 1948ء کے بعد اسرائیل نے نہ صرف یہودیوں کی سیاسی اور روحانی امیدوں کی تکمیل کر دی تھی بلکہ یہ ان لوگوں کے لیے مواقع کا مینارۂ نور بھی بنا رہا اور انھیں رہنمائی فراہم کرتا رہا جو ابھی تک دوسرے ممالک میں بکھرے پڑے ہیں۔ پھر جو لوگ سابقہ فلسطین میں رہائش پذیر تھے، اس نے انھیں اس قابل بنایا کہ وہ اپنی ترقی و نمودی فکر کے مطابق کر سکیں اور یوں اپنی تحصیلِ ذات کر سکیں۔ جہاں تک عرب فلسطینیوں کا تعلق ہے، ان کے لیے اسرائیل لازماً ایک معاندانہ حقیقت ہے جس کے بے شمار ناگوار ضمنی شاخسانے ہیں۔ 1948ء کے بعد ہر فلسطینی قومی اور قانونی طور پر معدوم ہو گیا۔ البتہ بعض فلسطینی عدالتی فیصلوں کے تحت ''غیر یہودیوں'' کے روپ میں دوبارہ نمودار ہو گئے۔ جو وہاں سے نکل آئے، وہ ''پناہ گزین'' بن گئے، بعد ازاں ان میں سے بعض نے عرب، یورپی یا امریکی شناخت حاصل کر لی تاہم آپ کو کوئی فلسطینی ایسا نہیں ملے گا جس نے اپنی ''پرانی'' فلسطینی شناخت گنوادی ہو۔ اس قسم کی بے معنی قانونی افسانہ طرازیوں سے کہ اسرائیل اور دوسرے ممالک میں فلسطینی عدم موجود ہیں، بالآخر فلسطینیوں نے چھٹکارا پا لیا ہے...... اس کے ساتھ ساتھ اس بات کے آثار بھی نظر آنے لگے ہیں کہ اب بین الاقوامی سطح پر صیہونی نظریے اور عمل کا تنقیدی جائزہ لینے کے لیے کافی آمادگی پائی جاتی ہے۔

1975ء کے بعد اقوام متحدہ نے جب ایک قرارداد منظور کی جس میں یہ کہا گیا تھا کہ ''صیہونیت نسل پرستی ہے۔'' تو اس پر مغرب میں جو شور و غوغا اور واویلا ہوا، وہ لاریب تصنع سے پاک تھا۔ اسرائیل کے یہودیوں نے جو کامیابیاں اور کامرانیاں حاصل کی ہیں...... یہ کامرانیاں مغربی یہودیوں کے کھاتے میں زیادہ ڈالی جاتی ہیں اور مشرقی یہودیوں کے حصے میں بہت کم آتی ہیں...... وہ مغربی دُنیا کے سامنے ہیں۔ اکثر معیاروں کے مطابق یہ خاصی زبردست کامرانیاں ہیں۔ جن چیزوں پر ''نسل پرستی'' کا ٹھپا لگ جاتا ہے، ان کی مذمت میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیے جاتے ہیں اور یوں انھیں مسترد کر دیا جاتا ہے۔ تاہم جہاں تک اسرائیلی یہودیوں کی کامرانیوں کا تعلق ہے، سچی بات یہ ہے کہ ان پر بھونڈے انداز سے ''نسل پرستی'' کا کلنک نہیں لگایا جا سکتا اور یوں ان کی عمومی اندز سے مذمت نہیں کی جا سکتی۔ جہاں تک عرب فلسطینیوں کا تعلق ہے جنھوں نے صیہونیت کی معیت میں زندگی بسر کی ہے اور جنھوں نے اس کے ان طریقہ ہائے کار کا مطالعہ کیا ہے، جو وہ ان کے اور ان کی زمین کے متعلق اختیار کرتی ہے، ان کے لیے یہ تکلیف دہ صورتِ حال پیچیدہ ضرور ہے لیکن اتنی بھی نہیں کہ وہ بالکل غیر واضح نظر آنے لگے۔ وہ جانتے ہیں کہ ''قانون واپسی'' یہودیوں کو اسرائیل میں فوری داخلے کی اجازت دیتا ہے لیکن بعینہٖ یہی قانون انھیں اپنے گھروں کو واپس آنے سے روکتا

ہے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اسرائیلی حملوں میں ہزاروں شہری باشندوں کو محض اس لیے اپنی جانوں سے ہاتھ دھونے پڑے ہیں کیونکہ ان کے پاس یہ قابلِ قبول گھڑا گھڑایا بہانہ موجود ہے کہ وہ دہشت گردی کے خلاف کارروائی کر رہے ہیں جب کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ فلسطینیوں کو من حیث القوم ایسے دہشت گردوں کے مترادف ٹھہرایا جا رہا ہے جو اپنی دہشت گردی پر نہ تو نادم ہوتے ہیں اور نہ شرمسار اور جس قسم کی دہشت گردی کے وہ مرتکب ہوتے ہیں، اس کے لیے انھیں کوئی مشتعل بھی نہیں کرتا۔ بس بلا جواز دہشت گردی کیے جا رہے ہیں۔ ① فلسطینی اس پُر فریب اور پُر پیچ عقلی عمل کو سمجھتا تو ہے لیکن وہ خود شاید اس پر عبور حاصل نہیں کر سکتا، جس کے ذریعے اس کی انسانیت کو، جسے پہلے ہی مسخ کیا جا چکا ہے، ناپاک بنایا جا چکا ہے، اسے دیکھے بغیر، اس کا نقطۂ نظر سنے بغیر، ایک ایسی آئیڈیالوجی کی تعریف و تحسین میں تبدیل کر دیا جاتا ہے، جس نے اسے قریب قریب تباہ کر دیا ہے۔ ''نسل پرستی'' ایک بہت ہی مبہم سی اصطلاح ہے۔ صیہونیت صیہونیت ہے۔ الفاظ کی یہ تکرار ② ایک فلسطینی کے لیے جو مفہوم رکھتی ہے، وہ اس مفہوم کے بالکل متجانس تو ہے لیکن اصلاً اس کے بالکل الٹ ہے جو یہ ایک یہودی کے لیے رکھتی ہے۔

① فلسطینی تشدید کی جو انتہائی مکروہ مثال پیش کی جاتی ہے، وہ ان کا مئی 1974ء میں ''معلوت'' کے قصبے پر حملہ ہے۔ یہ واقعہ فلسطینی دہشت گردی کے مترادف بن چکا ہے لیکن کسی بھی امریکی اخبار نے اس واقعے سے قبل ان واقعات کا مطلق ذکر نہیں کیا، جب اسرائیل کے طیارے اور توپ خانہ مسلسل دو ہفتے تک جنوبی لبنان پر وحشیانہ بمباری کرتے رہے۔ اسرائیلیوں نے نیپام بم بھی گرانے سے اجتناب نہیں کیا۔ نیپام بموں کے ان حملوں کے دوران میں دو سو عام شہری باشندے ہلاک ہوئے اور کم از کم دس ہزار افراد بے گھر ہو گئے۔ پھر بھی ابھی تک ''معلوت'' کی رٹ جاری ہے۔ (مصنف)

اسرائیلی کی دہشت گردی صرف جنوبی لبنان تک محدود نہیں رہی۔ 1982ء میں اس نے نہایت دھڑلے کے ساتھ اپنی فوجیں لبنان میں داخل کر دیں اور وہ مار دھاڑ کرتی بیروت پہنچ گئیں۔ یہاں انھوں نے ان کے حواریوں، عیسائی ملیشیا، نے فلسطینی پناہ گزینوں کے کیمپوں کا محاصرہ کر لیا اور انھیں بے پناہ گولہ باری کا نشانہ بنایا، خوراک، ادویات اور دوسری اشیائے رسد کی ترسیل ناممکن بنا دی۔ بلا مبالغہ ہزاروں ہی لوگ جن میں بچے، بوڑھے، جوان، خواتین، سبھی شامل ہیں، ہلاک ہوئے۔ زخمیوں کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں۔ اسرائیلی فوجیں تو کچھ عرصے کے بعد بیروت سے واپس آ گئیں لیکن اس کے حواریوں نے ابھی تک لبنان میں فلسطینی پناہ گزینوں کا ناطقہ بند کر رکھا ہے اور خود اسرائیلی طیارے بیروت، طرابلس اور دوسرے شہروں میں فلسطینی کیمپوں پر اکثر بمباری کرتے رہتے ہیں، ساحلی شہروں پر بحریہ کے جہاز گولہ باری کرتے ہیں۔ جنوبی لبنان ابھی تک اسرائیلی فوجوں اور عیسائی ملیشیا کے قبضے میں ہے اور لبنان کی حکومت کو اس پر کوئی کنٹرول نہیں۔ (مترجم)

② یہاں مصنف نے انگریزی کا لفظ (Tautology) استعمال کیا ہے، اس کے ایک معنی تو الفاظ کی تکرار یا ایک ہی مفہوم کو مختلف الفاظ کے ذریعے بلا ضرورت بیان کرنا ہے۔ دوسرا مفہوم ''منطق'' میں استعمال ہوتا ہے۔ جب ایک بیان کو جو سادہ بیانات پر مشتمل ہوتا ہے، اس طریقے سے ادا کیا جائے کہ سادہ بیانات بے شک صحیح ہوں یا غلط۔ یہ بیان اپنی جگہ درست معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً ''شاید کل بارش ہو، شاید نہ ہو۔''

آج جبکہ اسرائیل ایک بھاری فوجی بجٹ کے بوجھ تلے کراہ رہا ہے جو اس کی مجموعی پیداوار کا پینتیس فیصد کھا جاتا ہے، اپنے چند دوستوں کے علاوہ جو بحر اوقیانوس کے قرب و جوار میں واقع ہیں اور جن میں سے بھی بعض کی اس پر نکتہ چینی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے، یہ باقی دُنیا سے کٹ چکا ہے، اب یہ ایسے سماجی، سیاسی اور نظریاتی مسائل میں گھر چکا ہے، جنھیں وہ صرف اسی صورت میں حل کر سکتا ہے کہ وہ ان سے کامل مراجعت اختیار کر لے۔ ان حالات میں اس کا مستقبل خاصا بھیانک اور وحشت ناک ہو گیا ہے۔ صدر سادات امن کی جس مشن پر روانہ ہوئے تھے، اس سے کم از کم اتنا ضرور ہوا ہے کہ بیگن جس جامد اور بے لچک مذہبی جنون میں مبتلا تھا، اس کی دبی دبی سہی لیکن بہر حال مخالفت کا آغاز ہو گیا ہے لیکن جہاں ادارے تو ایک طرف رہے، فلسطین حقائق سے انسان دوستی کے جذبے کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کے لیے کوئی تصور، کوئی خیال تک موجود نہ ہو، وہاں یہ توقع کرنا کہ اسرائیلیوں کے فکر و عمل میں کوئی فیصلہ کن تبدیلی آسکے گی، محض خام خیالی ہے۔ امریکا کا انتہائی طاقتور اور بارسوخ یہودی طبقہ ابھی تک اپنا روپیا اور اپنا تقلیلی نقطۂ نظر اسرائیلی ارادے پر ٹھونسے ہوئے ہے۔ پھر ہمیں امریکی یہودیوں سے بھی کہیں زیادہ ہیبت ناک اور وحشت اثر امریکا کی دفاعی انتظامیہ کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے جو اس تاجر طبقے کے بھی مقابلے میں جو تیل کی دولت سے مالا مال عرب منڈیوں پر حریصانہ نظریں جمائے ہوئے ہے، کہیں آگے ہے کیونکہ یہ اسرائیل اور اب مصر میں جدید ترین ہتھیاروں کی مسلسل بھرمار اس لیے کیے جا رہی ہے کہ یہ ممالک ''انتہا پسندوں''[1] سوویت یونین یا ہر اس طاقت کے خلاف، جو امریکا کے لیے جغرافیائی یا سیاسی یا دونوں اعتبار سے ''بھیانک بھوت'' بن چکی ہے، سینہ سپر ہو جائیں گے۔ اسرائیل کی بے لگام عسکریت[2] کا جو بدیہی نتیجہ برآمد ہوا ہے، اس کا بالکل صحیح احوال اسرائیلی اخبار ''ہارتیز'' نے 24 مارچ 1978ء کو اپنے ایک مضمون میں بیان کیا تھا۔ لبنان میں جو کارروائی ہوئی، اس پر خوشی کے شادیانے بجاتے ہوئے اس اخبار نے تحریر کیا:

جو کچھ گزشتہ ہفتے پیش آیا، وہ ہر اس شخص کو، جو آنکھیں رکھتا ہے، یہ دکھانے کے لیے کافی ہے کہ

---

① انتہا پسند (Radicals) ان لوگوں کو کہتے ہیں جو حکومت اور قوانین، خاص طور پر معاشی اور معاشرتی قوانین میں فوری اور بنیادی تبدیلیاں لانے کے دعوے دار ہوں۔

② عسکریت یا حربیت (Militarism): لاتعداد اسلحہ جات رکھنا، شہریوں پر فوجی افسروں کو تعینات کرنا، شہری اداروں کی بجائے فوجی اداروں کو نصب العین بنانا۔ وہ اقوام جو جوع الارضی میں یقین رکھتی ہیں، وہ عسکریت کو اپنی حکمتِ عملی میں درجہ اولیت دیتی ہیں۔ ہٹلر اور مسولینی نے جنگِ عظیم دوم سے قبل اپنے اپنے ملکوں میں جو نظام قائم کیے تھے، وہ اس کی بدترین مثالیں ہیں۔ آج کل دُنیا کا تقریباً ہر ملک اس لت میں گرفتار ہے وہ اور کچھ نہیں تو اسلحہ کے انبار لگانے کی ضرور کوشش کرتا ہے۔

آج اسرائیل کی دفاعی افواج اپنے ساز و سامان کی کمیت اور تعداد کے اعتبار سے بالکل امریکی افواج ہیں۔ ہماری رائفلیں، فوج بردار گاڑیاں طیارے اور بحری جہاز، ایف 15 لڑاکا طیارے، بلکہ کفیر ① ہوائی جہاز بھی، جن میں امریکی موٹریں نصب ہیں، ہر شخص کو اس کا یقین دلا دیں گی۔

اسرائیل کے ''زبردست فوجی ساز و سامان'' کی اوپر جو نغمہ سرائی کی گئی ہے، اس کا لگا اگر کوئی چیز کھا سکتی ہے، تو وہ مغربی اور اسرائیلی دانشوروں کا، جو گزشتہ تیس سال سے پلکیں جھپکائے بغیر اسرائیل اور صیہونیت کا کلمہ پڑھے جا رہے ہیں، مہلک اور زیاں رساں اثر و رسوخ ہے۔ گرامشی نے جن لوگوں کے متعلق کہا تھا کہ یہ ''ناجائز کو جائز بنانے کے بڑے ماہر'' ہیں، یہ (مغربی اور اسرائیلی) دانشور ایسے ہی ''ماہرین'' کا کردار بحسن و خوبی ادا کر رہے ہیں، دانائی اور انسانی کی دہائی دینے کے باوجود یہ لوگ بڑے بے ایمان، دھاندلی، غیر عقلی اور غیر منطقی ہیں۔ شرمناک اور ذلیل ریکارڈ کا ذرا ناقدانہ جائزہ لیں تو آپ کو صرف چند ہی اصحاب، ② جن کے تعداد ہاتھ کی انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے، ایسے ملیں گے، جنھوں نے یہ دیکھنے کی سعی کی ہے کہ صیہونیوں نے فلسطینیوں کے ساتھ، صرف ایک مرتبہ 1948ء میں ہی نہیں، بلکہ سلسلہ تو کئی برسوں پر محیط ہے، کیا سلوک کیا ہے؟ مقامی فلسطینیوں کے متعلق صیہونیوں نے جو اصول اور نظریے وضع کیے ہیں اور ان کے ساتھ جو برتاؤ روا رکھا ہے، اس کے متعلق یہ کامل سکوت اس صدی کے انتہائی لرزہ خیز اور ہولناک ثقافتی واقعات میں سے ایک واقعہ ہے۔ آج ارجنٹائن، چلی یا جنوبی افریقہ میں انسانی حقوق کی جو تذلیل ہو رہی ہے اور انھیں جس طرح پاؤں تلے روندا جا رہا ہے، اس کے متعلق ہر وہ دانش ور، جس میں خودداری اور غیرت کی ذرا سی رمق بھی موجود ہے کچھ نہ کچھ کہنے پر آمادہ ہے لیکن اسرائیل میں عربوں کی امتناعی نظر بندی، اذیت رسانی، آبادیوں کی تبدیلی اور ملک بدری کے متعلق جب ناقابلِ تردید شواہد پیش کیے جاتے ہیں تو لغوی طور پر منہ میں گھنگھنیاں ڈال لی جاتی ہیں، مجال ہے کہ کسی کی زبان سے مذمت کا ایک لفظ بھی نکل جائے۔ مثلاً کسی ڈینیل موئی ہان یا کسی سال بیلو کو مطمئن کرانے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ انھیں یہ یقین دہانی، خواہ وہ کتنی ہی خفیف کیوں نہ ہو، کرا دی جائے کہ اسرائیل میں جمہوریت کا احترام کیا جاتا ہے تو پھر اخلاقی محاذ پر راوی چین ہی چین لکھتا ہے اور ان کا ضمیر مطمئن ہو جاتا ہے۔ یہ مملکت پرستی کس حد تک پہنچ چکی ہے، اس کا صحیح اندازہ غالباً اس ملاقات کا احوال پڑھنے

① اسرائیلی ساختہ فوجی طیارے

② ان لوگوں میں نوم چومسکی، اسرائیل شحاک، آئی، ایف سٹون (امریکی صحافی) اور ایلمر برگر (Berger) شامل ہیں۔

کے بعد ہی ہوسکتا ہے، جو مارٹن بوبر[1] اور ایوراہام ادیرت[2] کے مابین ہوئی اور جسے اسرائیل کے ایک سہ ماہی مذہبی جریدے پیتا حیم نے اپنے دسمبر 1974ء کے شمارے میں شائع کیا تھا۔ ادیرت اسرائیلی افواج کی تعریفوں کے پل باندھ رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ ان میں شمولیت اختیار کرنے کے بعد نوجوان کو کردار سازی کا موقع ملتا ہے وہ اس ضمن میں ایک واقعے کو بطور مثال پیش کرتا ہے۔ یہ واقعہ 1956ء میں مصر کے خلاف جنگ میں پیش آیا تھا۔ ہوا یوں کہ ایک فوجی افسر نے اپنے (زیرِکمان) فوجیوں کے ایک گروپ کو یہ حکم دیا کہ ''جتنے بھی مصری جنگی قیدی...... کہ ہمارے ہاتھ آئے ہیں آپ نے بس انھیں ہلاک کرنا ہے۔'' چنانچہ چند رضا کار آگے بڑھتے ہیں اور مناسب انداز سے قیدیوں کو گولیوں سے بھون دیتے ہیں۔ اگرچہ ایک رضا کار ایسا بھی تھا جس نے بعد میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ ''جب میں نے گولی چلائی، میں نے اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں۔'' اس موقع پر اڈیرت یہ ''ارشاد'' کرتا ہے کہ ''لاریب اس قسم کی آزمائش ہر اس شخص کو، جو صاحبِ ضمیر ہے اور جسے زندگی کا تجربہ بھی حاصل ہو چکا ہو، (ذہنی) انتشار میں مبتلا کرسکتی ہے۔ یہ بات ان نوجوانوں پر خاص طور پر صادق آتی ہے جو ابھی اپنی اپنی زندگی کی دہلیز پر کھڑے ہوں۔ میرے خیال میں اس سارے معاملے میں تکلیف دہ اور ناگوار بات وہ ذہنی انتشار نہیں جس میں وہ نوجوان بوقتِ ضرورت مبتلا ہوئے، بلکہ وہ داخلی توڑ پھوڑ ہے، جو بعد میں ان کے اندر ہوئی۔'' ''روح کی بالیدگی کرنے والی'' اس تعبیر وتشریح کا ''معلمِ اخلاق'' کریم النفس مفکر اور سابق دُہرے قوم پرست بوبر سے صرف یہ جواب بن پڑا۔

''یہ ایک سچی اور زبردست کہانی ہے۔ آپ کو اسے ضرور حیطۂ تحریر میں لانا چاہیے۔''

اس کہانی میں جو ہولنا کی ہے، اس کے متعلّق اور نہ اس صورتِ حال کے متعلّق، جس نے اسے ممکن بنایا، اس نے چھوٹے منہ بھی ایک لفظ تک نہ کہا۔

لیکن جس طرح گزشتہ سو سالوں کے دوران میں آپ کو ایک بھی یہودی ایسا نہیں ملے گا جس پر صیہونیت اثر انداز ہوئی ہو، اسی طرح آپ کو کوئی فلسطینی ڈھونڈے سے نہیں ملے گا جو اس کا نخچیر نہ بنا ہو۔ تاہم یہ بات فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ فلسطینی صیہونیت کا محض ایک وظیفہ نہیں، اس کی زندگی، ثقافت اور سیاست کا اپنا ایک محرک ہے اور ان چیزوں کی بالآخر اپنی ایک صداقت ہے۔ چنانچہ اب ہمیں انھی کی طرف توجہ دینا ہوگی۔

---

① مارٹن بوبر Buber (1878ء۔1965ء) آسٹریا نژاد یہودی عالم اور فلسفی

② ایوراہام ایدیرت (Aderet) ایک اسرائیلی صحافی

تیسرا باب

فلسطینیوں کے حق خود ارادیت کی طرف

①

بچے کھچے فلسطینی...... کچھ جلا وطن، کچھ زیر دست

اس وقت پینتیس سے چالیس لاکھ فلسطینی عرب دُنیا بھر کے مختلف ممالک میں بکھرے پڑے ہیں، ان میں سے ساڑھے چھ لاکھ تو وہ فلسطینی ہیں جنھیں اسرائیلی عرب کہا جاتا ہے۔ دس لاکھ اسرائیلی مقبوضہ مغربی کنارے اور غزہ (کی پٹی) میں سکونت پذیر ہیں، تقریباً دس لاکھ ہی اُردن میں اور کوئی ساڑھے چار لاکھ لبنان میں مقیم ہیں اور جو باقی بچتے ہیں، ان کی بیشتر تعداد عرب خلیجی ریاستوں، شام، مصر، لیبیا اور عراق میں رہتی ہے۔ تھوڑے سے فلسطینی ایسے بھی ہیں جو یورپ، شمالی اور جنوبی امریکا کے مختلف ممالک میں جا بسے ہیں۔ ان میں سے ہر شخص، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، مجھے یقین ہے کہ یہی کہے گا کہ ''میں تو جلا وطنی کی زندگی گزار رہا ہوں۔'' اگرچہ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ جلا وطنی کے حالات اور انواع میں بہت بیّن فرق ہے، تاہم ہر فلسطینی کی پشت پر ایک عظیم عمومی حقیقت موجود ہے کہ وہ کسی زمانے میں اور اس زمانے کے بیتے اتنا زیادہ عرصہ بھی نہیں گزرا...... اپنے وطن میں، جسے فلسطین کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا، سکونت پذیر تھا، لیکن یہ وطن اب اس کا اپنا وطن نہیں رہا۔ اس قسم کی بات کہنے کے لیے کسی فلسطینی کو کبھی بال کی کھال ادھیڑنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اس کے ساتھ بہت کم شرائط، تاویلات یا اگر مگر وابستہ نظر آتے ہیں۔ تاہم جس طرح کہ ٹالسٹائی[①]

① لیو ٹالسٹائی (Leo Tolstoy) (1828ء۔1910ء) مشہور روسی مصنف اور فلسفی غالباً دُنیا کا عظیم ترین ناول نگار۔ ''جنگ اور امن'' اور ''اینا کریننا'' اس کے شاہکار ناول ہیں۔

نے خاندانوں کے متعلق کہا تھا کہ مسرور و مطمئن خاندان بالکل ایک جیسے نظر آتے ہیں لیکن ایک ناشاد و نامطمئن خاندان اپنے غم و اندوہ اور نااطمینانی میں اپنی قسم کے ہر دوسرے خاندان سے مختلف ہوتا ہے۔ بالکل یہی کیفیت فلسطینیوں کی ہے۔ انھیں فرداً فرداً جو دکھ جھیلنے اور زخم اٹھانا پڑے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ہی دکھ کی پینتیس لاکھ اقسام ہیں۔ ان دکھوں کی ایک قسم کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔ یہ ان واقعات کی کہانی ہے جو مغربی الجلیل کے ایک چھوٹے سے عرب گاؤں میں پیش آئے جو 1948ء کے موسم بہار میں صیہونی فوجوں کے قبضے میں آ گیا تھا۔ (اس کہانی کی) راوی ایک بزرگ کسان خاتون ہے جو اس وقت لبنان میں پناہ گزینوں کے ایک کیمپ میں رہتی ہے۔ اس کی کہانی 1973ء میں ریکارڈ کی گئی تھی:

''اس رات ہم گاؤں کے (پھلوں کے) باغات میں سوئے۔ اگلی صبح میں اور اُمِ حسین گاؤں گئیں۔ گلیوں میں مرغیاں پھر رہی تھیں۔ ام حسین نے مجھ سے کہا: ''جاؤ اور کچھ پانی لے آؤ۔'' میں چوپال کی طرف جا رہی تھی کہ راستے میں میری ملاقات اُمِ طلحہ سے ہوئی وہ پھٹ پڑی اور چلّانے لگی کہ ''جاؤ اور اپنے مرحوم خاوند کو دیکھو۔'' وہ مجھے مل گیا۔ کسی نے اس کی سر کی پشت پر گولی ماری تھی۔ میں نے اس کی لاش گھسیٹ کر سایے میں کر دی اور خود اُمِ حسین کو بلانے چل دی تاکہ وہ اسے دفنانے میں میری مدد کر سکے، سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ میں قبر نہیں کھود سکتی تھی۔ چنانچہ ہم نے اسے ایک چوبی تختے پر لٹایا، اور اسے قبرستان لے گئیں۔ وہاں ہم نے اس کی والدہ کی قبر میں اسے اس کے پہلو میں ہی دفن کر دیا...... آج بھی میں سوچ سوچ کر پریشان ہوتی رہتی ہوں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی رہتی ہوں کہ میں نے اسے صحیح سمت میں لٹا کر دفنایا ہو۔ میں کچھ کھائے بغیر چھ دن کبریٰ (اس کے گاؤں کا نام) میں مقیم رہی۔ پھر میں نے فیصلہ کیا کہ میں اپنی بہن کے پاس چلی جاؤں گی جو کچھ عرصہ قبل اپنے گھر والوں کے ساتھ شام بھاگ گئی تھی۔ میں نے ایک بزرگ شخص، ابو اسماعیل ارکع سے درخواست کی کہ ''آپ میرے ساتھ ترشیحہ تک چلیں۔'' وہ میری بات مان گئے اور میرے ساتھ چل پڑے۔ ابو اسماعیل تو اپنے بیٹے کے پاس ترشیحہ ہی میں ٹک گئے اور میں نے شام کا رخ کر لیا۔''①

1970ء سے قبل آپ اس قسم کی کہانی انگریزی زبان میں نہیں پڑھ سکتے تھے۔ قیامِ اسرائیل کے بیس برس بعد تک دُنیا کو مبہم طور پر اور عمومی انداز سے اتنا تو معلوم تھا کہ ''فلسطینی پناہ گزین'' نام کی ایک مخلوق موجود

---

① اس کہانی کا حوالہ نافذ نزال نے اپنے مضمون The Zionist Occupation of Western Galilee 1948ء میں دیا ہے۔ یہ مضمون ''جرنل آف پیلسٹائن سٹڈیز'' کی جلد سوم شمارہ نمبر 3 موسم بہار 1974ء میں شائع ہوا تھا۔

ہے یا یوں کہیں کہ کبھی کبھار فلسطینی پناہ گزینوں کے متعلق بھنک ان کے کانوں میں پڑ جاتی تھی۔ 1955ء میں مشرقِ وسطیٰ کے بارے میں امریکا میں معاشرتی علوم کی ایک معیاری نصابی کتاب ''مشرقِ وسطیٰ کے معاشرتی قوتیں'' [1] شائع ہوئی۔ اس کتاب میں فلسطینیوں کے متعلق ایک علیحدہ باب باندھا گیا ہے۔ تاہم پوری کتاب کھنگال ڈالیں، آپ کو کہیں بھی اس بات کا عندیہ تک نہیں ملے گا کہ یہ لوگ بھی کہیں موجود ہیں۔ اگر کہیں ان کی موجودگی کا سوال اٹھایا بھی گیا ہے تو اس طرح کہ یہ لوگ علاقے کی ''ترقی'' میں معمولی انداز سے رخنہ انداز ہیں یا پھر ان کا شمار ان عام پناہ گزینوں کی صف میں کیا گیا ہے، جن کے متعلق اعداد و شمار اقوامِ متحدہ کے ایجنڈے میں شامل ہوتے ہیں۔ (ایران میں جو فریق شاہ کی مخالفت کرتے تھے۔ ان کی موجودگی کے متعلق بھی امریکا کی اعلیٰ درسگاہوں اور خفیہ اداروں سے وابستہ اشخاص نے اسی قسم کی لاعلمی اور ناکامی کا مظاہرہ کیا تھا اور جب 1979ء میں شاہ کے خلاف مخالفت کا طوفان پھٹ پڑا اور سارے بند ٹوٹ گئے تو سبھی لوگ ششدر رہ گئے۔ ان لوگوں کی حیرانی اور سراسیمگی کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ان کی دانست میں شاہ کی مخالفت موجود نہیں تھی۔ بات صرف اتنی تھی کہ کسی شخص کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ مخالفت اتنی شدت اختیار کر جائے گی اور شاہ کے استحکام کے لیے کسی خطرے کا باعث بن جائے گی۔)

ایک اور مسئلہ، جس امر نے ایک فلسطینی کا اپنے آپ سے اور باہر کی دُنیا سے اس کا رابطہ منقطع کر رکھا تھا، وہ بیس سالہ قومی تفرقہ اور آپس کی پھوٹ تھا۔ ایک طرف تو وہ فلسطینی تھے جو واضح طور پر جلاوطن تھے۔ دوسری طرف وہ فلسطینی تھے جو رہتے تو اسرائیل میں تھے لیکن دوسروں سے الگ تھلگ اپنی داخلی جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ جہاں تک اوّل الذکر کا تعلق ہے ان کا رجحان اپنے آپ کو عرب سیاست کی اصطلاحوں میں دیکھنے کی جانب تھا یا پھر ان کی کوشش یہ تھی کہ جن نئے مقامات پر انھوں نے رہائش اختیار کی ہے، وہاں کے ماحول میں رچ بس جائیں اور وہیں کے ہو کر رہ جائیں۔ مؤخر الذکر کے روابط عالمِ عرب سے کٹ چکے تھے کیونکہ وہ اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ اسرائیلی تسلط کے زیرِ سایہ انھیں جو تھوڑی بہت رہنے کو جگہ میسر ہے، وہیں وہ اپنی زندگیوں کو متشکل کر سکیں۔ دونوں صورتوں میں کافی عرصے تک جس (ترکیبی) عنصر کی کمی محسوس ہوتی رہی وہ متحد و مربوط بنا دینے والی ایک ایسی سیاسی قوت تھی جس میں اتنا دم خم ہو کہ فلسطینیوں کو تاریخ کے ایک ایسے عہد میں، جسے دوبارہ آواز دے کر بلایا نہیں جا سکتا تھا، جس مجہول ڈراؤنے خواب کا تجزیہ ہوا

[1] Social Forces in the Middle East, edited Sydney N.Fisher [Ithace, N.y: Cornell University Press]

تھا، اسے بھلانے میں وہ ان کی مدد کر سکے اور کوئی اس سے بہتر چیز انھیں پیش کر سکے۔

البتہ جس چیز کا فقدان تھا، وہ ایک ملک تھا۔ جب تک اکھاڑ پچھاڑ کے بعد فلسطین کی جگہ اسرائیل قائم نہیں ہو گیا۔ یہ (فلسطین) ایک ایسا ملک تھا جو اپنے کردار کے اعتبار سے غالب طور پر ایک عرب ریاست (جس میں مسلمان اور عیسائی دونوں آباد تھے۔) تھا۔ یہی وہ حقیقتِ ثابتہ ہے جس کے متعلق صیہونی اور مغربی رویے کی میں نے باب اول اور باب دوم میں وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن جہاں تک ایک عام فلسطینی کا تعلق ہے، اس کے ذہن میں اس بارے میں مطلق کوئی شک وشبہ نہیں کہ اس کے ملک کی ایک اپنی خصوصیت اور ایک اپنی شناخت تھی۔ یہ درست ہے کہ جنگِ عظیم اول کے اختتام تک فلسطین سلطنتِ عثمانیہ کا ایک حصہ رہا اور یہ بھی درست ہے کہ کسی بھی مسلمہ معیار کے مطابق یہ کوئی آزاد ملک نہیں تھا۔ تاہم اس کے باشندے اپنے آپ کو فلسطینی کہتے تھے اور وہ اپنے اور شامیوں، لبنانیوں اور اردنیوں کے مابین اہم امتیازات واختلافات کی نشاندہی کرتے تھے۔ فلسطینیوں میں اس چیز کا احساس، جسے ہم ان کا تشخص یا ادعائے ذات ① کہہ سکتے ہیں، زیادہ تر اس وقت بیدار ہونا شروع ہوا جب انھوں نے فلسطین میں یہودی تارکینِ وطن کی آمد جس کا سلسلہ 1880ء کے عشرے کے دوران میں شروع ہوا تھا، اور فلسطین کے متعلق مختلف صیہونی تنظیموں کے نظریاتی دعاوی کے خلاف اپنا ردِّعمل ظاہر کرنے کی ابتدا کی تھی۔ ایک طبقے کی حیثیت سے فلسطینی دونوں عظیم جنگوں کے درمیانی عرصے کے دوران میں ابھرے جب ان پر ہر آن غیر ملکی یلغار کا احساس طاری رہنے لگا......وہ چیزیں......معاشرے کی ساخت، گاؤں اور گھرانے کی شناخت، رسوم و رواج، طرز طباخی، لوک روایات اور فنون، امتیازی عادات وخصائل اور تاریخ......جن کی صداقت کے متعلق کبھی کسی شبہے کا اظہار نہیں کیا گیا اور جنھیں ہمیشہ حرزِ جاں بنا کر رکھا گیا، فلسطینیوں نے فلسطینیوں کے سامنے بطور ثبوت پیش کیں کہ جب یہ علاقہ ایک نوآبادی بھی تھا، اس وقت بھی یہ فلسطینیوں کا وطن تھا اور یہی وہ چیزیں ہیں جو کسی قوم کو قوم بناتی ہیں، چنانچہ فلسطینی بھی ایک (علیحدہ) قوم ہیں۔ ملک کی ساٹھ فیصد آبادی کھیتی باڑی کا کام کرتی تھی۔ جہاں تک باقی باشندوں کا تعلق ہے، ان کی بیشتر تعداد شہروں اور قصبوں میں رہتی تھی اور نسبتاً ایک معمولی سی تعداد خانہ بدوشوں پر مشتمل تھی۔ یہ تمام لوگ، اپنے ان احساسات کے باوجود کہ وہ ایک عظیم تر عرب قوم کے بھی افراد ہیں، اپنے متعلق یہ یقین رکھتے تھے کہ ان کا تعلق ایک ایسی سرزمین سے ہے جسے عرفِ عام میں فلسطین کہا جاتا تھا اور بیسویں صدی کے پورے عرصے کے دوران میں وہ اپنے ملک کو "فلسطینونہ" (ہمارا فلسطین) کہتے رہے۔

---

① ادعائے ذات (Self Assertion): اپنی شخصیت، امنگوں اور خیالات کو پُرزور طریقے سے پیش کرنا اور منوانے کی سعی کرنا۔

بدیہی حقیقت یہی ہے کہ فلسطینی ''مشرقِ وسطیٰ کے بحران'' کے قلب میں جاگزیں ہیں اور اگر اس بحران کا حل ڈھونڈنا مقصود ہے، تو انھیں اس (حل) میں شریک کرنا ہی پڑے گا۔ اس کتاب میں جو استدلال پیش کیا گیا ہے، وہ بظاہر اس بدیہی حقیقت کی تائید وحمایت کرتا ہے لیکن اصل مقصد اس نقطۂ نظر کو محض اس طور پیش کرنا نہیں کہ دوسروں کو قائل کیا جائے بلکہ اس سے کچھ زیادہ کرنے کی سعی کرنا ہے۔ میرا نقطۂ نظر جس پر میں سختی سے قائم ہوں، یہ ہے کہ چونکہ فلسطینیوں کے سیاسی تشخص کو اتنے وسیع پیمانے پر عمومی (اور حال ہی میں) قبولیت اور تائید حاصل ہوئی تھی، اس لیے بلاکم وکاست یہ کہا جاسکتا ہے کہ بالکل اسی بات (قبولیتِ عامہ) میں چند خطرات بھر مضمر ہیں اور وہ یہ ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ عمومی نوعیت کا حل فلسطینیوں کی مخصوص، مفصل حقیقت کو پوری طرح سمجھنے میں ناکام رہے بلکہ عین ممکن ہے کہ وہ انھیں تباہی کے کنارے پر ہی پہنچا دے۔ چنانچہ اس مقالے میں، میں نے جس بات کو بالاصرار کہنے کی کوشش کی ہے، وہ یہ ہے کہ ''مسئلۂ فلسطین'' متعدد اور گونا گوں کیفیات کا حامل ہے۔ کیفیات کے اس تنوع کو اکثر مبہم و مغلق بنا دیا جاتا ہے، نظر انداز کر دیا جاتا ہے یا پھر دیدہ و دانستہ اسے توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا ہے۔ میرے خیال میں یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ انسانی فریق...... خاص طور پر وہ لوگ جو فلسطینیوں اور صیہونیوں کی کشمکش میں براہِ راست ملوث ہیں...... بڑے جوشیلے یقین، یا کم از کم ایسے یقین کے ساتھ، جس سے یہ مترشح ہوتا ہو کہ انھوں نے اپنے آپ کو اس کا پابند بنا رکھا ہے، کام کرتے ہیں۔ یہ بات جس طرح فلسطینیوں کے بارے میں درست ہے کہ وہ صیہونیت اور اسرائیل کے متعلق کیا محسوس کرتے ہیں، بالکل اسی طرح یہودیوں پر بھی صادق آتی ہے کہ ان کے ان دونوں چیزوں (صیہونیت اور اسرائیل) کے بارے میں کیا احساسات ہیں۔ (دونوں ہی جوش و ولولہ سے تو کام کرتے ہیں لیکن عقل وخرد کو پاس بھی نہیں پھٹکنے دیتے) تاہم توازن کے فقدان نے جو صیہونیوں اور فلسطینیوں کی مشترکہ تفہیم کے مابین پایا جاتا ہے، عمومی طور پر ان اقدار اور مشکلات و مصائب سے بھرپور اس تاریخ کی، جس نے اس صدی کے دوران میں فلسطینیوں کو کچھ نہ کچھ کرنے پر ابھارا ہے، پردہ پوشی کر رکھی ہے کیونکہ اکثر امریکی اس بات سے آگاہ ہی نظر نہیں آتے کہ اسرائیل کے وجود میں آنے سے قبل فلسطینی واقعتاً فلسطین میں رہائش پذیر تھے۔ تاہم اگر ہم صرف انھی اقدار اور اسی تاریخ کو ملحوظِ خاطر رکھیں تو ہمیں سمجھوتے، تصفیے اور بالآخر امن کے بنیادی نقوش نظر آنا شروع ہو جائیں گے۔ میرا کام فلسطینیوں کی داستان پیش کرنا ہے، جہاں تک صیہونیوں کی کہانی کا تعلق ہے، (مغرب میں) وہ کہیں بہتر انداز سے جانی اور سمجھی جاتی ہے۔

میرے خیال میں یہ کہنا کوئی مبالغہ آرائی نہیں کہ اس اچانک توجہ کے باوجود جو فلسطینیوں کی جانب مبذول ہونا شروع ہوئی ہے، انھیں اب بھی بنیادی طور پر چند منفی اوصاف کا مجموعہ تصور کیا جاتا ہے...... بلکہ

بعض اوقات تو وہ خود بھی اپنے آپ کو انھی منفی اوصاف سے متصف سمجھتے لگتے ہیں...... جب حالت یہ ہو تو پھر فلسطینیوں کو مکمل حقِ خود ارادیت دینے کا عمل غیر معمولی طور پر دشوار ہو جاتا ہے کیونکہ حقِ خود ارادیت صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب ارادے کا اظہار کرنے کے لیے کوئی واضح طور پر نظر آنے والا ''خود'' موجود ہو۔ جلاوطنی اور انتشار[1] مسئلے کی نوعیت کو فوری طور پر واضح کر دیتے ہیں۔ اس صدی کے بیشتر حصے کے دوران میں وہ دُنیا بھر میں اور تاریخی اعتبار سے جس انداز سے متعارف ہوئے ہیں وہ زیادہ تر انکارات اور استردادات[2] کی شکل میں ہے۔ ان پر صیہونیت کی مخالفت کا الزام عائد کیا جاتا رہا ہے، کہا جاتا ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کے مسئلے کا مرکزی نقطہ وہی ہیں، پھر ان پر یہ تہمت بھی دھری جاتی ہے کہ وہ دہشت گرد ہیں۔ انھیں انتہا پسند اور ''میں نہ مانوں'' کی گردان کرنے کا طعنہ دیا جاتا رہا ہے...... یہ فہرست کافی طویل بھی ہے اور اس میں کوئی ایسی بات بھی نہیں جس پر فخر سے گردن بلند کی جا سکے۔ ان کی غیر معمولی بدقسمتی یہ ہے کہ اس بات کے باوجود کہ ان کا مقدمہ بہت مضبوط ہے کہ وہ اپنے وطن پر استعماری یلغار کی مزاحمت کرتے چلے آ رہے ہیں، ان کا واسطہ یہودیوں سے پڑا ہے جو بین الاقوامی اور اخلاقی دُنیا کی اصطلاحات میں تمام حریفوں کے مقابلے میں اخلاقی طور پر پیچیدہ ترین حریف ہیں۔ یہ پیچیدگی اس لیے پیدا ہوئی ہے کیونکہ یہودیوں کو خود طرح طرح سے ستایا گیا اور انھیں دہشت گردی کا نشانہ بنایا گیا۔ ان کی اس مظلومیت کی تاریخ خاصی طویل ہے۔ یہودیوں نے اپنا مقدر بنانے اور سنوارنے کے لیے آباد کار استعمار[3] استعمال کیا ہے لیکن یہ استعمار اپنے جلو میں جو کامل زیادتیاں اور ناانصافیاں لے کر آتا ہے، اہلِ مغرب کی نگاہوں میں ان کی شدت یا تو بہت کم ہو جاتی ہے اور یا غالباً بالکل معدوم ہو جاتی ہے کیونکہ ان کے نزدیک مسئلہ یہودیوں کی بقا کا ہے اور

---

① انتشار (Dispersion): مختلف ممالک یا مقامات پر بکھرے ہونا

② انکارات اور استردادات: بعض چیزوں کے وجود سے انکار کرنا یا انھیں مسترد کر دینا۔ صیہونی فلسطینیوں کے وجود سے انکاری ہیں اور فلسطین پر ان کے تمام دعاوی مسترد کر دیتے ہیں۔ اسی طرح فلسطینی اسرائیل کے وجود کو ماننے سے انکاری ہیں اور ارضِ فلسطین پر ان کے تمام دعاوی مسترد کر رہے ہیں۔ فلسطینی ان دونوں ہی اعتبارات سے دُنیا کے سامنے نمودار ہوئے ہیں۔

③ آباد کار استعمار (Settler Colonialism) عام طور پر استعماری طاقتیں کسی ملک پر سیاسی یا اقتصادی قبضے پر ہی اکتفا کرتی ہیں، ان کے شہری وہاں آباد ہونے کی کوشش نہیں کرتے لیکن جنوبی افریقہ اور فلسطین نہ صرف استعمار کا نشانہ بنے بلکہ یورپ کے آباد کار وہیں مستقل طور پر آباد ہو گئے۔ انھوں نے نہ صرف تمام وسائل پر قبضہ کر لیا بلکہ مقامی باشندوں کو مملکت کے امور سے بھی بے دخل کر دیا۔ اسے آباد کار استعمار کہا جاتا ہے۔

یہودیوں کی بقا انھیں جان سے بھی زیادہ عزیز ہے اور وہ اس پر نہایت سختی سے یقین رکھتے ہیں۔ مجھے اس بارے میں مطلق شبہ نہیں کہ ہر سوچنے سمجھنے والا فلسطینی، خواہ وہ مسرّت وافلاس کی چکی میں پس رہا ہو، یا وہ مجھ جیسا ہو جس کی آزمائشوں کو خوش قسمتی اور مراعات نے نسبتاً آسان بنا دیا ہے، کسی نہ کسی انداز سے یہ بات ضرور جانتا ہے کہ اسرائیل اور جنوبی افریقہ کے مابین جتنی بھی حقیقی مماثلتیں پائی جاتی ہیں، وہ اس وقت اس کے شعور میں بری طرح گڈمڈ ہونے لگتی ہیں جب وہ نہایت سنجیدگی کے عالم میں ان اختلافات پر غور کرتا ہے جو افریقہ کے سفید فام آبادکاروں اور یورپی یہود دشمنی سے بھاگ کر آنے والے یہودیوں کے مابین پائے جاتے ہیں تاہم اگرچہ افریقہ اور اسرائیل کے ایذادہندگان مختلف ہیں، دونوں صورتوں میں ان کے ستم زدگان کو ایک ہی قسم کے زخم اور چوٹیں سہلانا پڑتی ہیں۔ تاہم غیر یورپی ستم رسیدہ قوموں کے مابین جو روابط قائم ہو چکے ہیں، اس نے ان کے اور یہودیوں کے مابین، جو غیر مشروط طور پر مغرب کا دم بھرتے ہیں اور اس کے ہتھکنڈے اختیار کر چکے ہیں، ایک خلیج حائل کر دی ہے۔

اب تک تو مشکلات کا انبار بہت گھمبیر ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ یہی مشکلات جزوی طور پر فلسطینیوں کی پائیداری اور ان کی بقا کا موجب بنی ہیں......اور یہ سب کچھ اس حقیقت کے باوجود ہوا ہے کہ یہ مشکلات ان قوتوں کی پیدا کردہ ہیں جو ان کی وجود مٹانے کے درپے ہیں۔ اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ وہ یہودی اور دوسرے لوگ (جن میں بعض عرب بھی شامل ہیں) جن کا فلسطینیوں سے واسطہ پڑا ہے، بنیادی انسانی نفسیات کے بارے میں مکمل بے خبری اور عدم واقفیت کا مظاہرہ کر رہے ہیں، یہاں سیاست کی شپرہ چشمی اور جابر و سفاک طاقت کی کرختگی اور اکھڑپن بالکل اسی انداز میں نظر آتا ہے جیسا کسی نصابی کتاب میں درج ہوتا ہے۔ فلسطین کے صیہونی، یہودی نوآبادکار نظری اور عملی دونوں سطحوں پر شاید یہ توقع رکھتے تھے کہ اگر فلسطینیوں کو نظرانداز کر دیا جائے، انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے یا ان سے پہلوتہی کی جائے تو وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں گے، منظر سے غائب ہو جائیں گے یا انھیں پریشان نہیں کریں گے۔ بعدازاں انھیں خیال آیا کہ اگر فلسطینیوں کو جسمانی ایذائیں پہنچائی جائیں اور انھیں تشدد کا نشانہ بنایا جائے تو وہ صیہونیت کے سامنے سرِتسلیم خم کر دیں گے۔ 1948ء کے بعد مملکت اسرائیل نے مقامی عرب آبادی کو خود اپنے انسانی آثار اور نشانات مٹانے کے لیے استعمال کیا۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ (مار مار کر) انھیں انسانوں کے ایک ایسے طبقے میں تبدیل کر دیا جائے جن کے پاس سوچنے کے لیے اپنا دماغ نہ ہو، جو بمشکل حرکت کر سکیں اور مکمل طور پر مطیع و فرمانبردار رعایا بن جائیں۔ 1967ء کی جنگ کے بعد مغربی کنارے، جولان کی پہاڑیوں، غزہ کی پٹی اور سینائی کے مقبوضہ عرب علاقوں میں سفاکی، شقاوت اور درندگی نے ننگا ناچ ناچا۔

ایذارسانی کا کون سا طریقہ تھا جو عربوں کے خلاف آزمایا نہیں گیا۔ انھیں عقوبت گاہوں[1] میں پابندِ سلاسل رکھا گیا۔ ملک بدر کیا گیا، پورے پورے دیہات کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔[2] کیمیاوی ادویات چھڑک کر فصلوں اور درختوں کی ہریالی ختم کردی گئی۔[3] مکانات کو زمین بوس کردیا گیا، زمینیں ضبط کرلی گئیں۔ ہزاروں افراد پر مشتمل آبادیوں کی ''منتقلی'' عمل میں لائی گئی۔ تاہم (ان تمام ہتھکنڈوں کے باوجود فلسطینیوں کا وجود پھر بھی مٹایا نہ جاسکا اور نہ انھیں منظر سے اوجھل کیا جاسکا ہے۔ وہ موجود ہیں، خواہ دُنیا کی

---

① عقوبت گاہیں (Concentation Camps) یا حراست گاہیں: ایسی جگہوں کو کہتے ہیں جہاں ان افراد کو محبوس کیا جاتا ہے جو کسی حکومت کی مخالفت کرتے ہوں یا وہ سیاسی لحاظ سے مشکوک ہوں۔ ایسی عقوبت گاہوں کا آغاز برطانیہ نے انیسویں صدی میں جنوبی افریقہ میں جنگ بور کے دوران میں کیا تھا۔ ہٹلر نے انھیں پروان چڑھایا۔ بعض اشخاص کا دعویٰ ہے کہ نازی جرمنی میں ایسی دو ہزار عقوبت گاہیں قائم کی گئی جہاں یہودیوں اور حکومت مخالف افراد کو زیرِ حراست رکھا جاتا تھا۔ ان افراد پر کوئی مقدمہ نہیں چلایا جاتا تھا بلکہ اکثر کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا۔ ان عقوبت گاہوں میں سے بعض میں گیس چیمبر تعمیر کیے گئے اور ان گیس چیمبروں کو لوگوں کو اجتماعی طور پر ہلاک کرنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ صیہونیوں کا دعویٰ ہے کہ ان عقوبت گاہوں میں ساٹھ لاکھ یہودیوں کو لقمۂ اجل بنایا گیا۔

سوویت یونین نے اس قسم کی حراست گاہیں سائبیریا کے انتہائی ویران اور سرد علاقوں میں قائم کر رکھی ہیں۔ ویسے ان کا سلسلہ زاروں کے زمانے میں ہی شروع ہوگیا تھا۔ یہاں بھی حکومت کے مخالفین کو رکھا جاتا ہے۔ عام معنوں میں یہ لوگ محبوس نہیں کہلا سکتے لیکن یہ بھاگ کر بھی کہیں نہیں جاسکتے کیونکہ سیکڑوں میل تک آبادی اور ہریالی کے کہیں نشان تک نہیں ملتے۔ جو بھاگے گا، وہ سردی اور بھوک سے مرجائے گا۔ تاہم ان حراست گاہوں میں قیدیوں سے زبردست مشقت لی جاتی ہے۔

② حال ہی میں کمیل نصر، ڈینا لارنس اور روز میری رتھرنے، جو امریکا کی مختلف یونیورسٹیوں میں پروفیسر کے عہدوں پر فائز ہیں، اسرائیل اور مقبوضہ عرب علاقوں کا دورہ کیا اور بیس صفحات پر مشتمل ایک رپورٹ شائع کی ہے۔ اس رپورٹ میں نہایت لرزہ خیز انکشافات کیے گئے ہیں۔ رپورٹ کے مطابق مغربی کنارے اور غزہ کے شہریوں کو ناکردہ جرائم کا اعتراف کرنے کے لیے ''نہایت منظم طریقے سے ایذائیں پہنچائی جاتی ہیں۔'' بچوں سے ایسے افعال کے ارتکاب کا اعتراف کرایا جاتا ہے جو ان سے سرزد ہی نہیں ہوئے ہوتے اور ان اعترافات کو عبرانی زبان میں قلم بند کیا جاتا ہے جو وہ پڑھ ہی نہیں سکتے۔ رپورٹ کے مطابق ''بچوں کو ڈرایا دھمکایا جاتا ہے، انھیں ذلیل کیا جاتا ہے، ان پر جسمانی تشدد کیا جاتا ہے، انھیں گالیاں دی جاتی ہیں۔ انھیں تھپڑ مارے جاتے ہی، غسلخانے جانے نہیں دیا جاتا۔ گھنٹوں ان کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی رہتی ہیں۔ انھیں مکوں، رسوں اور لاٹھیوں سے پیٹا جاتا ہے۔ انھیں کئی کئی دن کھانے کو بھی کچھ نہیں دیا جاتا۔ گھنٹوں انھیں چھتوں سے لٹکایا جاتا ہے۔ ان پر جنسی تشدد سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔'' (روزنامہ ''نیشن'' مؤرخہ 11 ستمبر 1987ء لاہور)

③ مثلاً فرانسیسی اخبار ''Le Nouvel Observateur'' کے تین جولائی 1972 کے شمارے کے مطابق مغربی کنارے کے گاؤں ''اکرابہ'' میں 28 اپریل 1972ء کو ہوائی جہاز کے ذریعے کیمیاوی مادے کا چھڑکاؤ کر کے گندم کی فصل بالکل برباد کردی گئی۔

نگاہوں میں وہ لفظوں کی ایک ترکیب ''فلسطینی مسئلہ''......کی حیثیت ہی سے مصروف کار ہیں اور یہ وہ مسئلہ ہے جس کے متعلق ہمیں بتایا جاتا ہے کہ یہ اسرائیل اور عرب ممالک کے مابین آخری ناقابلِ عبور کھائی کی علامت بنا ہوا ہے۔

میرا مسئلہ فلسطینی بقا ہے۔ پہلے بڑی بڑی مشکلات پر غور فرمائیں۔ فلسطینیوں کا طبقہ وہ طبقہ ہے جو انتشار وافتراق کا شکار ہے یہ مختلف ممالک اور خطوں میں بکھرا ہوا ہے، اس کے پاس کوئی ایسا علاقہ نہیں جہاں اسے اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہو، اسے مسلسل ومتواتر صیہونی ظلم وستم اور عالمی بے اعتنائی سے واسطہ پڑا رہا ہے۔ اسے (اس سے مشورہ کیے بغیر) غیر حاضر یا بالکل ہی منفی ''انٹرلوکوٹر''[1] کا کردار سونپ دیا گیا ہے اور اس کا دل چاہے یا نہ چاہے، اس کا کام یہ ہے کہ وہ بین العرب حرکی قوتوں[2] کے جوڑ توڑ، عظیم طاقتوں کی مسابقت اور محاذ آرائی اور مختلف علاقائی نظریاتی طاقتوں کی کشمکشوں میں کسی نہ کسی طور پر ضرور شریک ہو۔ اسے ہر طرف سے محکومی اور بیخ کنی کا اندیشہ دامن گیر رہتا ہے۔ تاہم موجود ناگوار اور غیر موافق حالات میں اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ وہ ایک مکمل طور پر متحد فلسطینی خود ادعائی Self Assertion کا اظہار کر سکیں گے......اس خود ادعائی کا اظہار صرف انھیں صورتوں میں ممکن ہے کہ لفاظی سے کام لیا جائے، انفرادی سطح پر لوگ تنگ آمد بجنگ آمد کوئی کارنامہ سرانجام دیں لیکن ان کاموں میں بھی ان کا ارادہ دوسرے لوگوں کے ارادے سے قطعی مختلف ہوسکتا ہے۔ جن ممالک میں وہ بطور مہمان مقیم ہیں، ان کے ساتھ ارادتاً لیکن انجام کار خطرناک محاذ آرائی شروع کر دیں......آپ فلسطینیوں کے علاوہ، جس کا میں نے ذرا ہی پہلے ذکر کیا ہے۔ کوئی ایسی صورتِ حال نہیں جسے جامع فلسطینی صورتِ حال کہا جاسکے مثلاً لبنان ہی کو لیں۔ وہاں مسلح فلسطینی خاصے وسیع پیمانے پر موجود ہیں اور ان کی اس موجودگی کی علامت وہ اختیار ہے جو (لبنان کے اندرونی معاملات میں) تنظیم آزادی فلسطین کو حاصل ہے لیکن اصلاً لبنان کی تکمیل شام کے ہاتھ میں ہے، اس لیے شاہ مات دینے کا اختیار بھی اسی کے پاس ہے۔ چنانچہ لبنان میں تنظیم آزادی فلسطین جس صورتِ حال سے دوچار ہے، شام کو اس میں دخیل ہونے کا موقع میسر آتا رہتا ہے۔ ادھر اردن میں جو فلسطینی مقیم ہیں، انھیں اردن کی شہریت اختیار

---

① انٹرلوکوٹر (interlocutor): ناچ اور گانے کے ایک پروگرام منسٹرل Ministrel میں، جس کے کردار وحشیوں کی طرح اپنے منہ کالے کر لیتے ہیں، ایک کردار ہوتا ہے۔ خود یہ درمیان میں ہوتا ہے اور اس کے دونوں اطراف دو اور کردار ہوتے ہیں۔ اس کا کام ان دونوں کرداروں کے ساتھ جگت بازی، ٹھٹھہ مخول اور دل لگی کرنا ہوتا ہے۔

② حرکی قوتیں (Dynamics): وہ طبعی، ذہنی یا اخلاقی قوتیں جو ایک مقررہ دائرے کے اندر حرکت، عمل اور تغیر کا باعث بنتی ہے۔

کرنے کا حق تو حاصل ہے لیکن وہاں کی حکومت جس طرح ان کے امور میں دخیل ہوتی رہتی ہے (خودمختار مملکتوں کو یہ خصوصی حق حاصل ہے کہ وہ ان باشندوں کو، جو اس کی حدود کے اندر رہائش پذیر ہیں، اپنے احکام کے تابع بنا سکیں، اس لیے اردن بھی اس حق کو استعمال کرتا ہے)، وہ فلسطینیوں کے لیے خاصی تکلیف دہ بات ہے، کیونکہ وہ اس جنگ کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے جو 71-1970ء میں اردن نے ان کے خلاف برپا کی تھی (اردن نے اسرائیل کی انتقامی کارروائیوں سے بچنے کے لیے فلسطینیوں کا کچومر نکال دیا تھا کیونکہ فلسطینیوں نے اسرائیل کے خلاف اپنی کارروائیوں کے لیے اردن کو اڈا بنا رکھا تھا) جہاں تک عراق اور عرب خلیجی ریاستوں میں مقیم فلسطینیوں کا تعلق ہے اگرچہ ان میں سے بعض بہت نمایاں اور مقتدر حیثیت کے مالک ہیں، لیکن انھیں بھی انھی قوانین کی اطاعت کرنا پڑتی ہے جو خود مقامی باشندوں کے لیے شہری آزادیوں کے استعمال کو ناممکن بنا دیتے ہیں۔ مغربی کنارے اور غزہ کے فلسطینی عربوں اور نام نہاد اسرائیلی عربوں کے گرد قوانین اور تسلط و تغلب کا ایک ایسا جال بُن دیا گیا ہے کہ ان کے لیے اپنی اجتماعی صورتِ حال کو) اپنے اردن اور لبنان میں مقیم بہن بھائیوں کی صورتِ حال کے موافق بنانا قریب قریب ایک ناممکن امر بن گیا ہے۔

اپنا تشخص برقرار رکھنے کے لیے ہر فلسطینی طبقے کو کم از کم دو سطحوں پر لازماً جدوجہد کرنا ہوگی۔

اول: ایسے فلسطینیوں کی حیثیت سے جن کی صیہونیت کے ساتھ تاریخی مڈبھیڑ ہوئی اور اس مڈبھیڑ کے نتیجے کے طور پر انھیں اچانک اور بہ عجلت اپنے وطن سے محروم ہونا پڑا۔

دوم: ایسے فلسطینیوں کی حیثیت سے، جو دُنیا کے مختلف ممالک میں آباد ہیں اور جنھیں اپنی روزمرہ کی زندگی کے وجودی ماحول میں اس دباؤ کے خلاف اپنا ردِ عمل ظاہر کرنا پڑتا ہے، جو ان پر اس ملک میں پڑتا ہے، جسے انھوں نے اپنا مستقر بنالیا ہے۔

کسی بھی فلسطینی کا ایک فلسطینی کی حیثیت سے کوئی ملک نہیں ہے۔ یہ البتہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ جس ملک میں وہ مقیم ہے، اس کا وہ ایک باشندہ تو ہے لیکن اس کے ساتھ اس کا دلی لگاؤ کوئی نہیں۔ جس طرح اردنی، شامی اور مغربی کنارے کے فلسطینی ہیں، اسی طرح لبنانی فلسطینی اور امریکی فلسطینی بھی ہیں۔ اسرائیلی یہودیوں یا دیگر عربوں کے مقابلے میں ان کی تعداد میں نسبتاً زیادہ اضافہ ہو رہا ہے۔ گویا پیچیدگیوں میں جو اضافہ ہو رہا ہے، اس کا دائرہ کار اجسام کی تعداد میں اضافے تک پھیلتا جا رہا ہے۔ آج نیویارک یا عمان جیسے مقامات پر بھی جن فلسطینی بچوں کی پیدائش ہو رہی ہے، وہ بھی اپنی شناخت اس حوالے سے کراتے ہیں کہ ان کا ''تعلق'' شفاء العمرو یا بیت المقدس یا طبریہ سے ہے۔ یہ دعاوی قریب قریب بے معنی ہیں سوائے اس کے کہ وہ متناقض طور پر فلسطینی موجودگی کے سلسلۂ نسب میں، جس نے تاریخ اور جغرافیہ کی منطق کے علی الرغم اپنے آپ کو قائم کر

رکھا ہے، اضافہ کیے جا رہے ہیں۔ ① اس کی وجہ یہ ہے کہ فلسطینیوں کو زمان و مکان کے اجتماع ضدین کے نہایت ٹھوس سانچوں کے استعمال کے ذریعے جزئیات اور حقائق کا ادراک حاصل ہے۔ اس سانچے کا آغاز فلسطین میں ہوتا ہے جہاں زمین کا ایک ٹکڑا تھا، ایک گھر تھا، ایک علاقہ تھا، ایک گاؤں تھا، وہاں شاید صرف ایک ہی آجر تھا۔ جزوی طور پر یہ چیزیں حقیقی تھیں اور جزوی طور پر ان پر دیومالائی رنگ چڑھ گیا ہے۔ پھر منظر بدلتا ہے۔ اب یہ سانچہ فلسطین سے باہر نکلتا ہے۔ اب اس میں یہ احساس شامل ہونے لگتا ہے کہ ایک اجتماعی قومی شناخت کا فقدان پیدا ہوگیا ہے (اس فقدان کا احساس ان لوگوں کو بھی ہوجاتا ہے جو قدیم فلسطین میں ہی مقیم رہتے ہیں۔) ٹھوس جلاوطنی کا آغاز ہوتا ہے۔ اب اس کا ہر دم، ہر آن ایسے قوانین سے براہِ راست تصادم ہوتا ہے جو صرف فلسطینیوں کے لیے بنائے جاتے ہیں (بعد میں اس تصادم نے مختلف صورت اختیار کرلی۔ اب براہِ راست تصادم کم ہی ہوتا ہے، البتہ ان سے پہلو بچانے کے لیے ذہانت اور مہارت استعمال کی جاتی ہے۔) انجام کار اس سانچے کی صورت میں کچھ تبدیلی آتی ہے۔ اب اس میں نئے سرے سے امید کے رنگ بھرنا شروع ہوگئے ہیں، فلسطینیوں نے کچھ کارنامے بھی سرانجام دیے ہیں، ان پر فخر و مباہات کا اظہار کیا جاتا ہے، یہ اظہار بھی اس سانچے کا ایک حصہ بن جاتا ہے لیکن مخالفت و مخاصمت ہر جگہ موجود ہے۔ چنانچہ 1948ء کے بعد جس بچے نے بھی اس دُنیا میں آنکھ کھولی ہے، اس نے گم شدہ فلسطین کے ساتھ اپنے اصل تعلق کا اظہار بہ شدّت کیا ہے۔ یہ اس بات کی علامتی شہادت ہے کہ اتنا کچھ بیت جانے کے باوجود فلسطینی اپنا وجود برقرار رکھنے میں کامیاب رہے ہیں، چنانچہ اگر 1948ء کا سال وجود میں نہ آتا، تو یہ بچہ یا بچی فلسطین ہی میں پیدا ہوتی ہے۔ یہ تو جذباتی پہلو ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہر وہ بچہ جو 1948ء کے بعد پیدا ہوا، اپنے سینے میں اپنے والدین کی دربدر کی ٹھوکروں اور آزمائشوں کو اپنے سینے میں سموئے ہوئے ہے۔ اس کے باوجود ایک ایسا فرد بھی ہے جو اس قابل ہے کہ مستقبل کے بارے میں ہماری جدّوجہد جاری ہے، اس کا وہ اظہار کرسکتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے اندر سے یہ بتا سکتا ہے کہ یہ مستقبل وہ خود ہی ہے۔

---

① فلسطین میں جب اسرائیل قائم ہوگیا تو اکثر فلسطینیوں کو اپنے وطن سے دیس نکالا مل گیا، اور وہ دُنیا کے مختلف ممالک میں بکھر گئے۔ چنانچہ جغرافیہ کی منطق کے مطابق دُنیا میں فلسطین کے نام کا کوئی ملک موجود نہیں اور تاریخ کی منطق یہ کہے گی کہ جب فلسطین ہی نہیں رہا تو فلسطینیوں کی قوم کا وجود بھی مٹ گیا۔ لیکن فلسطینی ہیں کہ وہ کہیں بھی کیوں نہ ہوں اپنے آپ کو فلسطینی ہی کہلانے پر اصرار کرتے ہیں اور متناقض بات یہ ہے کہ ان کے دھڑا دھڑ جو بچے پیدا ہو رہے ہیں، وہ بھی فلسطینی شناخت سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں۔ یوں تاریخ اور جغرافیہ کی منطق کے علی الرغم فلسطینی تعداد کے اعتبار سے بڑھتے جا رہے ہیں، چہ جائیکہ وہ مٹ جائیں۔

تاریخ میں جو دوسرے لوگ بے گھر اور بے در ہوئے، چند ظاہری صورتوں کے سوا ان کا بیسویں صدی کے فلسطینیوں کے ساتھ موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ مسئلہ یہ نہیں کہ کس نے زیادہ مصائب جھیلے یا کس نے زیادہ نقصانات برداشت کیے۔ ایسے موازنے بنیادی طور پر نازیبا اور ناروا ہیں، جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں، اس کا مطلب یہ ہے کہ روئے زمین پر کوئی دوسری قوم ایسی نہیں جس پر...... عزائم خواہ نیک ہوں یا بد...... اتنے کثیر التعداد، لیکن جو دسترس سے باہر اور سمجھ سے بالا ہیں، مفاہیم کا بار لاد دیا گیا ہو جتنا کہ فلسطینیوں پر لادا گیا ہے۔ یہودیوں کے انٹرلوکوٹروں (Interlocutors) کی حیثیت سے صیہونیت اور انجام کار سیاسی اور بلکہ روحانی یہودیت کے ساتھ بھی اس کے تعلق نے ان پر ایک مہیب بارگراں لاد دیا ہے۔ پھر ان کے اسلام، عرب قوم پرستی، تیسری دُنیا کی سامراج اور نوآبادیات کے خلاف جدوجہد، عالم عیسائیت (اس کی ارضِ فلسطین کے ساتھ اپنی فقید المثال تاریخی اور وابستگی کے ہمراہ) مارکسسٹوں اور دُنیائے سوشلزم کے ساتھ کچھ نہ کچھ تعلقات، کچھ نہ کچھ روابط ہیں...... یہ تمام چیزیں مل ملا کر تشریحات و تعبیرات کے اتنے دروازے کھول دیتی ہیں اور فلسطینیوں کے تشخص کو وہ اتنے خانوں میں تقسیم کر دیتی ہیں کہ جن کی جدید سیاسی اور ثقافتی تاریخ میں عملاً کوئی مثال نہیں ملتی...... یہ ہے وہ حقیقت جو اس لیے مرعوب کن حد تک اور بھی گراں بار ہو جاتی ہے کیونکہ یہ منفی رویوں اور اگر مگر کی پیچیدگیوں میں سے چھن کر آتی ہے۔ یہ بالکل واضح ہے کہ ہم فلسطینی اپنے حق خودارادیت کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں لیکن پیچ یہ آن پڑا ہے کہ ہمارے پاس کوئی جگہ نہیں، ہماری دسترس میں کوئی متفقہ خطہ زمین نہیں جس پر ہم اپنی جدوجہد کو پروان چڑھا سکیں۔ جس قسم کی جدوجہد میں ہم مصروف ہیں، اس نے واضح طور پر ہمیں استعمار دشمن اور نسل پرستی کے مخالف بنا دیا ہے لیکن یہاں بھی مصیبت یہ آن پڑی ہے کہ جو لوگ ہمارے مخالف ہیں، تاریخی طور پر وہ نسل پرستی کے سب سے بڑے نخچیر ہیں اور شاید ہمیں اپنی جدوجہد جدید تاریخ کے ایک ایسے دور میں کرنا پڑ رہی ہے جو بہت کڈھب اور بعد از استعمار دور ہے۔

صاف عیاں ہے کہ ہماری جدوجہد ایک بہتر مستقبل کے لیے ہے لیکن یہاں بھی پیچ یہ آن پڑا ہے کہ وہ مملکت، جو ہمیں ہمارا اپنا مستقبل بنانے سے روک رہی ہے، پہلے یہ اپنی حرماں نصیب قوم کے لیے ایک مستقبل فراہم کر چکی ہے۔ ہم عرب ضرور ہیں لیکن محض عرب نہیں ہیں۔ ہم جلاوطن ضرور ہیں لیکن جن ممالک میں ہم اپنی جلاوطنی کے دن کاٹ رہے ہیں، وہ ہمیں مہمان کا درجہ دے کر ہمیں برداشت کر رہے ہیں۔ ہم اقوامِ متحدہ کے اجلاسوں میں اپنے دکھڑے ضرور سنا سکتے ہیں لیکن صرف مبصرین کی حیثیت سے۔ کسی بھی ایسی قوم کے متعلق، جس کی بے گھری اور بے دری کے متعلق قطعاً کوئی ابہام نہیں پایا جاتا، کوئی امریکی صدر (اس

دور میں بھی جب کہ انسانی حقوق اور ولسن ① کے وضع کردہ حق خود ارادیت میں اتنی دلچسپی لی جا رہی ہے) جس نے یقینی طور پر کسی جیتے جاگتے، گوشت پوست کے بنے ہوئے اصلی فلسطینی کو نہ تو کبھی شرفِ ملاقات بخشا ہے اور نہ کبھی اس سے گفتگو کی ہے، محتاط انداز سے بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہمیں (یعنی فلسطینیوں کو) اپنے مستقبل کو طے کرنے کے عمل میں شریک ہونا چاہیے (اس لفظ ''خود ارادیت'' کے گرد بیلے رقص کے انداز میں جو بھدے قدم حرکت کر رہے ہیں، وہ کتنے مضحک، بدصورت اور بے ڈھنگے ہیں۔) چنانچہ ہر امریکی صدر کی حکومت نے ایسی پالیسیوں پر ہی عمل کیا ہے جن کا سراسر مقصد یہ ہے کہ فلسطینیوں کو ان میں شریک ہونے سے روکنا ہے۔ دُنیا کا کوئی ایسا قومی گروہ روئے زمین پر موجود نہیں جس کے سیاسی اور ثقافتی عدم وجود کے متعلق اس پر ستم ڈھانے والوں نے اتنی طویل اور بلند آہنگ غوغا آرائی کی ہو بیشک یہ ''ناقوم'' اپنے ستم شعاروں کے خلاف احتجاج کرتی رہے، جوشیلی تقریریں کرتی رہے اور ان کے خلاف سر دھڑ کی بازی لگائے رکھے، جہاں تک فلسطینیوں کا تعلق ہے ''ضرورت سے زیادہ'' ''بالکل نہیں'' اور ''تقریباً اگر ایسا نہ ہوتا'' جیسی تراکیب نامحسوس طور پر ایک دوسرے میں ضم ہو جاتی ہیں اور اس کی بھاری قیمت بھی انھیں ہی ادا کرنا پڑتی ہے۔

بنیادی طور پر یہ نفسیاتی مشکلات نہیں ہیں، تاہم ان کے نفسیاتی عواقب ضرور ہیں لیکن میں یہاں جن مشکلات کا ذکر کر رہا ہوں، وہ حقیقی تاریخی اور مادی مشکلات ہیں۔ یہی وہ مشکلات ہیں، جنھوں نے مظلوم فلسطینیوں کے مقدر کو اتنا غیر معمولی بنا دیا ہے۔ ان کی تاریخ اور معاصریت ② مکعبی ③ ہے۔ تمام دخیل کار

---

① ولسن: ٹامس وڈرو ولسن (1856-1924ء): امریکی صدر (1913-21ء) انھوں نے جنگِ عظیم اول کے اختتام پر دُنیا میں مستقل امن قائم کرنے کے لیے چودہ نکات پیش کیے۔ ان میں سے ایک نکتہ قوموں کے حق خود ارادیت کے متعلق تھا لیکن یورپ کے حریص سیاستدان نہ صرف اپنی نو آبادیات سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھے، بلکہ وہ تو جرمنی اور ترکی کی نو آبادیات پر بھی اپنے پنجے گاڑنے کے لیے پر تول رہے تھے، بلکہ وہ تو جرمنی اور ترکی کی نو آبادیات پر بھی اپنے پنجے گاڑنے کے لیے پر تول رہے تھے، چنانچہ انھوں نے ولسن کی ایک نہ سنی، تاہم وہ ولسن کی تجویز پر لیگ آف نیشنز (جمعیت اقوام) قائم کرنے پر ضرور رضامند ہو گئے لیکن ان کے اپنے ہی ملک کی کانگریس نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور یہی صدمہ ان کی موت کا سبب بنا۔

② معاصر صورتِ حال

③ مکعبی (Cubistic) مکعبیت (Cubism): دراصل ایک قسم کی مصوری ہے جس میں اشیا کا خاکہ آسان طریقے سے پیش کیا جاتا ہے اس میں ایک شے بلاک، آئس کریم کون (CONE) یا گول گیند کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ مثلاً ایک مصور کو بوتل جیسی ایک بالکل فطری شے نظر آتی ہے لیکن جب کینوس پر وہ اس کی تصویر بناتا ہے تو اس بوتل کو وہ مخروطی کے بجائے تکونی شکل دے دیتا ہے۔ مکعبیت کا مقصد یہ ہے وہ اشیا کی تصویر وہ بنائی جائے جو مصور کے نقطۂ نظر کے مطابق اس کی بہترین......

سطحیں کبھی ایک قلم رو اور کبھی دوسری قلم رو...... ثقافت کی قلم رو، سیاسی امور کی قلم رو، نظریاتی تشکیل کی قلم رو، قومی نظم کی قلم رو...... میں اچانک گھس جاتی ہیں اور یوں وہ اپنی شناخت ایک مسئلے کے طور پر کراتی ہیں...... اس طرح جو مسائل وجود میں آتے ہیں، وہ حقیقی مسائل ہیں، یہ سبھی مسائل توجہ مانگتے ہیں، کبھی وہ منت ساجت کرتے ہیں کبھی پُرزور مطالبہ کرتے ہیں کہ ان کی ذمہ داری قبول کی جائے چنانچہ آج فلسطینی واقعیت کی یہ جو مجنونانہ حد تک اتنی سطحیں اور ان سطحوں کے پیدا کردہ مسائل ہیں، وہ اس بھرپور ایجنڈے کا حصہ ہیں، جس کی شقوں پر اگر انفرادی طور پر غور کیا جائے تو ان کی سمجھ میں آنے کا امکان موجود ہے لیکن اگر اس ایجنڈے کا بحیثیت مجموعی جائزہ لیا جائے تو پولیٹیکل سائنس کے بڑے بڑے ماہرین کی گھگھی بندھ جائے۔ غزہ اور مغربی کنارے اور خود اسرائیل میں سکونت پذیر فلسطینیوں کے مسائل کو جنھوں نے ابھی ابھی سر اٹھانا شروع کیا ہے لیکن جن کی نوعیت بہر حال جداگانہ ہے، تو فی الحال ایک طرف رکھیں، تنظیم آزادی فلسطین کو روزانہ سعودی عرب، چین اور روس کے ساتھ اپنے تعلقات کے بارے میں فیصلہ کرنا پڑتے ہیں، پھر ہر عرب ملک کے ساتھ، جن میں شام اور مصر بھی شامل ہیں اور جہاں فلسطینیوں کے اچھے خاصے سیاسی مفادات داؤں پر لگے ہوئے ہیں، روابط کے متعلق اچھے خاصے سیاسی مفادات داؤ پر لگے ہوئے ہیں، روابط کے متعلق فیصلے الگ منتظر رہتے ہیں۔ معاملہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ اقوامِ متحدہ اور اس کی ذیلی تنظیموں میں تنظیم آزادی فلسطین کے امور کا مسئلہ اپنی جگہ پر ہے۔ انھیں روزانہ خوراک پہنچانا، ان کے بچوں کے لیے تعلیم کا بندوبست کرنا، انھیں مسلح کرنا، ان کی ترتیب کرنا اور انھیں معلومات فراہم کرنا ہوتا ہے۔ ان تمام امور کو احسن طریقے سے سرانجام دینا آسان کام نہیں ہے۔ ہر آن شامی فوج، لبنان کے دائیں بازو اور ان کے مقامی اتحادیوں کے ساتھ مڈبھیڑ کا اندیشہ رہتا ہے۔ پھر خود فلسطینی مختلف طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ہر طبقے کی اپنی معینہ ترجیحات ہیں۔ چنانچہ ان مختلف طبقات کے مابین تعلقات کو فروغ دینا، ان کے مابین کشیدگی کو کم کرنا یا ختم کرنا اور ان کے مابین اتحاد قائم کرنا، یہ مسائل اپنی جگہ پر ہیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسرائیل پر، جس

......تصویر ہو سکتی ہے، نہ کہ وہ جو کہ وہ حقیقت میں نظر آتی ہے۔ اس سے ہمیں اس شے کا تاثر ملتا ہے کہ یہ چیز ہے کیا لیکن ساری چیز کو دیکھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ مکعبیت میں چیزوں کی صورتیں اور شکلیں چپٹی ہوتی ہیں اور زاویوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ان میں حقیقی سہ جہتی کیفیت شاذ و نادر ہی ہوتی ہے۔

مکعبیت کا آغاز پابلو پکاسو اور کچھ دوسرے مصوروں نے کیا تھا۔ 1910ء اور 1920ء کے درمیانی سالوں میں اس نے بہت فروغ پایا۔ فلسطینیوں کی صورتِ حال اس لیے مکعبی ہے کہ انھیں جو گوناگوں مسائل درپیش ہیں، وہ کوئی واضح شکل اختیار نہیں کر سکتے اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتھا بھی نظر آتے ہیں۔

کی سرحدیں فلسطینی جلاوطنوں کے لیے بہت دور ہیں اور جن تک پہنچنا بہت دشوار نظر آتا ہے، مسلسل دباؤ کیسے برقرار رکھا جائے۔ چنانچہ فلسطینی نفس میں ہم جس قسم کے بھی نفسیاتی مسائل دریافت کرنے کے آرزومند ہوں...... وہ لوگ جو اپنے آپ کو فلسطینی امور کے ''ماہرین'' تصور کرتے ہیں اور ان کے قومی کردار کا تجزیہ کرتے رہتے ہیں، ان کے ہاتھ یہ نیا مشغلہ آ گیا ہے...... میرے خیال میں ان کی نوعیت ان کی ہم سرمادی ضروریات کی اس زنجیر کے مقابلے میں بالکل عارضی ہے، اس لیے ان پر اتنی توجہ دینے کا کوئی جواز نہیں۔

1948ء سے فلسطینی لغوی طور پر جس الجھن میں گرفتار ہیں، وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص بہر حال فلسطینی ہے تو وہ کسی نہ کسی قسم کے یوٹوپیا① ...... حقیقتاً ایسا مقام جس کا کوئی وجود نہیں...... میں ضرور رہ رہا ہے۔ چنانچہ بالکل اتنا ہی لغوی طور پر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ آج فلسطینی جس جدّوجہد میں مصروف ہیں، وہ فی زمانہ ایک ایسا رُخ اختیار کر چکی ہے کہ دُنیا کا تقریباً ہر شخص اس میں دلچسپی لینے پر مجبور ہے اور یہ صورتِ حال اس امر کی وضاحت کرتی ہے جس کا ذکر میں بعد ازاں کروں گا کہ فلسطینی سیاست میں تبدیلی کیسے رونما ہوئی اور وہ کس طرح خیالوں کی دُنیا سے نکل کر ایک ایسے موڑ پر پہنچ گئی کہ اب اس نے ایک نہایت مؤثر صورت اختیار کر لی ہے۔ فلسطینی زندگی کی مکعبی صورت کا ایک پہلو، جو متعدد غلطیوں کی تلافی کر دیتا ہے، یہ ہے کہ فلسطینیوں نے اپنی منزل ایک ایسے علاقے یا خطے کا حصول قرار دے دیا ہے جہاں وہ ایک قوم کی حیثیت سے آباد ہو سکیں۔ محض یہ حقیقت کہ ماضی میں وہ اس قسم کے ایک خطے میں سکونت پذیر تھے یا موجودہ زمانے کی یہ حقیقت کہ اب وہ ''ناشخاص'' بن چکے ہیں، فی زمانہ ان میں اپنے برحق ہونے کا نہ تو اتنا احساس پیدا کرتی ہے اور نہ ان میں وہ غیظ و غضب کی کیفیت ابھارتی ہے، جو انھیں مسلسل جدّوجہد پر اکسانے کے لیے کافی ہو۔ 1967ء کی جنگ نے، اور ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ صیہونیوں کی طرف سے مزید فلسطینی علاقوں کے حصول نے جلاوطن اور مختلف مقامات پر بکھرے ہوئے فلسطینیوں کا اپنے علاقے سے رابطہ قائم کر دیا ہے۔ صیہونیوں نے فلسطینیوں کے قومی وجود کو مٹانے کے لیے پیچ در پیچ قواعد و ضوابط کی ان بھول بھلیاں تشکیل کی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ قواعد و ضوابط کی ان بھول بھلیوں کے ذریعے وہ فلسطینیوں کو اپنے وطن میں ٹکنے نہیں دیں گے۔ انھیں دُنیا کے مختلف ممالک میں منتشر ہونے پر مجبور کر دیں گے اور یوں ان کی وحشیانہ موجودگی سے چھٹکارا حاصل کر لیں گے۔ وہ ان سے سلوک بھی اس طور کرتے تھے گویا کہ وہ وہاں موجود ہی نہیں۔ اب تک یہ پالیسی خفیہ تھی اور اس پر عمل بھی رازداری سے ہوتا تھا لیکن 1967ء کے بعد ان کی قلعی کھل گئی اور اپنی اس پالیسی پر وہ کھلے بندوں عمل کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اب اسرائیل کی نئی حدود کے اندر لاکھوں فلسطینی تھے اور صریحی طور پر ان کے سروں پر اسرائیل سوار تھا جس نے پوری دُنیا کی نظروں کے سامنے جو فوجی قبضے کے معنی و

مفہوم کو سمجھتی تھی، ان پر حکومت کرنے کے لیے فوجی حکومت قائم کر دی۔ فلسطینیوں کو امن کی جو تلاش تھی اس نے اب ٹھوس معانی اختیار کر لیے، جو یہ تھے کہ (مقبوضہ علاقوں سے) اسرائیلی قبضے کو ختم کیا جائے۔ ساری علاقائی گتھی کو سلجھانے کے تمام امکانی حلوں کے فریم ورک میں فلسطینیوں کے حقِ خود ارادیت کا انحصار زیادہ تر اس ضرورت پر ہے کہ فلسطین کے اصل قدیم علاقے کے ایک حصے کو آزاد کرا کر وہاں ایک خودمختار اور آزاد مملکت قائم کی جائے۔

تاہم اگر فلسطینی مسئلہ محض اتنا سا ہوتا تو اس سے بہت زیادہ آسانی سے نپٹا جا سکتا تھا۔ ایک نعرے کی حیثیت سے جو سب کو ایک مقام پر اکٹھا کر دے، فلسطین کی ایک کہیں بڑی بین العرب اور بین الاقوامی (بین الفلسطینی جہت کا ذکر فی الحال چھوڑیں) جہت ہے۔ کسی بھی شخص کے ذہن میں، جس نے ایک حمایتی کی حیثیت سے اپنی توانائیاں صرف کی ہیں، اس بارے میں مطلق کوئی شبہ نہیں پایا جاتا کہ ''فلسطین'' نے بے شمار دوسرے مسائل کی لگامیں ڈھیلی کر دی ہیں۔ یہ لفظ معاشرتی ناانصافی کے خلاف جدّوجہد کی علامت بن چکا ہے۔ 1970ء کے عشرے کے ابتدائی سالوں کے دوران میں مصری طلبہ کے جو مظاہرے ہوتے تھے، ان میں ایک نعرہ اکثر لگایا جاتا تھا اور وہ یہ تھا کہ ''ہم سب فلسطینی ہیں۔'' 1978ء میں شاہ کے خلاف ایرانی مظاہرین اپنا رشتہ فلسطینیوں کے ساتھ جوڑا کرتے تھے۔ غیر سفید فام دُنیا میں یہ شعور عام ہو گیا ہے کہ سیاستِ جدید میں عوام کے جمِ غفیر پر اس طور حکومت کرنے کا جو رجحان در آیا ہے کہ انھیں (آسانی سے) ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جا سکتا ہے، وہ صدائے احتجاج بلند نہیں کرتے، چوں تک نہیں کرتے اور خاموش رہتے ہیں اور سیاسی طور پر غیر جانبدار ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں کسی واضح مثال کی ضرورت ہو تو جو کچھ فلسطینیوں پر بیتی، اس میں بآسانی مل سکے گی، اور اگر مزید مثالوں کی تلاش ہو تو ان نوآزاد ممالک کو لے لیں جو پہلے استعماری طاقتوں کے زیرِ نگیں تھے اور اب جن پر جمہوریت مخالف فوجی حکومتیں مسلط ہیں۔ اب دیکھ لیں ان کے عوام کے ساتھ مختلف طریقوں سے کیا سلوک ہو رہا ہے۔[1] وہ اگروہ جو کسی نہ کسی قسم کی مزاحمتی تحریکوں میں حصہ

---

① یوٹوپیا (Utopia): یہ لفظ ایک ایسے خیالی ملک کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جہاں ہر چیز کامل ہو...... جہاں کے باشندے مکمل اتحاد و یگانگت کی فضا میں رہتے ہوں، انھیں جس چیز کی بھی ضرورت پیش آئے، وہ انھیں بآسانی دستیاب ہو جائے اور جہاں مسرت اور شادمانی کے نقارے بجتے ہوں۔ اصل میں یہ ایک کتاب کا نام ہے جو ایک انگریز مصنف سر ٹامس مور (More) نے آج سے تقریباً سو سال قبل تحریر کی تھی۔ اس کتاب میں اس نے ایک ایسے ملک کا ذکر تفصیل سے بیان کیا ہے، جہاں کی ہر شے کامل تھی۔ متعدد مصنّفین نے مختلف ناموں کے تحت ایسے مقامات اور ممالک کا ذکر ہے انھیں باغ ارم یا باغِ عدن بھی کہا جا سکتا ہے۔ افلاطون نے ''جمہوریت'' میں ایک مثالی حکومت کا نقشہ کھینچا ہے۔ جیمز بلٹن نے اپنی کتاب......

لے رہے ہیں، اپنا مفاد اور قوت دونوں فلسطینی تحریک مزاحمت سے حاصل کرتے ہیں بلکہ اس سے بھی مفید تر بات یہ ہے کہ وہ اپنی تحریکوں کی جزئیات بھی فلسطینیوں ہی سے اخذ کرتے ہیں اور ان پر جو ظلم وستم ہوتا ہے اس کی چھوٹی سی چھوٹی تفصیل کے متعلق ان کا مثبت رویہ کیا ہونا چاہیے، وہ بھی انھیں فلسطینیوں ہی سے ملتا ہے اگر ہم فلسطین کے متعلق اس انداز سے سوچیں کہ یہ دو طرح کے فرائض سرانجام دے رہا ہے، ایک تو اس حیثیت سے کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں لوٹ کر جانا ہے اور دوسرے اس حیثیت سے کہ یہ ایک بالکل نئی جگہ ہوگی یعنی یہ جزوی طور پر ایک بحال شدہ ماضی اور جزوی طور پر ایک نئے اور انوکھے مستقبل کا تصور پیش کر رہا ہے یا یوں سمجھیں کہ غالباً ایک تاریخی سانحہ بھی ہے جو اپنی شکل وصورت تبدیل کر کے ایک بہتر مستقبل کی امید بن گیا ہے تو شاید ہم اس لفظ کے معانی بہتر طور پر سمجھ سکیں گے۔

جہاں تک فلسطینیوں کا تعلق ہے، ان کی سیاسی جدوجہد دو نقاط کے مابین جاری ہیں۔ ایک نقطے پر وہ فلسطینی ہیں جو اپنے وطن واپس لوٹنا چاہتے ہیں اور اپنی تاریخ، ثقافت، ورثے اور سیاسی حقیقت کے ساتھ کوئی نہ کوئی رابطہ استوار کرنے کے متمنی ہیں۔ دوسرے نقطے پر وہ فلسطینی ہیں جو ایک نئے اور انوکھے تجربے سے دوچار ہونے چاہتے ہیں۔ ان کی خواہش یہ ہے کہ ان کے وطن میں ایک نیا معاشرہ قائم ہو۔ یہ نیا معاشرہ مشتمل تو مختلف الخیال اور مختلف العقائد گروہوں پر ہوگا لیکن اصلاً جمہوری ہوگا۔ اس معاشرے میں جو حکومت قائم ہوگی۔ لوگوں کو نہ صرف سچی شہری آزادیاں حاصل ہوں گی بلکہ خود حکومت بھی نمائندہ اور ذمہ دار ہوگی۔ ان دونوں گروہوں کی یہ سوچ اگرچہ مختلف ہے لیکن اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ سوچ ہر فریق کے جغرافیائی ماحول کی مرہونِ منّت ہے، جس میں وہ رہ رہا ہے۔ وہ فلسطینی جو واضح طور پر جلاوطنی کی کیفیت میں ہیں، واپس لوٹنے کے متمنّی ہیں لیکن وہ فلسطینی جو اندرونی طور پر جلاوطن ہیں (یعنی یا تو خود اسرائیل کے اندر مقیم ہیں اور یا پھر فوجی قبضے کے تحت اپنی زندگی کے ایام گزار رہے ہیں،) وہاں، جہاں وہ رہائش پذیر ہیں، آزادی، خودمختاری اور حکومتی خوداختیاری حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ الجلیل یا جافہ کا ایک سابق باشندہ، جو اس وقت لبنان یا کویت میں پناہ گزین کی حیثیت سے سکونت پذیر ہے، بنیادی طور پر یوں سوچتا ہے کہ جب 1948ء یا اس کے بعد اسے اپنے وطن سے نکلنا پڑا، تو اس نے کیا کھویا تھا۔ وہ چاہتا ہے کہ یا تو اسے واپس فلسطین پہنچا دیا جائے اور یا پھر وہ وہاں لوٹنے کے لیے آمادۂ پیکار ہے۔ بہرحال اس کا مطمحِ نظر واپسی ہے۔ اس کے برعکس وہ

..... ''گمشدہ افق'' میں ایک مقام ''شنگریلا'' کا ذکر کیا ہے جہاں مدتوں کوئی شخص بوڑھا نہیں ہوتا۔ ہماری ''الف لیلہ'' اور ''داستانیں'' ایسی حکایات سے بھری پڑی ہیں جن میں ہر لحاظ سے مکمل مقامات کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

فلسطینی ہے، جو اس وقت بھی غزہ، الناصرہ یا نابلس میں مقیم ہے۔ اس کا قابض طاقت یا اس طاقت کے اختیارات کی علامات کے ساتھ روزانہ واسطہ پڑتا ہے یا اسے ان کے ہاتھوں تذلیل برداشت کرنا پڑتی ہے۔ اس قابض طاقت اور اس کے کارندوں نے اس پر جو بلا روک ٹوک تسلط و تغلب حاصل کر رکھا ہے، وہ چاہتا ہے کہ یہ بلا کسی نہ کسی طور اس کے سر سے ٹل جائے اور اسے اس سے نجات حاصل ہو جائے۔ پھر ایک عرب باشندہ وہ بھی ہے جو اندرونِ اسرائیل رہائش پذیر ہے کہ اُسے ''غیر یہودی'' سمجھا جاتا ہے یوں اس کی شناخت بھی منفی انداز سے ہوتی ہے اور اس کے ساتھ برتاؤ بھی منفی طرز کا ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اسے اس منفی شناخت اور منفی سلوک سے چھٹکارا بھی حاصل ہو۔ اسرائیل اور مقبوضہ علاقوں کے فلسطینی دونوں ہی ایک نیا ماحول اور نئی صورتِ حال کے متمنی ہیں۔ چنانچہ ایک طرف وہ فلسطینی ہیں جو اپنے مستقر ہی میں قیام پذیر رہنا چاہتے ہیں۔ دونوں ہی اچھی خاصی انقلابی تبدیلی کے خواہش مند ہیں لیکن کیا یہ خواہشات، جن کی جڑیں فوری توجہ کے مستحق مادی حالات میں پیوستہ ہیں، ایک دوسری کا تکملہ ہیں؟ کیا فلسطینیوں کی سیاسی امنگوں میں کوئی داخلی ہم آہنگی یا یگانگت موجود ہے؟

اگر اس کا تعجیل سے یہ جواب دیا جائے کہ ''ہاں، موجود ہے۔'' تو یہ یا تو بالکل لفاظی ہوگی اور یا پھر بالکل ہی ایک عمومی نوعیت کا جواب ہوگا۔ بیتی تاریخ کے نشانات نے......جن کی فہرست میں مرتب کرنے کی سعی کر رہا ہوں...... فلسطینی قوم کو نہایت شدت سے مختلف دھڑوں اور گروہوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ گزشتہ نسل کی زندگیوں میں فلسطینی تاریخ نے جو کروٹیں بدلیں، اس کے چند سادہ اور بنیادی حقائق پر ذرا غور فرمائیں تو آپ کو ان لوگوں کے، جو جلاوطن ہوئے اور ان لوگوں کے، جو اپنے گھروں میں مقیم رہے، مابین بہت نمایاں اختلافات نظر آئیں گے۔ اگر ہم اپنی بات کا آغاز اس مفروضے کو صحیح مان کر بھی کریں کہ 1948ء کا سال ہم سب کے لیے ایک ہی معنی رکھتا تھا، تو یہاں چند تفصیلات پیش کی جاتی ہیں جن پر لازماً دھیان دینا ہوگا۔ 1948ء کے بعد جو فلسطینی اسرائیل میں مقیم رہا، اس کا افق صیہونی قوانین اور صیہونی قانونی موشگافیاں متعین کرتی تھیں۔ وہ حتیٰ الامکان یہ کوشش کرتا تھا کہ اسرائیلی پارلیمنٹ کے بحث مباحثوں میں، قانونی عدالتوں میں اور اس اراضی کے بارے میں، جس کی ملکیت مسلسل متنازع رہی، اپنی شناخت مپائی (Mapai) جیسی سیاسی جماعتوں کے سیاق و سباق میں کرائے (کہ اس کی ہمدردیاں اس یا اس جماعت کے ساتھ ہیں۔) لیکن وہ اپنی قابلِ شناخت موجودگی اور استواری سے ہمیشہ محروم رہا (کوئی اسرائیلی حکومت یا اس کا کوئی کارندہ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ وہ وہاں موجود ہے۔) یہودیوں کے مقابلے میں اندرون اسرائیل اس کے لیے تعلیم حاصل کرنے کے مواقع قریب قریب ناپید تھے (اور اب تک ناپید چلے آرہے ہیں) جہاں تک عربوں

کے ان بچوں کا تعلق ہے، جو مدارس میں داخل ہونے کی عمر کو پہنچ جاتے ہیں، ان کے سلسلے میں حکومت لازمی تعلیم کا صحیح معانی میں نفاذ نہیں کرتی۔ پھر جو بچے مدارس میں داخل بھی ہوجاتے ہیں، ان میں سے اپنی پڑھائی ادھوری چھوڑ کر جانے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اساتذہ کی شدید کمی ہے اور تھوڑے بہت اساتذہ جو تعینات کیے جاتے ہیں، وہ تقریباً سبھی کے سبھی غیر تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔ صرف 1956ء میں مملکت نے اساتذہ کی تربیت کے لیے جافہ میں ایک ٹریننگ کالج قائم کیا۔ اس کے باوجود عربوں کے معیارِ تعلیم کو بلند کرنے کے لیے سنجیدگی سے کوئی کوشش نہیں کی جاتی۔ اس شفیق بے التفاتی کی پالیسی پر جو عمل ہو رہا ہے، شاید اس کا کوئی جواز بھی ہو کیونکہ اسرائیل یہودیوں کی مملکت ہے، غیر یہودیوں کی نہیں۔ تاہم اس سے اسرائیل کے عربوں کو جو صریحی نقصان پہنچ چکا ہے اور پہنچ رہا ہے اس کے سیاسی نتائج، جن کی آسانی کے ساتھ تصدیق کی جاسکتی ہے، یہ برآمد ہوئے ہیں کہ اسرائیل کے عرب شہری اپنے آپ کو الگ تھلگ محسوس کرتے ہیں اور ان کے حوصلے پست ہو چکے ہیں۔

اندرونِ اسرائیل عربوں کو روایتی طور پر ایسے اشخاص تصور کیا جاتا ہے جنھیں کبھی کوئی قومی شعور حاصل کرنے سے بہر طور روکنا ہوگا۔ نصابِ تعلیم اچانک تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ عربوں کے سکولوں اور ان سکولوں میں دستیاب سہولتوں کا حال واضح طور پر بہت پتلا ہے۔ انھیں ہر ممکن طریقے سے یہ سکھایا اور سمجھایا جاتا ہے کہ ان کا اور کمتری کا جنم جنم کا ساتھ ہے، وہ اس سے کبھی چھٹکارا نہیں پاسکیں گے اور انھیں ہمیشہ تذلیل کن طریقے سے مملکت پر انحصار کرنا ہوگا۔ اندرونِ اسرائیل جو چار لاکھ عرب باشندے موجود ہیں۔ 1970ء کے عشرے کے ابتدائی سالوں تک ان میں سے صرف پانچ سو گریجویٹ تھے۔ ان اعداد و شمار کا ان اعداد و شمار سے موازنہ کریں جو بیرون اسرائیل مقیم پناہ گزیں فلسطینیوں کی تعلیمی استعداد سے متعلق ہیں تو معلوم ہوگا کہ ہر ایک ہزار پناہ گزیں فلسطینیوں میں گیارہ فلسطینی ایسے ہیں جو یونیورسٹی کی سطح تک تعلیم پا چکے ہیں یا پا رہے ہیں۔ (اندرونِ اسرائیل) پیشہ ور تعلیم کی درسگاہوں میں (عرب) طلبہ کی تعداد کافی زیادہ تھی لیکن ان درسگاہوں میں بھی جیسا کہ صابری جریس تحریر کرتا ہے، ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت یہودی اور غیر یہودی طلبہ کے مابین نسبت کا فقدان برقرار رکھا جاتا ہے۔ ''عرب علاقوں میں پیشہ ور تربیت کے صرف انیس سکول ہیں۔ ان سکولوں میں 1048 طلبہ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں یہودی علاقوں میں ایسے سکولوں کی تعداد اڑھائی سو ہے اور 53,843 طلبہ زیرِ تعلیم ہیں۔ سکولوں اور یونیورسٹیوں کے سارے نظام میں عربی پر عبرانی کو ترجیح دی جاتی ہے۔ عربوں کی تاریخ پر یہودیوں کی تاریخ کو فوقیت حاصل ہے۔ (''یونیورسٹی کی چار سالہ تعلیم کے پروگرام میں چار سو سولہ گھنٹے آرٹس کے مضامین کے لیے وقف ہیں۔ ان چار سو سولہ گھنٹوں میں

صرف بتیس گھنٹے عربوں کی تاریخ کی تدریس کے لیے مخصوص ہیں اور ان میں بھی مسلم ہسپانیہ کی تاریخ کو ہاتھ تک نہیں لگایا جاتا...... اس کے برعکس یہودی تاریخ ہر درجے کے طالب علموں کو وسیع پیمانے پر پڑھائی جاتی ہے)'' اور جب عربوں سے متعلقہ موضوعات کی تدریس کی بھی جاتی ہے، تو انھیں ایسے تناظر میں پیش کیا جاتا ہے جہاں زور عربوں کے زوال، بدعنوانیوں یا تشدد پر ہو۔ حال ہی میں جو امتحانات منعقد ہوئے، ان میں جس قسم کے سوالات پوچھے گئے، ان کے جائزے پر معلوم ہوا کہ (حضرت) محمد (ﷺ)، ہارون الرشید، (سلطان) صلاح الدین (ایوبی) کے متعلق ایک سوال بھی نہیں دیا گیا۔ جریس نے اس سلسلے میں چند مزید تفصیلات دی ہیں اور بتایا ہے کہ عربوں کے بارے میں حکومت کی تعلیمی پالیسیوں کا ہدف یہ ہے کہ عربوں کو نہ صرف ''مملکت کے وفادار شہری'' بنایا جائے بلکہ ان کے ذہنوں میں یہ ''احساس بھی اجاگر کر دیا جائے کہ اسرائیل میں ان کی حیثیت بس اتنی ہے کہ یہاں وہ الگ تھلگ زندگی گزارتے ہیں۔''...... تعلیم کے یہ مقاصد ایک سرکاری کمیٹی نے متعین کیے تھے جو عربوں کے نصابِ تعلیم میں ترامیم کرنے کے لیے قائم کی گئی تھی۔ کمیٹی کی یہ رپورٹ روزنامہ ''ہارٹز'' نے اپنی 19 مارچ 1971ء کے شمارے میں شائع کی تھی۔ جریس لکھتا ہے:

سیاسی موضوعات کو (تعلیمی نصاب میں بالعموم اور) عربوں اور یہودیوں کی تاریخ اور لسانی تدریس کی کتابوں میں بالخصوص وسیع پیمانے پر گوندھ دیا جاتا ہے۔ تاریخ کے کسی بھی پروگرام پر اگر محض طائرانہ نگاہ بھی ڈالی جائے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ اسے یوں آراستہ پیراستہ کیا گیا ہے کہ یہودیوں کی تاریخ کی تحسین و توصیف کے توپل باندھ دیے گئے ہیں اور اسے یوں پیش کیا گیا ہے کہ اس کے بہترین اوصاف نمایاں ہو کر سامنے آجاتے ہیں لیکن جہاں تک عربوں کی تاریخ کا تعلق ہے، اس کے بارے میں اس قدر کج روی اختیار کی جاتی ہے کہ وہ افترا اور دروغ گوئی کی سرحدوں کو چھونے لگتی ہے۔ عربوں کی تاریخ کو انقلابات، قتل و غارت گری اور پیہم دیرینہ عداوتوں کا ایک سلسلہ بنا کر کچھ اس طور پیش کیا جاتا ہے کہ ان (عربوں) کے کارنامے اور کامرانیاں دھندلکوں کی اوٹ میں چھپ جاتی ہیں۔ اسی طرح عربوں کی تاریخ کے مطالعے کے لیے جو وقت دیا جاتا ہے، وہ بے حد قلیل ہے، مثلاً پانچویں جماعت کے دس دس سالہ طلبہ دس گھنٹے (یا پیریڈ) تو عبرانیوں کے مطالعے پر صرف کرتے ہیں جبکہ ''جزیرہ نمائے عرب'' کے مطالعے کے لیے صرف پانچ گھنٹے (یا پانچ پریڈ) مخصوص ہیں اور جب جزیرہ نمائے عرب کو زیرِ مطالعہ لایا بھی جاتا ہے تو پروگرام کی ہدایات کے مطابق وہاں بھی توجہ زیادہ تر وہاں کے یہودی طبقوں پر دی جاتی ہے۔ چھٹی جماعت کے لیے مطالعہ تاریخ کے چونسٹھ پیریڈ ہیں۔

ان میں سے نام نہاد ''اسلامی تاریخ'' کے لیے صرف تیس پیریڈ وقف کیے جاتے ہیں۔اس تاریخ کا عرصہ ابتدائے اسلام سے تیرھویں صدی کے اختتام تک پر محیط ہے، لیکن اس میں بھی (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) مائیمونی دیز① اور ہسپانیہ کے یہودی شاعر ابن جبریل شامل ہیں۔ ساتویں جماعت کے نصاب میں عرب تاریخ کا کوئی ذکر نہیں، تاہم تاریخ کے مطالعہ کے لیے جو پیریڈ مخصوص کیے جاتے ہیں۔ ان کا چھٹا حصہ اسرائیل اور دیگر ممالک میں منتشر یہودیوں کے مابین تعلقات کے مطالعے کے لیے مخصوص ہے۔ آٹھویں جماعت میں ''مملکتِ اسرائیل'' کی تاریخ کے مطالعے کے لیے تیس گھنٹے اور انیسویں صدی سے لے کر موجودہ زمانے تک عربوں کی تاریخ کے مطالعے کے لیے صرف دس گھنٹے دیے جاتے ہیں۔ یوں عربوں کی تاریخ میں پانچ صدیوں کا خلا باقی رہ جاتا ہے۔ آٹھویں جماعت میں جن موضوعات کو شاملِ تدریس کیا گیا ہے۔ ان میں شام اور لبنان کے مذہبی تنازعات اور 1860ء میں دروزیوں اور مارونی عیسائیوں کے مابین دنگا فساد بھی شامل ہے۔②

---

① مائیمونی دیز (Maimonides) (1135ء-1204ء) ایک ہسپانوی نژاد یہودی فلسفی

② صابری جریس: ''اسرائیل کے عرب'' (منتھلی ریویو پریس، نیویارک 1976ء) صفحات نمبر 12-210

یہ تو ان عربوں کا حال ہوا جو اندرونِ اسرائیل آباد ہیں۔ رہے وہ عرب جو 1967ء کی جنگ کے بعد اسرائیل کے زیرِ تسلط آئے، اور مغربی کنارے غزہ میں آباد ہیں، تو ان کا حال بھی کچھ اچھا نہیں۔ پاکستان کے مشہور ادیب قدرت اللہ شہاب ایک ایرانی کا بھیس بدل کر اسرائیل گئے اور وہاں کے حالات کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر کے آئے۔ وہ فرماتے ہیں: ''جو عرب ممالک اسرائیل نے فتح کر لیے تھے۔ مغربی کنارہ، یروشلم، غزہ کی پٹی، وہاں یونیسکو کے بہت سے سکول تھے جسے یونیسکو چلاتی تھی، فلسطینی مہاجر بچوں کے لیے، اور وہاں مسلمان اساتذہ تعینات کیے جاتے تھے۔ ان کا انتخاب یونیسکو کرتی تھی ان علاقوں کے نمائندوں کے ذریعے اور نصاب کی کتابیں ہر سکول میں عربوں کی تصنیف کی ہوئی اور یونیسکو سے منظور کی ہوئی وہاں لگائی جاتی تھیں۔ جب ان علاقوں پر اسرائیل نے قبضہ کر لیا تو انھوں نے مسلمان اساتذہ کو گھر بٹھا دیا...... اور کتابیں جو یونیسکو کی منظور شدہ تھیں، وہ بھی بدل دیں اور ان کی جگہ اپنی لکھائی ہوئی کتابیں لگا دیں۔ ان کتابوں میں اسلام کے خلاف، عرب کلچر کے خلاف، اسلامی تاریخ کے خلاف اور حضور ﷺ کی ذاتِ مبارک کے خلاف اتنی غلط اور گمراہ کن باتیں لکھی ہوئی تھیں کہ کئی فلسطینی بچے پڑھنے سے انکار کر دیتے تھے، ان کو پھر اذیتیں دی جاتی تھیں۔ چنانچہ عرب ممالک کے نمائندے جب ایگزیکٹو بورڈ میں آتے تھے تو کتابیں بھی لاتے اور احتجاج بھی کرتے تھے۔ دو دفعہ ایگزیکٹو بورڈ نے انسپکشن ٹیم بھیجی۔ یہ ٹیم اپنے پروگرام کا پہلے سے اعلان کر دیتی تھی...... چنانچہ اس ٹیم نے جس روز کسی جگہ جانا ہوتا، اسرائیلی اس روز وہاں مسلمان اساتذہ کو لا کر بٹھا دیتے اور کتابیں بھی بچوں کے ہاتھ میں یونیسکو کی منظور شدہ تھما دیتے...... چنانچہ دونوں دفعہ انسپکشن ٹیم نے یہ رپورٹ دی کہ عرب ممالک کے نمائندے اسرائیلیوں پر غلط الزام لگاتے ہیں۔ مجھے بڑی ندامت ہوئی۔......

حالیہ دنوں تک اس پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسرائیل کے عرب شہری دوسرے عربوں اور فلسطینیوں سے الگ تھلگ ہو کر رہ گئے۔ اس نے دوسرے عربوں اور فلسطینیوں کا اسرائیل کے عرب فلسطینیوں کے ساتھ کسی قسم کی تفہیم تک پہنچنا بھی خاصا دشوار بنا دیا ہے۔ اس کا ایک موثر سیاسی نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ طرفین کے مابین ایک غیر یقینی کی کیفیت رونما ہو گئی ہے۔ اسرائیل کے عرب شہری اسرائیلی پاسپورٹوں پر سفر کرتے ہیں، چنانچہ ان کے لیے عالم عرب کا دورہ کرنا بے حد مشکل ہے اور جب کبھی جلا وطن فلسطینیوں اور نام نہاد عرب اسرائیلیوں کے مابین ملاقاتیں ہوتی ہیں، تو تبادلہ خیالات کے لیے جس باہمی اعتماد کی ضرورت ہوتی ہے، اس کی نوبت آنے سے پہلے بے شمار باہمی شکوک وشبہات کو رفع کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ یہ ایک ناگزیر امر ہے کہ ایک جلا وطن (فلسطینی) جس کی پرورش و پرداخت اپنے آبائی وطن کی تمنّا کی غذا پر ہوئی ہو اور جس میں قوم پرستی کی آئیڈیالوجی کی خاصی بڑی خوراک بھی شامل ہو، اس کرید میں پڑ جائے کہ اس کا جو ہم وطن الناصرہ سے آیا ہے، کہیں وہ اسرائیلی ایجنٹ تو نہیں بن چکا ہے اور وہ یہ سوچنے لگے کہ اس کا یہ ملاقاتی جب اندرون اسرائیل تنہائی کا شکار ہوتا ہوگا، تو عبرانی تصانیف یا اسرائیلی قوانین کے مطالعے میں پناہ ڈھونڈتا ہوگا اور یوں اسے اس سچی اور کھری اجنبیت کا احساس ہوتا ہوگا جس نے اسے خالص عرب ثقافت سے الگ تھلگ کر دیا ہے۔

ان حالات میں اسرائیلی فلسطینیوں کو فلاح خویش (اپنی حالت بہتر بنانا) کے جو طریقے میسّر تھے، ان میں بھی مملکت بری طرح رخنہ انداز ہوتی تھی اور انھیں اس رخنہ اندازی کے خلاف جو جدّوجہد کرنا پڑتی تھی، وہ سب کچھ اسرائیلی قانونی موشگافیوں کی حدود کے اندر رہ کر کرنا پڑتا تھا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ یہ قوانین اور ان کی تعبیرات بھی غیر یہودیوں کے خلاف جاتی تھیں اور ان کا پٹرا کر دیتی تھیں۔ چونکہ اسرائیل کا کوئی آئین (مملکت کے اختیارات کی اساس "بنیادی قوانین" کے مجموعے یا "آئین" پر ہوتی ہے) نہیں، اس لیے فلسطینی اپوزیشن کو اولاً کمیونسٹ پارٹی (جس کی رکنیت یہودیوں اور عربوں دونوں کو حاصل ہے) اور ثانیاً

...... چنانچہ میں نے یونیسکو کو اپنی خدمات پیش کیں۔ میں خفیہ طور پر ایک فلسطینی ادارے کے زیر اہتمام گیا اور وہاں سے ایک سو تیرہ ٹیکسٹ بک جو اسرائیل نے لگوائی تھیں، ان پر اسرائیلی اساتذہ جو وہاں موجود تھے، ان کے آٹو گراف لے کر جمع کر کے لایا۔ اس کے ساتھ چھ سات سو تصویریں بھی جو میں نے خفیہ طور پر ایک سگریٹ لائٹر کے ذریعے اتاریں، اپنے ساتھ لایا...... ان تصویروں میں بعض اسرائیلی ہیں ماسٹروں کے ساتھ گروپ فوٹو بھی تھے...... اس کے بعد یہ کتابیں ہٹائی گئیں اور یونیسکو کے نمائندوں کو بغیر نوٹس سکولوں کے معائنے کا اختیار مل گیا۔" (روزنامہ نوائے وقت لاہور۔ 30 جولائی 1986ء)

قوم پرست گروہوں کی، جن کے دوائرِ کار اسرائیلی قانونی موشگافیاں طے کرتی تھیں، جرأت مندانہ ابتکاریوں ① (Initiatives) پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ 1955ء اور 1960ء کے درمیانی برسوں کے دوران میں اسرائیل کے اندر عوامی محاذ (پاپولر فرنٹ) جیسے گروپ وجود میں آئے۔ ان کا کام فلسطینیوں کی ان جائدادوں کا تحفظ کرنا تھا جنھیں حکومت بلا جواز اپنے قبضے میں لے لیتی تھی لیکن غالباً فلسطینیوں کی جو اہم ترین قوم پرست جماعت ابھر کر سامنے آئے وہ ''اسرۃ الارض'' ② تھی۔ اس کی بنیاد 1958ء میں نوجوان فلسطینی قوم پرستوں کے ایک گروپ نے رکھی اور اگرچہ یہ بہت تھوڑا عرصہ قائم رہی لیکن اس نے ایک زبردست معرکہ یہ مارا کہ اس نے اندرونِ اسرائیل مقامی آبادی کی بے چینی کو زبان دے دی (اس جماعت کا اسرائیل میں جو حشر ہوا اور اس کے ردِعمل کے طور پر جلاوطن فلسطینیوں نے جس طرح تنظیم آزادی فلسطین...... پی ایل او...... قائم کی، ان باتوں کو ہمیں یہاں ذہن میں رکھنا چاہیے) عربی زبان میں ''اسرۃ الارض'' کا مطلب ''خاندانِ اراضی'' یا ''زمین کا خاندان'' تھا اور یہ ایک ایسا نام تھا جو بچے کھچے (فلسطینی) طبقے کی تشویش کو احسن طریقے سے ادا کرتا تھا۔ اس گروپ کے وجود میں آنے کی علتِ غائی یہ تھی کہ فلسطینیوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ فلسطین ہی میں رہیں۔ ابتدا ہی سے اس گروپ کی کوشش یہ تھی کہ وہ اس طرح کام کرے، جس سے یہ مترشح نہ ہو کہ وہ اپنی آزادی پر زور دے رہا ہو بلکہ یہ معلوم ہو کہ وہ اسرائیلی بالادستی کے اندر رہتے ہوئے ایک آزاد فلسطینی عرب سیاسی موجودگی کی نمو کرنا چاہتا ہے۔ میرے خیال میں اس کی عظیم کامیابی منفی نوعیت کی تھی۔ ''الارض'' نے یہ عملاً ثابت کر دیا کہ اسرائیل کے اندر غیر یہودیوں کے لیے مساوات (کا حصول) ایک ناممکن امر ہے۔ اگرچہ اس نے ہمیشہ یہی کوشش کی کہ یہ اپنا کام قانونی حدود کے اندر رہ کر کرے لیکن 1960ء کے عشرے کے بالکل آغاز ہی میں یہ ان قوانین کا شکار ہو گیا۔ جن کے تحت اس کے اخبارات و جرائد پر پابندی لگا دی گئی، اس کے چھاپے خانے (پریس) سربمہر کر دیے گئے اور اسے ایک قانونی سیاسی پارٹی کی حیثیت سے اپنے آپ کو رجسٹر کرانے کی بھی ممانعت کر دی گئی۔ ''الارض'' پہلا فلسطینی عرب سیاسی گروپ تھا جس نے ایک علیحدہ فلسطینی ریاست کے قیام کا مطالبہ کیا۔

اسرائیل کے اندر فلسطینیوں کی نمو کا دوبارہ ذکر میں ذرا بعد میں کروں گا۔ اب میں جس بات پر زور دینا چاہتا ہوں وہ ان کے تشخص کی مخصوص ساخت ہے کیونکہ یہ تشخص ہی ہے جو سیاسی طور پر سرگرم عمل ہو کر آزادی

---

① جدید فارسی میں (Initiatives) کا ترجمہ ابتکاری کیا جاتا ہے۔

② اس کا لفظی ترجمہ ''خاندانِ اراضی'' ہے۔

اور ظلم وستم سے رہائی دلاتا ہے۔ ان فلسطینیوں کے لیے ایک نا قابلِ تخفیف حقیقت یہ تھی کہ وہ ایک ایسی مملکت کے اندر موجود تھے جہاں ان کا قیام دوسروں کے رحم وکرم پر تھا اور پھر خالی از خطر بھی نہیں تھی کیونکہ یہ مملکت ان کے وجود کو اپنے لیے وبالِ جان سمجھتی تھی اور انھیں عارضی طور پر محض اس لیے برداشت کر رہی تھی کیونکہ فی الحال ان سے چھٹکارا پانا مشکل تھا۔ وہ اپنی زندگیوں کے اساسی استحکام کے لیے اراضی کے مرہونِ منّت ہیں یا پھر اس بات کے، اور یہ بات کتنی متناقض ہے اور اپنی تردید آپ کر رہی ہے کہ اسرائیل کے غیر یہودی باشندوں کی حیثیت سے وہ زمین اور اراضی کے ساتھ کسی قسم کے روابط برقرار رکھنے کے لیے قابلِ عمل جواز سے محروم ہیں (کیونکہ اسرائیل نے ایسے قوانین نافذ کیے ہیں، جن کی رو سے کسی غیر یہودی کا اسرائیل میں زمین پر قابض رہنا ناممکن ہی نہیں ہو گیا بلکہ غیر قانونی بھی ہو گیا ہے۔ ان علاقوں کے فلسطینیوں کا بھی، جن پر اسرائیل نے 1967ء کی جنگ کے دوران میں قبضہ کیا تھا، کافی حد تک یہی حال ہو گیا ہے حالانکہ ان فلسطینیوں کے باہر کی دُنیا سے کافی عرصے تک روابط قائم رہے) فلسطینیوں کا وہ بچا کھچا طبقہ، جو ابھی تک اندرونِ اسرائیل ڈٹا ہوا ہے، اس کا ایک فرد، توفیق زیاد، بڑے پائے کا شاعر ہے۔ اس کی ایک معرکہ آرا نظم کا عنوان ''بقون'' (ہم موجود رہیں گے) ہے۔ اس نظم میں جو زبان استعمال کی گئی ہے، وہ استخوانی استقامت کی حامل ہے اور اس کا مقصد اسرائیلیوں کو یہ یاد دلانا ہے کہ فلسطینی ''تمھارے حلقوم میں شیشے اور ناگ پھنی کی طرح پھانس بن کر اٹک گئے ہیں۔'' ایک سطح پر فلسطینی شعور کو ''بیس ناممکنات'' کا سیٹ (مجموعہ) بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ دوسری سطح پر زیادہ ان ہتک آمیز رویوں (ہوٹلوں میں برتن صاف کرنا، ''آقاؤں کو مشروبات'' پیش کرنا، وغیرہ) کو، جن کا نشانہ فلسطینی بنائے جاتے ہیں، اس انداز میں لیتا ہے کہ وہ ان کی روح کی بالیدگی کر رہے ہیں کیونکہ

یہاں...... ہمارا ایک ماضی ہے
ایک حال
اور ایک مستقبل

ہماری جڑیں پیوست ہیں
زمین کی عمیق گہرائیوں کے ساتھ
بیس ناممکنات کی طرح
ہم موجود رہیں گے۔ ①

① Enemy of the Sun: Peotry of Palestinian Resistance, ed. Naseer Arari and Edmund Ghareeb (Washington: Drum and spear Press,1970),p66

جہاں تک جلا وطن فلسطینیوں کا تعلق ہے، ان کے خیالات و جذبات ان خیالات و جذبات کے بالکل برعکس ہیں۔ ان کی زندگیاں ان معنوں میں نا قابلِ برداشت بن چکی ہیں کہ فی الحال وہ جہاں ہیں، وہاں ان کی کوئی جڑیں نہیں۔ ان کے آفاق اقوامِ متحدہ کی ریلیف اینڈ ورکس ایجنسی (UNRWA) جیسے بین الاقوامی ادارے پناہ گزینوں کے کیمپ، جو کسی ایک یا دوسرے عرب ملک میں واقع ہیں اوران پر فوری طور پر اثرانداز ہونے والے (اور ایک دوسرے سے بے پناہ مختلف) واقعات متعین کرتے ہیں۔ اس جلاوطن طبقے کا، جسے عرف عام میں ''غربا'' کہا جاتا ہے، نقشہ کھینچنا یا مختصراً اس کی خصوصیات گنوانا عملی طور پر ایک ناممکن امر ہے، کیونکہ بحیثیت مجموعی اس نے جدید عرب دُنیا کے معاشرتی اور سیاسی شعور...... اپنے تمام تر تنوع کے ساتھ...... کی آئینہ داری بھی کی ہے اوراس کے فروغ میں قابلِ قدر حصہ بھی لیا ہے۔ ①

آج اکثر عرب ممالک میں فلسطینی دانشور، انجینئر، مزدور، غیر ممالک کاشتکار اور کیمپوں کے باسی موجود ہیں، ان میں جو طبقاتی تقسیم موجود ہے، وہ مہمان ممالک کے اپنے بڑے ڈھانچوں کے مطابق ہے لیکن ان سب میں ایک بات اور بھی ہے کہ وہ ناگزیر طور پر (خاص طور پر 1967ء کے بعد سے) فلسطینی سیاسی تشخص کے کسی نہ کسی تصور کے، جو باقی تمام امور پر حاوی ہوجاتا ہے، زیر نگیں آچکے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہم بالکل جائز طور پر یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہم میں سے بعض فلسطینی ایسے ہیں جو اپنے افکار کے اعتبار سے (مرحوم صدر) ناصر کے پیروکار ہیں، بعض فلسطینی بعث پارٹی سے متفق ہیں، بعض کو فلسطینی مارکسی کہا جاتا ہے اوران میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جسے فلسطینی بورژوا کا نام دیا جاسکتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے مخصوص انداز سے، جو بعض اوقات بالکل انوکھا عجیب وغریب نظر آتا ہے، (فلسطین) واپسی کے متعلق ایک منصوبہ (جو بے شک ہمیشہ قابلِ عمل نظر نہ آئے) نہیں تو کم از کم ایک نظریہ ضرور گھڑ رکھا ہے۔ میں سیاسی خیالات اور جماعتوں کے متعلق ذرا بعد میں اظہارِ خیال کروں گا۔

ظاہر ہے کہ اسرائیلی فلسطینیوں کے برعکس جلاوطن فلسطینیوں کی روزمرہ کی مصروفیات غیر مساوی طور پر ان کے مہمان ملک، پناہ گزینوں کے مسائل سے نپٹنے والے بین الاقوامی اداروں اور خود ان کے اپنے مابین بٹ کر رہ گئی ہیں۔ 1967ء کا سال (پہلی اور بعد کی مصروفیات کے مابین) حدِ فاصل بن گیا ہے۔ یہ سال اس امر کی علامت ہے کہ عربوں کا روایتی اسلوب اور ڈھانچہ ناکام رہا ہے اور فلسطینیوں نے اپنی مختلف سیاسی

① See Rosemary Sayig Palestinians: Form Peasants to Revolutionarise, London: Zed Press, 1979

تنظیموں کے اتفاق رائے (اجماع) کے ذریعے یہ جو دُنیا کو دکھا دیا ہے کہ وہ اپنی مدد آپ کر سکتے ہیں، اپنی ذمہ داریاں خود سنبھال سکتے ہیں اور اپنی شناخت خود کرا سکتے ہیں، اس کا آغاز 1967ء سے ہی ہوتا ہے۔
1967ء تک عرب مملکتیں جس انداز سے فلسطینیوں کی تائید وحمایت کرتی تھیں، وہ فلسطینی امنگوں کے اتنا موافق نہیں ہوتا تھا جتنا کہ ان کے اپنے رموزِ سلطنت کے لیے ساز گار ہوتا تھا اور یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ یہ مملکتیں فلسطینیوں کی حمایت میں جو اقدامات بھی کرتی تھیں وہ صرف اس لیے کہ اپنے عوام الناس کے جذبات واحساسات کی تسکین کر سکیں جو بے لاگ اور بے ریا طور پر فلسطینی المیے میں بحیثیت قوم دلچسپی لیتے تھے۔ اقوام متحدہ کی ریلیف اینڈ ورکس ایجنسی جیسے ادارے اس لیے قائم کیے گئے تھے تا کہ فلسطینی پناہ گزینوں کو اپنی جلاوطنی کے بڑے بڑے مقامات اور مراکز پر جن مخصوص دشواریوں اور مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ان سے نپٹنے کے لیے ان کی مدد کی جا سکے۔ تاہم اس ادارے کا اصل ہدف ہمیشہ فلسطینیوں کی بقا رہا ہے، جب بھی ان کی سیاسی آزادی کا مسئلہ اٹھایا گیا، یہ ادارہ یا تو کنّی کاٹ گیا یا طرح دے گیا۔ اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی سال بہ سال اس مفہوم کی جو قرارداد پاس کرتی رہتی ہے کہ اسرائیل پناہ گزینوں کو واپس لے لے، ریلیف اینڈ ورکس ایجنسی کی پالیسی اس (قرارداد) کے عین مطابق ہے، تاہم جنرل اسمبلی اسرائیل سے پناہ گزینوں کی واپسی کا جو مطالبہ کرتی ہے، وہ بھی کم وبیش غیر جانبدارانہ انسانی ہمدردی کی اساس پر کیا جاتا ہے اور اس میں کبھی اس حقیقت کا اعتراف نہیں کیا جاتا کہ فلسطینی اور اسرائیلی قومی اور سیاسی وجوہ کی بنا پر ایک دوسرے کے حریف ہیں۔

ریلیف اینڈ ورکس ایجنسی کے متعلّق فلسطینیوں نے جو متضاد دو جذبی رویہ (1) اختیار کر رکھا ہے، وہ بذاتِ خود ایک پیچیدہ موضوع ہے اور میرا اس قسم کا کوئی ارادہ نہیں کہ میں یہاں اس کا جائزہ لوں۔ تاہم میں جس چیز کے متعلّق اظہارِ خیال کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ اس ایجنسی کے کردار کے بارے میں ایک عام بے اطمینانی پائی جاتی ہے، جس کا اگرچہ کھلے بندوں اظہار تو نہیں کیا جاتا لیکن وہ اپنی جگہ موجود ضرور ہے۔ سب سے پہلے ہمیں یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ پناہ گزینوں کو انتہائی سیاست گزیدہ گروپ بننے میں کوئی زیادہ دیر نہیں لگی (اور اب سیاست جھاڑنا ان کا مشغلہ بن چکا ہے) اپنے زیرِ کفالت فلسطینیوں کی علانیہ قومی خود آگاہی کے مقابلے میں ریلیف اینڈ ورکس ایجنسی غیر سیاسی ابویت کی علمبردار تھی اور اس کا اظہار وہ روٹی کپڑے کی خیرات بانٹ کر اور طبی اور تعلیمی سہولتیں بہم پہنچا کر کرتی تھی۔ فلسطینیوں کے سیاسی مصائب کے متعلّق ریلیف اینڈ ورکس ایجنسی جس قسم کی مخیّرانہ تشویش کا اظہار کرتی تھی، معلوم ہوتا تھا کہ اسے لا حاصل، روکھے پھیکے اور بے جان اعداد وشمار میں ڈھالا جا سکتا ہے...... مثلاً یہی کہ کتنے لوگوں کو خوراک مہیا کرنا ہے، کتنے تن ڈھانپنے

ہیں، کتنے اجسام کا علاج کرنا ہے، وغیرہم، میرے خیال میں یہ کہنا درست ہے کہ وہ فلسطینی جو اس سیاسی خول میں مقید تھا، جس کے متعلق یہ مفروضہ قائم کرلیا گیا تھا کہ یہ ریلیف اینڈ ورکس ایجنسی اس کی ضروریات مہیا کرتی رہے گی، یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ آیا وہ کبھی یہ زنجیریں توڑ کر صحیح حق خودارادیت حاصل کر بھی پائے گا یا نہیں؟ ایک طرف ریلیف اینڈ ورکس ایجنسی کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ پناہ گزین اپنی بے دخلی کے بعد محض ایک عبوری دور میں سے گزر رہے ہیں اور وہ کسی وقت بھی کسی دوسرے مقام پر آباد ہوسکتے ہیں۔ دوسری طرف پناہ گزینوں کو یہ اندیشہ کھائے جا رہا تھا کہ گو کیمپوں میں تو ان کا قیام عارضی نوعیت کا ہے لیکن اس کے متبادل انھیں جو نیا ٹھکانا میسر آئے گا وہ کہیں ان (کیمپوں) سے بھی بدتر نہ ہو۔ اس کا ناگزیر نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اس ایجنسی کے بارے میں وہ غیر مطمئن نظر آنے لگے۔ پھر چونکہ ریلیف اینڈ ورکس ایجنسی کے تحت چلنے والی درسگاہوں کا عملہ فلسطینیوں پر ہی مشتمل ہوتا تھا، چنانچہ ان درسگاہوں میں صیہونیت اور فلسطین کے متعلق جو کچھ پڑھایا جاتا تھا، اس نے ایک نئی قسم کی کشیدگی اور کھنچاؤ پیدا کردیا۔ جوں جوں ان درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، ان میں اس ناخوشگوار اور مکروہ تفاوت کا احساس بڑھتا گیا جو ان کی تاریخ اور ان کی حقیقی (قابلِ رحم) حالت کے مابین پایا جاتا تھا۔ ریلیف اینڈ ورکس ایجنسی کو اپنی محنت و مشقت کا صلہ یہ ملا کہ اسے ایک ناگوار بلکہ مخاصمانہ صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔

ریلیف اینڈ ورکس ایجنسی کے عملے کے بعض ارکان بین الاقوامی سول سرونٹ تھے۔ تاہم ان کی ایک خاصی بڑی تعداد خود فلسطینیوں پر مشتمل تھی۔ اگرچہ کسی نے اس تبدیلی کا، جو لبنان اور اردن کے کیمپوں میں، جہاں سب سے زیادہ پناہ گزیں مقیم ہیں، رونما ہوئی، مطالعہ نہیں کیا، لیکن اغلباً یہ بات درست ہے کہ اس تبدیلی میں سب سے زیادہ ہاتھ ان فلسطینیوں کا تھا جو ریلیف اینڈ ورکس ایجنسی کے ملازم تھے۔ ان دونوں ممالک میں معاشرتی خدمات بہم پہنچانے کا فریضہ بہ تدریج خود فلسطینیوں نے سنبھال لیا۔ سیاسی سطح پر اس عبوری دور کی تکمیل (اگرچہ ریلیف اینڈ ورکس ایجنسی ابھی تک اپنا کام کیے جا رہی ہے) اس وقت ہوئی جب تنظیم آزادئ فلسطین کی تشکیل عمل میں آئی۔ پروگرام کے اعتبار سے یہ جماعت ایک قومی تنظیم ہے اور کیمپوں کے اندر اور باہر فلسطینیوں کی نیم سرکاری ذمہ داری اس نے اپنے کندھوں پر لے لی۔ تاہم تنظیم آزادئ فلسطین نے جزوی طور پر ریلیف اینڈ ورکس ایجنسی کی جو جگہ سنبھالی ہے، اسے ایک دوسری صورتِ حال سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا

---

① جب کسی شخص کے دل میں ایک ہی چیز یا واقعے کے متعلق محبت اور نفرت یا دوسرے متضاد جذبات بہ یک وقت موجود ہوں، تو وہ دوجذبی رویے کا اسیر ہوتا ہے۔

اور وہ صورتِ حال یہ ہے کہ فلسطینیوں کے اپنے مہمان ممالک، پھر زیادہ تر وہی اردن اور لبنان کے ساتھ تعلقات خاصے کشیدہ ہو چکے ہیں اور اس کشیدگی میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ 1967ء کی جنگ ایک نہایت زبردست اہمیت کا حامل واقعہ ہے۔ اس نے نہ صرف اسرائیل سے نپٹنے کے لیے عربوں کے روایتی طریقِ کار کو بے وقعت اور بے وقار بنا دیا بلکہ اس نے اکثر فلسطینیوں کو بھی یہ باور کرا دیا کہ صیہونیت کے ساتھ ان کا جو جھگڑا چل رہا ہے اسے نیابتی فوجوں اور مملکتوں کے ذریعے چکایا نہیں جا سکتا۔ لبنان اور اردن میں مقیم کثیر التعداد فلسطینیوں کے متعلق اہم حقیقت یہ ہے کہ وہ تقریباً سبھی کے سبھی 1967ء سے قبل اسرائیل سے ترکِ وطن کر کے آئے تھے۔ جوں ہی اسرائیل نے مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی پر قبضہ کیا، اسرائیلی قبضے کو ختم کرنے کے لیے جن کوششوں کا آغاز ہوا، جزوی طور پر ان کی توجہ کا مرکز وہ علاقے بن گئے جن پر اردنی اور لبنانی فلسطینیوں کو کوئی خاص دعاوی حاصل نہیں۔ وہ یہ مطالبہ نہیں کر سکتے تھے کہ انھیں ان علاقوں میں بھیج دیا جائے جہاں سے وہ درحقیقت آئے نہیں تھے۔ چنانچہ ان میں جو نام نہاد ''مستردین'' ہیں، انھوں نے مغربی کنارے پر فلسطینی ریاست کے (قیام کے) تصور کی مخالفت کی۔ مزید برآں، اسرائیل سے بالکل ملحقہ دو ملکوں میں ان کی جو گت بنی، اس نے نہ صرف یہ بات بالکل واضح کر دی کہ فلسطینی مختلف مقامات پر بکھرے ہوئے ہیں بلکہ اس ضرورت کا بھی انھیں شدت سے احساس دلایا کہ انھیں کسی نہ کسی صورت میں اپنے وطن واپس لوٹنا ہوگا، یہ الگ بات ہے کہ یہ واپسی پورے فلسطین میں ہو یا صرف مغربی کنارے پر، اردن اور لبنان میں مقیم فلسطینیوں کو دوسرے علاقوں میں قیام پذیر فلسطینیوں کی جو حمایت و تائید حاصل تھی، جوں جوں اس میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہ فلسطینی ان ممالک (اُردن اور لبنان) کی حکومتوں کے اختیارات چیلنج کرتے نظر آنے لگے۔ یہ حالات بالخصوص اس وقت پیدا ہوئے جب بھروسے کے قابل اور مسلح فلسطینیوں نے اس خلا کو پُر کر دیا جو شکست خوردہ عرب فوجوں نے چھوڑا تھا۔ 1920ء کے عشرے کے اواخر میں فلسطینیوں کو ایک سہ جہتی مسئلے کا، جو اُن کے مختلف مقامات پر بکھر جانے کی وجہ سے پیدا ہوا تھا، سامنا کرنا پڑا:

ان کے حقِ خود ارادیت (کے حصول) کی امنگ

ایک محفوظ اور امکانی علاقائی اڈے کی عدم موجودگی اور

ایک فلسطینی مقتدرہ قائم کرنے کی ضرورت جو حتی الامکان مقامی حکام کے ساتھ کسی قسم کی کشمکش میں ملوث نہیں ہوگی۔

1967ء سے اب تک فلسطینیوں کو جو مشکلات اور دشواریاں پیش آئی ہیں، ان میں سے ہر ایک کے

نشانات انھی تینوں چیلنجوں میں تلاش کے جاسکتے ہیں۔

اگر مسئلے کی ان تینوں جہتوں کو پیش نظر رکھا جائے، تو آپ کو تنظیم آزادیٔ فلسطین کے رویوں میں جو بھی کج روی یا خلافِ معمول بات نظر آتی ہے، اس کی آسانی سے توضیح ہوسکتی ہے۔ یہ بات یقیناً درست ہے کہ ابتداً تنظیم آزادی فلسطین عرب لیگ نے 1964ء میں قائم کی تھی اور اس کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ فلسطینیوں کی توانائیوں کو ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت استعمال کیا جائے (ممکن ہے کہ اس تنظیم کے قیام کے پیچھے یہ خواہش بھی کام کر رہی ہو کہ فلسطینیوں اور ان کی توانائیوں کو حدود کے اندر رکھا جائے) تاہم میرے خیال میں یہ کہنا درست نہیں کہ اس معاملے میں فلسطینیوں کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ ان کا ہاتھ تھا لیکن ابتداً یہ تنظیم اتنی سیاسی نہیں تھی جتنا کہ دل کا غبار نکالنے اور خطابت کے جوہر دکھانے کا آلہ تھی، چنانچہ اس نے عہدوں کے متلاشیوں کو تو اپنی طرف ضرور راغب کیا، پالیسی سازوں کو نہیں۔ تاہم امتدادِ زمانہ کے ساتھ جیسا کہ میں ذرا بعد میں اس کے عملی ثبوت بھی پیش کروں گا۔ فلسطین کے مبارزت طلبوں Militants کو بھی تنظیم آزادی فلسطین میں کشش محسوس ہونے لگی۔ ان لوگوں کو یہ خیال آیا کہ (اقوامِ متحدہ کی ریلیف اینڈ ورکس ایجنسی کے برعکس) اس تنظیم میں یہ امکانات موجود ہیں کہ اسے صحیح معنوں میں ایک قومی اور ذمہ دار ادارہ بنایا جاسکتا ہے اور یہ وہ اختیارات بھی استعمال کرسکتی ہے جو صرف ایک حکومت ہی کے پاس ہوتے ہیں۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ آزادی کی خواہاں دوسری تنظیموں یا عارضی حکومتوں کے برعکس، تنظیم آزادی فلسطین کے پاس اپنا کوئی آبائی علاقہ نہیں تھا جہاں وہ اپنی کارروائیوں میں مصروف ہوسکے۔ غالباً اس کے ساخت کی المناک خامی یہ تھی کہ آغاز ہی سے یہ مقامی باشندوں کی تنظیم نہیں تھی جو اپنے ستم شعاروں کے خلاف مصروفِ پیکار تھے بلکہ یہ جلاوطنوں کی تنظیم تھی۔ ایک لحاظ سے تنظیم آزادیٔ فلسطین کی ایک بین الاقوامی گروہ بندی تھی۔ اس بات کے باوجود کہ عملی حالات میں اسے مقتدر اور خود مختار حکومتوں سے ٹکر لینا پڑی، اسے شروع ہی سے ایک بین الاقوامی قومی جواز مل گیا۔ یہ آج تک اس مسئلے کا حق تلاش نہیں کرسکی کہ آیا یہ قومی آزادی کے حصول کی سیاسی تحریک ہے یا لڑ کر قومی آزادی حاصل کرنے کی تحریک۔ تاہم یہ اپنے حامیوں کے لیے کافی ترقی یافتہ معاشرتی خدمات بہم پہنچانے میں خاصی کامیاب رہی ہے۔ اس نے جلاوطن فلسطینیوں کو منظم کرنے اور انھیں (حریف کے خلاف) حرکت پذیر بنانے میں مہتم بالشان کامیابی حاصل کی ہے اور پچھلے چند سالوں سے اسے فلسطینیوں کی ایک زبردست اکثریت کی، خواہ وہ جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہوں، مقبوضہ علاقوں کے باسی ہوں یا اندرونِ اسرائیل آباد ہوں، تائید وحمایت حاصل ہے اور وہ اس کے احکام پر مرمٹنے کے لیے آمادہ وتیار ہیں۔

تنظیم آزادیٔ فلسطین کو مضبوط بنانے کے لیے جن عناصر نے اہم حصہ لیا ہے، ان میں سے ایک قوم پرستی

کی وہ مستحکم اور توانا روایت ہے جسے جلاوطنی کے عالم میں بھی زندہ رکھا گیا۔ جب اسرائیلیوں نے 1956ء میں غزہ پر قبضہ کیا تو فلسطینیوں کے متعدد چھوٹے چھوٹے گروہ تشکیل دیے گئے جن کا فریضہ اسرائیلیوں کو اپنے حملوں کا نشانہ بنانا تھا۔ 1960ء یا 1961ء تک جلاوطن فلسطینیوں کی کوئی چالیس تنظیمیں قائم ہو چکی تھیں۔ یہ سبھی کی سبھی اسرائیل کی دشمن تھیں اور ان کا مقصد وطن واپسی کے لیے جدّوجہد کرنا تھا۔ بے شمار تصانیف...... نظمیں، سیاسی مقالے اور کتابچے، تاریخ اور صحافت کی کتب...... منظرِ عام پر آ چکی ہیں اور اس کام کا آغاز اسی وقت ہی ہو گیا تھا جب اولین پناہ گزیں نے فلسطین کو خیر باد کہا تھا۔ ان میں متعدد تصانیف کی عرب ممالک نے حوصلہ افزائی کی اور یہ انھی کے ایما پر تحریر کی گئی تھی لیکن ان کی خاصی بڑی تعداد خود فلسطینیوں کی اپنی ابتکاری کا نتیجہ ہے۔ عرب دُنیا اپنے آپ کو منوانے کے دور میں سے گزر رہی تھی اور اس سلسلے میں فلسطینیوں نے اپنی امتیازی صلاحیتوں اور فقید المثال خوبیوں کا مظاہرہ کیا۔ اگرچہ پچاس اور ساٹھ کے عشروں میں ناصر کا طوطی بول رہا تھا، پھر بھی یہ بات لازماً ذہن نشیں رہنا چاہیے کہ عرب اتحاد، استعمار دشمنی اور انقلابی جدّوجہد کے متعلّق صدر ناصر بے پناہ حد تک اپنے فلسطینی تجربات کے مرہونِ منّت تھے۔

ابتلا اور جلاوطنی کے ایام میں وہ قومی گروہ جن کی حیثیت ڈیڑھ اینٹ کی مسجد کی سی ہوتی ہے، حقیقی معنی میں قومی گروہ بن جاتے ہیں۔ چونکہ فلسطینی اتنے مختلف ممالک میں بکھر چکے ہیں، اس لیے معاشرتی طور پر ایک متجانس قوم کا روپ نہیں دھار سکے۔ وہ لوگ بھی جو کیمپوں میں مقیم ہیں، بہت آہستہ آہستہ اپنے گردوپیش کے معاشروں میں گھلنا ملنا شروع ہوئے۔ جو زیادہ خوش قسمت تھے، انھوں نے یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی، کاروباری ادارے قائم کیے یا اعلیٰ پیشوں کے ساتھ منسلک ہو گئے۔ اس حقیقت نے کہ وہ کچھ کھو چکے ہیں...... بلکہ اس سے بڑھ کر اس حقیقت نے کہ جو کچھ کھویا جا چکا تھا، اسے عام طور پر چھپانے کی کوشش کی جاتی تھی...... فلسطینیوں کی ایک ایسی مستند برادری تخلیق کر دی جو مہمان معاشرے سے قطعاً مختلف نظر آتی ہے۔ خود مجھے جن تجربات میں سے گزرنا پڑا، وہ ان معنوں میں بعض دوسرے جلاوطن فلسطینیوں کے تجربات کے مماثل تھے کہ میری مخصوص تاریخ کو عام عرب چھتری نے ڈھانکے رکھا (یعنی ہمیں فلسطینیوں کی الگ قوم نہیں سمجھا گیا، بلکہ عمومی انداز سے عام عرب قوم کا ایک جزو سمجھا گیا) اور کافی عرصے تک یہی مناسب نظر آتا رہا لیکن پھر ایک وقت ایسا آیا جب بعض دوسرے فلسطینیوں کی طرح جن کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا، میں بھی اپنی زندگیوں اور اپنے خیالات کو عالمِ عرب کی ہر شے سے الگ تھلگ کر کے دیکھنے لگا۔ آج فلسطینی جس چیز کو فلسطینی انقلاب کہہ کر پکارتے ہیں وہ دوسروں سے مختلف ہونے کا کوئی منفی امتیاز نہیں بلکہ یہ ایک پورے فلسطینی تجربے کے متعلّق ایک مثبت احساس ہے کہ ہمیں ایک حشر سے دوچار ہونا پڑا اور اب ہمیں اس کا مداوا

تلاش کرنا ہے، یہ کہ ہماری ایک فلسطینی شناخت ہے جو محض ان معنوں میں ہی نہیں کہ ہم نے کیا کھویا، قابلِ تفہیم ہے، بلکہ ہمارے نزدیک وہ ایک ایسی شے ہے جس کے حصول کے لیے ہم کوشش کر رہے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہماری جدّوجہد کا اصل نکتہ یہ ہے کہ ہمیں عدمِ تشخص، استبداد اور جلاوطنی سے رستگاری (آزادی) حاصل ہو۔

چونکہ تنظیم آزادیٔ فلسطین زیادہ تر جلاوطنوں کی تنظیم ہے، اس لیے تاریخی طور پر اس کا زیادہ تر سروکار واپسی سے رہا ہے اور یہ واپسی وطن کو غیروں کے قبضے سے چھڑانے کا سب سے بڑا ماحصل اور ثمر ہوگا۔ یہاں ان فلسطینیوں کے، جو اسرائیل ہی میں قیام پذیر ہیں، اہداف سے تقابل بہت اہم ہے۔ جو بچے کھچے لوگ ابھی تک وہاں موجود ہیں، وہ مخصوص طور پر اپنے آپ کو اس زبان، تدابیر و تراکیب، اور چلوں کے حوالے سے دیکھتے ہیں جو ''اسرۃ الارض'' نے انھیں سجھائی تھیں۔ چونکہ اس تنظیم کا قیام اسرائیل کے اندر عمل میں آیا تھا، اس لیے اس کی کچھ مجبوریاں تھیں جو اس کی راہِ عمل متعین کرتی تھیں۔ اسے اس کے ارکان اور اسکے متفقین کو اسرائیل کے اندر ہی رہائش پذیر رہنا تھا، وہیں اپنے طبقے کے افراد کے مابین یوتگی پیدا کرنا اور اس یوتگی کو مضبوط و مستحکم بنانا تھا، ایک طرف اپنے آپ کو اسرائیل کے منظم معاشرے میں سمونا تھا اور دوسری طرف مساوی حقوق کے حصول کے لیے مصروفِ پیکار ہونا تھا۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیں کہ وہاں کے فلسطینی اپنے آپ کو یوں لیتے تھے کہ ان کی اپنی ایک قومی شناخت تو ہے تاہم چونکہ ان کا واسطہ ایک ایسی حقیقت سے تھا جو بظاہر ایک مادی وجود رکھتی تھی، اس لیے انھیں اسرائیل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اپنی اس شناخت کی ازسرِ نو تعریف کرنا پڑی۔ تاہم ایک یہودی ریاست میں ایک غیر یہودی ہونے کے فرق (کہ یہ دو متضاد چیزوں کے مابین فرق تھا) کا سامنا جرأت کے ساتھ نہیں کیا گیا اور نہ صیہونیت کے اس مخصوص اسلوبِ سیاست سے، جس میں غیر یہودیوں کو شرکت کی اجازت نہیں دی جاتی، نپٹنے کے لیے صحیح راہِ عمل اختیار کی گئی۔ اس کے برعکس جلاوطنوں نے......اس میں غالباً ملک بدر ہونے والوں کی کچھ رومانی عینیت بھی شامل تھی......اپنے اندازِ سیاست کا اظہار نظریۂ کلیت کی اصطلاحات میں کیا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ انھیں فلسطین کے چیدہ چیدہ حصوں سے نہیں، بلکہ پورے فلسطین سے ملک بدر کیا گیا تھا، اس لیے ان کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ سارے کے سارے فلسطین کو آزاد کرائیں۔ صیہونیت نے مقامی عرب فلسطینیوں کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اور اب تک ان کے ساتھ جو سلوک روا رکھ رہی ہے، اس کے پیشِ نظر نہ تو اسے (صیہونیت کو) ایک تحریک کی حیثیت سے جائز قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ یہ ایک معاشرے کی حیثیت سے قابلِ قبول بن سکتی ہے۔ جلاوطنوں نے جس چیز کی نہ تو مناسب طور پر توضیح کی اور نہ اسے پیشِ نظر رکھا، وہ وہ حمایت تھی جو اسرائیل کو اپنے یہودی

شہریوں اور دُنیا کی بعض اقوام سے حاصل ہوئی اور اس سے بھی اہم تربات جسے فلسطینیوں نے قطعی طور پر نظرانداز کر دیا تھا، یہ تھی کہ اسرائیل اپنے منتخب شہریوں کی نظروں میں ایک جائز اور مستحکم مملکت کا درجہ اختیار کر چکا تھا (اس کے غیر یہودی شہری اور جلا وطن فلسطینی اسے بے شک ایک فاسق و فاجر مملکت تصور کرتے رہیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔)

اس مقام پر ہم بہ خوبی اس اہمیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں جو فلسطینی جدّ وجہد میں اس کے تازہ ترین عنصر کو حاصل ہے۔ یہ عنصر آبادی کی تیسری اکائی ہے اور اس نے 1967ء میں اپنے آپ کو اچانک اسرائیل کے قبضے میں پایا۔ 1967ء تک مغربی کنارے کے باشندوں کو اردن اردنی شہری تصور کرتا تھا اور وہ لوگ، جو غزہ کی پٹی میں رہائش پذیر تھے، ان پر مصری انتظامیہ کا حکم چلتا تھا۔ یہ بات بھی درست ہے کہ مغربی کنارے اور غزہ کے باشندے ایک دوسرے سے کٹے ہوئے تھے (ان دونوں کے بیچ میں اسرائیل کا علاقہ حائل تھا۔) تاہم 1967ء کے بعد دونوں کو (غزہ والوں کو زیادہ) اسرائیلی فوجی حکومت کی شکل میں ایک مشترکہ بوجھ اٹھانا پڑا۔ مشرقی (یعنی کہ عرب) بیت المقدس کے باشندوں کے ماسوا، جن کے شہر کا اسرائیل نے انتظامی طور پر اپنے ساتھ انضمام کر لیا تھا، دوسرے فلسطینیوں کو دوبارہ انھی تجربات میں سے گزرنا پڑا جو اسرائیل کے عربوں کو ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی انھیں ان مشکلات کا تجربہ بھی ہوا جو جلاوطنوں کو جھیلنا پڑتی ہیں۔ نابلوس یا رام اللہ کا کوئی فلسطینی باشندہ بھی ملک بدر کیا جا سکتا تھا اور بے شمار کو کیا بھی گیا۔ ''مشکوک''، قسم کے جرائم (زیادہ تر اس نوعیت کے جن کے متعلق نئی مقبوضہ آبادی یہ سمجھتی ہے کہ قابضین کے خلاف اسے ان کے ارتکاب کا حق حاصل ہے) کے محض شبہے میں ہزاروں خاندانوں کے گھروں کو مسمار کر دیا گیا۔ ہزاروں لوگوں کو ایک مقام سے دوسرے مقام پر ''منتقل'' کر دیا گیا (اور یہ بات غزہ کے بیس ہزار بدوؤں اور متعدد دیگر مقامات کے باشندوں کے متعلق تکلیف دہ حد تک درست ہے) اور سب سے بڑا ظلم یہ ہوا کہ مقبوضہ علاقوں کے فلسطینی باسیوں کو اپنے ہی وطن میں شہریت کے تمام حقوق و مراعات سے بہ یک جنبشِ قلم محروم کر دیا گیا۔ اب وہ نہ تو اردنی تھے اور نہ اسرائیلی۔ ایک لحاظ سے وہ پناہ گزیں بن گئے لیکن پہلے (دور کے) سات لاکھ اسّی ہزار پناہ گزینوں کے برعکس وہ ارضِ فلسطین پر ہی مقیم رہے۔ ابتدائی پناہ گزینوں کے برعکس یہ فلسطینی اپنی زندگی دُنیا بھر کے عوام کی نظروں کے عین سامنے گزار رہے تھے جو واقعتاً اپنی آنکھوں سے اسرائیلی فوجیوں کو اپنی جیپوں میں سوار غیر مسلح عرب دیہاتوں اور شہروں کا گشت کرتے، بعض اوقات عربوں کو موت کے گھاٹ اتارتے اور اکثر ان کی پٹائی کرتے دیکھ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ عالمی رائے عامہ نے بہ یک زبان قبضے اور ان درجنوں غیر قانونی اسرائیلی بستیوں کے قیام کی مذمت کی جسے صحیح ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا جاتا

ہے۔ انجیل سے فرسودہ دلائل و براہین ڈھونڈ ڈھونڈ کر پیش کی جاتی ہیں حالانکہ تاریخی اعتبار سے یہ ساری تاویلات جھوٹ کا پلندہ ہیں۔

فوجی تسخیر کا معاشرے پر بھی نمایاں اثرات پڑے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو فلسطینیوں کی نگاہوں سے اوجھل نہیں رہی۔ اسرائیل محض ایک یہودی مملکت ہی نہیں رہا بلکہ وہ ایک قابض طاقت بھی بن چکا ہے۔ بعض اسرائیلیوں کو پہلی مرتبہ اس حقیقت کا ادراک ہوا کہ اسرائیل کو سارے خطے کے ساتھ بالخصوص اور باقی دُنیا کے ساتھ بالعموم جو مصالحت کرنا ہوگی، اس کا مرکزی نقطہ یہی مسئلۂ فلسطین ہے، اسرائیلی عربوں اور غزہ، مغربی کنارے کے فلسطینیوں کے مابین جب روابط بحال ہوئے تو اس سے سیاسی شعور کو ابھارنے میں اچانک بڑی مدد ملی۔ اسرائیل نے اپنی طرف سے بڑی کوشش کی کہ فلسطینی آبادی کی ان دو اکائیوں کے مابین فاصلے اور رکاوٹیں کھڑی کی جائیں، اس کے باوجود ان دونوں کے مابین تعلقات کا ایک سلسلہ چل نکلا اور دونوں نے یہ سمجھنا شروع کر دیا کہ وہ تنظیمی طور پر (آبادی کی) تیسری اکائی کے ساتھ جو جلاوطنی کی زندگی گزار رہی ہے، منسلک ہیں۔ مزید برآں اسرائیل مغربی کنارے اور غزہ میں جس پالیسی پر عمل پیرا تھا، وہ احمقانہ حد تک ناعاقبت اندیشانہ تھی۔ ایشیا اور افریقہ کے استعماری منتظمین یہ سمجھتے تھے کہ فوجی حکومت کے خلاف ''مقامیوں'' نے اگر ذرا بھی مزاحمت کی یا ان کی طرف سے گڑبڑ کا معمولی سا اندیشہ بھی ہوا تو اسے بآسانی کچلا جا سکے گا۔ اسرائیلیوں کی سوچ اور رویہ بالکل اسی قسم کا ہے۔ ہر وہ فلسطینی جس کے متعلق ذرا سا بھی شک ہوتا کہ اس میں فلسطینیوں کا رہنما بننے کے جراثیم پائے جاتے ہیں، اسے یا تو ملک بدر کر دیا جاتا اور یا پھر حوالۂ زنداں۔ ''بے چینی'' یا اسرائیل کے مفروضہ دشمنوں کے ساتھ ''سازباز'' کی سزا یہ دی جاتی کہ فلسطینیوں کو انتظامی احکام کے تحت نظربند کر دیا جاتا۔ اپنی تاریخ میں پہلی مرتبہ اسرائیل نے اشخاص کا ایک نیا طبقہ پیدا کیا، بلکہ گھڑا، جو اتنا ''عرب'' (اسے تو اسرائیل نے ایک قانونی جال میں جکڑ لیا تھا، جو اس نے 1948ء کے بعد اپنے ''غیر یہودی'' شہریوں کے لیے تیار کیا تھا اور جس کے متعلق ان قانونی موشگافیوں سے بالاتر ہو کر کبھی سوچا تک نہیں گیا تھا جس کا نشانہ صرف عرب بنتے تھے) نہیں تھا، جتنا کہ ''دہشت گرد۔''

نظر بظاہر یہی آتا تھا کہ اسرائیل کے نزدیک اس ''دہشت گرد'' کی نہایت ہی محدود اور تخیل سے بالکل محروم (جس کی کوئی ڈھونڈے سے مثال نہیں ملتی) تعریف ہے...... اس کے متعلق یہ مفروضہ قائم کر لیا گیا تھا کہ وہ مملکت کی سلامتی کا دشمن ہے...... لیکن اس کے متعلق حقیقتاً اہم بات یہ ہے کہ وہ قوم پرست محب الوطن کے روپ میں ڈھلتا گیا۔ ان عربوں کے مابین جو 1967ء کے بعد اسرائیلی شکنجے میں گرفتار ہوئے، ایک فرق یہ ہے کہ جہاں تک اوّل الذکر کا تعلق ہے، صیہونیت نے اسرائیل کے مملکت بننے سے پہلے ہی ان سے علمیاتی

طور پر نپٹنے کا اہتمام کر لیا تھا۔ البتہ نئے عربوں پر پرانے طور پر طریقے نہیں آزمائے جا سکتے تھے۔ چنانچہ انھیں ان ضوابط کی، جن کی نوک پلک سنوارنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا اور جو غیر یہودیوں (نااشخاص) کے لیے وضع کیے گئے تھے، بھول بھلیوں میں آسانی سے گم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ نئے علاقوں کا نظم و نسق چلانے کے لیے اسرائیل نے جو بھی ''ڈنگ پٹاؤ'' (ایڈہاک) اقدم کیا، وہ بہت بھونڈا اور بے تکا (جیسے وقت کے وقت گھڑا گیا ہو) ہی نظر نہیں آتا تھا بلکہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے مقاصد کی خود ہی نفی کر رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فلسطینی قوم پرستانہ جذبے کی عوامی لہر نہایت مؤثر طور پر بڑھتی جا رہی تھی، اسرائیل مقبوضہ علاقوں کے اندر ''دہشت گرد'' کے ساتھ تنظیم آزادئ فلسطین کا رشتہ جتنا زیادہ جوڑتا تھا، اتنے ہی زیادہ فلسطینی تنظیم کو اپنی واحد سیاسی امید سمجھنا شروع کر دیتے تھے، معلوم ہوتا ہے کہ 1948ء سے قبل فلسطین کو نوآبادی بنانا اور اس کے مقامی باشندوں کو زیر کرنا ایک جائز اور برحق مہم تصور کیا جاتا تھا۔ تاہم 1967ء کے بعد جب یہ دعویٰ کیا گیا کہ اس مہم کو اسرائیل کی بین الاقوامی طور پر منظور شدہ سرحدوں سے اگلے علاقوں تک بڑھایا جا سکتا ہے، تو پھر مسئلہ محض تہذیب سکھانے یا محض سرزمین کی بازیابی کا نہیں رہا بلکہ سیدھی سادھی توسیع پسندی کا بن گیا۔ کہاں تو اسرائیلیوں کو مقابلے کا کمزور حریف تصور کیا جاتا تھا اور کہاں ان کی یہ کایا پلٹ ہوئی کہ وہ ایک ہی نسل کی زندگی میں بڑے لاٹ صاحبان بن گئے۔ تاہم معمول میں ایک فرق یہ آیا کہ فلسطینی ایک فلسطینی کی حیثیت سے منظرِ عام پر نمودار ہوا۔

میں نہیں سمجھتا کہ چند گنے چنے لوگوں کے ماسوا اسرائیلی فلسطینیوں کے متعلق یہ تصور قبول کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ وہ ایک ایسی سیاسی حقیقت ہیں جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ تاہم فلسطینیوں کو اتنا مرتبہ ضرور مل گیا ہے کہ بلحاظ آبادی انھیں ایک حقیقت تسلیم کر لیا گیا ہے اور اب یہودی بھی اس حقیقت سے نظریں چرا نہیں سکتے۔ اسرائیل کے ان سیاست دانوں نے جو پچھلے چند سالوں کے دوران میں وزارتِ عظمیٰ کے عہدے پر متمکن رہے ہیں، فلسطینیوں کا ذکر کرتے ہوئے جن تراکیبِ الفاظ کو استعمال کیا ہے، ان سے یہ کافی حد تک واضح ہو جاتا ہے کہ ان (فلسطینیوں) کے متعلق (اسرائیل کا) سرکاری رویہ کیا ہے۔ 1968ء میں آنجہانی وزیر اعظم گولڈا میئر نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ فلسطینی نام کی کوئی مخلوق صفحۂ ہستی پر موجود نہیں (جب کہ اس کے اطلاعات کے محکمے اور عرب امور کے علمی ماہرین نے مسلسل یہ مؤقف اختیار کیے رکھا کہ فلسطینی اصلاً ''جنوبی شام کے باشندے'' ہیں۔ ایک اور سابق وزیر اعظم تیز حاک رابن جب بھی فلسطینیوں کا ذکر کرتا تو انھیں ''نام نہاد'' فلسطینی کہتا۔ (جب کہ اس کے قابض حکام اسے یہ مشورہ دیتے نہ تھکتے تھے کہ اردن کے ساتھ سرحدیں کھول دی جائیں اور فلسطینیوں کو حقیقتاً اردنی بنانے کی پالیسی پر عمل کیا جائے۔) مناچم بیگن انھیں

ارتیز اسرائیل کے عرب کہتا ہے جیسے کہ وہ اسرائیل کے اپنے ''سیاہ فام'' باشندے ہوں۔ ① (اور انھیں اسرائیلی فوجی نگرانی میں حکومت خود اختیاری کی پیشکش کرتا ہے۔) ان تینوں (سابق وزرائے اعظم) کے سروں پر ایک ہی دھن سوار رہی کہ سیاسی طور پر فلسطینیوں کو نیست و نابود کرنا ہے۔ تینوں نے بیرون اسرائیل عام باشندوں کے خلاف وسیع پیمانے پر مملکتی دہشت گردی کی اجازت دی اور تینوں نے فلسطین کی مقامی عرب آبادی کو اپنے گھروں اور جائدادوں سے محروم کرنے کی اسرائیلی تاریخ سے کامل بے نیازی برتی ہے۔ ہر جگہ فلسطینیوں کے متعلق اسرائیلی پالیسی کا انتہائی حوصلہ شکن پہلو یہ ہے کہ اسرائیلیوں نے عقل و خرد بلکہ فہم عام (کامن سنس) کو بھی سرکاری طور پر اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا ہے اور آئیڈیالوجی کو ان سب باتوں پر ترجیح دی جاتی ہے۔ فلسطینیوں کی موجودگی سے وہ جس طرح انکار کرتے ہیں، علمیاتی طور پر وہ صرف اسی صورت میں بامعنی بن سکتا ہے، اگر اپنے آپ کو اور دوسروں کو یہ باور کرا دیا جائے کہ (صیہونیوں کی آمد سے قبل) فلسطین تو محض ایک بنجر، اجاڑ، ویران بیابان تھا اور اس بات کا منتظر کہ اس کے متعلق جو اغماض اور لاپروائی برتی گئی ہے، اس کا مداوا کیا جائے لیکن اصل حقیقت جب اس کے بالکل برعکس ہو اور روزِ روشن کی طرح عیاں ہو، تو اس قسم کی خرافات پر کان دھرنا اور انھیں ماننا اپنی پالیسی سے عقل و خرد کے کردار کو خیر باد کہنا ہے۔ مزید برآں یہ خیال کہ اسرائیل کو اس (مقبوضہ) علاقے کو اپنی دسترس میں رکھنے کا حق حاصل ہے کیونکہ انجیل مقدس یہ کہتی ہے اور اس (اسرائیل) کی اپنی سلامتی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس پر اس کا قبضہ برقرار رہے (حالانکہ جنگ کے دوران میں یہی علاقہ خاص طور پر غیر محفوظ اور ضرب پذیر ثابت ہوا) اسرائیل کے نہایت پُرجوش اتحادیوں کی سمجھ سے بھی بالا ہے۔

تنظیم آزادیٔ فلسطین کو جو محیر العقول بین الاقوامی کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں اور فلسطینیوں کے تمام طبقوں میں اسے جو مسلسل پذیرائی اور مقبولیت مل رہی ہے، ان کے نشانات اسرائیلی پالیسی کے منفی پہلوؤں اور عام فلسطینیوں کے اس عزم میں کہ اسرائیلی نقطہ ہائے نظر کے جو بھی متبادلات ہوں گے، وہ ان کو اپنانے کے لیے متحد ہو جائیں گے، تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ فلسطینی پہلا عرب طبقہ ہیں جنھوں نے کثیر النسل آبادی کے مسئلے کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ کسی دوسرے گروہ، طبقے یا قومیت نے اتنا جدید نقطہ نظر اختیار نہیں کیا کہ

① یہاں اشارہ جنوبی افریقہ کی طرف ہے جہاں کی سفید فام اقلیتی حکومت مقامی سیاہ فام اکثریت کو چھوٹی چھوٹی مقامی ریاستوں کی، جنھیں محدود طور پر حکومت خود اختیاری حاصل ہوگی جیسے ہمارے ہاں بلدیاتی اداروں کو حاصل ہے، پیشکش کر رہا ہے اور ایسی ایک دو ریاستیں اس نے قائم بھی کر دی ہیں۔

فلسطین میں مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کی ایک سیکولر جمہوری مملکت قائم کی جائے۔ 1967ء کی جنگ کے بعد کے زمانے میں علاقے میں جو ڈرامائی تبدیلیاں ہوئیں اور وہاں جن نئی حقیقتوں نے جنم لیا، ان سے خاطر خواہ نپٹنے کی جو کوشش تنظیم آزادیٔ فلسطین نے کی کسی دوسرے سیاسی ادارے یا تنظیم نے، خواہ وہ عرب ہو یا یہودی، نہیں کی۔ تنظیم آزادیٔ فلسطین نے پہلا کام تو یہ کیا کہ اس نے شعوری طور پر تمام فلسطینیوں......خواہ وہ جلاوطن تھے، مقبوضہ علاقوں کے باشندے یا اسرائیل کے باسی......کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ ناقابلِ برداشت حد تک چھوٹے چھوٹے گروہوں میں منقسم آبادی سے وسیع المشربی، رواداری، کشادہ دلی اور عدم تعصبی کے خوب صورت تناظر میں عہدہ برآ ہونے کی یہ اولین کوشش تھی جو فلسطینی قیادت نے کبھی کی تھی۔ اس سے کم از کم نظری طور پر یہودیوں کی کثیر موجودگی کی گنجائش نکل آئی (معاشرے، انتخابات، سیاسی نظام، غرضیکہ ہر جگہ انھیں عمل دخل حاصل ہو سکتا تھا۔) تنظیم آزادیٔ فلسطین کی ایک ٹھوس کارکردگی یہ ہے کہ اس نے جہاں بھی ممکن ہو، فلسطینیوں کو تعلیم حاصل کرنے کے مواقع فراہم کیے، انھیں مسلح کیا، ان کی سلامتی اور تحفظ کا سامان کیا، انھیں خورونوش کی اشیا مہیا کیں اور انھیں عام ضروریات کی دوسری چیزیں بہم پہنچائیں۔

دوم: تنظیم نے اپنی بین الاقوامی حیثیت اور اثر و رسوخ کو فلسطینی حقیقت کی، جو گزشتہ تقریباً ایک صدی کے دوران میں دُنیا کے سامنے دھندلا چکی تھی، تشریح و تعبیر کے لیے استعمال کیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے خود فلسطینیوں کو اس حقیقت کا احساس دلایا۔ یوں فلسطین کی ایک آزاد و خود مختار سفارتی شناخت اُبھر کر سامنے آئی۔ اس کے ساتھ ہی ایسے ذیلی ادارے وجود میں آ گئے جن کا کام معلومات فراہم کرنا اور مختلف امور اور موضوعات کے بارے میں تحقیق و جستجو کرنا ہے۔ ایسے ذیلی اداروں میں مطالعاتی مراکز، ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور طباعتی ادارے شامل ہیں۔ معلومات فراہم کرنے اور مختلف امور و مسائل کی تشریح و تعبیر کرنے والے ان مختلف النوع اداروں نے انجام کار اجتماعی طور پر فلسطینیوں کا رابطہ افریقہ، ایشیا اور امریکا کی دیگر استعمار گزیدہ اقوام کے ساتھ قائم کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صیہونیوں کا یہ جو رعب و دبدبہ تھا کہ باہر کی دُنیا جو جی چاہے کہتی اور کرتی رہے، وہ کوئی اثر قبول نہیں کریں گے اور اپنی مرضی کرتے رہیں گے، فلسطینیوں اور دوسرے عربوں کی نگاہوں میں وہ زائل ہونے لگا اور اب وہ ان سے اتنا مرعوب نہیں رہے جتنا کہ وہ پہلے کبھی تھے بلکہ اب تو صورتِ حال نے مؤثر بہ ماضی ایک نیا پلٹا کھایا۔ اب انھیں صیہونی آبادکار سنگدل خاموش آقا کے بجائے افریقہ کے سفید فام نو آبادکاروں کا مثیل نظر آنے لگا۔ صیہونی آبادکاروں کے متعلق رویے کی یہ تبدیلی ایک ایسی قوت میں ڈھلنے لگی جسے بسرعت حرکت میں لایا اور (حریف کے خلاف) کارروائیاں کرنے کے لیے مجتمع کیا جا سکتا تھا۔

سوم: ایک سیاسی تنظیم کی حیثیت سے تنظیم آزادئ فلسطین کے دروازے چاروں طرف سے کھول دیے گئے تاکہ قوم کے تمام افراد کو اس کی صفوں میں داخل اور شامل کیا جاسکے اور سچی بات یہ ہے کہ اور اس میں مبالغے کا کوئی پہلو بھی شامل نہیں کہ تنظیم آزادئ فلسطین نے ہر فلسطینی کے لیے (بالخصوص جب یہ حقیقت پیشِ نظر رہے کہ یہ قوم تباہ کن انداز سے مختلف چھوٹے چھوٹے اور بے حیثیت گروہوں میں تقسیم ہو چکی تھی) اس بات سے قطع نظر کہ وہ کہاں رہتا ہے یا یہ کہ نظریاتی طور پر اس کی سیاسی وابستگیاں کیا ہیں، نہ صرف ایک فلسطینی ہونا ممکن بنا دیا بلکہ اسے ایک بامعنی اور باوقار چیز بھی بنا دیا۔ یہ تنظیم آزادئ فلسطین ہی کا فیضان ہے کہ اس نے عام فلسطینیوں کو مجہول اور انفعالی حیثیتوں سے اٹھایا اور انھیں ایسے انسانوں کے قالب میں ڈھال دیا جو سیاسی محاذ پر پورے تن من دھن سے سرگرمِ عمل ہو چکے ہیں، تاہم جیسا کہ میں بعد میں ذکر کروں گا، یہ (تنظیم آزادئ فلسطین) خطرناک حد تک عدم التصاق [1] کا ذریعہ بھی ہے۔

میرے خیال میں فلسطینیوں کے ان مختلف اور منتشر اجزا کی تاریخ اور نمو کا مبسوط لیکن بہترین جائزہ و تجزیہ پیش کرتا ہے جو حال ہی میں ابراہیم ابوالغود نے جن کا شمار فلسطین کے انتہائی ہوش مند، زیرک اور طباع مفکرین میں ہوتا ہے، پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ 1948ء کے معا بعد فلسطینی جلاوطنوں نے بھی، اور ان فلسطینیوں نے بھی، جنھوں نے اسرائیل ہی میں مقیم رہنے کا فیصلہ کیا تھا، ''مصالحت کی سیاست'' اختیار کرلی۔ اوّل الذکر اگرچہ سیاسی اعتبار سے بے حیثیت ہو چکے تھے، پھر بھی وہ فلسطینی نہ سہی، کم از کم عرب سیاست میں ضرور خیل ہو سکتے تھے اور ہوتے تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ایک تو ان کے پاس اور کوئی متبادل نہیں تھا۔ دوسرے صیہونیت کے برعکس عربیت لاغیریت پسند نہیں تھی۔ البتہ جو لوگ اسرائیل ہی میں قیام پذیر رہے، انھوں نے اسرائیلی نظم کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا اور صیہونیت نے ان کے لیے زبردستی جو دائرۂ کار متعین کیا تھا، انھوں نے اس کی حدود کے اندر رہتے ہوئے سیاست کاری کے روایتی فلسطینی طریقے اپنا لیے۔ 1950ء کے عشرے کے دوران میں ''تارکینِ وطن اور اسرائیلی عرب، دونوں ہی، اس سیاست میں مشغول ہو گئے جسے استرداد کی سیاست کہا جاسکتا ہے۔'' اس سیاست نے اندرونِ اسرائیل اسرۃ الارض کی مہم جوئی کی صورت اختیار کرلی۔ جہاں تک جلاوطن پناگزینوں کا تعلق ہے، انھوں نے یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ وہ سیاست کاری کے حق سے محروم ہو چکے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے ''آزادئ فلسطین'' کے متعلق ''برادر عربوں'' کی پالیسیوں کو تنقید کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ ابراہیم الغود رقمطراز ہیں:

---

[1] Incoherence

یہ جون 1967ء کی جنگ کے دھچکے اور صدمے تھے جو انقلاب اور امید کی سیاست کے نقیب بنے۔ جلاوطن فلسطینیوں نے اس نئی صورتِ حال کا مفہوم یہ لیا کہ اب انھیں مزاحمت کی کارروائیوں کا آغاز کر دینا چاہیے، عرب سیاست سے دامن چھڑا لینا چاہیے اور اپنے فلسطینی ہونے کا کھلم کھلا اظہار کرنا چاہیے۔ انجام کار یہ رویہ تنظیم آزادیٔ فلسطین اور اس کے پروگرام کی ٹھوس صورت اختیار کر گیا۔ جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے جو اسرائیل کے اندر ہی قیام پذیر رہے تھے، ان کے نزدیک اس نئی صورتِ حال کا مطلب یہ تھا کہ وہ (اسرائیلی) نظام کے اندر رہ کر زیادہ جارحانہ رویہ اختیار کریں اور کمیونسٹ پارٹی اور فلسطین میں دو ریاستوں کے قیام کے متعلّق اس (کمیونسٹ پارٹی) کی مزید تائید وحمایت کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کا یہ خیال بھی تھا کہ اس بات سے قطع نظر کہ فلسطینی مختلف چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ چکے تھے، انھیں فلسطینی قوم کی ایکتا کا پُرزور اعلان کرنا چاہیے۔ دونوں فریقوں نے عرب ''قوم'' کے ساتھ اپنے ثقافتی رشتوں کا ادعا تو کیا لیکن عرب قوم کو وحدت کی ایک لڑی میں پرونے کا جو سیاسی پروگرام ہے، اسے انھوں نے کم سے کم بنا کر پیش کیا۔ ان دونوں فریقوں کے جو جو نقطہ ہائے نظر ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک نقطۂ اتصال کی طرف بڑھ رہے ہیں (ابو الغود نے صرف دو فریقوں کا تذکرہ کیا ہے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ ان میں ایک تیسرے فریق کا اضافہ کرنا چاہیے اور یہ تیسرا فریق ان فلسطینیوں پر مشتمل ہے، جو مقبوضہ علاقوں میں آباد ہیں۔)[1]

لیکن ''انقلاب اور امید کی سیاست بھی'' کرب اور رکاوٹوں سے خالی نہیں تاہم اس معاصر دور کی تہ در تہ پیچیدگی اور گنجائنیت عمیق غور وفکر کی مستحق ہے اور اب میں اسی کو زیرِ بحث لانا چاہتا ہوں۔ میری توجہ کا مرکز صحیح معنوں میں سچے اور بے آرائش متحدہ فلسطینی سیاسی شعورِ ذات کی نمو ہے۔ اس سیاسی شعورِ ذات کا معاصر تاریخ کے ساتھ نہایت گہرا اور قریبی تعلق ہے اور قوم اپنے حق خود ارادیت کے حصول کی طرف جو آہستہ آہستہ پیش قدمی کر رہی ہے، یہ (سیاسی شعورِ ذات) اس کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

---

(1) ابو الغود: جریس کی کتاب ''اسرائیل کے عرب'' پر تبصرہ۔ مطبوعہ MERIP Reports شمارہ نمبر 58 (جون 1977ء) صفحہ نمبر: 24

②

فلسطینی شعور کا ظہور

شاید یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ایسے موضوع پر بحث کرتے وقت، جو تاریخ کے لیے اتنا ہی حسّاس ہے جتنا کہ قومی خود آگاہی، اس شخص کا، جو بحث میں حصہ لے رہا ہے، یہ فرض بنتا ہے کہ وہ ٹھوس صداقت کے مقابلے میں مجرد وضاحت کی قربانی دے دے۔ فی زمانہ فلسطینیوں کی صورت بے حد الجھی ہوئی ہے۔ پیشتر اس کے کہ میں اس چیز کو بالتفصیل بیان کروں جسے وہ اپنے ماضی اور مستقبل، اپنی تاریخی اور سیاسی شناخت کی اپنی تفہیم کہتے ہیں۔① یہ ضروری ہے کہ پہلے اس شے سے بھی نپٹ لیا جائے جو ایک طرف تو اس تفہیم کی وجہ سے ان کے حالات میں در آئی ہے اور دوسری طرف اس کا واقعیت کی دُنیا میں واسطہ کن چیزوں سے پڑا۔ فلسطین عوام کی پیچ در پیچ اور تکلیف دہ صورتِ حال کو زیرِ بحث لاتے وقت ایک مزید الجھن اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اسے انتہائی مفسدہ پردازی بلکہ افراتفری کے پس منظر میں رکھ کر دیکھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر 77-1975ء کی لبنانی جنگ نے لبنانی، شامی، فلسطینی ڈرامے کی محض سٹیج ہی آراستہ نہیں کی بلکہ درحقیقت یہ جنگ بذاتِ خود بین الاقوامی سیاست، عظیم طاقتوں کے مفادات، عرب دُنیا میں اقلیتوں کی تاریخ، سماجی، سیاسی انقلاب اور مشرقِ وسطیٰ میں مغربی نوآبادکاری اور استعمار کے پورے المناک ورثے کو ایک چھوٹے

① یعنی خود فلسطینی ان چیزوں کے متعلق خود کیا سمجھتے ہیں۔

پیمانے پر پیش کرنے کی کوشش بھی تھی۔اب اصل کام جو کرنے کا ہے، وہ یہ ہے کہ ان امور کا ایک سرسری خاکہ پیش کردیا جائے تا کہ یہ (خاکہ) اس مرکزی موضوع کا، جس کے متعلق میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں اور جو فلسطینی بقا اور 1967ء کے بعد کے عہد میں فلسطینی قومی شناخت جیسے مسائل کا احاطہ کرتا ہے، افتتاحیہ بن سکے۔

پہلے لبنان ہی کو لیں۔عرب مشرقِ وسطیٰ کا ایک زیرک اور تیز فہم مؤرخ معاً اس حقیقت کو بھانپ جائے گا کہ لبنان میں جو کچھ پیش آیا، اگر فلسطینی اور شامی وہاں موجود نہ ہوتے، تو یہ بالکل انھی واقعات کا اعادہ ہوتا جو 1845ء اور 1860ء میں وہاں وقوع پذیر ہوئے تھے۔(ان سالوں میں) لبنان کے دو بڑے فرقوں...... مارونی عیسائیوں اور دروزیوں ① ...... کے مابین شدید مخاصمت امنڈ آئی تھی۔جس طرح اب اس تنازعے میں بڑی طاقتیں ملوث ہیں، اس وقت بھی وہ اس میں اسی طرح ملوث تھیں۔تاہم ان دونوں فرقوں کے مابین جو معاشرتی اور سیاسی آویزش پائی جاتی ہے، اس کی نہ تو اس وقت خالص مذہبی بنیادوں پر حدود متعین کی جاسکتی تھیں اور نہ اس وقت لیکن میرا اپنا خیال یہ ہے کہ یہاں انیسویں اور بیسویں صدی کے مابین سودمند موازنہ ختم ہوجاتا ہے۔اس علاقے کا کوئی بھی باشندہ اپنے متعلق کیا سوچتا ہے اور وہ اپنی سیاسی وابستگی کے مفہوم کو کس طور لیتا ہے، جنگِ عظیم دوم کے بعد اس میں فیصلہ کن ہی نہیں بلکہ انتہائی اہم تبدیلیاں اور اضافے رونما ہو چکے ہیں۔اولین تبدیلی یا اضافہ یہ ہے کہ اپنی قومی مملکت کے بارے میں لوگ جن جذبات کا اظہار کرتے ہیں، ان کی شدت میں اب بے پناہ اضافہ ہوگیا ہے۔البتہ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ قومی مملکت کے ساتھ وابستگی میں جو شدت پائی جاتی ہے، وہ مختلف مدارج کی ہے، بالکل اسی طرح جس طرح کہ قومی مملکتوں کی آزادی یا علاقائی تشخص کو جب کوئی خطرہ لاحق ہوتا ہے، تو اس سے مختلف اقسام اور مختلف مدارج کے جذبات عالمِ وجود میں آتے ہیں۔ایک اور نقطۂ نظر کی رو سے جو بات لاریب درست ہے، وہ یہ ہے کہ جنگِ عظیم دوم کے بعد مملکت اور اس کے کارپردازان نے خیرہ کن اختیارات حاصل کرلیے ہیں۔پھر جہاں تک ان اختیارات اور ان کے استعمال کا تعلق ہے، مختلف ممالک میں ان کی نوعیت مختلف ہے (کسی کے پاس کچھ کم ہیں اور کسی کے پاس کچھ زیادہ) تاہم موجودہ زمانے کے اختیارات ان اختیارات سے، جو مثال کے طور پر سلطنتِ عثمانیہ اپنے آپ کو تفویض کرتی تھی، بالکل مختلف قسم کے ہیں اور یہ بات (آج کی) تمام مملکتوں پر صادق آتی ہے۔

بیسویں صدی میں جو دوسری بڑی تبدیلی رونما ہوئی، وہ یہ ہے کہ جہاں تک سیاسی فکر کا تعلق ہے، اس

---

① اسمٰعیلی شیعوں کی ایک شاخ

بات کا غالب امکان پایا جاتا ہے کہ خالصتاً مقامی نوعیت کے مسائل کا بھی وسیع تر عالمی تعمیمات کے تناظر میں ہی ادراک کیا جائے گا، (اسی تناظر میں) ان سے نپٹا جائے گا، ان کا تجزیہ کیا جائے گا اور ان کے متعلق محاذ آرائی کی جائے گی۔ صیہونیوں نے (حصول) فلسطین کی خاطر جو طور طریقے اور ہتھکنڈے اپنائے، ان پر یقیناً یہی بات صادق آتی ہے۔ مثال کے طور پر بیسویں صدی کے کٹر مارونی عیسائیوں میں یہ بات بہت عام ہے کہ وہ اپنے متعلق یہ باور کرتے ہیں کہ ہم مغربی تہذیب وتمدن کی اصل خصوصیات اپنے اندر سمو چکے ہیں اور یہ ہم وحشیوں کے ان جتھوں کو، جو ہمارے دروازوں پر دستک دے رہے ہیں، دور باش کہنے کی سعی کر رہے ہیں۔ بعینہٖ 1967ء کے بعد فلسطینیوں میں بھی یہ رجحان پیدا ہوا ہے کہ وہ اپنی جدوجہد کو اسی تناظر میں رکھ کر دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں جس میں ویت نام، الجزائر، کیوبا اور سیاہ فام جنوبی افریقہ کے عوام اپنی جدوجہد کو دیکھتے تھے یا دیکھتے ہیں۔ جزوی طور پر نقطۂ نظر کی یہ تبدیلی اس اضافہ پذیر عالمی سیاسی شعور کی مرہونِ منت ہے جس کی تشکیل حریت اور علم کے متعلق خیالات کی وسیع وعریض تشہیر اور نوآبادیات اور استعمار کے خلاف جدوجہد کے نتیجے کے طور پر ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ ذرائع ابلاغ کے اثر ورسوخ نے دُنیا کے دور دراز علاقوں اور اس سے بھی کہیں زیادہ بالکل ہی مختلف (اور بعض اوقات متضاد) خیالات کے گروپوں کو بعض اوقات بلاامتیاز اور بعض اوقات منصفانہ انداز سے ایک دوسرے کے بالکل قریب لاکھڑا کردیا ہے۔ ایک طرف تو عام رجحان یہ ہے کہ ہر واقعہ کو تعمیمی رنگ دے دیا جاتا ہے، اور دوسری طرف ذرائع ابلاغ اور اوسط دماغ کے مالک انسانوں میں یہ رجحان عام پایا جاتا ہے کہ وہ ہر بات کو آسان سے آسان تر بنا کر اور اسے ڈرامائی انداز دے کر پیش کرتے ہیں۔ اگر ان دونوں رجحانات کو آپس میں اکٹھا کردیا جائے تو اس کا نتیجہ بس یہی نکلے گا کہ مسائل اور عمل کے متعلق غلیظ سیاسی لفاظی کا سہارا لیا جائے گا، مبالغہ آرائی میں اضافہ ہوجائے گا، غیراہم موضوعات کو خواہ مخواہ اہم بنا کر پیش کیا جائے گا اور اکثر اوقات ان پر مذہب کا غلاف چڑھا دیا جائے گا۔ یہ ہوگا نہیں، بلکہ ہوتا ہے۔ کوئی بھی اس سے مامون نہیں، کوئی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔

غالباً یہ بات ہمیشہ صحیح رہی ہے کہ انسان ایک دوسرے سے اپنے اختلافات کو تشریح وتعبیر کے امور گردانتے رہے ہیں، یہ کہنا کہ انیسویں صدی کے دوران میں کسی چیز کے متعلق ایک مخصوص قسم کا فرانسیسی یا برطانوی رویہ تھا، یہ کہنے کے مترادف ہے...... آپ یہ بات خواہ کتنے ہی مبہم یا گول مول طریقے سے کیوں نہ کریں...... کہ حقیقت سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ایک مخصوص قسم کا فرانسیسی یا برطانوی انداز تھا۔ اس قسم کے ادعا میں یہ تفہیم یا ادراک بھی شامل ہوتا ہے کہ ایسی چیزیں، جنھیں صحیح معنوں میں خالصتاً فرانسیسی یا برطانوی مفادات کا نام دیا جاسکتا ہے، حقیقتاً موجود تھیں، اور دراصل یہی وہ مفادات تھے جو ان (اقوام کے) رویے

متعین کرتے تھے۔ موجودہ زمانے میں اس قسم کی باتیں مشرقِ وسطیٰ اوراس کی اقوام کے متعلق کہی جاتی ہیں۔ تاہم ان دو تبدیل شدہ حقیقتوں کے پیشِ نظر، جن کا ذکر میں کر چکا ہوں، اس قسم کی باتوں میں یہ سہولت پیدا ہوگئی ہے کہ آپ ان سے جو چاہیں، مطلب اخذ کرلیں اور یہ چیز بڑی خطرناک ہے۔ فی زمانہ ہم جب عربوں، لبنانیوں، یہودیوں یا اسرائیلیوں کا ذکر کرتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ ہم گویا محکم تشخصات کا ذکر کر رہے ہیں جب کہ درحقیقت ہم ایسے مفاہیم وتفاسیر کا ذکر کر رہے ہوتے ہیں جو انتہائی سیماب وش، متلون بلکہ انتہائی قیاسی ہوتے ہیں۔ مانا کہ ایسی مملکتیں موجود ہیں جن کے متعلق ہم یقین سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ کیا چاہتی ہیں لیکن...... اور یہاں بیسویں صدی کی دوسری بڑی تبدیلی پہلی تبدیلی کے ساتھ متصادم ہوجاتی ہے...... یہ مملکتیں ایسی سیاسی لفظیات کی گرفت میں ہیں اور ایک سیاسی اقلیم میں مقید ہیں، جس کی زمین مسلسل تبدیلیوں کے عمل میں سے گزرتی رہتی ہے۔ اس صورتِ حال کے سیاسی لین دین اور طریقہ ہائے کار پر جو اثرات مرتب ہوئے ہیں، ان کے بارے میں کسی قسم کے مغالطے کی کوئی گنجائش نہیں۔ 1976ء میں شام نے لبنان پر جو چڑھائی کی، اس کے بعد ''عرب اتحاد'' جیسی تراکیب کے کیا معنی رہ جاتے ہیں؟ ''انقلابی یا انتہا پسند عرب ممالک'' جیسی تراکیب کا کیا مفہوم ہے؟ پھر اس قسم کے مطالبات کا صحیح مطلب کیا ہے جن کے تحت اسرائیل اور امریکا اس قسم کے استفسارات کرتے ہیں۔ کیا عرب اسرائیل کو ''تسلیم'' کرلیں گے یا نہیں؟ یہ سوال اس وقت اور بھی گنجلک ہوجاتا ہے جب اتنا بھی واضح نہ ہو کہ وہ کس اسرائیل کی بات کر رہے ہیں، جس کا وجود وہ ''عربوں'' سے منوانا چاہتے ہیں...... 1948ء کا اسرائیل یا 1967ء کا اسرائیل؟ یا بات اُس اسرائیل کی ہو رہی ہے جس کی جنگی کشتیاں جنوبی لبنان کی ناکا بندی کر چکی ہیں اور اس پر گولہ باری کرتی ہیں (اور بعض اوقات تو اس ''نیک کام'' میں اسے خیر سے شام کی تائید وحمایت بھی حاصل ہوتی ہے)؟

مجھے یہ دلیل پیش کرنے میں قطعاً کوئی دشواری پیش نہیں آتی کہ اس قسم کے مسائل مشرقِ وسطیٰ کی سیاسی زندگی کا ایک باقاعدہ رنگ روپ ہیں اور یہ کہ مشرقِ وسطیٰ میں جو باتیں اتنی انوکھی، عجیب وغریب اور خلافِ معمول دکھائی دیتی ہیں، وہ حقیقتاً اتنی انوکھی، عجیب وغریب اور خلافِ معمول ہیں نہیں۔ اس قسم کی باتوں کے متعلق میرا جواب یہ ہے کہ چونکہ اس علاقے میں مملکتوں اور مملکتی ڈھانچوں کی ضرورت اور اہمیت پر حالیہ زمانے میں اس قدر بڑھ چڑھ کر زور دیا جانے لگا ہے اور نیز چونکہ مملکتوں کی جو تعریف کی جاتی ہے، وہ تعریف اس قسم کی ہوتی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ مملکت کوئی عام قسم کی چیز ہے یا کائناتی اہمیت کی حامل کوئی عمومی چیز، چنانچہ بالکل یہی وجہ ہے جو مشرقِ وسطیٰ کے انوکھے پن، اس کے عجیب وغریب ہونے یا خلافِ معمول نظر آنے کو اتنا نمایاں بنا کر ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ مشرقِ وسطیٰ ویسے ہی مسائل کی ایک پوٹ ہے۔ ان مسائل میں

فلسطینیوں کو ایک فقید المثال مقام حاصل ہے۔ چنانچہ مسائل کی اس پوٹ میں اگر فلسطینیوں کے فقید المثال مقام کا اضافہ کر دیا جائے تو صورتِ حال یہ بنے گی کہ مشرقِ وسطیٰ جو پہلے ہی اتنی بے ضابطگیوں (Anomalies) کی آماجگاہ بنا ہوا ہے، وہ پہلے سے کئی گنا بڑھ جائیں گی۔ فلسطینی مشرقِ وسطیٰ کا وہ پہلا مقامی گروپ ہیں جنھیں عرب قوت کے مسئلے سے اس کے وسیع، عمومی اور تشریحی صورت میں عہدہ برآ ہونا پڑا اور اس کے ساتھ ہی انھوں نے سب سے پہلے ایک ٹھوس شکل میں یہ مطالبہ بھی کیا انھیں ایک مملکت کا درجہ دیا جائے۔ صیہونیوں نے جب فلسطین کو ایک نوآبادی بنانے کی تحریک شروع کی، فلسطینیوں نے اس کی مخالفت کی اور یوں ان دونوں کے مابین کشمکش شروع ہوگئی۔ اس کشمکش نے فلسطینیوں پر دُہری ذمہ داریاں ڈال دیں۔

1۔ سلطنتِ عثمانیہ کے سقوط کے بعد عربوں نے سیاسی آزادی اور آزاد ممالک کا درجہ حاصل کرنے کی جو تحریک چلا رکھی تھی، ضرورت اس بات کی تھی کہ فلسطینی اپنی مزاحمت کا ناتا اس کے ساتھ استوار کریں۔

2۔ صیہونیوں نے ایک مخصوص یہودی مملکت کے قیام کے لیے جو مطالبہ پیش کر رکھا تھا، ضرورت اس بات کی تھی کہ اس مطالبے کی ڈٹ کر مخالفت کی جائے کیونکہ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا...... اور بعد کے واقعات نے تو اسے صحیح ثابت کر دیا...... کہ نئی یہودی مملکت میں مجموعی طور پر انھیں کوئی حیثیت حاصل نہیں ہوگی بلکہ انھیں بہ یک بینی و دو گوش ملک سے ہی باہر نکال دیا جائے گا۔

ایک خاص حد تک فلسطینیوں کو اور اس خطے کو، جس سے ان کا تعلق ہے، بالکل اسی قسم کی تکلیف دہ صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا جس کا سامنا دُنیا کے بعض سابقہ استعمار گزیدہ علاقوں کے عوام کو کرنا پڑا تھا، تاہم جیسا کہ میں باب اول میں اشارہ کر چکا ہوں، مشرقِ وسطیٰ کی تاریخ کا ایک غیر معمولی طور پر اہم پہلو یہ ہے کہ یہاں نہ صرف ایسی جماعتیں اور ادارے موجود ہیں جو جھگڑا اور فساد کھڑا کرنے اور حقائق کی من مانی تعبیر کرنے کے ماہر ہیں...... عام طور پر اس قسم کے ادارے اقلیتی حکومتوں کے روپ میں سامنے آتے ہیں...... بلکہ یہاں ایسے اداروں اور جماعتوں کی بھی کوئی کمی نہیں جو بے حد فعال ہیں اور جنھیں اپنا نقطۂ نظر پُرزور انداز سے پیش کرنے میں بہت مہارت حاصل ہے۔ ان میں سے ہر ادارے یا جماعت نے دُنیا کے اس خطے میں، جس کا وہ خود ایک جزو ہے، اپنی مرضی اور اپنا نقطۂ نظر ٹھونسنے کے لیے نہ صرف یہ کہ مہم جوئی کا آغاز کیا بلکہ اس مقصد کے حصول کی خاطر (اسرائیل کی طرح) عملی جدوجہد بھی کی۔ بیسویں صدی کی جن تبدیلیوں کا میں نے ذکر کیا ہے، اگر ان میں محولہ بالا عنصر کو بھی شامل کر دیا جائے اور ساتھ ہی ان میں اقلیتوں کے اس قدرتی میلان کو بھی ملا جائے کہ وہ اپنی کوششوں کو پروان چڑھانے کے لیے خارجی طاقتوں کی امداد و حمایت حاصل کرتی

ہیں، تو آج مشرقِ وسطیٰ میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس کو ہم بہتر انداز سے سمجھ سکیں گے۔ ان اقلیتوں نے اپنی مخصوص خود آگاہی کو برقرار رکھا ہے۔ اس خود آگاہی کا خاکہ البرٹ حورانی نے بدیں الفاظ پیش کیا ہے:

مجموعی طور پر ان گروہوں نے بند طبقوں کی تشکیل کی۔ ان میں سے ہر طبقہ اپنی ''دُنیا'' آپ تھا۔ یہ دُنیا نہ صرف اس طبقے کے ارکان کی تشکیل کے لیے کافی تھی بلکہ ان کی قطعی وفاداری حاصل کرنے کے لیے بھی ممد ثابت ہوتی تھی۔ یہ دُنیا میں ایک دوسرے کو مس ضرور کرتی تھیں لیکن ایک دوسری میں مدغم نہیں ہوتی تھیں۔ ان میں ہر ایک باقیوں کو نہ صرف شک وشبہ بلکہ نفرت کی نظر سے بھی دیکھتی تھی۔ یہ تقریباً ساری کی ساری ساکن، غیر متبدل اور محدود تھیں لیکن جہاں تک سنی دُنیا کا تعلق ہے، اگرچہ ہر قسم کے اندرونی اختلافات کی وجہ سے وہ پارہ پارہ ہو چکی تھی، پھر بھی اس میں ایک نوعیت کی آفاقیت، خود اعتمادی اور احساسِ ذمہ داری موجود تھی اور یہ وہ چیزیں ہیں جن سے دوسری دُنیائیں محروم تھیں۔ تاہم ان سب (باقی دُنیاؤں) کی حیثیت برائے نام تھی اور جہاں تک طاقت اور یا ایسے فیصلے کا تعلق ہے جو تاریخ پر اثر انداز ہو سکے، وہ اس سے بھی تہی دامن تھیں۔ ①

مشرقِ وسطیٰ کی اقلیتیں جو پہلے ہی چھوٹی چھوٹی اور (تعداد میں) بے شمار ہیں، اپنے ارکان کو اور بھی چھوٹی نظر آتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا کام کرنے کا رجحان کچھ اس قسم کا ہے، جو انھیں اصل سے بھی چھوٹا بنا دیتا ہے۔ اقلیتیں اپنے آپ کو اپنے انسانی گردوپیش سے علیحدہ کر لیتی ہیں اور داخلی طور پر وہ مزید چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ جاتی ہیں۔ یہ بات اسرائیل پر بھی صادق آتی ہے جہاں (عربوں کا تو ذکر ہی کیا) مشرقی اور یورپی یہودی ملک کو نمایاں انداز میں چھوٹے چھوٹے ذیلی خانوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ مشرقِ وسطیٰ کے عیسائی جنھیں عام طور پر مشرقی یا اورینٹل عیسائی کہا جاتا ہے، لبنان جیسے ممالک میں بھی، جہاں وہ کسی انداز سے بھی ایک دبکنے والا یا نظروں سے اوجھل ہو جانے والا گروہ نہیں، اپنے امتیازات اور اختلافات کی بہت فکر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہر فرقہ دوسرے فرقے کے مقابل ڈٹا ہوا ہے اور اس میں وہ اسی قسم کی شوونیت ② اور مہارت کا مظاہرہ کرتا ہے، جو وہ مسلمانوں کے ساتھ اپنے اختلافات اور نزاعات میں دکھاتے ہیں۔ بظاہر تو یہی دکھائی دیتا ہے کہ لبنان میں جو دھما کا خیز صورتِ حال پیدا ہو چکی ہے اور جس قسم کی آگ وہاں بھڑک رہی

---

① البرٹ حورانی (Hourani) عرب دُنیا کی اقلیتیں (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، لندن: 1947ء) صفحہ نمبر 22

② اس لفظ کی تشریح صفحہ نمبر 101 کے حاشیے پر کی جا چکی ہے۔

ہے، اس نے ''مسلمان'' کو ''عیسائیوں'' کے مدمقابل لا کھڑا کیا ہے لیکن جس بات کو پردۂ اخفا میں رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ مارونی عیسائی، جو اورینٹل عیسائیوں کی ایک خاص قسم ہیں، ہی تھے جنھوں نے جنگ کے آغاز میں سنی مسلمانوں کی مخالفت کی تھی حالانکہ اِن سنی مسلمانوں کا کثیر التعداد شیعہ مسلمانوں کے ساتھ فی نفسہٖ کوئی اتحاد نہیں تھا اور مارونی عیسایوں کی اس جنگجویانہ جدّوجہد میں یونانی قدامت پسند، پروٹسٹنٹ، آرمینی یا یونانی کیتھولک فرقوں نے اس اتفاقِ رائے کے ساتھ شرکت نہیں کی جس کی کہ ہم توقع کر سکتے تھے پھر مارونی عیسائیوں کو اکسانے اوراُن کی دم مروڑنے میں اسرائیلیوں نے بھی ایک فعال کردار ادا کیا (بلکہ ابھی تک کر رہے ہیں) یہ اسرائیلی ہی تو ہیں جو انھیں ہتھیار، گولہ بارود اور رسد پہنچاتے ہیں اور ان کی سیاسی حمایت کرتے ہیں۔ اسرائیل لبنان میں جس پالیسی پر عمل پیرا ہے، اس کی تہ میں یہ حکمت کارفرما نہیں کہ اسے ''عیسائیوں'' کے ساتھ کوئی ہمدردی ہے بلکہ مشرقِ وسطیٰ کی اقلیتوں کا یہ جو مشترکہ مقصد ہے کہ فلسطینیوں کو کسی نہ کسی طریقے سے تباہ و برباد کر دیا جائے۔ ① اسے وہ دائیں بازو کے عیسائیوں کی امنگوں کا ساتھ دے کر حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جنگِ عظیم دوم سے قبل بھی صیہونی عالمی کونسل کی کانگریس منعقدہ 29 جولائی تا 7 اگست 1937ء ڈیوڈ بن گوریان ② نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''لبنان کی قربت یہودی مملکت کے لیے بے پناہ سیاسی حمایت تشکیل کرتی ہے۔ لبنان یہودی ارتیز اسرائیل کا قدرتی اتحادی ہے۔ لبنان کی عیسائی قوم کا مقدر بعینہٖ وہی ہے، جو یہودی قوم کو درپیش ہے۔''

میرا خیال ہے کہ یہاں مجھے یہ ذکر بھی کر دینا چاہیے کہ مشرقِ قریب کی جنگجو اقلیتوں کا رویہ، اس چیز کے خلاف جسے حورانی سُنّی مسلمانوں یعنی اکثریتی طبقے کی آفاقیت، خود اعتمادی اور احساسِ ذمہ داری کا نام دیتا ہے، ہمیشہ جارحانہ رہا ہے۔ اس علاقے کے مسلم، عیسائی تعلقات کی تاریخ پر غور کریں۔ نارمن ڈینیل نے اپنی ایک کتاب ③ میں اس کے متعلق کافی کچھ لکھا ہے۔ ایک معاصر اورینٹل عیسائی یا عرب امور کے ماہر ایک اسرائیلی

---

① پچھلے پندرہ بیس برسوں سے لبنان میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ مصنف کے دعوے کی تائید کے لیے کافی ہے۔ فلسطینیوں کی ایک عظیم اکثریت سنی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ چنانچہ جب بھی موقع ملتا ہے، اسرائیلی، مارونی عیسائی، لبنان کے شیعہ مسلمان اور شامی (شام کی حکومت ایک اقلیتی گروہ کے قبضے میں ہے) فلسطینیوں پر چڑھ دوڑتے ہیں۔

② ڈیوڈ بن گوریان (1973-1886ء) اسرائیل کا پولینڈ نژاد اولین وزیر اعظم۔ اسے اسرائیل میں وہی مقام حاصل ہے جو پاکستان میں قائداعظم کو، ترکی میں کمال اتاترک کو، اور بھارت میں مہاتما گاندھی کو حاصل ہے۔

③ Norman Daniel, Islam and the West: The Making of an Image ناشر: ایڈنبرا یونیورسٹی پریس، 1960ء

کی حیثیت سے، جو اسلام یا عرب ''ذہنیت'' کو اپنا دشمن باور کرتا ہے۔ ڈینیل نے یہ جو کتاب لکھی ہے وہ اکثر مقامات پر شدید بے چینی اور پریشانی کا باعث بنتی ہے۔ وہ جو کچھ ثابت کرتا ہے، یہ ہے کہ یہ شامی عیسائی تھے جن میں دمشق کا سینٹ جان (تقریباً 675ء یا تقریباً 749ء)[1] اور نویں صدی کا فلسفی الکندی شامل تھے، جنھوں نے یورپی عیسائیوں کو مسلمانوں اور (حضرت) محمد (مصطفیٰ ﷺ) کی ذاتِ اقدس پر حملے کرنے کے لیے مذہبی (اکثر دریدہ دہنی اور دشنام طرازی سے بھرپور) اور اعتقادی مواد فراہم کیا۔ بعدازاں اس مواد کو مغربی ثقافت میں اہم مقام مل گیا اور بعض لوگ تو آج بھی اس مواد کو بالکل صحیح سمجھتے ہیں۔ (حضرت) محمد (مصطفیٰ ﷺ) کے متعلق طرح طرح کی واہیات اور لغو باتیں، انھی شامی عیسائیوں کی دماغی اختراع تھیں۔ چونکہ یہ شامی عیسائی عربی اور ایک دو کلیسائی زبانیں جانتے تھے، اس لیے وہ اس قسم کی غلیظ اور بدبودار خرافات کو فروغ دینے میں کامیاب رہے۔ (اس کے پس پردہ) ان کے جو محرکات تھے، وہ (آسانی سے) سمجھ میں آجاتے ہیں۔ اصل قصہ یہ تھا کہ اسلام ایک تبلیغی اور فاتح دین تھا اور چونکہ شامی عیسائیت پر نہایت استقامت اور ثابت قدمی سے ڈٹے ہوئے تھے، اس لیے وہ اپنا یہ فرض سمجھتے تھے کہ وہ اسلام پر بڑھ چڑھ کر تند و تیز تنقید کریں تاکہ انھیں طاقتور یورپی اتحادیوں کی حمایت حاصل ہو سکے۔ یہ ہے وہ طویل عرصے سے فراموش شدہ پس منظر جس سے اس بغض اور کینے کے سوتے پھوٹتے ہیں جو آج کے لبنان میں عیسائی اور مسلمان محسوس کرتے ہیں اور اخلاقی طور پر معیوب اس ورثے میں آج بے شمار صیہونی بھی شریک ہو گئے ہیں۔ اس کے برعکس چونکہ فلسطین میں اور معاصر فلسطینیوں کے مابین کبھی کوئی غالب، غیر متبدل عیسائی فرقہ موجود نہیں رہا اور چونکہ 1880ء سے اولین یورپی صیہونی نو آبادکاروں کی شکل میں انھیں ایک مشترکہ عرب دشمن کا سامنا بھی کرنا پڑ رہا ہے، اس لیے ایک عیسائی ہونے کے ناتے اس قسم کے خرافات کبھی اس کی تعلیم کا جزو نہیں رہیں۔

اگر کسی فرقے یا گروہ میں اپنے اقلیتی ہونے کا شعور بیدار ہو جائے اور اس کے ساتھ اسے سیاسی امور کو اس طرح عمومی رنگ دینے کی عادت پڑ جائے جس سے اس کی اپنی جاہ طلبی کے پورے ہونے کا امکان ہو سکتا ہو اور یہ دونوں چیزیں مل کر ایسے حالات پیدا کر دیں کہ اسے کسی سیاسی مملکت کی سیادت فقید المثال انداز سے حاصل ہو جائے تو سمجھیں کہ مصیبت آن کھڑی ہوئی......اور یہ مصیبت عموماً تقسیم کر دینے والی علیحدگی پسندی کی صورت میں آتی ہے۔ آج کل مشرقِ وسطیٰ کے اکثر ممالک میں، جن میں اسرائیل بھی شامل ہے، آپ کو یہ

[1] بعض لوگوں نے اس کا عرصۂ حیات 700ء سے 754ء تک شمار کیا ہے۔

کیفیت دیکھنے کو ملے گی کہ ایک طرف تو ان میں عزلت گزینی کا رجحان عام ہے، وہ دوسروں سے کوئی تعلق واسطہ ہی نہیں رکھنا چاہتے اور دوسری طرف وہ اپنے انداز سے سیاسی امور کو عمومی رنگ دینے کے بھی بڑے شوقین ہیں۔ چونکہ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کے متضاد ہیں، اس لیے کشمکش کی ایک صورت نکل آتی ہے۔ چنانچہ ان ممالک میں بھی کشمکش کی یہ چنگاریاں موجود ہیں جو اندر ہی اندر سلگ رہی ہیں اور بجھنے کا نام تک نہیں لیتیں۔ مصر کی مثال لیں۔ وہاں ایک طرف تو عرب اتحاد کا جذبہ زوروں سے سرگرمِ عمل ہے۔ دوسری طرف مخصوص قسم کی مصری قومی شناخت کا پیچیدہ نظریاتی رجحان بھی چھپائے نہیں چھپتا۔ چنانچہ یہ دونوں جذبے آپس میں گتھم گتھا ہو رہے ہیں۔ چنانچہ اس تصادم کی ڈرامائی شہادت صدر سادات کے ''مقدس مشن''[1] کے دوران میں سامنے آئی۔ جو چیز تقسیم کے اس عمل کا موجب بنی ہے، وہ کم وبیش یہ فطری امکان ہے کہ مملکت ایسے لوگوں اور ایسے رجحانات کا ساتھ دے گی جنھیں علم ہے کہ وہ اقلیت میں ہیں، اس ناتے ان میں خود اعتمادی کا فقدان ہے۔ چنانچہ وہ چاہتے ہیں کہ غیروں کو امورِ مملکت یا خود مملکت ہی سے نکال دیا جائے اور دوسروں سے بالکل علیحدگی اختیار کر لی جائے۔ اس کے ساتھ وہ اپنے اعمال پر بلاتمیز سیاسی عمومیت کا غلاف بھی چڑھانا چاہتے ہیں۔ آج شام میں عرب قومیت کا پرچار بھی کیا جاتا ہے (عمومی رنگ دینے کی کوشش) اور دوسری طرف رموزِ مملکت کی خاطر اس عرب قومیت سے گریز بھی کیا جاتا ہے...... لبنان میں شام نے جو رویہ اختیار کیا، وہ اس گریز کی واضح مثال ہے...... چنانچہ ان متحارب امور میں جو رسہ کشی ہو رہی ہے، اس پر اگر آپ غور فرمائیں تو میرا نکتہ واضح ہو جائے گا۔ مجھے امید ہے کہ اب یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ ان دونوں امور کے مابین کشمکش کا دارومدار زیادہ تر ان اختلافی توضیحات وتشریحات پر ہے جو اقتدارِ اعلیٰ، عرب اتحاد، اور اس قسم کے دوسرے تصورات کی کی جاتی ہیں۔ ان متحارب تفاسیر وتشریحات کی دُنیا کی ستم ظریفیاں اس وقت اور بھی واضح ہو گئیں جب 21 جولائی 1976ء کو صدر اسد نے اپنی ایک تقریر کے دوران میں اپنی لبنانی پالیسی اور تنظیمِ آزادیٔ فلسطین پر اپنی چڑھائی کا جواز اس دعویٰ کی صورت میں پیش کیا۔ ''میں جو کچھ کر رہا تھا، وہ عرب قومیت اور فلسطین انقلاب کی خاطر کر رہا تھا۔'' چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد، اس سے بھی زیادہ ستم ظریفی کی بات یہ تھی کہ شامی پالیسی کی اساس عرب مفادات پر نہیں بلکہ صرف اپنے ملک کے مفاد پر رکھی گئی تھی۔

بیسویں صدی کے عرب فلسطینیوں کی ایک عجیب وغریب بدقسمتی یہ رہی ہے کہ علاقے کی تمام دوسری

---

① یہاں اشارہ صدر سادات کے دورۂ اسرائیل کی طرف ہے۔ تفصیلات اگلے باب میں آئیں گی۔

مقامی قوموں کے برعکس ان کی کوئی اپنی مادرِ وطن نہیں ہے۔ کم از کم جنگِ عظیم دوم کے بعد سے ایسا بالکل نہیں ہوسکا۔ ان کی سیاسی محرومی کی ٹھوس حقیقت نے ان کے مقدر کو اور بھی تلخ بنا دیا اور اس تلخی میں رنگ اس حقیقت نے بھی بھرا کہ اس چیز کے خلاف جسے وہ اپنے وطن پر واضح طور پر غیر ملکی قبضہ قرار دیتے تھے، وہ جس جدّ و جہد میں مصروف ہیں، اس کے بالکل آغاز پر ہی انھوں نے صیہونیت کی مخالفت اس بنا پر کی تھی کہ جہاں تک اس خطے کا تعلق ہے، وہ غیر ملکی بھی تھی اور ایک اقلیتی ثقافت بھی۔ اسی طرح یہاں اس بات کا اعادہ کرنا بھی سود مند ہے کہ یہودی زندگی کی ابتدائی صورتوں نے اپنے گرد و پیش کی اکثریت کے سلسلے میں اقلیتی صوبائیت [1] کی راہ اختیار کی۔ مملکتِ اسرائیل قائم بھی ہوگئی لیکن یہ رجحان اپنی جگہ قائم ہے۔ چونکہ صیہونیت کے علاقے کی سنی عرب اکثریت کے ساتھ شاید کوئی نامیاتی رشتے نہیں تھے، اس لیے علاقے کے دوسرے اقلیتی فرقوں کی نسبت وہ کہیں زیادہ ایک ملفوف دُنیا کی صورت اختیار کر گئی (بہ الفاظِ دیگر، وہ اپنی ہی دُنیا میں بند ہوگئی۔) چنانچہ اس طرح ایک طرف تو یہودی، اسرائیلی مملکت نے جو ٹھوس شکل اختیار کر لی اور دوسری طرف فلسطینیوں کو جلاوطنی کے عالم میں ایک فلسطینی مملکت کا جو ٹھوس احساس ہوا جو کہ نظریاتی طور پر محرومی کی اساس پر استوار ہوا تھا، اس سے دونوں کے مابین ایک بالکل صحیح (اور تکلیف دہ) تناسب قائم ہوگیا۔

جیسا کہ میں بار بار عرض کر چکا ہوں کہ اب فلسطینی شناخت کے بڑے بڑے اصول وطن کی بازیابی کی ضرورت اور فلسطین کو دوبارہ ایک مملکت کی شکل میں ڈھالنے کے خواب کی تکمیل پر استوار ہیں۔ جہاں تک صیہونیت کا تعلق ہے، وہ نہ صرف ان دونوں ضرورتوں کے جواز بلکہ ان کی حقیقت سے بھی ہمیشہ انکار کرتی رہی ہے۔ جوں جوں فلسطینیوں کا اصرار بڑھتا ہے، صیہونی انکار میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسرائیل کے اقلیتی شعور کا بھی، جو بظاہر آویزش کے زمانے میں اور بھی بڑھ جاتا ہے، زبان و قلم سے اتنے ہی زیادہ ٹھوس طریقے سے اظہار کیا جانے لگتا ہے۔ 1967ء کی جنگ سے ایک سال قبل اسرائیل کے ایک معروف فوجی افسر اور "عرب امور کے ماہر" نے مندرجہ ذیل تحریر سپردِ قلم کی تھی:

> سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان (عربوں) کے پاس ہے کیا جس کی تقلید ہمارے لیے مناسب و موزوں ہو؟ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ عرب شستہ و نفیس اور نستعلیق خصوصیات اور ظاہری خوبیوں سے بالکل ہی تہی دامن ہیں لیکن انھیں تو کسی سیاسی پروگرام کی اساس نہیں بنایا جاسکتا۔

---

[1] انگریزی میں یہ لفظ ان لوگوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جن کا نقطۂ نظر محدود ہوتا ہے اور جو اپنی ہی ذات کے خول میں بند رہتے ہوں۔

جہاں تک طرزِ حیات اور تنظیم کا تعلق ہے، عربوں میں اپنے روایتی طور طریقوں کو ترک کرنے اور مغرب کی نقالی کرنے کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے اور یہ بات تو بہت عجیب ہوگی کہ جو کچھ وہ خود ترک کر رہے ہیں، اسے ہم اپنا لیں۔ جہاں تک ثقافتی پہلو کا تعلق ہے، تو مجھے اس بات کا قطعاً کوئی یقین نہیں ہے کہ فریقین کے پاس ایک دوسرے کو دینے کے لیے بہت کچھ موجود ہے۔ یہ ایک مبہم مفروضہ ہے کہ عرب ثقافت، جس کے بڑے اثاثوں پر قرونِ وسطیٰ کی چھاپ لگی ہے (یہ خیال اس یہودی مصنف کا ہے، ہمیں اس سے اتفاق نہیں۔) بیسویں صدی کے باشندوں کو اپنا گرویدہ بنا سکے گی اور یہ امر تو بہت ہی مشتبہ ہے کہ اس (عرب ثقافت) میں کوئی ایسا عنصر بھی موجود ہے جو ان (بیسویں صدی کے باشندوں) کی رہنمائی کر سکے گا، انھیں کسی کام کے لیے آمادۂ عمل کر سکے گا اور یا ان سوالات کے جوابات فراہم کر سکے گا جنھوں نے فی زمانہ ان کا گھیرا تنگ کر رکھا ہے۔ ایک ایسی نسل کے لیے جو چاند پر پہنچ چکی ہے، یہ بہت مشکل ہے کہ وہ ''معلقات'' کی صحرائی شاعری، ''مقامات'' کے اندازِ بیان یا (امام) غزالی جیسے عظیم عرب مفکرین کے فلسفیانہ افکار سے بھی، جن کی روحانی آب و ہوا آج کل کی آب و ہوا سے اتنی مختلف ہے، متاثر ہو سکیں۔ میرا خیال ہے کہ عرب ثقافت کے مقابلے میں ہماری اپنی ثقافت بھی اس معاملے میں کوئی زیادہ مختلف نہیں۔ (ان دونوں کے برعکس) یورپی ثقافت کے پاس پیش کرنے کے لیے کہیں زیادہ (مواد) موجود ہے۔

اگر منطقی طور پر اس استدلال کا دائرہ وسیع کیا جائے، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ چونکہ امریکی چاند پر کمند ہی نہیں ڈال چکے بلکہ اس پر چہل قدمی بھی کر چکے ہیں، اس لیے شیکسپیئر فرسودہ، ازکار رفتہ اور بے وقت کی راگنی بن چکا ہے۔ لیکن غالباً جو بات موضوعِ بحث سے زیادہ متعلق ہے، یہ ہے کہ فلسطینیوں کی ایک خاص شکایت (یا اسے رنجش کہہ لیں) کے بارے میں صیہونیوں کا ردِعمل اقلیت کی ثقافتی برتری کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ ٹھوس حقیقت تو یہ ہے فلسطینیوں کو اپنے گھروں اور جائدادوں سے بے دخل کر دیا گیا اور انھیں اپنے وطن سے باہر نکال دیا گیا، اس کے متعلق تو ایک لفظ بھی نہیں کہا جاتا صرف وسیع تر عمومی تناظر میں بات کہہ دی جاتی ہے اور یہ وہ تناظر ہے جس میں فلسطینیوں کو صیہونیت کے خلاف جو گلا ہے، اس پر نہ تو کوئی توجہ دی جاتی ہے، نہ دی جا سکتی ہے اور نہ غالباً دی جائے گی۔

محولہ بالا عبارت میں کچھ اور باتیں بھی ہیں، جن پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ہمیں یہ سوال اٹھانا ہوگا کہ ایک کٹ حجت اسرائیلی مناظرہ باز نے کس طرح ایک تکلیف دہ حقیقی فلسطینی محرومی کی قلب ماہیت کر کے

اسے صیہونیت کے خلاف ایک جامع ''عرب'' مخاصمت میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس ماہر کے نزدیک اسرائیل کی کچھ اس طور کا یا پلٹ ہوئی ہے کہ وہ محض ایک مملکت ہی نہیں رہا بلکہ ایک ترقّی پسند یورپی ثقافت کی علامت بھی بن گیا ہے (یہاں عین مین جارج ایلیٹ کے خیالات کے بازگشت سنائی دیتی ہے) اور یہ بالکل اسی طرح ہوا ہے جس طرح کہ فلسطینی نیم فاقہ کش، کنگال اور بے حیثیت کاشتکار دہقانوں سے عربوں کی ثقافتی کمتری کی علامت مطلب بنا دیے گئے ہیں۔ میں یہاں یہ ضروری نہیں سمجھتا کہ صیہونیت اور یورپی استعمار کے مشترکہ منابع کا دوبارہ ذکر کروں اور نہ میرے نزدیک اس بات کا حوالہ دینے کی ضرورت ہے کہ جس طرح افریقہ، ایشیا اور امریکا کے دونوں براعظموں میں سفید فارم یورپی یہ باور کرتے تھے کہ ان علاقوں میں مقامی باشندے عدم موجود ہیں اور ان کی زمینیں بے آباد ''غیر توجہی کا شکار'' اور بنجر ہیں، بالکل اسی آسانی سے فلسطین میں وارد ہونے والے ابتدائی یہودی آباد کاروں نے بھی مقامی عربوں کو نظر انداز کر دیا۔ اب میں جس بات پر زور دینا چاہتا ہوں، وہ فلسطینیوں کی وہ کوشش ہے جو وہ عرب ثقافت کی عمومیت میں اپنے لیے سیاسی اور نظریاتی ملجاو مامن تلاش کرنے کے لیے کر رہے ہیں اور میں اس بات کو بھی واشگاف انداز سے بیان کرنا چاہتا ہوں کہ بعد میں اسرائیل اور دوسرے عربوں، دونوں نے ہی کس طرح اس تلاش کا استحصال کیا۔ پہلے تو فلسطینی صیہونیوں کا نقطۂ نظر سننے اور ان سے مصالحت کرنے کے لیے تیار تھے، پھر یہ کیا ہوا کہ وہ استرداد، انقلاب اور امید کی راہ پر چل پڑے؟ میں اس صورتِ حال کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

فلسطینیوں کو جس تکلیف دہ وجودی [1] صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، اس کا تعلق ان کی سیاسی بقا سے ہے جس کی ضرورت وہ سبھی محسوس کرتے ہیں۔ لیکن مسئلہ صرف سیاسی بقا کا ہی نہیں، اس کے ساتھ وہ نتائج وعواقب بھی شامل ہو گئے ہیں جو علاقے سے محروم ہونے اور سیاسی طور پر اجنبی بن جانے کی وجہ سے ظہور میں آئے ہیں اور ان نتائج وعواقب نے صورتِ حال کو اور بھی گھمبیر بنا دیا ہے۔ فلسطینیوں میں یہ احساس تو ضرور ہے کہ ان کے اور مشرقِ وسطیٰ کے دوسرے مقامات پر ان کے جو دوسرے مسلمان اور/ یا عرب بھائی بند موجود

---

(1) وجودیت: فلسفے کی وہ شاخ جو اس بات پر زور دیتی ہے کہ ایک معاند یا بے نیاز کائنات میں ایک فرد کو جو تجربہ ہوتا ہے وہ صرف اسی کا تجربہ ہوتا ہے، اس لحاظ سے یہ تجربہ فقید المثال بھی ہو اور دوسروں سے الگ بھی۔ فرد ان معنوں میں عزلت گزیں ہے کہ دوسروں کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ انسان دُنیا میں کیوں آیا، اس کی کوئی توجیہ ممکن نہیں۔ تاہم اس فلسفے میں اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ فرد اپنی مرضی کا مالک ہے اور اس لیے اپنے اعمال کے نتائج وعواقب کی ذمہ داری بھی اسی پر عائد ہوتی ہے۔

ہیں کے مابین ایک رشتہ مؤاخات ہے لیکن اس احساس پر بھی اس تکلیف دہ وجودی صورتِ حال کی، جس کا انھیں سامنا کرنا پڑ رہا ہے، چھاپ لگی ہوئی ہے۔ فلسطینیوں کے نزدیک دوسرے عرب ایک سطح پر اس کے ساتھ اخوت کے رشتے میں بندھے ہوئے ہیں لیکن ایک دوسری سطح پر ان دونوں کے مابین ایک ایسی خلیج حائل ہے جسے پاٹنا ممکن نظر نہیں آتا۔ یوں کہیے کہ تعلقات کی یہ متناقض صورتِ حال زمانۂ حال میں پیدا ہوئی ہے کیونکہ یہ زمانۂ حال کا مسئلہ ہے، معاصر زمانے کا مسئلہ جو فلسطینیوں اور دوسرے عربوں کو ایک دوسرے کے قریب بھی لاتا ہے اور انھیں ایک دوسرے سے الگ بھی کرتا ہے۔ ایک فلسطینی کے نزدیک عربوں کا ایک ماضی بھی ہے اور مشرقِ وسطیٰ کا اور عربوں کا ایک مشترکہ مستقبل بھی، لیکن اب زمانۂ حال میں، کیفیت یہ ہے کہ (فلسطینی) قوم نہ صرف عدم استحکام کا شکار ہے بلکہ اسے یہ خطرہ بھی درپیش ہے کہ وہ کہیں تحلیل ہی نہ ہو جائے۔

اس مشکل تعلق کی کوئی ٹھوس اور فصیح مثال، جس کا میں حوالہ دے سکتا ہے، فلسطینی ادیب غسان کنفانی① کے ناولٹ ''رجال فی الشمس'' (دھوپ میں لوگ) کے ابتدائی منظر سے بڑھ کر دستیاب نہیں۔ کنفانی 1960ء کے عشرے کے ابتدائی سالوں تک اسرائیل میں مقیم رہا۔ اس کے بعد اس نے جلاوطنی اختیار کر لی اور جنگ جو صحافی اور ادیب بن گیا۔ 1972ء میں اسرائیلیوں نے اسے دھوکے سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کے ناولٹ کے ابتدائی منظر کی عبارت مندرجہ ذیل ہے:

> ابوقیس نے اپنا سینہ مرطوب زمین کے اوپر ٹکا دیا اور دھرتی اس کے نیچے دھڑکنے لگی۔ قلب زمین کی تھکی تھکی دھڑکن، جو ریت کے ذرات میں تھرتھراتی اور اس کے جسم کے خلیوں میں سرایت کر جاتی۔ وہ جتنی مرتبہ بھی نیچے جھک کر دھرتی کے ساتھ ہم آغوش ہوا، اسے اس دھڑکن کا احساس ہوا، جیسے زمین کا دل اس وقت سے، جب وہ پہلی بار سینے کے بل مٹی پر لیٹا تھا، جہنم کی عمیق گہرائیوں سے جوکھم سہتا، زور کرتا، روشنی کی طرف ابھرا آ رہا تھا۔ دس برس پہلے کہ اسے

① غسان کنعانی (1936ء۔1972ء): وہ فلسطین کے شہر عکہ میں پیدا ہوئے تھے، انھوں نے بطور معلم اور صحافی پہلے دمشق اور پھر کویت میں کام کیا۔ اس کے بعد انھوں نے بیروت کو اپنا مسکن بنالیا۔ پہلے وہ مختلف اخباروں کے لیے لکھتے رہے۔ 1969ء میں انھوں نے اپنا رسالہ ''الہدف'' شروع کیا۔ جولائی 1972ء میں اسرائیلیوں نے ان کی کار میں بم نصب کر دیا تھا جس سے وہ لقمۂ اجل ہو گئے۔ ان کے پانچ ناول، پانچ افسانوی مجموعے، دو ڈرامے اور فلسطینی ادب کے دو مطالعے شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب کے مترجم نے ان کے ناولٹ ''دھوپ میں لوگ'' کا ترجمہ کیا تھا جو ''محراب'' لاہور میں شائع ہو چکا ہے۔

اپنا وطن چھوڑے اتنا عرصہ گزر چکا تھا، اس نے یہ بات اپنے ایک پڑوسی سے کہی تھی جو ایک کھیت میں اس کا ساجھے دار تھا۔ بات سن کر پڑوسی نے تمسخر آمیز لہجے میں جواب دیا تھا:

''یہ تمھارے اپنے دل کی دھڑکن کی آواز ہے۔ جب بھی تم اپنا سینہ زمین کے ساتھ ملا کر لیٹو گے، تمھیں یہ آواز سنائی دے گی۔''

کیا فضول بکواس ہے! پھر وہی خوشبو؟ وہ جب بھی یہ سوندھی سوندھی خوشبو سونگھتا تھا، وہ اس کے دماغ کی طرف امنڈنے اور پھر اس کی رگوں میں اترنے لگتی تھی۔ جب بھی زمین پر لیٹ کر وہ اس مہک کو سونگھتا، وہ یہی تصور کرتا جیسے وہ اپنی شریکِ حیات کی زلفوں کو سونگھ رہا ہے جو ابھی ابھی ٹھنڈے پانی سے نہا کر غسل خانے سے باہر آئی تھی، بالکل ہی خوشبو، صنفِ نازک کی خوشبو، جس نے اپنے جسم کو ٹھنڈے پانی سے نہلایا تھا اور جس نے اس کا چہرہ اپنی گھنیری زلفوں میں، جو ابھی گیلی تھیں، چھپا لیا تھا، وہی تھرتھراہٹ جو آپ اس وقت محسوس کرتے ہیں جب آپ پیارے کسی نرم و نازک پرندے کو اپنی ہتھیلیوں پر بٹھا لیتے ہیں۔

یہ منظر جاری رہتا ہے تا آنکہ ابوقیس کی آنکھیں آہستہ آہستہ وا ہونے لگتی ہیں اور اسے اپنے صحیح گردوپیش کا احساس ہونے لگتا ہے۔ یہ مقام، جہاں وہ لیٹا ہوا ہے، دجلہ اور فرات کے دہانوں کے کہیں قریب واقع ہے۔ وہاں وہ ان انتظامات کا انتظار کر رہا ہے جو اسے غیر قانونی طور پر کویت پہنچانے کے سلسلے میں کیے جائیں گے، جہاں اسے امید ہے کہ اسے کوئی نہ کوئی روزگار مل جائے گا۔ جیسا کہ حوالہ شدہ عبارت کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے، وہ زمانۂ حال میں اپنے محلِ وقوع اور منظر کے ماحول کو اپنے ماضی کی یادوں کے حوالے سے سمجھے گا۔ یہ یادیں ایک فلسطینی سکول کے متعلق ہیں جہاں اس نے 1948ء سے قبل ایک استاد کو جغرافیے کا سبق ایک خاص لہجے میں پڑھاتے سنا تھا اور یہ سبق دریائے دجلہ اور دریائے فرات کے انھی دہانوں کے متعلق تھا جہاں وہ اس وقت لیٹا ہوا تھا۔ چنانچہ ابوقیس کا اپنا زمانۂ حال اس کی بے ترتیب اور بے ربط یادوں کا ایک آمیزہ ہے، جس میں اس کی موجودہ مشکل صورتِ حال، جس کی سنگینی میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہوتا جا رہا ہے، شامل ہو گئی ہے۔ وہ ایک پناہ گزیں ہے۔ اس کا ایک خاندان بھی ہے اور وہ ایک ایسے ملک میں روزگار تلاش کرنے پر مجبور ہے جس کی آنکھوں کو چندھیا دینے والی دھوپ اس بات کی علامت ہے کہ اس کے مقدر کے متعلق ایک قسم کی آفاقی بے نیازی موجود ہے۔ (بعد میں) ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ وہ روشنی جو اس کے چاروں طرف پھیل رہی تھی، دراصل وہ پیش بینی کے انداز سے ناولٹ کے آخری منظر کا حوالہ ہے۔ دو دوسرے فلسطینی پناہ گزینوں کی معیت میں ابوقیس کو ایک ٹینکر کے خالی پیٹ میں بٹھا کر کویت سمگل کیا جا رہا ہے۔ ٹینکر جب کسٹم

کی سرحدی چوکی پر پہنچتا ہے، تو تینوں پناہ گزینوں کو نیچے اتارنے کے بجائے ٹینکر کے پیٹ میں پڑا رہنے دیا جاتا ہے بلکہ اوپر سے ڈھکنا بھی بند کر دیا جاتا ہے تاکہ کسٹم والوں کی نظروں میں دھول جھونکی جاسکے۔ ادھر ڈرائیور پولیس اور کسٹم کے اہل کاروں سے گفت وشنید میں مصروف ہے۔ یہ گفت وشنید بہت طویل ہوجاتی ہے۔ دھوپ کی حدت میں دم گھٹنے سے تینوں آدمیوں کی موت واقع ہوجاتی ہے۔ وہ اتنا بھی نہ کر سکے کہ اپنی موجودگی کا کوئی نشان ہی دکھا سکتے، کسی کو بتا سکتے کہ وہ بھی وہاں موجود تھے۔

محولہ بالا عبارت ان بے شمار مناظر میں سے، جن میں کہانی کی تقسیم کی گئی ہے، ایک منظر کی نقشہ کشی کرتی ہے۔ تقریباً ہر منظر میں، زمانۂ ماضی کی صداہائے بازگشت، ہم تحسی [1] (جیسا کہ قوتِ باصرہ صورت یا قوتِ شامہ کے آگے پسپائی اختیار کر لیتی ہے اور جیسا کہ ایک حس دوسری حس میں خلط ملط ہوجاتی ہے) سفاک اور بے رحم زمانہ حال کے خلاف مدافعتوں کے ایک جال اور زمانۂ ماضی کے کسی مخصوص لیکن پسندیدہ جزو کے تحفظ کے امتزاج کے تابع ہے۔ کنعانی کے اسلوبِ بیان (جو میرے ترجمے میں خاصا بھونڈا اور بے سلیقہ نظر آتا ہے لیکن میں نے اسی بات کو اہم جانا کہ پیچیدہ ساخت کے جملے کا جس قدر ممکن ہو، صحیح ترجمہ کروں) میں بھی یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی کہ وقت کے وہ کون سے لمحات ہیں جن کی طرف شعور کا مرکز (تینوں میں سے ایک آدمی) اشارہ کرتا ہے۔ جس عبارت کا میں نے حوالہ دیا ہے اس میں ''جتنی مرتبہ بھی کا'' ''اس وقت سے جب وہ پہلی مرتبہ'' میں امتزاج ہوجاتا ہے، اور جو مبہم انداز سے ہی سہی لیکن وہ ''اپنا وطن (جسے چھوڑے اتنا عرصہ (دس سال) گزر چکا تھا'' کو اپنے میں شامل کرتا نظر آتا ہے۔ تمثیلی طور پر الفاظ ان تینوں تراکیب پر اس تمثال (امیج) کا غلبہ ہے جو ظلمت کو چیر کر روشنی اور نور کی شاہراہ میں ڈھلتی نظر آتی ہے۔ بعد ازاں ناولٹ کے مرکزی حصے میں ہم یہ دیکھیں گے کہ کہانی میں مندرج بیشتر واقعات ایک عراقی قصبے کی گرد آلود شاہراہ پر پیش آتے ہیں جہاں تینوں آدمی اپنے اپنے طور پر ''سپیشلسٹوں'' کے سامنے گڑگڑاتے، منتیں کرتے اور سودے بازیاں کرتے نظر آئیں گے کہ انھیں سرحد پار پہنچا دیا جائے۔ ناولٹ کی اصل آویزش گھوم پھر کر زمانۂ حال کے اس جدل اور مقابلے کا رخ اختیار کر لیتی ہے کہ جلاوطنی اور بے دری ایک فلسطینی کو اس بات کی تحریک دیتی ہے کہ حیات وکائنات میں وہ اپنا راستہ خود تراشے جو کسی اعتبار سے بھی اس کے لیے

---

1 ہم تحسی (Synesthesia): یہ ایک قلم کی قدرتی صورتِ حال ہے جس میں ہیجان کی ایک نوع ایک دوسری قسم کے تحسس (یا احساس) کو جنم دیتی ہے جیسا کہ کسی آواز کے سنائی دینے پر ذہن میں ہلچل پیدا ہوجاتی ہے اور رنگوں وغیرہ کے ذہن میں دیکھنے جانے کی حس بیدار ہوجاتی ہے۔

ایسا راستہ نہیں جو دوسروں نے اسے فراہم کیا ہو یا جو مستحکم حقیقت کا روپ دھار چکا ہو۔ وہ اپنے عرب بھائیوں کے درمیان ہی کیوں نہ ہو، پھر بھی اس بات کی صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس سرزمین کی طرح جس کو وہ خیر باد کہہ آیا ہے، فی الحال اسے یوں نظر آتا ہے کہ اپنے ماضی سے بھی، پیشتر اس کے کہ وہ اس کے لیے بارآور ثابت ہو سکتا، اس کے روابط منقطع ہو چکے ہیں۔ لیکن جہاں تک زمانۂ حال کا تعلق ہے، اس فلسطینی کا ایک خاندان ہے، ذمے داریاں ہیں، خود زندگی ہے، جس کے سامنے وہ جواب دہ ہے۔ نہ صرف یہ کہ اس کا مستقبل غیر یقینی ہے، بلکہ اس کی موجودہ صورتِ حال کی مشکلات میں بھی اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے اور وہ گرد آلود شاہراہ کے پُر ہجوم ٹریفک میں بمشکل اپنا توازن قائم کر پاتا ہے۔ دن، دھوپ، زمانۂ حال ...... یہ سبھی وہاں فوری طور پر آن موجود ہوتے ہیں، سبھی اس کی جان کے دشمن ہیں۔ وہ اسے مہمیز لگاتے ہیں، اکساتے ہیں کہ وہ یادداشتوں اور بے لگام سوچوں کے فراہم کردہ تحفظ کے حصار سے، جو بعض اوقات دھندلا اور بعض اوقات بہت مضبوط دکھائی دیتا ہے، باہر نکل آئے، جب انجام کار یہ اشخاص اپنے رومانی صحرا سے باہر نکل کر زمانۂ حال میں داخل ہوتے ہیں اور مستقبل کی طرف قدم بڑھاتے ہیں تو بادلِ ناخواستہ لیکن لازماً ان کا انتخاب یہی ہوگا کہ وہ موت سے ہم آغوش ہو جائیں۔ ان کی یہ موت گمنامی کی موت ہوگی۔ کسی کو یہ نظر بھی نہیں آئے گا کہ ان کا دمِ واپسیں ہے۔ ان کی ہلاکت دھوپ میں ہوگی اور اسی زمانۂ حال میں، جس نے انھیں اپنے ماضی سے باہر نکلنے کا حکم دیا تھا، اور ان کی بے بسی اور بے عملی پر انھیں طعنے دیے تھے، ان کی ملامت کی تھی۔

چنانچہ اپنی بے دخلی کے ابتدائی ایام میں فلسطینی کو جس بنیادی قسم کی جدّ و جہد کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کنعانی اس پر حاشیہ آرائی کرتا ہے، فلسطینی کو اپنا (زمانۂ حال بنانا ہوگا کیونکہ حال کوئی تخیلی عیاشی نہیں بلکہ ایک حقیقی، جیتی جاگتی وجودی ضرورت ہے۔ کوئی منظر لے لیں۔ فلسطینی کے لیے اس میں بمشکل گنجائش نکلتی ہے اور وہ اس کے لیے (وجۂ) اشتعال بن جاتا ہے۔ فلسطینی کے لیے معاصریت کا تناقضہ حقیقتاً بہت تلخ اور تکلیف دہ ہے۔ اگر اسے سیدھے سادے انداز سے (زمانۂ) حال نہیں "دیا" جا سکتا (یعنی اگر وقت اسے اپنے ماضی اور اپنے حال کے مابین واضح تفریق کرنے کی اجازت نہیں دیتا یا اسے ان دونوں کے مابین ربط قائم کرنے نہیں دیتا، کیونکہ 1948ء کا المیہ، جس کا کھلے عام ذکر نہیں کیا جاتا سوائے اس کے کہ وہ بھی ایک واقعہ تھا جو دوسرے واقعات میں پوشیدہ ہو چکا ہے، تسلسل کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے) تو پھر یہ اس کے لیے اسی صورت میں قابلِ فہم بن سکتا ہے، اگر وہ اس میں کوئی کارنامہ، کوئی کسب کر کے دکھائے۔ کاش کہ کچھ اور نہیں تو کم از کم کوئی ایسی صورت نکل آتی کہ یہ لوگ اعراف سے نکل سکتے اور کویت میں داخل ہو سکتے، تب کہیں جا کر کسی بھی اعتبار سے ان کی زندگیاں محض ایک حیاتیاتی عرصہ، جس کے دوران میں زمین اور آسمان عام زندگی کی غیر یقینی انداز

سے تصدیق کرتے نظر آتے ہیں، نہ رہتیں بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہوسکتیں۔ چونکہ انھیں لازماً زندہ رہنا ہے...... تاکہ انجام کار وہ موت سے ہم کنار ہوسکیں...... حال انھیں کچو کے لگاتا ہے تاکہ وہ عمل پر کمربستہ ہوجائیں جو (عمل) اپنی باری پر مصنف اور قاری کو ''فکشن'' (کہانی) کا موادفراہم کرے گا۔

اس ضمن میں مجھے ایک اور فلسطینی کہانی یاد آتی ہے اور میں لازماً اس کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ یہ کہانی بھی خوبیوں کے اعتبار سے اوّل درجے کی کہانی ہے۔اس کہانی کا عنوان ''الواقعة الغریبہ فی اختفاء سعید ابی نحس المتشائل'' (سعید ابی نحس متشائل کی گمشدگی کے متعلق عجیب وغریب حقائق) ہے اوراس کے مصنّف کا نام ایمل جیبی ہے۔ جیبی حیفہ کا باسی ہے۔ وہ بیس سال سے اوپر اسرائیلی پارلیمنٹ کا رکن رہا اور اندرونِ اسرائیل فلسطینیوں کا ایک سرکردہ ترجمان ہے۔ اس کا مکتوبی ناول ان معنوں میں عربی ادب میں فقیدالمثال ہے کہ اس میں نہایت استقامت اور پامردی کے ساتھ ''تشنیع''① سے کام لیا گیا ہے۔ یہ تشنیع ایک حیرت انگیز حد تک ایک منضبط لیکن پُرجوش اسلوبِ نگارش کی پیداوار ہے جس کے ذریعے اندرونِ اسرائیل فلسطینیوں کی انوکھی صورتِ حال کی نقشہ کشی کی گئی ہے کہ منظرِعام پر ''نمایاں'' بھی ہیں اور ''نظر بھی نہیں آتے۔'' کنفانی کی نگارشات کی طرح جیبی بھی فلسطینی شناخت کی ایک ایسی مکمل تصویر پیش کرتا ہے جو کسی خالص سیاسی نوعیت کے کتابچے کے بس کی بات نہیں۔ معاملہ اسرائیل کا ہو یا عالم عرب کا، دونوں مقامات پر فلسطینی بالکل اسی قسم کی صورتِ حال سے دوچار ہیں جس قسم کی کافکا② کے ناولوں میں پائی جاتی ہے۔ایک وقت

---

① (i) تشنیع یا ستم ظریفی (Irony): جب آدمی توقع تو کسی بات کی کرے اور اس کے سامنے جو کچھ آئے، وہ اس (توقع) کے بالکل برعکس ہو۔

Hyde noted the irony of Ireland,s copying the nation she most hated: Richard Kain

(ii) ایسے الفاظ کا استعمال جن کا مفہوم ان کے لفظی معانی کے بالکل الٹ ہو۔ مثلاً بظاہر آپ کسی شخص کی تعریف کر رہے ہیں لیکن حقیقتاً آپ کا مقصود اس کی تنقیص ہوتا ہے جیسے کسی بدصورت بچے کو دیکھ کر کہا جائے، ''کتنا خوب صورت بچہ ہے۔''

(iii) جب کوئی ادیب اپنے اسلوبِ نگارش کو موثر بنانے یا مزاح پیدا کرنے کے لیے اس قسم کے متضاد معانی کے حامل الفاظ اور تراکیب استعمال کرتا ہے، تو وہ بھی Irony سے کام لے رہا ہوتا ہے۔

(iv) ڈرامے میں بعض اوقات ایسی صورت پیدا ہوجاتی ہے کہ ناظرین کو ایک بات کا علم ہوتا ہے لیکن خود کردار اس سے لاعلم ہوتا ہے اسے ڈرامائی Irony کہا جاتا ہے۔

(v) مشہور فلسفی سقراط دوسری کو جاہل ثابت کرنے کے لیے اپنے آپ کو جاہل بنا کر پیش کرتا تھا۔ یہ ''سقراطی'' Irony کہلاتی ہے۔

② کافکا (Franz Kafka): (1883ء-1924ء) کافکا قومیت کے اعتبار سے آسٹریا کا باشندہ تھا لیکن وہ پیدا......

پر وہ وہاں موجود ہوتے ہیں لیکن دوسرے وقت پر موجود نہیں ہوتے اور یہ سلسلہ باری باری چلتا رہتا ہے۔ ①

میں نے یہاں فلسطینی نگارشات کا تفصیلی ذکر اس لیے کیا ہے کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ وہ عرب، اسلامی ماحول میں فلسطینی بقا کی صحیح نوعیت کو بالکل درست اور چبھتے ہوئے انداز سے پیش کرتی ہیں۔ 1948ء اور 1967ء کی جنگوں میں عربوں کو جو شکستیں اٹھانا پڑیں، فلسطینی ان کی ایک علامت ہے۔ چنانچہ اس علامت کی حیثیت سے وہ سیاسی یادوں کی ایک ایسی صورت کی نمائندگی کرتا ہے جسے لوحِ دماغ سے کھرچنا اتنا آسان نہیں۔ وہ دربدر کی ٹھوکریں کھا رہا ہو، جس جگہ کا نام لیں وہاں وہ موجود نظر آتا ہو، یا سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ شعوری طور پر یہ جانتا ہے کہ وہ خود اور اس کی نگارشات دونوں جدید عرب ثقافت کے موضوعات بنتی ہیں، چنانچہ معاملے کی صورت خواہ کوئی بھی ہو، وہ ایک ایسی ہستی ہے جس کو دیکھ کر آپ کو تشویش لاحق ہوتی ہے، اندیشہ ہونے لگتا ہے کہ وہ کہیں آپ ہی کو بے دخل نہ کر دے اور آپ کی جگہ خود سنبھال لے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کے متعلق فوری طور پر کچھ نہ کچھ کیا جانا چاہیے۔ اگر اس کے لیے اس طور کوئی گنجائش نکل آئے کہ عرب آزادی پر کوئی زور نہ پڑے بلکہ اس آزادی کا تحفظ ہوتا ہو تو اللہ اللہ خیر سلا، فکر کی کوئی بات نہیں۔ جب حالات میں بگاڑ آنے لگتا ہو تو اس بات کے باوجود کہ اس کا کوئی وطن نہیں، کوئی گھر نہیں، اے استحکام...... یہ استحکام مملکتوں کا ہو یا سیاسی جماعتوں کا، حکومتوں کا ہو یا فرقوں کا...... کے لیے جو اس کے پہلو بہ پہلو موجود سمجھا جاتا ہے، خطرہ تصور کیا جانے لگتا ہے۔ 1967ء کے بعد ایک نئی صورتِ حال سامنے آئی ہے۔ اب عربوں اور مسلمانوں کی تکثیریت ② کا ڈھنڈورا بڑے زور و شور سے پیٹا جانے لگا ہے اور اس کی تحسین میں بڑی لفاظی سے کام لیا جاتا ہے۔ خود فلسطینی بھی اس تکثیریت میں پوری طرح ملوث ہو چکا

......چیکوسلواکیہ کے شہر پراگ میں ہوا اور اس کی زندگی کا بیشتر حصہ بھی وہیں گزرا۔ اس کا ذریعۂ اظہار جرمن زبان تھی۔ اس کا شمار اس صدی کے عظیم ترین ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ اس کے مشہور ترین ناول ''قلعہ'' (Castle) ''مقدمہ'' (Trial) اور ''امریکا'' ہیں۔

① معاصر فلسطینی ادب کا ایک وقیع جائزہ حنان میخائل اشروی نے اپنی کتاب Contemporary Palestinian Literature under Occupation میں پیش کیا ہے۔ اس کتاب کو برزیت یونیورسٹی پبلیکیشنز، برزیت، مغربی کنارہ نے 1976 میں شائع کیا تھا۔ (مصنف)

② تکثیریت (Pluralism): جب کوئی معاشرہ، قوم، ملت یا ملک جو مختلف نسلوں، مذہبوں یا ثقافتوں سے تعلق رکھنے والوں یا مختلف زبانیں بولنے والوں کو جو ہر لحاظ سے ایک دوسرے سے علیحدہ طور طریقوں کے مالک ہوں، ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو زندگی بسر کرنے کی اجازت دیتا ہو تو اس حالت کو تکثیریت کہا جائے گا۔

ہے۔ چنانچہ اس کے اس طرح ملوث ہونے سے عربوں کو ہردم یہ خیال ستانے لگا ہے کہ یہ تکثیریت اس تک بامعنی نہیں ہوسکتی جب تک کہ فلسطینی جو کہ انتہائی زہریلی بے دخلی کا نخچیر ہے اپنے آبائی وطن واپس نہیں پہنچ جاتا اوراس کے ساتھ اس کا دوبارہ پوری طرح ربط قائم نہیں ہوجاتا۔ چنانچہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ فلسطینی بہ یک وقت ایک نمائندہ عرب اور ایک راندۂ درگاہ بن گیا ہے۔

1967ء کے بعد فلسطینیوں اور دوسرے عربوں کے مابین ستم ظریفانہ کشیدگی میں اضافہ ہوگیا ہے۔ اس کا اظہار مندرجہ ذیل خلافِ معمول لیکن حیران کن باتوں سے ہوتا ہے:

تنظیم آزادی فلسطین کے سفارتی وقار میں اضافہ ہوا ہے۔

دُنیا نے فلسطینیوں کو ''نئے سرے سے دریافت'' کیا ہے اور اس کے زبردست نتائج برآمد ہوئے ہیں۔

عام عرب امور میں اتنی دلچسپی نہیں لی جاتی جتنی کہ پہلے لی جاتی تھی۔

اسی طرح فلسطینی ادارے نہ صرف فلسطینی خود اختیاری (آٹانومی) کے تناقصے کا بار اٹھائے ہوئے ہیں بلکہ وہ ایک لحاظ سے اس کی مثال بھی بن گئے ہیں۔ جب کہ دوسری طرف کیفیت یہ ہے کہ وقفے وقفے کے بعد فلسطینیوں کو کبھی ایک عرب ملک سے باہر نکال دیا جاتا ہے اور کبھی دوسرے سے، لیکن اس کے باوجود عرب ممالک جس طرح فلسطینی مقاصد کی تائید وحمایت کرتے چلے آئے ہیں۔ اس میں کسی قسم تخفیف نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہر چیز کے باوصف فلسطینی اپنی زندگی کی تعمیر بیرون فلسطین نہیں کرتا۔ مکمل جلاوطنی سے اس کی جو ذلت اور رسوائی ہوئی ہے، وہ اس سے اپنا پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ اس نے جتنے بھی ادارے اور جماعتیں قائم کی ہیں، وہ اس کی جلاوطنی کی حقیقت کا اعادہ کرتے ہیں۔ یہ بات واضح طور پر ان عربوں پر بھی، جو اسرائیلی تسلط وتغلب کے زیرِ سایہ مغربی کنارے اور غزہ میں مقیم ہیں، اور ان عربوں پر بھی جو اندرون اسرائیل قیام پذیر ہیں، صادق آتی ہے۔ فلسطینی جو کارنامہ بھی سرانجام دیتے ہیں، اس پر پانی پھر جاتا ہے اور وہ باعیب بن جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ متناقض صداقت ہے کہ تنظیم آزادیٔ فلسطین کی غیر معمولی علامتی کامیابیوں کے باوجود فلسطینیوں کی بیرونِ فلسطین بقا ان معنوں میں پامال ہوتی رہتی ہے کیونکہ اسے ثبات حاصل نہیں، اس کی بنیادیں ٹھوس زمین پر استوار نہیں اور فلسطینیوں کے مستقبل کے بارے میں اس میں اس خودمختارانہ ارادے کا فقدان ہے جسے مخصوص فلسطینی ارادہ کہا جاسکتا ہے۔ چنانچہ جو کارنامہ بھی سرانجام دیا جاتا ہے، جو کامیابی بھی حاصل کی جاتی ہے، اس کے پیچھے ہر وقت یہ خطرہ منڈلاتا رہتا ہے کہ یہ کامیابی یا کارنامہ کہیں اپنی شناخت سے محروم نہ ہوجائے، کہیں اسے عرب قوم کی عمومیت ہڑپ نہ کرجائے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ عرب مملکتیں مسلسل تنظیمِ آزادیٔ فلسطین کی آزادی (عمل) میں مخل ہوتی رہتی ہیں۔ تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ فلسطینی

جو بھی کامیابی حاصل کرتے ہیں اور جو بھی کارنامہ سرانجام دیتے ہیں، اسے یوں بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ یہ عام عرب قوم کے منہ پر ایک طمانچہ ہے کیونکہ اس قوم نے شکست کے نتائج و عواقب کے ساتھ سمجھوتا کرنا سیکھ لیا ہے تاہم شکست کے جو عظیم ترین عواقب ہیں (موجودہ صورت میں فلسطینی) ان کے ساتھ وہ بھی سمجھوتا نہیں کر پائی۔

اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ فلسطینی جو کچھ کرتے ہیں اور جو کچھ وہ سوچتے ہیں، اس کا بیشتر حصہ فلسطینی شناخت کے متعلق ہوتا ہے۔ میں اسے مشاہدہ باطن (Introspection) قرار دینے میں تو متامل ہوں کیونکہ یہ محض احتساب ذات یا محاسبۂ نفس (Self Exemination) کا معاملہ نہیں بلکہ یہ زیادہ تر ایک سیاسی مسئلہ ہے جو بے پناہ اہمیت کا حامل ہے۔ دوسری طرف، محض اس بنا پر کہ آپ ایک فلسطینی ہیں، آپ کو جن مخصوص زحمتوں اور ٹھوس صعوبتوں میں سے گزرنا پڑتا ہے، ان کے متعلق ہمارے تمام ادیبوں نے خامہ فرسائی کی ہے اور اس حد تک اپنی صلاحیتوں کا استعمال کیا ہے کہ عربی ادب (جس میں خودنوشت سوانح حیات یا اعترافی نگارشات قلم بند کرنے کی کوئی خاص سیکولر روایت نہیں پائی جاتی۔) اس فلسطینی صنف پر نازاں ہے جسے عام طور پر ''مزاحمتی'' ادب کہا جاتا ہے اور جس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی نگارشات تخلیق کی جائیں جن میں زور اس بات پر دیا جائے کہ ہم (فلسطینی) بھی کچھ شے ہیں، ہمارے بھی کچھ عزائم ہیں، کچھ آرزوئیں اور کچھ امنگیں ہیں۔ پھر نگارشات میں ان لوگوں کے خلاف مزاحمت کا درس دیا جاتا ہے جو فلسطینیوں کو اپنی چیرہ دستیوں اور مظالم کا نشانہ بناتے ہیں اور انھیں گمنامی کے غار میں دھکیل دینا چاہتے ہیں۔ اگر کسی بھی فلسطینی کی کسی بھی تحریر کو قومی نظم کہا جا سکتا ہے تو وہ محمود درویش کی مختصر نظم ''بطاقۃ الھویہ'' (شناختی کارڈ) ہے۔ اس مختصر نظم کی عجیب و غریب قوت یہ ہے کہ جب یہ 1960ء کے عشرے کے اواخر میں منظرِ عام پر آئی تو اس نے ایک عام فلسطینی کی، جس کی سیاسی شناخت دُنیا میں اس حد تک گھٹا دی گئی تھی کہ وہ شناختی کارڈ پر بس ایک نام بن کر رہ گئی تھی، اس قدر نمائندگی نہیں کی جتنی کہ اس کی تجسیم کی ہے۔ (یعنی اسے شناختی کارڈ پر صرف ایک نام نہیں رہنے دیا بلکہ اسے گوشت پوست کے بنے جیتے جاگتے انسان کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔) محمود درویش یہ بات پوری طرح بھانپ گیا تھا کہ فلسطینی کو گوشت پوست کا انسان نہیں رہنے دیا گیا بلکہ اسے محض ایک نام بنا دیا گیا تھا جو کہ اس کے شناختی کارڈ پر درج تھا بلکہ ایک لحاظ سے یہ معانی خود شناختی کارڈ نے اسے سمجھائے۔ اس نے ان معانی کو ایک وسیع تر تناظر دیا اور انھیں ایک زبان دی......اس سے زیادہ وہ اور کچھ نہ کر سکا۔ ساری نظم پر فعل امر سجل (اندراج کرلو، لکھ لو) حاوی ہے۔ ٹیپ کے مصرعے کی طرح وقفے وقفے کے بعد اس کی گردان کی جاتی ہے۔ اس کا مخاطب کوئی اسرائیلی پولیس تحریر ہے۔ اس پولیس محرر سے صرف اس محدود چوکھٹے کے اندر، جو شناختی کارڈ کا فراہم کردہ ہے، بات کی جا سکتی ہے، لیکن اس شخص (محرر) کو یہ یاد دلانا ضروری ہے کہ کارڈ کی

زبان اس حقیقت کے ساتھ جس کا وہ مفروضہ طور پر حامل ہے، پوری طرح انصاف نہیں کرتی۔ تشنیع درویش کی نظم میں زبردست اہمیت رکھتی ہے۔ نظم کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

لکھ لو!
میں عرب ہوں
اور میرے شناختی کارڈ کا نمبر
پچاس ہزار ہے
میرے آٹھ بچے ہیں
اور نواں
وہ گرما کے شباب میں تولّد ہونے والا ہے
کیا تم جل بھن تو نہیں گئے؟

دو بندوں کے بعد وہ کہتا ہے:

لکھ لو!
میں عرب ہوں
میرا نہ کوئی نام ہے......اور نہ خطاب
میں ایک ایسے ملک میں صابر و شاکر ہوں
جہاں کے لوگ جل بھن کر کباب ہو جاتے ہیں

نظم کے درمیانی بندوں میں راوی کا نجی شجرۂ نسب بیان کیا گیا ہے، یہ شجرۂ نسب کیا ہے اس کے مصائب و آلام اور نقصانات کی ایک داستان ہے، جسے بار بار دُہرایا گیا ہے جیسے کلیسا میں دعائیں کہ انھیں ایک شخص پڑھتا جاتا ہے اور باقی حاضرین اس کے چیدہ چیدہ حصے بار بار دُہراتے جاتے ہیں۔ تاہم نظم کا انجام ایک ایسے نکتے پر ہوتا ہے جو اس بیشتر ادب کا، جسے 1970ء کے عشرے کے دوران میں فلسطینیوں نے تخلیق کرنا تھا یا جو فلسطینیوں کے متعلق تخلیق کیا جانا تھا، مرکزی موضوع Motif بن جائے گا یعنی کہ فلسطینیوں کا ظہور:

چنانچہ!
صفحۂ اول کے عین اوپر لکھ لو:
میں انسانوں سے نفرت نہیں کرتا
اور نہ میں اپنی حدود سے تجاوز کرتا ہوں
تاہم اگر میرا پیٹ خالی ہو
تو غاصب کا گوشت میری غذا بنے گا۔
بچو...... میری بھوک سے بچو
اور میرے غصّے سے بھی!

''شناختی کارڈ'' میں فلسطینیوں کا ظہور خطرے کی زد میں ہے۔ چند سالوں کے بعد یہی ظہور عرب سیاسی زندگی کی ایک ایسی واقعیت بن جائے گا کہ سب کی زبان پر اسی کا ذکر ہوگا۔ لیکن یہ ذکر اس طور نہیں ہوگا کہ گویا اسے کوئی خطرہ لاحق ہے بلکہ اس طور جس سے یہ ثابت ہو کہ یہ موجود ہے اور اکثر و بیشتر حالات میں جب اس کا ذکر آئے گا، تو اس سے امید کا پہلو نکلے گا۔ یہ بات بہت اہم ہے کہ دُنیائے عرب کے ناول نگاروں کے سرخیل، نجیب محفوظ نے، جس کی نس نس میں مصریت بھری ہوئی ہے اور یہ مصریت اپنی تمام جزئیات سمیت اس کے ناولوں میں جلوہ افروز ہوتی ہے، اپنے 1973ء کے ناول ''حب تحت المطار'' (برشگال میں محبت) کا، جس میں اس مصر کا ذکر کیا گیا ہے جو نہ امن، نہ جنگ کی کیفیت سے گزر رہا تھا، نقطۂ عروج (کلائمکس) فلسطینیوں کے ظہور ہی کو بنایا ہے۔ ناول کا آخری منظر ہمارا تعارف فلسطینی گوریلے ابوالنصر الکبیر (بابائے فتح عظیم) سے کراتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب تازہ ترین ''امریکی پہل کاری'' نے اعصاب زدہ مصری حامیوں کی توجہ بٹا کر انھیں ذہنی پراگندگی کا شکار بنا دیا ہے۔ بابائے فتح کی رائے یہ ہے کہ آج جو واقعات ظہور پذیر ہو رہے ہیں ہمیں ان کے دور رس نتائج پر نظر رکھنا چاہیے۔ محفوظ ایک ایسا طنز نگار ہے جسے اپنے کیے پر کوئی ندامت نہیں۔ یہاں وہ بہ یک وقت دو چیزوں پر رائے زنی کر رہا تھا کہ مسلح فلسطینیوں نے عربوں کے انقلابی ترجمانوں کا فریضہ کس طرح اچانک اپنے ذمے لے لیا اور انقلابی وعدے اور لفاظی کس طرح پہلے ہی خود اپنی پیروڈی[1] آپ بن چکے تھے۔

---

① پیروڈی (Parody) کا اُردو میں ترجمہ ''تحریف'' کیا جاتا ہے۔ اصلاً یہ ایک ادبی اصطلاح ہے۔ کسی سنجیدہ کلام کی....

بابائے فتح ابھی صرف بالقوہ بابائے فتح تھا گو نجیب محفوظ نے اس حقیقت کی اہمیت گھٹانے کی کوشش نہیں کی (اور نہ اس کے قاری اس اہمیت کو گھٹا سکتے تھے) کہ اب جو بھی سیاسی حساب کتاب ہوگا اس میں فلسطینیوں کو شریک کرنا پڑے گا۔

محفوظ کے ناول کی ایک دوسری "تشنیع" (Irony) یہ ہے (اور 1970ء کے عشرے کے اوائل میں عرب دُنیا کی جو صورتِ حال تھی، اس پر اس کا اطلاق ہوتا ہے) کہ جہاں تک ہر شخص کا تعلق ہے، معلوم ہوتا تھا کہ فلسطینی شناخت قطعی انداز سے بیرون فلسطین ابھر کر سامنے آئی ہے۔ محفوظ کا فلسطینی گوریلا، ابو النصر، الناصرہ یا نابلوس میں نہیں، بلکہ قاہرہ میں رہتا ہے، اور جہاں تک ہر شخص کا علم کام کرتا تھا، اندرونِ اسرائیل درویش کی شناختی کارڈ والی زندگی بھی اتنی ہی غیر مطمئن اور ناشد تھی، جتنی کہ پہلے تھی۔ 1975ء یا 1976ء تک اسرائیلی فلسطینی عرب جلاوطنی کے سحر اور کشش کے سامنے سپر انداز رہے۔ پھر ان کا ظہور ہوا۔ اس ظہور میں جو ناگزیر "تشنیع" (Irony) مضمر ہے، یہ اس کے لیے بھی اور ان ٹھوس کامیابیوں کے لیے بھی، جو اس کی مرہونِ منت ہیں، نہایت اہم ہے۔ آئیں، اب ہم ان پر غور کرتے ہیں۔

..... مضحک نقالی کو ادبیات کی اصطلاح میں پیروڈی کہا جاتا ہے۔ جس ادب پارے کی پیروڈی کی جاتی ہے، اس کا ادبی دُنیا میں معروف ہونا ضروری ہے، ورنہ پیروڈی اپنا لطف کھو دے گی۔ اُردو میں پیروڈی کی بہترین مثال پطرس بخاری کا مضمون "لاہور کا جغرافیہ" ہے۔ اس میں نہ صرف جغرافیے کی درسی کتابوں کی بھد اڑائی گئی ہے بلکہ لاہور کی بعض معاشرتی ناہمواریوں کو بھی مضحک بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ خضر تمیمی نے خوشی محمد ناظر کی مشہور نظم "جوگی اور ناظر کی پیروڈی" سارنگی اور طبلہ کے عنوان سے، اور عاشق محمد غوری نے اختر شیرانی کی نظم "سلمٰی" کی پیروڈی "کتا" کے عنوان سے کی ہے۔

ویسے یہ لفظ عام زندگی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اگر کسی شخص یا ادارے کی کارکردگی اتنی خراب ہو کہ مذاق بن کر رہ جائے، تو اس صورتِ حال کو "پیروڈی" کہا جاتا ہے۔ مثلاً مقدمے کی کارروائی انصاف کی پیروڈی کے مترادف تھی۔"

③

تحریک آزادیٔ فلسطین نمایاں مقام حاصل کرتی ہے

فلسطین جو محض پناہ گزین تھے، کس طرح قابلِ قدر اہمیت کی حامل سیاسی قوت بن گئے، جہاں تک مجھے معلوم ہے، کسی نے اس کی نہ تو مکمل طور پر تسلی بخش تجزیاتی توضیح کی ہے اور نہ منطقی طور پر اس کا لحہ بہ لحہ جائزہ لیا ہے۔ لیکن یہ بات تمام عوامی تحریکوں پر صادق آئی ہے جو اپنے عناصر کی ریاضیاتی جمع تفریق سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہوتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ فلسطینیوں کی اس کایا پلٹ کی تاریخ دار واقعہ نگاری گمراہ کن حد تک آسان ہے۔ ''الفتح[1] نے اپنی زیست کا آغاز 1965ء میں اندرونِ اسرائیل ایک معمولی یورش کے ساتھ کیا۔ اس کے بعد جنگجو فلسطینی تنظیموں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اسرائیل کے ساتھ (اور اندرون اسرائیل) عسکری اعتبار سے اہم تصادمات کا سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ تاہم مارچ 1968ء تک فلسطینیوں نے جو کوششیں کی، ان کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ان دائروں کے اندر محصور تھیں جو عربوں کی قومی نمو (بالخصوص بعث پارٹی[2] اور ناصر اور ان کی حامیوں) نے متعین کیے تھے۔ مارچ 1928ء

---

① ''تنظیم آزادیٔ فلسطین'' مختلف گروپوں اور جماعتوں پر مشتمل فلسطینیوں کی متحدہ جماعت ہے۔ ''الفتح'' اس کا سب سے بڑا گروپ ہے۔ یاسر عرفات اس گروپ کے سربراہ ہیں۔

② عربوں کی بائیں بازو کی تنظیم۔ یہ مختلف عرب ممالک میں کام کر رہی ہے۔

میں بالخصوص 1967ء کی جنگ جون کے بعد، فلسطینی تحریک نے ایک نیا جامہ زیب تن کرلیا۔ اس تبدیلی کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ سیاسی اور علامتی طور پر یہ عرب گردوپیش سے الگ ہوگئی اور اس نے ایک اپنی جداگانہ حیثیت منوالی۔ اس تاریخی دن کی اہمیت یہ ہے کہ 1967ء اور 1948ء کے بعد اس روز اسرائیل کی باقاعدہ فوجوں (جو اندرون اردن ایک فلسطینی قصبے کرامہ پر چڑھائی کرنے کے لیے دریائے اردن عبور کرآئی تھیں) اور فلسطینیوں کی بے قاعدہ فوجوں کے مابین پہلی جھڑپ ہوئی۔ اس لڑائی میں، جو دن بھر جاری رہی، بعدازاں اردنی فوج کے باقاعدہ دستوں نے فلسطینیوں کی امداد کی، لیکن (فلسطینیوں کے بیان کے مطابق) لڑائی کا بیشتر بوجھ فلسطینیوں نے اٹھایا اور وہی اسرائیلیوں کے خلاف مصروف کارزار رہے۔ کرامہ کا دفاع کرنے والے نہ صرف اپنے مورچوں میں ڈٹے رہے اور لڑائی کرتے رہے، بلکہ انھوں نے اسرائیل کے بکتر بند دستوں کو بھی کافی نقصان پہنچایا۔ انھوں نے متعدد فوجی گاڑیاں تباہ کردیں اور اس کے بے شمار فوجیوں کو یا تو ہلاک کردیا اور یا گھایل۔ یہ وہی بکتر بند دستے تھے جو اس وقت تک اس بات کے عادی تھے کہ ان کا جہاں (مثلاً مغربی کنارے کا گاؤں السموع) جی چاہتا، آرام سے آتے، مار دھاڑ کرتے، جائدادوں کو تباہ و برباد کرتے۔ نہتے عربوں کو ہلاک کرتے اور کوئی ان کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکتا بلکہ وہ کوئی خاص نقصان اٹھائے بغیر واپس چلے جاتے۔

کرامہ فلسطینیوں کی تیز ترین نمو کا نقطۂ آغاز تھا۔ تمام عرب ممالک سے رضا کار جوق در جوق آنے لگے اور ایک سال کے اندر اندر فلسطینی فدائین اندرون اردن ایک ایسی قوت بن کر ابھر چکے تھے کہ ان سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں تھا۔ لیکن یہی وہ دور تھا جس کے دوران میں وہ چیز صورت اختیار کرنے لگی، جس کی طرف میں پہلے ہی اشارہ کرچکا ہوں اور جسے تذبذب کہا جاسکتا ہے۔ تذبذب اس بارے میں تھا کہ ایک انقلابی جہت (قوم کو غیروں کے پنجے سے چھڑانے کا عمل)[1] اختیار کی جائے یا وہ جہت اختیار کی جائے جو فلسطینی قوت کے ڈھانچوں کو ایک عرب ریاست کے ڈھانچوں (قومی آزادی)[1] میں تبدیل کردے۔ یہی وہ تذبذب

[1] اصل میں یہاں مصنف نے دو الفاظ Liberation اور Independance استعمال کیے ہیں۔ اُردو زبان میں ان دونوں کا ترجمہ "آزادی" کیا جاتا ہے لیکن ان دونوں الفاظ کے مابین ایک باریک سا فرق ہے۔ لبریشن وہ کارروائی ہے جو کوئی قوم کسی دوسری قوم کا جوا اپنے کندھوں سے اتارنے کے لیے کرتی ہے۔ محکوم قوم کو حاکم قوم سے نجات مل جاتی ہے تو اس حالت کو (Independence) (آزادی) کہا جاتا ہے۔ فلسطینیوں کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ آیا وہ سارے فلسطین کو صیہونیوں کے چنگل سے چھڑانے کی کارروائی کریں، اگر وہ کام کرتے ہیں تو وہ لبریشن کے لیے جدّوجہد کررہے ہوتے، یا ان کے سامنے یہ صورت تھی کہ وہ فلسطین کے اس علاقے پر، جہاں اسرائیل نے 1967ء کی جنگ کے دوران میں قبضہ کیا تھا۔ ایک آزاد فلسطینی ......

تھا جس نے فلسطینیوں...... یا یوں کہیں اور زیادہ مناسب بھی یہی بات ہے کہ اس نے تنظیم آزادیٔ فلسطین......کو اپنے نرغے میں لے لیا تھا اور یہ فیصلہ نہیں ہو رہا تھا کہ کون سی راہِ عمل زیادہ صحیح ہوگی۔ میں اس کتاب میں جس متناقص فلسطینی ''صورتِ حال'' کا ذکر کر رہا ہوں، یہ دونوں صورتیں اس کے لازمی عواقب ہیں، نظری طور پر ان دونوں امکانات کو ایک دوسرے کا حریف نہیں ہونا چاہیے لیکن اگر انھیں فلسطینی شناخت کے سارے مسئلے کے تناظر میں دیکھا جائے تو وہ ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوتے نظر آئیں گے۔ تاہم جب واضح انتخاب کر بھی لیا گیا تو بھی یہ دونوں متبادل صورتیں جو مسائل پیدا کرتی تھیں، وہ ختم نہیں ہوئے۔ فلسطینیوں نے چونکہ کافی ہتھیار اکٹھے کر لیے تھے اور انھوں نے بڑی سرعت کے ساتھ اپنے آپ کو سیاسی اور فوجی گروپوں (کی صورت) میں منظم کرنا شروع کر دیا تھا، اور البتہ چونکہ یہ سب کچھ اندرون فلسطین نہیں بلکہ کسی نہ کسی برادر عرب ملک کے اندر ہو رہا تھا، یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ نوجنگجو فلسطینی (اس برادر عرب ملک) کی مرکزی مقتدرہ کے لیے ایک چیلنج بنتے جا رہے ہیں اور جیسا کہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ یہ واضح ہو گیا کہ فلسطینی خودارادیت نے سمجھوتے کی راہ اختیار کر لی تھی۔ پہلے وہ یہ چاہتے تھے کہ انھیں سارے فلسطین کو آزاد کرانا چاہیے لیکن اب وہ فلسطین کے ایک حصے پر اپنی مملکت قائم کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ اس دوران میں تنظیم آزادیٔ فلسطین نے یہ ہاتھ دکھایا کہ کسی نہ کسی عرب مملکت کے اندر فلسطینیوں کے امور طے کرنے کے لیے اپنی ایک نیم مملکت قائم کر لی اور یہ نیم مملکت پہلے اردن میں اور پھر لبنان میں اپنے سے بڑی مملکت کے ساتھ متصادم ہو گئی۔ دوسری طرف فلسطینی تحریک کی عظیم سیاسی اور نظریاتی قوت کا راز وہ صلاحیت تھی جس کی مدد سے اس نے علاقے کے تقریباً ان تمام عناصر کی توجہ، جو ادب، ثقافت، فنونِ لطیفہ اور اس قسم کے دوسرے محاذوں پر پیشرووں کا کردار ادا کر رہے تھے، اپنی طرف مبذول کرا لی۔ ایک خاص مفہوم میں ''فلسطینی'' ہر اس چیز کا مترادف تھا جو ان الفاظ کے بہترین معانی کے اعتبار سے نئی جدید یا انوکھی تھی۔

پھر یہ ''فلسطینیت'' سیاست کی مترادف بھی ہے۔ میرے خیال میں یہ کہنا کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہوگا کہ 1948ء کے بعد عرب دُنیا میں جو وقیع سیاسی تحریکیں شروع ہوئیں، خیالات کے جو دھارے رواں دواں ہوئے، جن بحث مباحثوں کا آغاز ہوا ان سب پر فلسطین کا مسئلہ حاوی رہا ہے۔ فلسطینیوں کے اپنے بحث مباحثوں، مذاکروں، تنظیموں، وغیرہ پر یہ بات کتنی صادق آتی ہے، اس کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ

......مملکت قائم کرنے کی کوشش کریں، ان کی یہ جدوجہد آزادی (Independence) کی خاطر ہوتی۔ انھوں نے دوسری صورت کو ترجیح دی۔

بات خود ہی اظہر من الشّمس ہے۔اس کا جو خالص نتیجہ برآمد ہے، وہ واقعی زبردست اہمیت کا حامل ہے۔گزشتہ چند برسوں سے فلسطینی سیاست تنظیموں کی اصطلاحوں میں چلائی جارہی ہے......ان تنظیموں میں اہم ترین وہ ہیں جو تنظیم آزادیٔ فلسطین کی صورت میں شیرازہ بند ہوچکی ہیں۔ان میں ''الفتح''، عوامی محاذ برائے آزادیٔ فلسطین (پاپولر فرنٹ فار دی لبریشن آف پیلسٹائن یا پی ایف ایل پی)، عوامی جمہوری محاذ برائے آزادیٔ فلسطین (پاپولر ڈیموکریٹک فرنٹ فار دی لبریشن آف پیلسٹائن یا پی ڈی ایف ایل پی) [1]، صاعقہ اور بے حد چھوٹے چھوٹے گروپوں کی ایک خاصی بڑی تعداد شامل ہے۔ان گروپوں کے ارکان مختلف افکار و نظریات اور رجحانات کے حامل ہیں اور تو اور ان کی وفاداریوں کے منابع بھی مختلف ہیں۔ [2] جن کا انھیں باقاعدہ معاوضہ بھی ملتا ہے۔ تاہم ان کے تنظیم آزادیٔ فلسطین کی صورت میں شیرازہ بند ہونے کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ مخصوص فلسطینی مسائل کا رشتہ عرب سیاست ہی سے نہیں بلکہ تیسری دُنیا کی سیاست اور مختلف قسم کے دیگر مفادات سے بھی قائم ہوگیا ہے۔بعض اوقات فلسطینی سیاست سر چکرا دینے کی حد تک بے ربط ہوجاتی ہے (اس کی وجوہات کیا ہیں، ان پر میں ذرا بعد میں روشنی ڈالوں گا) اور کبھی یہ بالکل خونخوار رویہ اختیار کرلیتی ہے۔لیکن بعض مواقع ایسے بھی آتے ہیں جب یہ روزِ روشن کی طرح بالکل واضح صورت اور رخ اختیار کرلیتی ہے۔لیکن ایک بات پر حیران کن حد تک مکمل اتفاقِ رائے پایا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ سبھی گروہ فلسطینیوں کے حق خود ارادیت اور اس کے ساتھ آزادی حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس سے بھی بڑھ کر جو بات قابلِ غور اور اہم ہے، وہ یہ ہے کہ انھوں نے بکاؤ مال بننے، اپنی جدّ و جہد ترک کرنے اور احتجاج کے بغیر دوسروں کا دبیل بننے یا اپنے ملک پر غیروں کا قبضہ تسلیم کرنے سے صاف انکار کردیا ہے۔اس معاملے میں ان کا ریکارڈ صاف بھی ہے اور غیر منقطع بھی۔

فلسطینیوں کا سب سے بڑا گروپ ''الفتح'' ہے۔اس گروپ پر یاسر عرفات اور فدائین کا ایک گروہ حاوی ہے۔یہ وہ لوگ ہیں جن کی قوت، اثر و رسوخ اور سیاسی سوچ بچار جلاوطنوں اور غزہ اور مغربی کنارے کی ایک بہت بڑی اکثریت کو اپنے دائرے میں سموئے ہوئے ہے۔الفتح (اور واقعتاً یاسر عرفات) جن نمونوں کی

---

① یہ گروپ اصل میں پاپولر فرنٹ فار دی لبریشن آف پیلسٹائن (پی ایف ایل پی) کے بطن سے نکلا ہے۔

② مثلاً صاعقہ گروپ کی وفاداریاں شام کے ساتھ وابستہ ہیں اور شام ہی انھیں امداد فراہم کرتا ہے۔پچھلے سالوں میں شام بیروت کے فلسطینی کیمپوں پر جو حملے کرتا رہا ہے۔ان میں اس گروپ کے ارکان شام کی طرف سے لڑتے رہے ہیں۔کچھ گروپوں کی وفاداریاں لیبیا کے ساتھ وابستہ ہیں اور ہوسکتا ہے کہ ان میں سے بعض خود اسرائیل کے ایجنٹ ہوں۔(مصنف)

پیروی کرتا ہے، وہ بنیادی طور پر ناصری ہیں، لیکن (صدر) ناصر (مرحوم) کے علی الرغم الفتح اور عرفات نے عملاً یہ تہیہ کر رکھا ہے کہ وہ حتیٰ الامکان کسی بھی عرب ملک کی داخلی سیاست میں ضرورت سے زیادہ ملوث نہیں ہوں گے۔(اس معاملے میں لبنان اور اردن دو مستثنیات تھیں۔ اگرچہ ایک لحاظ سے یہاں دخل اندازی ناگریز تھی لیکن انجام کار یہ دخل اندازی بہت مہنگی ثابت ہوئی۔) ناصری سیاست سے میری مراد صرف یہ نہیں کہ اقتدار (اتھارٹی) یعنی ''زعیمہ'' ہمیشہ ایک مرئی علامت......اس صورت میں یہ علامت عرفات ہیں، جو ''بڑے میاں'' کے نام سے بھی جانے جاتے ہیں جن کی محض مسلسل موجودگی ہی اس بات کی ضمانت ہے کہ فلسطینیوں کا ایک مقصد (کاز) ہے......ہوتی ہے بلکہ یہ کہ بنیادی طور پر دو انتہاؤں کے بین بین ایک قوم پرستانہ فلسفہ ہے جو تحریک کی رہنمائی کرتا ہے۔ ایک لحاظ سے یہ ایک خامی ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ سیاسی تنظیم پر کم سے کم زور دیا جاتا ہے، ماسوائے ایک صورت کے جب معاملہ صیہونیت کے خلاف محاذ آرائی کرنے کا ہو۔ چنانچہ عرفات اور الفتح کو مجموعی طور بلا تامل محض عرب اور فلسطینی کی حیثیت سے شناخت کیا جاسکتا ہے۔ ایک دوسرے لحاظ سے یہ بات اچھی بھی ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ

(الف) الفتح سیاسی خیالات اور اسلوب میں ڈھنڈورا پیٹے بغیر حقیقی جمہوریت کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔

(ب) کوئی بھی یہ کبھی ثابت نہیں کر سکا کہ الفتح ایسے ممالک کے ساتھ جیسے کہ مثال کے طور پر سعودی عرب، لیبیا، سوویت یونین یا جرمن ڈیموکریٹک ری پبلک (مشرقی جرمنی) ہیں، اپنے تعلقات کے باوجود ان سے آزاد نہیں اور چنانچہ سب سے بڑھ کر یہ فلسطینی نہیں۔

(ج) اور اہم ترین بات یہ ہے کہ الفتح اس اہم اور اساسی حقیقت کی نمائندگی کرتی ہے کہ یہ مظلوم فلسطینیوں کی ایک جماعت تو ہے لیکن وہ یہ ضروری نہیں سمجھی کہ عوامی جنگ یا طبقاتی تجزیے کے نظریے میں ہر فلسطینی کو گھسیٹر دے۔

لیکن الفتح صرف انھی باتوں کی نمائندگی نہیں کرتی۔ الفتح کے لاتعداد حمایتی ہیں۔ اس کی جدوجہد کی تاریخ نسبتاً طویل ہے۔ اس کے وسائل (ہزاروں تربیت یافتہ فدائین، حکام وغیرہ) وافر ہیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دُنیا کے متعلق اس کا نقطہ نسبتاً رجائی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ آخری بات آپ کو عجیب نظر آئے لیکن یہ اس یقین اور اعتماد، بے جھجک روش اور بے تکلفی اور بنیادی طور پر مثبت رویے کی مظہر ہے، جس کے ذریعے الفتح سیاسی طور پر باقی دُنیا کو متاثر کرتی ہے اور خود اس سے متاثر ہوتی ہے۔ اس کی جزوی وجہ یہ ہے کہ اس نے نہ صرف عرب قوم پرستانہ سیاست کے اس بڑے اصول کے ساتھ پیوندکاری کے ذریعے اپنا رشتہ جوڑ لیا ہے

جس کا تعین جمال عبدالناصر نے کیا تھا بلکہ اس نے اپنے (حقیقتاً بہت ترقّی پسندانہ) سنی اسلام کے ثقافتی رسومیہ [1] کی پردہ پوشی کی کوئی خاص کوشش نہیں کی۔ قصہ مختصر یہ ایک اکثریتی گروپ ہے اور یہ اپنے آپ کو فلسطینی مسئلے کے متعلّق (میرے خیال میں بجا طور پر) بات کرنے کا اہل سمجھتا ہے۔ چنانچہ مجموعی طور پر اسے تنظیم آزادیٔ فلسطین میں بھی غلبہ حاصل ہے۔ پھر بھی الفتح جو کچھ ہے اور جن چیزوں کی یہ نمائندگی کرتی ہے ایک لحاظ سے ان کی حدود منفی طور پر متعین کی جاتی ہیں...... ان منفی حدود کا تعین ان باتوں سے ہوتا ہے جو اس کے سیاسی حریف اس کے متعلّق کہتے ہیں اور ان باتوں سے بھی، جن کے متعلّق ان حریفوں کا یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ یہ وہ چیزیں، جو ہم نے فلسطینی سیاست کی دُنیا کو اپنے حصے کے طور پر دی ہیں۔ یہاں چند اہم نکات کا ذکر ضروری ہے۔

اگر یہ بات درست ہے کہ فلسطینی سیاست کی تاریخ کا ایک نمایاں وصف یہ رہا ہے کہ اس نے فلسطین کے متعلّق ایسے منصوبوں میں شریک ہونے سے اکثر انکار کیا ہے جو (فلسطین میں نہیں بلکہ) کہیں باہر گھڑے گئے تھے (اعلان بالفور سے لے کر 1947ء کے تقسیم کے منصوبے تک اور وہاں سے کیمپ ڈیوڈ تک) تو پھر الفتح کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ وہ جماعت ہے جس نے کسی دوسری سیاسی جماعت کی نسبت ان منصوبوں کو ماننے سے سب سے کم انکار کیا ہے۔ (یا مروّجہ اصطلاح کے مطابق انھیں سب سے کم مسترد کیا ہے)۔ چونکہ الفتح اس احساس کے ساتھ اور اس احساس میں ہر آن اضافہ ہوتا جارہا ہے، اپنے دشمنوں سے عہدہ برآ ہوتی ہے کہ اس کی طاقت کا سرچشمہ جمہور کی حمایت ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ واحد فلسطینی جماعت ہے جو اپنے دشمنوں کے ساتھ کوئی ذمہ دارانہ سیاسی تصفیہ کرنے کی اہلیت سے بہرہ ور ہے۔ الفتح اور بالخصوص عرفات، عملیت پسند [2] ہیں، جس کا مطلب میرے قیاس کے مطابق یہ ہے کہ چالوں اور گھاتوں پر زیادہ وقت، توجہ اور مہارت صرف کی جانا چاہیے اور نظریے اور منضبط حکمتِ عملی پر کم۔ معلوم ہوتا ہے کہ الفتح کی نسبت اس کے حریفوں، بالخصوص پاپولر فرنٹ اور بعد ازاں متاثر کن نیشنل ڈیموکریٹک فرنٹ کو ان مشکلات، سیاق و سباق اور نظریاتی مسائل کا، جنھوں نے مسئلۂ فلسطین کو محصور کر رکھا ہے، زیادہ درک تھا،

---

1. رسومیہ (Ethes) کسی شخص، قوم، فرقے، ثقافت، نظام، ادب پارے یا تحریک وغیرہ کا خصوصی مزاج، کردار اقدار یا عقائد

2. عملیت پسندی (Pragmatism): مسائل کو حل کرنے کا عملی طریقہ۔ اصل میں یہ فلسفے کا ایک نظریہ یا اصول ہے۔ اس کے مطابق کسی دعوے کی قدر و قیمت صرف اس بنا پر متعین کی جاتی ہے کہ اس کے عملی نتائج کیا برآمد ہوں گے اور انسانی مفادات پر یہ کس طرح اثر انداز ہوگا۔

چنانچہ وہ مسئلے کی نوعیت بھی بہتر طور پر سمجھتے تھے۔ مثلاً پاپولر فرنٹ نے یہ دعوت دی کہ عرب ممالک میں انقلاب برپا کیا جائے کیونکہ فلسطین کا دوبارہ حصول صرف اسی ذریعے سے ممکن ہے۔ یہ فرنٹ اسرائیل، امریکا یا "عرب رجعت پسندی" کے ساتھ کسی بھی قسم کے سیاسی حل پر غور کرنے کے لیے تیار نہیں اور اپنے اس انکار پر نہایت سختی سے قائم ہے کیونکہ اس کے خیال کے مطابق مسئلے کا صرف ایک ہی حل ہے اور وہ ہے فوجی حل۔ ڈیموکریٹک فرنٹ (ڈی پی ایف) کا جسے خطے کے مارکسی، لیننی گروپوں میں مرکزی مقام حاصل ہے، استدلال یہ ہے کہ جو بھی سیاسی رویہ اپنایا جائے، وہ پہلے سے زیادہ زیرکی، معاملہ فہمی اور مہارت کا حامل ہونا چاہیے۔ یہ فرنٹ 1969ء میں وجود میں آیا اور جب سے یہ قائم ہوا ہے، اسی وقت سے یہ بڑھ چڑھ کر اس بات کا پرچار کر رہا ہے کہ اجتماعی فلسطینی مؤقف میں ترقّی پسندانہ تبدیلی ہونا چاہیے۔ یہ ڈی پی ایف تھا جس نے سب سے پہلے اس عبوری پروگرام کا، جسے تنظیم آزادیٔ فلسطین نے 1974ء میں منظور کرلیا، زور شور سے پراپیگنڈہ کیا۔ اس پروگرام کے تحت تنظیم آزادیٔ فلسطین کو جن مقاصد کے حصول کے لیے جدّوجہد کرنے کو کہا گیا وہ فوری نوعیت کے مقاصد تھے اور پورے کے پورے فلسطین کو آزاد کرانے کے مقاصد سے کہیں کم تر تھے۔ یہ پروگرام جس کی 1977ء میں نوک پلک مزید سنواری گئی، اس تصور کو قبول کرتا ہے کہ فلسطین کے کسی بھی حصے پر، جسے اسرائیل خالی کردے، قومی فلسطینی اقتدارِ اعلیٰ (اب مملکت) قائم کیا جاسکتا ہے۔

لیکن وہ گروپ، جو اس قسم کے منصوبوں کو پائے استحقار سے ٹھکرانے اور مسترد کرنے کے عادی ہیں (ان میں وہ ننّھی منی تنظیمیں شامل ہیں جنھیں لیبیا اور عراق مالی امداد فراہم کرتے رہتے ہیں) اور ڈی پی ایف (جو مسترد کرنے والوں میں شامل نہیں) جو چیلنج پیش کرتے ہیں، وہ یہ ہے کہ وہ الفتح کی کم و بیش برجستہ، اور بعض صورتوں میں خاندانی انداز کی بھی، سیاست کے ناقد ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی نکتہ چینیاں نظریاتی، تنظیمی اور حربی تقاضوں کی بنیاد پر کرتے ہیں۔ (اور اس میں ان کی اپنی کوئی غرض شامل نہیں) تنظیمِ آزادیٔ فلسطین اور سعودی عرب یا شام کے مابین مفروضہ تعلقات کس نوعیت کے ہونے چاہییں، اردن کے متعلق جو بلحاظ آبادی فلسطینی اکثریت کا علاقہ ہے، ہمارا رویہ کیا ہونا چاہیے؟ 1976ء کے موسم خزاں میں تنظیم آزادیٔ فلسطین کے بعض ارکان اور اسرائیل کی بعض عوامی شخصیات کے مابین جو ملاقاتیں ہوئیں، وہ کیوں ہوئیں اور کن مخصوص مقاصد کے پیش نظر ہوئیں؟ جب سادات نے بیت المقدس کا دورہ کیا تو اس کی ہر پہلو اور ہر لحاظ سے مذمت کیوں نہ کی گئی؟ الفتح کے خیال میں مستقبل کا فلسطینی معاشرہ کس قسم کا ہونا چاہیے؟ استعمار کے مسائل کے متعلق الفتح کے واضح عزائم کیا ہیں؟ وہ ایسے عزائم کیوں نہیں اپناتی جن سے امریکا اور اس کے حواریوں کے ساتھ پینگیں بڑھانے کا سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے منقطع ہوجائے؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جب الفتح کا رویہ یہ

ہو کہ کچھ یہاں اور کچھ وہاں کیا، اس کا ایک رہنما الف کہتا ہے اور دوسرا ب، اس نے جو نوکرشاہی (بیوروکریسی) قائم کر رکھی ہے، اس کی کوئی کل سیدھی ہی نہیں ہے، وہ انقلابی تنظیم کا کام کرنے اور شعور بلند کرنے کی جگہ محض نعرے لگاتی رہتی ہے، کام کروانے کی بجائے محض سرپرستی کرنا ہی کافی سمجھتی ہے، سنجیدہ جواب طلبی کے بجائے محض اس بات پر عمل کرتی ہو کہ لیڈر کے پیچھے پیچھے چلو، ان تمام امور کے باوصف وہ (الفتح) کب تک مواخذے سے بچی رہے گی؟

بعض اوقات ان مباحث پر اتنا زیادہ وقت صرف ہوجاتا ہے جو صیہونیت کے خلاف نبرد آزما ہونے میں بھی صرف نہیں ہوتا۔ بعض مواقع ایسے بھی آتے ہیں جب کسی ایسے امر کے متعلق، جو ساری فلسطینی قوم کے لیے بے پناہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے...... مثلاً 1977ء کے اواخر میں اقوامِ متحدہ نے جو قرارداد نمبر 242 منظور کی تھی اس کی بابت تنظیم آزادیٔ فلسطین کا مؤقف...... فیصلہ دو عاجلانہ جملوں میں کر دیا جاتا ہے، جب کہ ایک مسئلہ، جو ایک دفتر میں فروکش ایک استردادی اور اس سے ملحقہ دفتر میں قیم الفتح کے ایک فدائی کے مابین عارضی جھگڑے سے متعلق ہو، زبردست دلائل سے معمور (اور عام طور پر مبہم اور آب و تاب سے محروم) نثر کے صفحات کے صفحات کھا جائے گا۔ ٹیڑھی ٹیڑھی ترجیحات اور عدمِ ارتباط (جس کا ذکر میں نے کچھ ہی دیر پہلے کیا تھا) کا احساس نہ صرف ایک دوسرے سے گتھم گتھا سیاسی فلسفوں بلکہ فلسطینی حیات کی مکعبی صورت کا بھی وظیفہ ہے۔ جب آپ کے پاؤں تلے زمین (یعنی اپنا علاقہ) نہ ہو، تو پھر اس کے لیے یہ امر انتہائی مشکل ہے کہ آپ یقین کے ساتھ یہ معلوم کر سکیں کہ آپ کے لیے بہترین راستہ کون سا ہے کیونکہ آپ ٹھوس حقائق سے عہدہ برآ نہیں ہو رہے تھے بلکہ صرف عالمِ تجرید میں ہاتھ پاؤں مار رہے ہوتے ہیں۔ پھر بسا اوقات سیاسی وفاداریوں اور وابستگیوں کا ایک مایوس کن (بلکہ لاعلاج) ملغوبہ وجود میں آجاتا ہے جو نیم ڈھیلی ڈھالی آنول نالوں [1] کی طرح فلسطینیوں کو ایک دوسرے سے اور ان ممالک کے ساتھ، جہاں وہ مقیم ہیں، منسلک کر دیتا ہے۔ ہر عرب سیاستدان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ فلسطینی جدوجہد کے ساتھ رسم و راہ بڑھائے کیونکہ اس سے اسے اختیار کی سند بھی ملتی ہے اور اسے برسرِ اقتدار رہنے یا آنے کا جواز بھی مہیا ہوتا ہے، چنانچہ عربوں کی ہر مملکت یا حکومت یہ ضرورت محسوس کرتی ہے کہ اسے فلسطینی سیاست میں کسی نہ کسی قسم کا اثر و رسوخ حاصل ہو۔ اس اثر و رسوخ کے حصول کے لیے عام طور پر دو ذرائع استعمال کیے جاتے ہیں۔ کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ کچھ فلسطینی اپنی سیاست میں ان ممالک کی نیابت کر رہے ہوتے ہیں اور کبھی یہ ممالک فلسطینیوں کی ایک پارٹی بنا دیتے

---

[1] وہ نالی یا آنت جو پیدائش کے وقت بچے کے ناف سے جڑی ہوتی ہے اور جسے کاٹ دیا جاتا ہے۔

ہیں جو ان ممالک کے اشاروں پر رقص کرتی رہتی ہے۔ چنانچہ قریب قریب ہر فلسطینی کی یہ کیفیت ہے کہ کبھی شعوری طور پر اور کبھی غیر شعوری طور پر وہ اس قسم کی سیاست کاری کر رہا ہوتا ہے کہ وہ دانشورانہ یا مادی وسائل کے لیے عراق، مصر، سعودی عرب یا کسی بھی دوسرے ملک کے احسانات تلے دبے ہوتا ہے۔ عرفات ایک قسم کی نابغہ روزگار شخصیت ہیں کیونکہ انھوں نے ان سب کو حدود کے اندر رکھا ہوا ہے بلکہ (ناصر کی طرح) بعض اوقات انھیں اس طریقے سے استعمال کر لیتے ہیں جس سے ان کا اپنا مطلب نکل آتا ہے اور فلسطینی تحریک کو خاصا فائدہ پہنچ جاتا ہے۔

تاہم بعض مواقع ایسے بھی آجاتے ہیں کہ یہ صورتِ حال ہلاکت آفریں جنگ پر منتج ہوتی ہے۔ اس کی ایک مثال وہ تصادم ہے جو 1978ء کے نصفِ اول کے دوران میں الفتح کے فدائین اور عراق کے پروردہ استردادین کے مابین ہوا تھا۔ لیکن زیادہ تر...... اور یہ غالباً ایک متناقض صورتِ حال ہے...... فلسطینی سیاست کا رجحان آپس کی کھینچا تانی کی طرف نسبتاً کم ہے اور ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی طرف زیادہ ہے۔

صورتِ حال کی توضیح کا یہ ایک طریقہ ہے کیونکہ ویت نام اور الجزائر کی تحاریک آزادی کے مقابلے میں فلسطینی تحریک کی ایک نمایاں خصوصیت متشددانہ گروہی سیاست نہیں ہے جہاں حریف ایک دوسرے کے مقابلے میں صف آرا ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے کو نیست و نابود کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔ بعض ناقدین یہ باور کرتے ہیں کہ یہ (فلسطینی) تحریک کی ایک زبردست خامی ہے۔ کیونکہ فلسطینیوں (بالخصوص الفتح) کی سوچ یہ ہے کہ طاقت بندوق کی نالی سے نہیں بلکہ استدلالی طور پر اپنے حریفوں کو چاروں شانے چت گرانے سے حاصل ہوتی ہے۔ دوسرے لوگ اس سچائی کو تسلیم تو کرتے ہیں لیکن وہ ایسا محض اس لیے کرتے ہیں تاکہ وہ تنظیم آزادیٔ فلسطین کو اپنی نکتہ چینی کا ہدف بنا سکیں کہ یہ سیاسی اور انقلابی عزم سے تو عاری ہے لیکن جنگ جوئی کا پرچار بہت کرتی ہے۔

میرے خیال میں فلسطینیوں کی ایک خاصی بڑی تعداد ان معنوں میں غلط راستے پر چل پڑی ہے کہ وہ یہ باور کرنے لگے ہیں کہ وہ قوت جو تحریک کو مہمیز دیتی اور اسے پروان چڑھاتی ہے، وہ اس کا مسلح جدوجہد کا فلسفہ ہے۔ اس فلسفے کے متعلق یہ مفروضہ قائم کر لیا گیا ہے کہ یہ ایک نیا اور انوکھا تصور ہے جسے اولین بار فلسطینیوں نے متعارف کرایا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ عوامی جنگ کے عمومی نظریے کے متعلق بھی یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بھی انھوں نے ہی تخلیق کیا ہے۔

ایک لحاظ سے یہ بات ٹھیک بھی ہے کیونکہ 1960ء کے عشرے کے اواخر میں یقیناً یہ صرف فلسطینی ہی تھے جو ابھی تک عرب جدوجہد کو استعمار مخالف اصطلاحات میں سوچنے کی ہمت کرتے تھے۔ 1967ء کے

بعد اقوامِ متحدہ نے جب قرارداد نمبر ① 242 منظور کی، تو اس کا عالمی رائے عامہ پر گہرا اثر پڑا۔ اس (عالمی رائے عامہ) سے صدر ناصر اور بعث پارٹی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور سمجھنے لگے کہ اس قسم کی عالمی رائے عامہ کا بننا ناگزیر تھا۔ چنانچہ اس کی ایک علامت 1970ء میں راجرز ② منصوبے کی منظوری کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ فلسطینیوں کی مسلح جدّوجہد کی اصل معنویت پیچیدہ نوعیت کی حامل تھی لیکن کم از کم ایک سطح پر یہ اس بات کی بھی نمائندگی کرتی تھی کہ اب سارے فلسطین کو آزادی دلانے کی جدّوجہد سے منہ موڑ لیا گیا ہے اور ایک قوم پرستانہ مساعی کا آغاز کر دیا گیا ہے جس میں ہتھیار (اور فوجیں) ایک مرکزی قومی مقتدرہ کے تحفظ کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ اقوامِ متحدہ کی قرارداد نمبر 242 نے ناصر ازم اور بعث ازم کے ساتھ یہی کچھ کیا کیونکہ اس نے (نظری طور پر) فوج کا یہ کردار کہ وہ ایک انقلابی سامراج دشمن طاقت ہے، تو ختم کر دیا اور اس کا حلیہ یوں بگاڑا کہ اسے موجودہ حالت (سٹیٹس کو) کا لازمی طور پر قدامت پسند محافظ بنا دیا۔ چنانچہ اس حد تک فلسطینیوں کے متعلق یہ تاثر قائم ہونے لگا کہ ان کے ہتھیاروں کا انقلابی مقاصد کے لیے استعمال ہونے کا امکان کم ہے اور اس مملکت کی خاطر جو ابھی تکمیل کے مراحل میں سے گزر رہی ہے، زیادہ۔

چنانچہ اردنی فوج اور تنظیم آزادیٔ فلسطین کے مابین جو جھڑپیں ہوئیں، ان میں فلسطینی ہتھیاروں نے ایک آزاد فلسطینی شناخت کا، وہ جیسی کیسی بھی تھی، تحفظ کیا۔ یہ ہتھیار کوئی انقلابی پیش قدمی نہ کر سکے کیونکہ اُردنی

---

① اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل نے قرارداد نمبر 242,22 نومبر 1967ء کو منظور کی تھی۔ اس قرارداد کی رو سے جنگ کے ذریعے دوسروں کے علاقوں کو ہتھیانے کی کارروائی پر اظہارِ ناپسندیدگی کیا گیا تھا۔ اسرائیل سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ اس نے 1967ء کی جنگ کے دوران میں جن علاقوں پر قبضہ کیا تھا، انھیں وہ خالی کر دے۔ اس کے ساتھ ہی اس قرارداد میں مشرقِ وسطیٰ کے تمام ممالک (بشمول اسرائیل) کی علاقائی سالمیت اور سیاسی آزادی کی ضمانت دی گئی تھی۔ چنانچہ علاقے کے تمام ممالک سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ وہ حالتِ جنگ ختم کر دیں۔ ایک دوسرے کی سیاسی آزادی، علاقائی سالمیت اور اقتدارِ اعلیٰ کا احترام کریں۔ تسلیم شدہ سرحدوں کے اندر امن چین سے رہیں اور ایک دوسرے کو دھمکیاں نہ دیں۔

② ولیم راجرز (Rogers): صدر نکسن کے زمانے میں امریکا کے وزیرِ خارجہ تھے۔ انھوں نے 9 دسمبر 1969ء کو ''مشرقِ وسطیٰ میں دیرپا امن، امریکی نقطۂ نظر'' کے عنوان سے ایک تقریر کی تھی۔ اس تقریر میں جو نکات بیان کیے گئے تھے، انھیں ''راجرز منصوبہ'' کہا جاتا ہے۔ اپنی تقریر میں انھوں نے سلامتی کونسل کی قرارداد نمبر 242 کی تائید کی تھی۔ انھوں نے بھی اسرائیل سے مطالبہ کیا کہ وہ مقبوضہ عرب علاقے خالی کر دے، عربوں کا فرض بنتا ہے کہ وہ اسرائیل کو تسلیم کر لیں۔ انھوں نے فلسطینی پناہ گزینوں سے ہمدردی کی اور ان کی خواہشات کا احترام کرنے پر زور دیا۔ تاہم انھوں نے کہا کہ سرحدوں کا نئے سرے سے تعین ہونا چاہیے اور یہ معاملہ اسرائیل اور اردن کی حکومتیں آپس میں صلاح مشورے سے کریں۔ گویا فلسطینیوں کا پتا نہایت صفائی سے کاٹ دیا گیا۔

مملکت کے سیاق و سباق میں تو پیں زیادہ سے زیادہ اس تشدد کی اجارہ داری کو، جو مملکت کی تحویل میں تھی، للکار سکتی تھیں، اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں، اور ان کی للکار صرف اس بنا پر تھی کہ وہ ایک مملکت کے اندر اپنے فلسطینی مفادات کا، جو ادارے کی صورت اختیار کر چکے تھے، تحفظ کرنا چاہتے تھے۔ تاہم اگر طرف فلسطینی اردنی دلدل کی کیچڑ میں لتھڑ گئے تاہم دوسری طرف اس عمل نے ان میں آزادی کی زبردست تڑپ بھی پیدا کر دی۔ کیونکہ اگر فلسطینی تحریک محض مسلح جدوجہد اور عوامی جنگ کے فلسفے سے ہی عبارت ہوتی تو تحریک کا وہیں بولو رام ہو جاتا اور اس کی قوت وہیں دم توڑ دیتی۔ لیکن یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ ایسا کیوں نہیں ہوا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ فلسطینی جو ''خواب'' دیکھتے ہیں اور جسے میں نے ایک جگہ ''فلسطینی تصور'' بھی کہا ہے، تو یہ خواب اور اس سے وابستہ اقدار عارضی باہمی عرب مناقشات سے بھی اور خونریز باہمی عرب تشدد سے بھی بہت ماورا ہے۔ فلسطین میں جس سیکولر، جمہوری مملکت کے قیام کی سب سے پہلے تنظیمِ آزادیٔ فلسطین نے وکالت کی تھی، وہ اس بات کی علامت تھی کہ تحریک صحیح معنوں میں ایک نیا اور انوکھا تصور پیش کر رہی ہے اور وہ انقلابی قوت سے بھی لیس ہے۔ چنانچہ اس تصور نے ایک ایسے علاقے میں، جو ابھی تک ہر قسم کی رجعت پسندیوں اور ظلم و جبر کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا، ان تمام جمہوری اقدار کو، جو اس (تصور) میں مضمر تھیں، آگے بڑھایا۔ اس تصور نے ایک اور کام جو کیا، وہ یہ تھا کہ اس نے محض یہ خواب نہیں دکھایا کہ اپنا مقصد تبھی حاصل ہو سکتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ ہتھیاروں کی نمائش کی جائے یا تاریخ سے غصیلا انتقام لیا جائے بلکہ اس (تصور) نے اس سے کہیں زیادہ کی امید دلائی۔

چنانچہ کرامہ میں جو کچھ ہوا تھا، اس کے بعد فلسطینی تحریک باری باری دو پلڑوں کے مابین گھومتی رہی۔ کبھی تو وہ انقلاب کے خواب دیکھنے لگتی اور کبھی ایسی چالیں سوچنے لگتی جن سے عملی طور پر قومی مقاصد کے حصول میں مدد مل سکتی تھی۔ مجموعی طور پر فوجی پسپائیوں کے ایک (پورے) سلسلے کے باوجود جو اپنے نقطۂ عروج پر اس وقت پہنچیں جب تنظیمِ آزادیٔ فلسطین کو اردن سے زبردستی نکال دیا گیا، تنظیم اپنے دفاتر، کارکنوں، فدائیوں اور حمایتیوں کے کامل حسابی مجموعے سے کہیں زیادہ طاقتور ہو کر ابھری۔ تحریک کے مغربی تجزیہ نگار باقاعدگی کے ساتھ جن باتوں کی غلط تعبیر کرتے چلے آ رہے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ تنظیم کو اپنی مقبولیت، یا حمایتی، بلکہ رضا کار بھی، جو اس کی صفوں میں شامل ہوتے چلے آ رہے ہیں، اس لیے حاصل نہیں ہوئے کیونکہ یہ دُنیا کو دہشت گردی کے ذریعے مرعوب کرنے کے لیے ایک ''اختراع'' تھی، اگرچہ اس کے منہ پر غازہ مل دیا گیا تھا۔ [1] اس کے برعکس

[1] یہ بات اخبارات پر صادق آتی ہے لیکن فلسطین کے متعلق امریکا میں جو معیاری یا نیم سرکاری مطبوعات شائع ہوتی ہیں،……

تنظیم جن چیزوں کی نمائندگی کرتی تھی، وہ فلسطینیوں کے ایک عمومی اتفاقِ رائے (اجماع) (جہاں تک فلسطینی تاریخ اور امنگوں کا تعلق ہے، فلسطینی اتفاق رائے سے ان کے بارے میں بہت حساس ہیں) کا بروئے کار آنا ہے۔ اگر تنظیمِ آزادیٔ فلسطین اپنی مجموعی کارکردگی کے اعتبار سے بعض اوقات افراتفری اور بدنظمی کا شکار نظر آتی ہے تو اس کی جزوی وجہ بھی یہ ہے کہ اسے مختلف الخیال فلسطینیوں کو جبری طور پر اپنے ساتھ ملا لینے کا غیر معمولی ملکہ حاصل ہے۔ تنظیمِ آزادیٔ فلسطین کے اندر جو مختلف دھڑے بندیاں...... پاپولر فرنٹ، ڈیموکریٹک فرنٹ اور دوسرے گروپ...... موجود ہیں، وہ یقیناً خیالات کے فلسطینی (نیز دوسرے عرب) دھاروں سے متاثر ہوئے اور اپنی باری پر خود انھوں نے دوسروں کو متاثر کیا۔ لیکن جہاں تک خود تنظیم کا تعلق ہے، اس کا عمیق اور دیرپا جواز مستقل طور پر اپنی جگہ قائم رہا اور کسی میں اتنا حوصلہ نہیں کہ اسے ایک ناجائز جماعت قرار دے سکے اور سچی بات یہ ہے کہ 1974ء کے بعد اس کی حمایت اور بھی مستحکم بنیادوں پر قائم ہوگئی۔

اس کی جو بھی وجوہ ہوں، انھیں آسان بنا کر پیش نہیں کیا جاسکتا۔ اقدار، خیالات، کھلے عام بحث مباحثوں اور انقلابی ابتکاری (INITIATIVE) کے عناصر جس وافر مقدار میں تنظیمِ آزادیٔ فلسطین میں موجود ہیں، میں ذاتی طور پر ان سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ یہ وہ غیر مرئی انسانی اثاثے ہیں جن کا کردار اس کردار سے کہیں زیادہ ہے جو ایک عام جنگجو پارٹی ادا کر پاتی ہے۔ ایک عام جنگجو پارٹی کے ارکان میں اپنے پارٹی کے ساتھ وہ وفاداری نہیں ہوتی جو تنظیم کے ارکان میں تنظیم کے ساتھ ہے اور اس کی وجہ بھی انھی غیر مرئی انسانی اثاثوں کا اتنی وافر مقدار میں موجود ہونا ہے۔ تنظیمِ آزادیٔ فلسطین کے اندر جس فلسطینی نوکر شاہی (بیوروکریسی) نے فروغ پایا ہے، وہ بھی ان غیر مرئی انسانی اثاثوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔ ذرا غور فرمائیں کہ اس بات کو کوئی زیادہ مدت نہیں گزری بلکہ یوں کہیں کہ 1960ء کے عشرے کے اواخر تک فلسطینی اپنی زندگیاں کامل طور پر اس ڈھانچے کے اندر گزار رہے تھے جو عرب مملکتوں نے ان کے لیے مرتب کیا تھا۔ دس سال کے اندر اندر فلسطینی تنظیموں کا حیرت انگیز حد تک فعال جھرمٹ وجود میں آگیا اور ایک لحاظ سے یہ سبھی کی سبھی، تنظیمِ آزادیٔ فلسطین کے، جو اتفاقِ رائے کے معاملے میں بہت حساس ہے، زیرِ انتظام مصروفِ عمل تھیں۔ بیشمار طلبہ تنظیمیں، خواتین کے ادارے، محنت کشوں کی انجمنیں، درسگاہیں، فوجی تنظیموں کے سابق ارکان کی دیکھ بھال کرنے اور انھیں امداد بہم پہنچانے کے پیچیدہ پروگرام، طبی مراکز، رسد پہنچانے کا پورا نظام

......ان میں بھی ان انسانی عناصر کا جو تنظیم کے لیے حمایت اکٹھی کرتے ہیں۔ خاص خیال نہیں رکھا جاتا۔ تفصیل کے لیے فواد جبار اور اس کے ساتھیوں کی مرتب کتاب "فلسطینی قوم پرستی کی سیاست"، مطبوعہ کیلیفورنیا پریس برکلے کا مطالعہ فرمائیں۔

موجود ہے۔ یہ فہرست مکمل نہیں ہے بلکہ اس میں مزید اضافہ ہوسکتا ہے اوراس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ جوں جوں فلسطینیوں کی زیادہ سے زیادہ ضروریات پر توجہ دی جانے لگی ہے، ان تنظیموں اور پروگراموں کو بہتر سے بہتر بنایا جارہا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ تنظیم آزادیٔ فلسطین کا کردار یہ ہے کہ وہ فلسطینیوں کی اس انداز سے نمائندگی کرتی ہے کہ کوئی دوسری تنظیم اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ (یہاں بھی تنظیم آناً فاناً ہر فلسطینی کے لیے، خواہ وہ کہیں بھی ہو، اپنی صفوں میں جگہ بنالیتی ہے اور یہ اس کا سب سے بڑا کارنامہ ہے) اس کا دوسرا کام یہ ہے کہ اپنی پالیسیوں یا اپنی قیادت کی تمام خامیوں کے باوجود فلسطینی مقاصد کو زندہ رکھا جائے اور یہ مقاصد عبوری تنظیموں یا پالیسیوں سے کہیں عظیم تر ہیں۔

یہاں دو اور عناصر کا ذکر بھی ضروری ہے۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی اس حد تک زیرِ بحث نہیں لایا گیا جس کے وہ مستحق ہیں۔ ان میں سے پہلی بات یہ ہے کہ فلسطین کے بڑے بڑے رہنماؤں نے فلسطین کے (انسانی اور دیگر) وسائل کی عام طور پر نہایت کامیابی کے ساتھ نگہداشت بھی کی اور ان کا نہایت احسن لیکن کفایت شعارانہ انداز سے انتظام بھی کیا۔ ان سب رہنماؤں کے شیخ یاسر خیل یاسر عرفات ہیں۔ یاسر عرفات ایک ایسی سیاسی شخصیت ہیں جنھیں اکثر اوقات غلط سمجھا گیا اوران کی ذات پر خواہ مخواہ کیچڑ اچھالا گیا۔ میرے خیال میں یاسر عرفات کے متعلق یہ کہنا بدتمیزی یا گستاخی نہیں ہوگا کہ وہ پہلے فلسطینی قائد ہیں جنھوں نے دو مکمل طور پر انتہائی ضروری کام سرانجام دیے۔

(1) انھوں نے ان تمام بڑے بڑے عناصر کا، جو فلسطینی کو کہیں بھی متاثر کرتے ہیں (مثلاً فلسطینیوں کے باہمی مسائل، عرب اور علاقائی امور، بین الاقوامی حالات و واقعات وغیرہ) بڑی ذہانت کے ساتھ ادراک کیا ہے۔

(2) انھوں نے فلسطینی زندگی کی جزئیات پر بھی اتنا ہی حیرت انگیز عبور حاصل کیا ہے یہی وہ باتیں ہیں جنھوں نے انھیں اتنی مہارت کے ساتھ اتنے طویل عرصے تک مرکزی مقام سنبھالنے میں مدد دی ہے۔ برطانوی انتداب کے زمانے میں ایک قسم کی قیادت موجود تو تھی لیکن یہ عوام الناس کے دلوں میں گھر نہیں کرسکی تھی کیونکہ اس قیادت کی جڑیں عوام میں نہیں تھیں اور یہ بس چند اشخاص کے مابین گھومتی رہتی تھی اور غالباً جس چیز نے اس کے مؤثر ہونے میں سب سے بڑی رکاوٹ کھڑی کی، وہ یہ تھی کہ جو کچھ یہ کرتی تھی، اس کے لیے اسے نہ تو عام حمایت حاصل تھی اور نہ مرکزی طبقوں کی۔ چنانچہ یہ کوئی نیم سرکاری ذمے داری بھی نہیں سنبھال سکتی تھی۔ لیکن جہاں پرانی قیادت ناکام رہی، یاسر عرفات اور الفتح نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے۔ انھوں نے یہ کام جزئیات پر توجہ دے کر اور کل کے بارے میں حساس رویے کا مظاہرہ کرکے سرانجام دیا لیکن اس

کے ساتھ ہی انھوں نے کبھی اس بات کا عندیہ تک نہیں دیا کہ وہ اپنے رویے میں ظالمانہ حد تک متلون مزاج ہیں۔ دوسرا عنصر جس سے تجزیاتی طور پر نپٹنا بہت مشکل ہے۔ سرمایہ ہے، میں اس کا ذرا مختصر ساذکر کرتا ہوں۔

فلسطینیوں نے ایک مالی ادارہ، فلسطینی قومی فنڈ کے نام سے قائم کر رکھا ہے۔ جلاوطن فلسطینی اس ادارے کو باقاعدہ چندہ بھیجتے ہیں۔ تمام فلسطین اداروں (بشمول تنظیم آزادیٔ فلسطین) کی طرح یہ فنڈ بھی فلسطینی نیشنل کونسل (جو پارلیمانی یا قانون ساز ادارے کا فریضہ سرانجام دیتی ہے) کے سامنے جواب دہ ہے۔ نیشنل کونسل عمومی پالیسی طے کرتی ہے۔ اس پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کی ذمہ داری تنظیم آزادیٔ فلسطین اوراس کے مختلف ذیلی اداروں پر عائد ہوتی ہے۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ فلسطینی بجٹ اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ تقریباً دس لاکھ باشندوں کو خدمات اور رسد بہم پہنچانے، ان کی تربیت کرنے اور انھیں اسلحہ مہیا کرنے پر جو رقوم صرف ہوتی ہیں، وہ اس (بجٹ) کی بدولت نہایت احسن اور موثر طریقے سے مہیا ہو جاتی ہیں۔ کچھ سرمایہ تو ان رقوم کی وجہ سے مہیا ہو جاتا ہے جو فلسطینی باشندے رضا کارانہ طور پر دیتے ہیں، تاہم اس سرمائے میں اضافہ اس امداد سے، جو ہر سال گھٹتی بڑھتی رہتی ہے، ہو جاتا ہے جو مختلف عرب ممالک بشمول سعودی عرب، کویت اور تیل کی دولت سے مالا مال عرب ریاستیں، فراہم کرتی ہیں۔ مزید برآں، شام اور مصر کو اس امداد کی بنا پر جو یہ ممالک فراہم کرتے ہیں، فلسطینیوں کے معاملات میں اچھا خاصا دخل حاصل ہے۔ ویسے یہ دونوں ممالک جو امداد دیتے ہیں، وہ مادی اعتبار سے تو کوئی زیادہ نہیں ہوتی لیکن انھیں عرب ممالک میں جو اہمیت اور وقار حاصل ہے، اس سے یہ ضرور فائدہ اٹھاتے ہیں اور یوں ان کی حمایت فلسطینیوں کے لیے مفید ثابت ہوتی ہے۔ خیر ان تمام باتوں میں جو اصل نکتہ ہے، وہ یہ ہے کہ فلسطینیوں نے جس طرح تعلیمی میدان میں قابلِ قدر ترقی کی ہے، اسی طرح ان کی مالی پوزیشن اس دعوے کی تکذیب کرتی ہے کہ وہ علاقائی یا سیاسی اعتبار سے کسی خاص گھاٹے میں ہیں۔ تیسری دُنیا کی عوامی تحریکوں کا یہ جو کلاسیکی تجزیہ کیا جاتا ہے کہ وہ عوام کی مسلسل لاتعلقی ① اور غربت کو اپنا اصل اثاثہ بنا لیتی ہیں اور انھیں متواتر اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہیں، یہاں دم توڑ دیتا ہے۔ بے شک فلسطینی آبادی کا ایک خاصا بڑا حصہ ابھی تک مفلوک الحال ہے۔ لیکن ایک بہت بڑی اقلیت ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو تعلیم یافتہ ہیں اور انھیں ہر قسم کے وسائل پر دسترس حاصل ہے۔ یہ تناقض مسائل کو شدید ڈرامائی شکل دے دیتا ہے۔ چند مسائل مندرجہ ذیل ہیں:

① تیسری دُنیا کے عوام، جو غربت کی چکی میں پس رہے ہیں، عام طور پر حکومت اور مملکت کے مسائل و امور میں کم ہی دخل دیتے ہیں۔

اوّل: سماجی آدرشوں اور اداروں کے مابین جو اپنی فطرت کے اعتبار سے کم و بیش قدامت پسند ہیں، کشمکش جاری ہے۔

دوم: اس بات کا واضح امکان موجود ہے کہ عرب ممالک اپنے سیاسی امور طے کرنے کے لیے جن روایات کی پاسداری کرتے ہیں، وہ کھلم کھلا ان ترقّی پسند کمروں میں گتھم گتھا ہو جائیں گی جو اکثر فلسطینی نمو کو تحریک دیتی ہیں۔

سوم: اس بات کے آثار دکھائی دے رہے ہیں کہ فلسطینی بورژوا[1] ذہنیت اختیار کرلیں اور یہ بات بڑی خطرناک ہوگی۔ تاہم اس بارے میں یہ استدلال کیا جاسکتا ہے کہ اگر یہ صورتِ حال پیدا ہوئی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ فلسطینیوں کے مابین یہ صحت مند طریقے سے طبقاتی کشمکش کا موجب بن جائے گی اور بہ تدریج اس کشمکش میں اس حد تک اضافہ ہو جائے گا کہ انجام کار یہ محنت کش طبقے کی فتح پر منتج ہو۔ یوں یہ انقلاب کے لیے بہت اچھی صورت ہوگی۔

تاہم یہ استدلال سارے اہم معاملے کے اس پہلو سے کنی کترا جاتا ہے کہ جلاوطنی کے دوران میں باہمی طور پر ہلاکت آفرین کشمکش کا مطلب کیا ہے۔ جب تک فلسطینی قومی حقِ خودارادیت کے حصول کی تلاش میں سرگرداں ہیں، ہر وہ چیز جو اس تلاش کا رخ کسی اور طرف پھیر دے گی، منفعت بخش ہونے کے بجائے غالباً نقصان رساں زیادہ ہوگی۔ دوسری طرف فلسطینی تلاش کی یہ جو قدامت پسندانہ تعبیر کی جاتی ہے، کہ ہم سب اسی حالت کی طرف لوٹ سکیں گے، جس کا 1948ء میں چلن تھا، ہمیں ہماری املاک مل جائیں گی، ہمارا ملک پھر سے ایک عرب ملک بن جائے گا اور غالباً ہم پر حکومت بھی مستبد اور جابر عرب حکمرانوں کی قائم ہو جائے گی، تو یہ تعبیر بھی تاریخی اور اخلاقی دونوں اعتبار سے ناقابلِ قبول ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ فلسطینی صرف انھی چیزوں کی تلاش میں ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ ان کے منہ پر چپت مار رہے ہیں اور انھوں نے جو خواب دیکھا تھا، اسے آپ جھٹلا رہے ہیں حالانکہ یہ وہی خواب ہے جس نے ملک ملک کے انسانوں کو، جو ناانصافی کے نخچیر ہیں، اپنی طرف متوجّہ کیا ہے اور انھیں امید کی کرن دکھائی ہے۔ تاہم ناخوشگوار صداقت یہی ہے کہ جلاوطنی کے دوران میں جب املاک اور کامرانیوں کے انبار لگ جاتے ہیں، تو انسانوں کے نقطۂ نظر

---

[1] عام معنوں میں ملک کا درمیانہ طبقہ بورژوا طبقہ کہلاتا ہے، تاہم مارکس کے نظریات کے مطابق املاک اور سرمائے کے مالک بورژوا طبقے میں شمار ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ طبقہ محنت کشوں (پرولتاری طبقہ) کے طبقے کا مخالف طبقہ ٹھہرا۔ اس طبقے کا قلع قمع کرنے کے بعد ہی کسی ملک میں پرولتاری حکومت قائم ہو سکتی ہے۔

میں تبدیلی واقع ہونے لگتی ہے اور مستقبل کے بارے میں ان کے تصورات پر رجعت قہقری کی چھاپ گہری ہونے لگتی ہے۔ چنانچہ مسئلہ یہ ہے کہ عرب فقید المثال دولت (اور ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو انھیں یہ دولت ناگزیر طور پر ملنا ہی تھی) کے جس دور میں سے گزر رہے ہیں، ہمیں اس کی افادیت کو تسلیم کر لینا چاہیے لیکن اس کے ساتھ ہی اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ یہ دولت اپنے ہمراہ جو ممکنہ بدعنوانیاں لے کر آتی ہے، ہم ان کے دامِ فریب میں نہ آئیں۔

نقطۂ نظر یا مقصد اگر انتہا پسندانہ ہو، تو وہ جلاوطنوں کا شیرازہ بکھیر سکتا ہے، قوم میں تقطیب[1] پیدا کر سکتا ہے اور یوں اسے مفلوج بنا سکتا ہے۔ تاہم فلسطینیوں نے ان انتہا پسندیوں کا مداوا اپنے داخلی رشتوں میں ڈھونڈ لیا ہے اور انھی داخلی رشتوں نے انھیں متحد کر رکھا ہے۔ انتہائی طور پر کامیاب جو بورژوازیوں پر بھی جلاوطنی اثر انداز ہوتی ہے اور ہمیں اس اثراندازی کی اہمیت کو کبھی کم سے کم بنا کر پیش نہیں کرنا چاہیے۔ مزید برآں 1967ء کے بعد کی ٹھوس تاریخ نے (فلسطینی) قوم کی اتنے ہی مؤثر انداز سے شیرازہ بندی کر رکھی ہے جتنی کہ اس صدی کے اوائل سے اس میں (کم از کم روحانی طور پر) موجود تھی۔ 1967ء کی تباہ کن شکست کے بعد یہ بات بالکل واضح ہوگئی اور اس سے نظریں چرائی نہیں جاسکتیں کہ عرب ممالک اسرائیل کے ساتھ اپنے تنازعے کو فوجی طور پر طے نہیں کر سکتے چنانچہ اب سیاسی تصفیے پر خصوصی زور دیا جانے لگا۔ اس خطے میں امریکی اثر و رسوخ کا جو ڈرامائی احیا ہوا ہے، اس کی جزوی وجہ بھی یہی تھی۔ 1970ء میں اپنے انتقال سے قبل خود جمال عبدالناصر نے اپنی سوچ میں نظریاتی تبدیلی پیدا کر لی تھی۔ پہلے ان کا زورِ بیان عرب اتحاد اور حصولِ آزادی کے لیے استعمار کے خلاف جدوجہد پر صرف ہوتا تھا۔ اب وہ امریکا کے ساتھ سیاسی مصالحت کی گنجائش نکالنے، خطے کی ہر مملکت کی سالمیت کا احترام کرنے اور محدود سیاسی مقاصد کے حصول کی باتیں کرنے لگے۔ یہ تمام باتیں اس چیز کا عندیہ دیتی تھیں کہ وہ اسرائیل کو تسلیم کرنے کے لیے (ذہنی طور پر) تیار ہوگئے تھے (حالانکہ ایک زمانے میں وہ اسرائیل کو تسلیم کرنے سے سختی سے انکار کرتے تھے) پالیسی میں اس تبدیلی کے جو اثرات فلسطینیوں پر مرتب ہوئے، ان میں 71-1970ء کا اردنی اور 1975ء، 1976ء کا لبنانی بحران شامل ہے۔

میرے خیال کے مطابق یہ کہنا جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا، کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہوگا کہ یہ

---

① تقطیب (Polarization): جب دو فریقین کا نقطۂ نظر اور مؤقف ایک دوسرے کے بالکل معکوس ہو اور ان میں سمجھوتے کا کوئی امکان نہ ہو، تو اس صورتِ حال کو تقطیب کہا جائے گا۔

دونوں بحران جن میں بے شمار انسانی جانوں کا اتلاف ہوا، ناگزیر تھے، لیکن جس طرح یہ بحران خود ناگزیر تھے۔ ان کا یہ ناگزیر نتیجہ جو بظاہر متناقض نظر آتا ہے، نکلا کہ تنظیم آزادیٔ فلسطین کے اختیار اور وقار میں بہت اضافہ 1974ء میں مراکش کے شہر رباط میں اسلامی ممالک کی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کے ایک فیصلے کی رو سے تنظیم آزادی فلسطین کو فلسطینی عوام کی واحد جائز نمائندہ جماعت تسلیم کر لیا گیا۔ حقیقتاً کانفرنس کا یہ فیصلہ اس تصادم کا رہینِ منّت تھا جو 71-1970ء میں فلسطینیوں اور اردنیوں کے مابین ہوا تھا۔ پھر لبنان میں جو آتشِ عظیم بھڑکی، اس کا ایک نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ فلسطینی قوم کے تمام گروہ (جس میں وہ گروہ بھی شامل ہیں جو اسرائیل اور مقبوضہ علاقوں میں مقیم ہیں) تنظیم آزادیٔ فلسطین کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ چنانچہ جس بات کی توقع تھی، وہی ہو کر رہی، اردن اور لبنان دونوں ممالک میں...... مخصوص حالات خواہ کتنے ہی مختلف کیوں نہ تھے...... فلسطینیوں کو اس لیے حملوں کا نشانہ بنایا گیا کہ وہ اپنے وطن سے باہر دوسرے ممالک میں قیام پذیر تھے اور یوں دونوں ممالک میں مختلف انداز سے فلسطینیوں کی امنگوں کی، جو محدود ہی سہی، تصدیق ہو گئی۔ ایک مرتبہ پھر ہمیں اس شدید ضرورت کا احساس ہونے لگتا ہے کہ فلسطینی شناخت کی کوئی قابلِ عمل اور کام چلاؤ تعریف ہونا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہمیں ہی اس شدید ضرورت اور سرعت سے تبدیل ہونے والے سیاسی حقائق کے متعلق فلسطینیوں کے ردِعمل کا بھی اندازہ ہونے لگتا ہے۔

اردن اور لبنان میں جو دو عظیم بحران رُونما ہوئے، ان کے مابین 1973ء کی جنگ آ گئی۔ گویا کہ سیاسی مصالحت کے تصور کو شدید بنانے کا یہ اس کا اپنا انداز تھا حالانکہ دو سال قبل راجرز منصوبہ اور جارنگ (Jarring) مشن[1] دونوں بہت بری طرح ناکام رہے تھے۔ صدر سادات نے واضح اور شامیوں اور اردنیوں نے ذرا کم واضح انداز سے جو کچھ 1971ء میں پیش کیا تھا۔

وہ وہی کچھ تھا جو صدر سادات نے 1973ء میں پیش کیا تھا۔ پھر 1977ء میں جب صدر سادات نے بیت المقدس کا دورہ کیا تھا تو وہ وہاں بھی یہی کچھ پیش کرتے نظر آتے تھے۔ ان تمام پیش کشوں کا لب لباب یہ تھا کہ عرب ممالک اسرائیل کے ساتھ صلح کر لیں گے بشرطیکہ اسرائیل مقبوضہ علاقوں کو کسی اگر مگر کے بغیر مکمل طور پر خالی کر دے اور وہاں ایک فلسطینی ریاست کا قیام عمل میں لایا جائے۔ خاصی بڑی حد تک خود فلسطینیوں کا مؤقف بھی اس پیش کش کے مطابق ہو چکا تھا۔ فلسطینیوں کی قومی کونسل نے اپنے اجلاس منعقدہ 1975ء

---

① اقوام متحدہ نے سلامتی کونسل کی قرارداد نمبر 242 کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سویڈن کے سفیر گنار جارنگ کو اپنا نمائندہ مقرر کیا تھا لیکن کئی سالوں کی کوشش کے باوجود ان کا مشن کامیاب نہ ہو سکا اور یوں اسے ختم کرنا پڑا۔

اوراس سے بھی زیادہ مثبت طور پر اپنے اجلاس منعقدہ 1977ء میں اس عزم کا اظہار کر دیا تھا کہ وہ ایک فلسطینی ریاست کے قیام کے حق میں ہے (اگرچہ ایک مختصر اقلیت بڑے جذباتی انداز سے یہ استدلال کر رہی تھی کہ فلسطینیوں کو سارے فلسطین کو آزاد کرانے کی جدوجہد جاری رکھنا چاہیے)۔ میرے خیال میں انجامِ کار تنظیم آزادیٔ فلسطین کو جس چیز نے متاثر کیا، وہ اس کے درمیانہ قوم پرستانہ رویے کی تائید وحمایت کرنے والوں کا ایک نیا اور مضبوط گڑھ تھا جو غزہ اور مغربی کنارے پر مشتمل تھا۔ یہاں کے باشندوں نے اسرائیل کی جابرانہ حکمرانی کے تقریباً دس سال بعد 1976ء کے میونسپل انتخابات میں بڑی واضح اکثریت سے تنظیم آزادیٔ فلسطین کو اپنی نمائندہ جماعت قرار دیا تھا۔ اس کے علاوہ اندرونِ اسرائیل فلسطینیوں نے بھی تقریباً اسی انداز سے تنظیم آزادیٔ فلسطین کا خیر مقدم کیا تھا۔ (اپنی کشمکش کی تاریخ کے عین مطابق) انھوں نے اس مقصد کے لیے ''یوم الارض'' کا انتخاب کیا جو تیس مارچ 1976ء کو منایا گیا۔ چنانچہ اس وقت سے لے کر اب تک وہ فلسطینی تنظیم (آزادیٔ فلسطین) کی حمایت میں درجنوں اعلانات اور مظاہرے کر چکے ہیں۔ کسی فلسطینی سیاسی جماعت کو نہ تو کبھی اتنا مرکزی مقام حاصل ہوا ہے اور نہ وہ کبھی اتنی مضبوط دکھائی دی ہے جتنی کہ تنظیم نظر آتی ہے۔ فلسطینی اور تنظیم ایک دوسرے کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر چل رہے ہیں۔

④

فلسطینی ابھی تک سوالیہ نشان بنے ہوئے ہیں

تاہم فلسطینیوں کی اساسی مشکل علیٰ حالہٖ قائم ہے اور تاریخ نے اس مشکل کے اردگرد اپنی ستم ظریفوں کا سنگین حصار نہ صرف مستحکم تر بنا دیا ہے بلکہ ان ستم ظریفوں کا انبار بھی لگا دیا ہے۔ میں بار بار اس بات کی تکرار کرتا چلا آیا ہوں کہ مقدر نے فلسطینی کو عجیب وغریب نوعیت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر رکھا ہے اور یہ بات تکلیف دہ حد تک کبھی بھی اتنی درست نہیں تھی جتنی کہ اس وقت ہے۔ جس زمانے میں صیہونیت فلسطین کے استعماری تصفیے میں مصروف تھی، اسے وہاں اپنی موجودگی کی سزا مل رہی تھی اور اب جبکہ اسے وہاں سے نکالا جا چکا ہے، وہ فلسطین سے اپنی عدم موجودگی کی سزا بھگت رہا ہے وہ لوگ جو فلسطین چھوڑ گئے ہیں، آوارۂ وطن ہیں، صحیح معنوں میں ان کی نہ کوئی قوم ہے اور نہ ان کا کوئی علاقہ ہے۔ وہ لوگ جو اسرائیل میں موجود ہیں، وہ ستم گزیدہ ہی نہیں، لاشے بھی بن چکے ہیں۔ ان دونوں ہی حیثیتوں سے انھیں مشرقِ وسطیٰ کا مرکزی یا بطونی نکتہ تصور کیا جاتا ہے۔ 1974ء میں اقوامِ متحدہ میں ایک سو سے زائد اقوام نے تنظیم آزادیٔ فلسطین کو فلسطینیوں کے ساتھ نہایت گہرا تعلق ہے، نہ صرف یہ کہ وہ تنظیم کو فلسطینیوں کی نمائندہ جماعت تسلیم نہیں کرتیں، بلکہ وہ تو فلسطینیوں کی شناخت ہی کو ماننے سے انکاری ہیں۔ ان کے خیال میں اس قسم کی کوئی چیز موجود نہیں۔ جب ایک طرف تو یہ کیفیت ہے کہ فلسطینیوں کی بنیادی قومی اور جائز شناخت کا اقرار تک نہیں کیا جاتا حالانکہ بین الاقوامی طور پر ہر معاشرے کے متعلق یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ اس کی ایک شناخت ہے۔ لیکن دوسری طرف

یہ عالم ہے کہ فلسطینی شہرت ونمود، کامیابی اور ترقی ونمو کی جس سطح پر، جو ہر شخص کو نظر آرہی ہے، زندگی گزار رہے ہیں وہ انھیں تاریخ میں کبھی حاصل نہیں رہی اس کے علاوہ تنظیم آزادی فلسطین کے ذریعے سیاسی طور پر ان کا اپنے ہم وطنوں سے جو اتحاد ہوا ہے، وہ اس سے پہلے کبھی اتنا نہیں ہوا تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود وہ آبادی کے اعتبار سے بھی اور جغرافیائی طور پر بھی، جس طرح تتر بتر ہوئے ہیں اور اس طرح تتر بتر ہونے کی وجہ سے جو رکاوٹ پیدا ہوئی ہے، اس کو عبور کرنا شدید طور پر کبھی اتنا مشکل نظر نہیں آیا جتنا کہ اب نظر آرہا ہے۔

لیکن جن تناقضات اور ستم ظریفوں نے اس کا احاطہ کر رکھا ہے، وہ بھی کم سنگین نہیں۔ غور فرمائیں کہ 1967ء اور 1973ء کی جنگوں کے بعد عرب دُنیا اسرائیل کے ساتھ امن چین سے رہنے کے تصور کے قرب آتی جارہی ہے لیکن اسی دوران میں عربوں نے جو ایک دوسرے کا کشت وخون کیا ہے، اتنا اس سے قبل کبھی نہیں ہوا تھا۔ فلسطینی مقصد کو ہر عرب حکومت کی ترجیحات میں بلند ترین مقام حاصل ہے لیکن انھی عرب حکومتوں کے ہاتھوں جن فلسطینیوں کا خون ہوا ہے، ان کی تعداد خوفناک حد تک زیادہ ہے۔ یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ اس علاقے میں دونوں عظیم طاقتوں (سپر پاورز) کے مابین مساوات موجود ہے۔ کم ازکم یہ مساوات اس حد تک ضرور موجود ہے کہ اس کے بل بوتے پر دُنیا میں امن قائم ہے۔ مثال کے طور پر، امریکا اور سوویت یونین امن کانفرنس کے شریک چیئرمین ہیں حالانکہ جہاں تک اس علاقے میں اسلحہ کی فراہمی کا تعلق ہے، مؤخرالذکر صرف اتنے ہتھیار بہم پہنچاتا ہے جن سے وصول کنندہ کی ضروریات بمشکل پوری ہوسکتی ہیں لیکن جہاں تک اوّل الذکر کا تعلق ہے، وہ اس معاملے میں پوری طرح چھایا ہوا ہے اور کوئی اس کا بال تک بیکا نہیں کرسکتا۔ کل عالم کو یہ بتایا جارہا ہے کہ فلسطینیوں کو امن کی کارروائی میں شریک کیا جانا چاہیے، لیکن اگر آپ کسی ایسے فلسطینی کی تلاش میں ہوں، جسے اس قسم کی کارروائیوں میں شریک کیا گیا ہو آپ لاکھ کوشش کریں، آپ کو ایک شخص (فلسطینی) بھی ایسا نہیں ملے گا۔ اس کے بجائے آپ کیا دیکھیں گے کہ مصری، امریکی، اسرائیلی یا دوسری قوموں کے رہنما فلسطینیوں کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ یہی لوگ ان (فلسطینیوں) کے مقاصد کا تعین کرتے ہیں اور وہی انھیں بتاتے ہیں کہ بین الاقوامی امور میں انھیں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ فطری طور پر فلسطینیوں کے لیے تمام در وا ہیں لیکن عملاً ایک بھی نہیں۔ اس تضاد کی ایک ٹھوس مثال دیکھنا ہو تو پھر ہمیں فلسطینیوں اور مشرقِ وسطیٰ کے بارے میں امریکا کے عمومی اور حالیہ ردعمل پر غور کرنا ہوگا۔

1974ء اور 1975ء میں صحرائے سینا کے متعلق جو معاہدے ① طے ہوئے ان کے بعد کے مہینوں کے

---

① یہ معاہدے امریکا کے سابق وزیر خارجہ ہنری کسنجر کی کوششوں سے اسرائیل اور مصر کے مابین طے پائے تھے۔......

دوران میں امریکا کے اس وقت کے (یہودی) وزیر خارجہ ہنری کسنجر نے جو پالیسی وضع کی، اس میں زور اس بات پر دیا جاتا تھا کہ تمام فریقوں کو آپس میں گفتگو کرنا چاہیے اور مختلف امور کو نپٹانے کے لیے تدریجی طریقے اختیار کیا جائے۔ اس پالیسی کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ یہ عرب اتحاد کی عظیم، لیکن اکثر و بیشتر التباسی، تعمیرات کو تو دیمک کی طرح چاٹ گئی لیکن ناعاقبت اندیشانہ انداز سے ان رکاوٹوں کو، جنھوں نے علاقے کی مملکتوں کو ایک دوسرے سے الگ تھلگ کر رکھا ہے اور جنھیں نہایت اہتمام کے ساتھ برقرار رکھا جاتا ہے، علیٰ حالہٖ قائم رکھنے پر توجہ مرکوز کر دی۔

شاید ہی کوئی تبصرہ نگار ایسا ہوگا جس نے اس بات کی طرف دھیان دیا ہوگا کہ اس علاقے کے متعلق امریکی سوچ بچار جس نہج پر کام کر رہی ہے اور جس کا انکشاف اسرائیل، مصر اور شام کے مابین 1975ء کے عبوری معاہدوں میں ہوا تھا، اس کا رخ نہ تو ماضی کی طرف ہے اور نہ مستقبل کی طرف بلکہ سارا زور محض اس بات پر دیا جاتا ہے کہ صرف زمانۂ حال کے متعلق غور و فکر کیا جانا چاہیے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیں کہ امریکی پالیسی صرف موجودہ صورتِ حال (Status Quo) کو برقرار رکھنا چاہتی ہے (حالانکہ تاریخ اس بات کی نفی کرتی ہے۔ جس کسی نے بھی اور جہاں بھی صورتِ حال کو جوں کا توں برقرار رکھنے کی کوشش کی، کوشش کی گئی، سوائے ناکامی کے کچھ ہاتھ نہ آیا) پالیسی کے اس میلان کا، جس کا نقطۂ عروج کیمپ ڈیوڈ کا معاہدہ تھا۔ نچوڑ یہ ہے کہ اس نے سیاسی توجہ اور اہمیت کی اکائی سکیڑ دی۔ بجائے اس کے کہ معاملات کا جائزہ ان کی حرکی کلیت میں رکھ کر لیا جاتا، امریکا نے علاقے کی حکومتوں کی کچھ اس طرح حوصلہ افزائی کی کہ وہ معاملات پر اپنی علیحدہ علیحدہ حیثیت سے ہی غور کریں اور اس سے آگے ایک قدم بھی نہ بڑھائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف امور میں جو تسلسل پایا جاتا ہے اور انسانی زندگی میں جو اتصاق [1] موجود ہوتا ہے، وہ اچانک ختم ہو گیا۔ مختلف ممالک کے مابین ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہنے والے مختلف فرقوں اور طبقوں کے مابین جو تعلقات ہوتے ہیں اور اسی طرح زمانہ حال کے مسائل کا ماضی اور مستقبل کے مسائل کے ساتھ جو رشتہ ہوتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کو باطل اور کالعدم قرار دے دیا گیا تھا۔ یوں دکھائی دیتا ہے کہ اصل بات جسے اہمیت دی گئی تھی وہ بس یہ تھی کہ ہنری کسنجر کی طرح کی کوئی گشتی امریکی شخصیت جسے مختلف فریقوں اور گروہوں

……ان معاہدوں کی رو سے اسرائیل نے صحرائے سینا کا بیشتر حصہ خالی کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا تھا۔ اس کے معاوضے میں مصر نے کئی سیاسی مراعات دینے کا وعدہ کیا ہے۔

[1] اتصاق (Coherence) ہم آہنگی: مختلف اجزا کو سلیقے کے ساتھ یا منطقی انداز سے ایک دوسرے کے ساتھ جوڑنے یا منسلک کرنے کا عمل تاکہ ایک مکمل چیز وجود میں آسکے۔

کے مابین سمجھوتے کرانے میں مہارت حاصل ہو، آئے گی اور ''سمجھوتوں'' کو ایک لڑی میں پرو دے گی۔ مختلف ملکوں، قوموں اور اداروں کے مابین بیچ بچاؤ کرانے اور ثالثی کے فرائض سرانجام دینے کا فریضہ امریکا نے خود سنبھال لیا۔ مختلف ممالک اور اقوام کے مابین جو علاقائی تعاون ہونا چاہیے، اس کو نظرانداز کر دیا گیا اور اس کی جگہ امریکا نے اپنے مفادات کو آگے کر دیا اور یوں اپنے نقطۂ نظر کو دوسروں پر ٹھونسنے کی کوشش کرنے لگا۔

چنانچہ آج کل کے مشرقِ وسطیٰ میں مشترکہ مفادات کے متعلق جو رویہ اختیار کیا جا رہا ہے، اس کے مطابق ان مفادات کو ایک وسیع تر مربوط تناظر میں رکھ کر نہیں دیکھا جاتا (کہ علاقے کے تمام ممالک کی بھلائی کس بات میں ہے) بلکہ زیادہ زور محدود نوعیت کے دوطریقہ تعلقات پر دیا جانے لگا ہے اور یہ دوطرفہ تعلقات بھی اقلیتوں ...... اقلیتی حکومتوں، اقلیتوں کے چھوٹے چھوٹے طبقوں اور گروہوں...... کو ایک دوسرے کا اتحادی بنانے کے لیے استوار کیے یا کرائے جاتے ہیں تاکہ وہ اپنی بقا کا بندوبست کر سکیں۔ وہی طریقے جو کسی زمانے میں سلطنتِ عثمانیہ نے اپنائے تھے، دوبارہ مروّج کیے جا رہے ہیں اور سچی بات یہ ہے کہ اس سارے عمل میں صرف فلسطینیوں کو، جن کی حیثیت عام معنوں میں اب ایک قوم کی نہیں رہی اور اس لیے وہ دوسروں سے بہت مختلف نظر آتے ہیں، باہر رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یوں فلسطینی باشندوں کو بار بار اپنی جلاوطنی کی سزا بھگتنے کے لیے مجبور کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ لبنان جس مخمصے میں گرفتار ہے اور جس کا کوئی حل بھی نظر نہیں آتا، وہ اصل میں فلسطینیوں ہی کی قابلِ رحم حالت کی ایک ٹھوس شکل ہے چونکہ انھیں (فلسطینیوں) مختلف علاقوں اور ممالک میں منتشر کیا جا چکا ہے اور ان کے پاس کوئی ایسا خطۂ زمین بھی نہیں، جسے وہ اپنا کہہ سکیں، چنانچہ اس علاقے کے تمام ممالک ان کی بقا کو ایک ایسا مسئلہ تصور کرتے ہیں جو خود ان کی اپنی بقا کو متاثر کرتا ہے اور یوں ان کے لیے صورتِ حال کو سنگین تر بنا دیتا ہے۔

یہ بتانے کے لیے کہ فلسطینی کہاں پر موجود ہے اور یہ کہ اس کی بقا کا مسئلہ کیسے ترتیب دیا جا سکتا ہے، جو تصوری ① الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں (بلکہ وہ الفاظ بھی جو اس کی ذات اور شخصیت کا ذکر کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں) وہ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ایک ایسا مستعد کارگر لیکن فتوری ② نظام موجود ہے جس کے ذریعے اس کی موجودگی کو یوں پیش کیا جا سکتا ہے کہ موجودگی موجودگی نہیں رہتی بلکہ موجودگی کی محض ایک علامت بن جاتی ہے اور پھر اسی نظام کے ذریعے اس کی ضروریات، اس کی تاریخ، ثقافت اور سیاسی حقیقت کو ایسے الفاظ بنا کر پیش کیا جا سکتا ہے جنھیں انسان اپنی زبان سے ادا کرنے میں شرم محسوس کرے اور وہ یہ سمجھے کہ یہ تو بڑے غلیظ الفاظ ہیں۔ مغرب میں فلسطینیوں کو نہایت عجلت سے دہشت گردی کے ساتھ وابستہ

کر دیا جاتا ہے اور اس معاملے میں اسرائیل اس بات کا پورا اہتمام کرتا ہے کہ وہ اور دہشت گردی لازم وملزوم نظر آئیں۔ فلسطینیوں کا کوئی بھی فعل خواہ وہ انھوں نے تنگ آمد بجنگ آمد کی کیفیت میں ہی سرانجام دیا ہو، جب اپنے سیاق وسباق سے محروم کر دیا جائے، تو وہ سنگ دلانہ ارادۂ قتل نظر آنے لگتا ہے...... جیسا کہ میرے خیال کے مطابق انفرادی مہم جوئی کی بے شمار کارروائیاں (طیاروں اور انسانوں کا اغوا، وغیرہ) غیر متوازن، انجام کار اخلاق سے عاری اور بے منفعت تباہ کاری کے افعال تھے۔ تاہم ہمیں یہ بات فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ تنظیم آزادیٔ فلسطین 1970ء کے عشرے کے اوائل ہی سے دہشت گردی سے گریز کرتی بلکہ اس کی مذمت کرتی چلی آئی ہے۔ تاہم امریکا میں جس چیز کو نہایت رسوا کن اور اہانت آمیز انداز سے نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور ذرائع ابلاغ میں جس کا کوئی ذکر اذکار تک نہیں کیا جاتا، وہ یہ ہے کہ 1974ء میں ''معلوت'' کے مقام پر جو واقعہ پیش آیا یا ایسے ہی واقعات بعض دوسرے مقامات پر رُونما ہوئے، تو ان واقعات کے معرضِ ظہور میں آنے سے قبل اسرائیل جنوبی لبنان میں فلسطینی پناہ گزینوں کے کیمپوں پر نہایت تسلسل کے ساتھ ہفتوں نیپام بموں ③ کی بارش کرتا رہا تھا۔ ④ بعینہٖ اسرائیل، مغربی کنارے یا غزہ میں مختلف مقامات پر جو بم پھٹتے ہیں، تو کیوں پھٹتے ہیں؟ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان علاقوں پر اسرائیل نے ایک طویل مدت سے فوجی حکومت قائم رکھی ہے اور یہ فوجی حکومت آئے روز فلسطینیوں پر جبر کرتی ہے، انھیں چیرہ دستیوں اور ستم رانیوں کا نشانہ

---

① تصوری (Conceptual): جس کا تعلق کسی چیز کے ذہن میں تصور باندھنے یا خاکہ بنانے سے ہو۔

② فتوری (Aphasic): یہ لفظ (Aphasia) سے نکلا ہے، بعض اوقات انسان کا دماغ چوٹ لگنے سے یا کسی دوسری وجہ کی بنا پر اس حد تک ضعف کا شکار ہو جاتا ہے کہ انسان اپنے خیالات صحیح طور پر ادا نہیں کر پاتا یا کر پاتا بھی ہے تو صرف جزوی طور پر۔ یہاں ''فتور'' سے یہ مراد ہے کہ صیہونی اور ان کے حمایتی جان بوجھ کر الفاظ کو غلط معانی پہناتے ہیں یا انھیں غلیظ بنا کر پیش کرتے ہیں۔

③ نیپام بم: ایک قسم کا بم، جو جہاں گرتا ہے، وہاں آگ لگا دیتا ہے یہ بم مختلف قسم کے تیزابوں کی پٹرول کے ساتھ آمیزش کر کے بنائے جاتے ہیں۔

④ ایران، انڈونیشا کے صوبے مشرقی تیمور اور بعض دوسرے علاقوں میں جو کچھ ہوا، امریکی اخبارات ان کے متعلق منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے رہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یا تو وہ آزادانہ تحقیقات پر مائل نہیں تھے، یا وہ پریشان کن تاریخ کو نظر انداز کر دینا ہی بہتر سمجھتے تھے اور یا پھر وہ سرکاری پراپیگنڈے پر آمنا وصدقنا کہنے کے لیے آمادہ تھے۔ کولمبیا جرنلزم ریویو کی جلد نمبر 17 شمارہ نمبر 5 (جنوری، فروری 1979ء میں ولیم اے ڈور میں اور ایلسن اوسیڈ کا مضمون Reporting the Shah,s Way ملاحظہ فرمائیں۔ اسلام کے متعلق جو غلط بیانات شائع ہوتی ہیں، ان کے متعلق ایڈورڈ سعید کے مضمون Whose Islam کا مطالعہ فرمائیں، یہ مضمون ''نیویارک ٹائمز'' میں 29 جنوری 1979ء کو شائع ہوا تھا۔ (مصنف)

بناتی ہے اور وہ کون سا ظلم ہے، جو وہ ان پر نہیں ڈھاتی۔ ایسے میں فلسطینی بم نہ چلائیں تو اور کیا کریں۔ چنانچہ ان کے ان افعال کو اسرائیلی کارروائیوں کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ پھر ایک بات اور بھی ہے۔ صیہونیوں نے عربوں کے خلاف دوسرے یہودیوں کے خلاف، اقوامِ متحدہ کے کارندوں کے خلاف اور برطانوی باشندوں کے خلاف دہشت گردی کی کارروائیوں کے جو ریکارڈ قائم کیے ہیں، فلسطینی تاریخ تو ان کا عشر عشیر بھی پیش نہیں کرسکتی۔ مزید برآں، عرب ممالک کے داخلی معاملات میں صیہونیوں کے ملوث ہونے (اس کی تازہ ترین مثال لبنان ہے جہاں صیہونیوں نے اپنے مذموم کارروائیوں پر کسی قسم کی پردہ پوشی کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی بلکہ کھلے عام بیروت پر بھی چڑھائی کردی اور جنوبی لبنان پر تو ابھی تک اس کا قبضہ برقرار رہے)، فلسطینیوں پر اسرائیلیوں کے ظلم وستم ڈھانے، مملکت کی رضامندی سے دوسروں کو اذیتیں پہنچانے اور بین الاقوامی قوانین و ضوابط کی دھجیاں اڑانے (اقوامِ متحدہ کی قراردادوں پر عمل کرنے سے انکار، شہری یعنی غیر فوجی آبادیوں سے سلوک کرنے کے لیے جنیوا کنونشن [1] کی خلاف ورزیاں، جوہری اسلحہ کی تحدید کے معاہدے [2] پر دستخط کرنے سے انکار، یورپی ممالک میں عرب باشندوں کا چوری چھپے قتل، اس سلسلے کی چند مثالیں ہیں۔ لیکن بدترین مثال یہ ہے کہ اسرائیل آئے دن اردن اور لبنان میں فلسطینیوں کے خلاف چڑھائی کرتے رہتے ہیں) کی صیہونیت

① جنیوا کنونشن (یا موافقہ) انیسویں صدی کے دوران میں یورپی ممالک اکثر ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار رہتے تھے۔ جنگ کے دوران میں مریضوں، ضعیفوں، عورتوں اور بچوں کا بھی کوئی خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ 1864ء میں جنیوا کے مقام پر اہم یورپی طاقتوں کا اجلاس ہوا اور اس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ اگر کسی متحارب فریق کی تحویل میں کوئی بیمار یا زخمی دشمن ہے، تو اسے مناسب طبی سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔ مزید برآں وہ افراد اور ادارے جو مریضوں اور زخمیوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں، انھیں ناوابستہ فریق تصور کیا جائے گا اور ان کے خلاف کوئی جنگی کارروائی نہیں ہوگی ان افراد میں ایمبولینسوں اور ہسپتالوں میں کام کرنے والے صفائی کا عملہ، مذہبی رہنما اور بعض دوسرے لوگ شامل ہوتے ہیں۔ 1906ء میں موافقہ پر نظر ثانی کی گئی اور اسے نئے تقاضوں کے مطابق بنایا گیا۔

② 1961ء میں امریکا اور روس کے مابین ایک معاہدہ طے پایا جس کے تحت انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ آئندہ ایٹمی دھماکے صرف زیرِ زمین کریں گے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے دوسرے ممالک پر یہ پابندی لگادی کہ جن کے پاس ایٹمی ہتھیار نہیں وہ نہ تو یہ ہتھیار بنا سکتے ہیں اور نہ ان کے تجربے کر سکتے ہیں سب سے پہلے فرانس اور چین نے اس معاہدے کو ماننے سے انکار کردیا۔ یہ دونوں ممالک مسلسل ایٹمی ہتھیار بنا بھی رہے اور ان کے تجربے بھی کر رہے ہیں۔ بھارت، اسرائیل اور جنوبی افریقہ نے معاہدے پر دستخط کرنے سے انکار کردیا۔ بھارت نے 1974ء میں ایٹمی دھماکا بھی کردیا تھا۔ تاہم اسرائیل اور جنوبی افریقہ کے پاس کافی ہتھیار موجود ہیں۔ برازیل اور ارجنٹائن بھی یہ ہتھیار بنا چکے ہیں یا بنا رہے ہیں۔ پاکستان نے بھی اس معاہدے پر دستخط کرنے سے انکار کردیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جب تک بھارت دستخط نہیں کرے گا، وہ بھی نہیں کرے گا۔

کی جو طویل تاریخ ہے، اس کے سامنے فلسطینی ''دہشت گردی'' تو بالکل پھیکی، بے آب بلکہ نا اہلی کا شاہکار نظر آتی ہے لیکن میری یہ قطعاً خواہش نہیں کہ صورت اس کے برعکس نظر آئے تو تان یہاں آن کر ٹوٹتی ہے کہ اسرائیل کی نظروں میں فلسطینی یا تو ''دہشت گرد'' ہے، یا وہ لازماً ایک غیر سیاسی (کیونکہ وہ غیر یہودی ہے) شے ہے جو اسرائیل کے اعداد و شمار میں اضافے کا موجب بنتی رہتی ہے، یا پھر وہ ایک ایسی رعیت کا فرد ہے جو مفید بھی ہے، فرمانبردار بھی ہے اور جسے آسانی سے اپنے ڈھب کی تربیت دی جاسکتی ہے۔ آج اسرائیل میں وہ لوگ جو محنت مزدوری کرتے ہیں، ان میں اَسّی ہزار سے ایک لاکھ تک وہ عرب کارکن شامل ہیں جو غزہ اور مغربی کنارے سے آتے ہیں۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ عرب محض لکڑیاں پھاڑنے اور کنوؤں سے پانی نکالنے والے ہیں۔ ① عام اسرائیلی اپنی روزمرہ کی گفتگو میں جب لفظ ''عربی'' کو اسم صفت کے طور پر استعمال کرتے ہیں، تو اسے ''غلیظ کور عقل، اور نا اہل'' کا مترادف بنا دیتے ہیں۔ اس قسم کے استحصال (جو عملاً نسلی امتیاز کی بنا پر کیا جاتا ہے) کی مرتکب اگر کوئی اور قوم یا ملک ہو، تو مغرب کے لبرل جمہوریت پسند بہ یک زبان اس کی مذمت کرنے لگیں گے، لیکن اسرائیل کے ریکارڈ سے نہ صرف درگزر کیا جاتا ہے بلکہ اس کی تحسین بھی کی جاتی ہے کیوں؟ محض اس لیے کہ اسرائیل نے عربوں کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس کے متعلق وہ نہ صرف اپنی آنکھیں بند کرنے بلکہ دُنیا کی نگاہوں میں بھی دھول جھونکنے میں کامیاب رہا ہے۔ اس سے بھی بدتر بات یہ ہے کہ مغرب کے دانش وروں اور مفکروں کی ایک پوری منظم جماعت موجود ہے، جو اسرائیل کے ان ''کارناموں'' کی تعریف میں رطب اللسان رہتی ہے۔ ② جن کے تاریک پہلوؤں نے انسانی اور قومی اصطلاحات میں ایک پوری قوم کی زندگی کو جہنم بنا دیا ہے۔

یہ بات حوصلہ افزا ہے کہ حال ہی میں اسرائیل میں امن کی ''فاختاؤں'' ③ کا ایک گروپ منظرِ عام پر آیا

---

① Merip Report کی جلد نمبر 74 شمارہ نمبر 9، (جنوری 1979ء) کے صفحات نمبر 20-9 پر سارہ گراہم براؤن کا مضمون The Structural Impact of Israeli Colonization ملاحظہ فرمائیں۔ یہ اس موضوع کا مکمل ترین تجزیہ پیش کرتا ہے۔

② مثلاً بیت المقدس میں اسرائیل نے جو مذموم کارروائیاں کی تھیں جب یونیسکو نے اپنی رپورٹ شائع کی تو اسرائیل کی حمایت میں مغرب کی سرکردہ اور ممتاز شخصیات اکٹھی ہو گئیں۔

③ فاختہ: امن کا نشان گردانی جاتی ہے اور سیاست میں یہ لفظ ان لوگوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جو تشدد کے مقابلے میں مذاکرات کو ترجیح دیتے ہیں۔ اسرائیل میں یہ لوگ مختلف جماعتوں کے زیر سایہ کام کر رہے ہیں۔ ایک جماعت کا نام ''اب امن'' تحریک ہے۔ اس کے ارکان اپنے مقاصد کے بارے میں ایک دوسرے سے اختلاف کرتے رہتے ہیں ایک گروپ ......

ہے۔اس گروپ کے ارکان امن اور مفاہمت کی خاطر کچھ خطرات مول لینے کے لیے آمادہ ہیں۔تاہم یہ بات حوصلہ شکن بھی ہے کہ اسرائیل کی سلامتی اور عرب خطرات کے بارے میں جو گھسے پٹے اور فرسودہ دلائل دیے جاتے ہیں، ان کے سامنے اس گروپ کے ارکان بھی سپر انداز ہو جاتے ہیں اور تمام متبادل صورتیں ان کے ذہنوں سے نکل جاتی ہیں۔ان فلسطینیوں کے لیے بھی جو دوسرے عرب ممالک میں مقیم ہیں، صورتِ حال کوئی خاص بہتر نہیں۔کیونکہ ہر مملکت ان کے وجود کو اپنے مخصوص مفادات کا محض حاشیہ تصور کرتی ہے۔کوئی عرب مملکت بھی فلسطینی مسئلے کے متعلق کوئی نہ کوئی مؤقف اختیار کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی لیکن اکثر و بیشتر یہ مؤقف محض ایک تجریدی تصور ہوتا ہے جس کا ''تقدس'' برسر اقتدار حکومت کو خفیف سی عزت اور وقار عطا کر دیتا ہے لیکن بین الاقوامی طور پر اسے عزت اور وقار تصور نہیں کیا جاتا بلکہ فلسطینیوں کی تائید وحمایت میں یہ حکومتیں جو حفاظتیں برتتی ہیں اسے اکثر و بیشتر یہود دشمنی پر محمول کیا جاتا ہے اور یوں بلند ترین سیاسی عزائم بھی، جن کی نوعیت اکثر و بیشتر مذہبی اور ثقافتی ہوتی ہے، اپنا اعتبار کھو بیٹھتے ہیں۔کون وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ مصر، لبنان، اردن اور شام بھی فلسطینیوں کے اسی حق خود ارادیت کے خواہاں ہیں، جس کے خود فلسطینی متمنی ہیں کوئی شخص یہ کیسے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ فلسطینیوں کے حقوق کی خاطر جو جدوجہد کی جارہی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ عربوں نے اسرائیل کے ساتھ مفاہمت کرلی ہے؟

فلسطینیوں کے حق خود ارادیت کے حصول میں جو رکاوٹیں حائل ہیں، ان کا یہ سرسری جائزہ بھی کسی قسم کے مغالطے کے بغیر یہ احساس دلانے کے لیے کافی ہے کہ سیاسی سیاق و سباق کتنا حوصلہ شکن ہے۔باقی رکاوٹیں تو جو ہیں، سو ہیں، ایک اور بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ خود فلسطینی بھی نسبتاً اس بات کی کم ہی تکرار کرتے ہیں کہ (ان کے نزدیک) حق خود ارادیت سے مثبت طور پر مراد کیا ہے میں جو کچھ عرض کر رہا ہوں، میرے خیال کے مطابق اس کا مفہوم مندرجہ ذیل ہے:

چونکہ فلسطینی وہ لوگ ہیں جنھیں اپنے گھروں اور املاک سے بے دخل کیا جا چکا ہے اور جو سیاسی طور پر ایک اجنبی قوم پائے ہیں اور چونکہ (جیسا کہ میں بار بار عرض کرتا رہا ہوں) اسرائیلی صیہونیت کی کامیابی میں جن بڑے بڑے عناصر نے حصہ لیا ہے، ان میں سے ایک عنصر یہ ہے کہ اس (صیہونیت) میں یہ طاقت اور

.....SHELI کے نام سے کام کر رہا ہے۔اس گروپ کا ایک رکن اسرائیلی پارلیمنٹ کا بھی ممبر ہے۔ایک اور گروپ ''اسرائیلی فلسطینی کونسل برائے امن'' ہے۔لیکن یہ تمام گروپ گانٹھ کے پکے ہیں اور کوئی ایسا کام کرنے کے لیے تیار نہیں جو اسرائیل کے مفادات کے خلاف جاتا ہو۔بس وہ ''امن'' کی ضرور رٹ لگائے رکھتے ہیں۔ویسے بھی وہ اقلیت کے اندر اقلیت ہیں۔

صلاحیت تھی کہ وہ اپنا وجود، اپنے نظریات اور اپنی امنگوں کو مؤثر انداز سے منوا سکتی تھی، اس لیے ان فلسطینیوں کا جو جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور ان کا بھی جو ابھی تک اسرائیل کے زیرِ تسلط ہیں، اکثر و بیشتر صرف یہ کام رہ گیا ہے کہ وہ اس بات سے انکار کرتے رہیں کہ وہ ''لاشے'' نہیں ہیں۔ جہاں تک ان (فلسطینیوں) کے اس مؤقف کا تعلق ہے کہ وہ صیہونی دعاوی کو مسترد کرتے رہیں گے، صیہونیوں کے خلاف مزاحمت جاری رکھیں گے اور ان کی مخالفت کرتے رہیں گے، تو اس کی آج کے فلسطینی سیاسی کلچر میں ایک طاقتور روایت موجود ہے۔ صیہونیت کا بین الاقوامی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے فلسطین کے اندر سینندھ لگا کر فلسطین پر قبضہ کر لیا ہے اور پھر یہ بات بھی کوئی کم اہم نہیں ہے کہ اس نے مقامی آبادی کے ساتھ کچھ ایسا سلوک کیا ہے کہ وہ خارجی دکھائی دینے لگی ہے اور اس کے بعد فلسطینی بیشتر وقت اپنے آپ کو ایک ایسے شخص کی صورتِ حال میں جو پھنسا ہوا پاتے ہیں جو خود تو باہر ہو لیکن دیکھ اندر کی طرف رہا ہو اور اب انھیں معلوم ہوا ہے کہ ان کی جلاوطنی ہی وہ اصل حقیقت ہے جو ان کی زندگی کی حدود متعین کرتی ہے۔ چنانچہ اس بات کا ادعا کرنے کے لیے کہ ہمارا تو اس سرزمین کے ساتھ بہت پرانا تعلق ہے ہمیں وہاں رہنے کا یوں حق حاصل ہے کیونکہ تاریخی اعتبار سے ہمارے آباؤ اجداد وہاں مدتوں سے رہتے چلے آئے ہیں۔ ہم اس بات سے انکار کرتے رہیں گے کہ ہم وہ نہیں جو کہ ہم بنا دیے گئے ہیں یعنی کہ صیہونیوں نے جس طرح ہمیں اپنے گھروں اور املاک سے بے دخل کیا ہے اور جس طرح ہمیں خارجی بنایا ہے، ہم وہ خارجی بننے سے انکار کرتے رہیں گے......اور ہمارا یہ انکار اس وقت تک جاری رہے گا جب تک اس طرح خارجی بنے رہنے کا عمل ختم نہیں ہو جاتا اور ہمیں اپنا قومی حق خود ارادیت استعمال کرنے کا موقع نہیں مل جاتا۔ اس کے فوراً بعد ہمارا واسطہ ان مشکلات سے پڑتا ہے جو میں نے ابھی ابھی گنوائی ہیں۔ وہ حالات جو ہمارے دائرۂ عمل کو محدود کر دیتے ہیں، ہم ان سے کیسے پیچھا چھڑا سکتے ہیں، اب تک ہم نے جو منفی طرزِ عمل اپنائے رکھا ہے، اس سے کیسے اوپر اٹھا جا سکتا ہے کہ جو کچھ ہم ہیں اور جو کچھ ہم چاہتے ہیں، اس کا مثبت انداز سے اظہار ہو سکے؟ لیکن یہ ایسے امور ہیں جن کا تعلق محض ارادے سے نہیں (کہ ہم جو چاہیں گے، وہ ہو جائے گا) بلکہ ان باتوں سے بھی ہے کہ ہم صحیح جہت اور صحیح طریقہ کار تلاش کریں، وہ قوتیں جنھیں کام پر لگایا جا سکتا ہے، ان کی صحیح انداز سے آمیزش کریں۔ صحیح پیرایۂ بیان اور صحیح تصورات کا کھوج لگائیں تاکہ اپنے عوام اور اپنے دوستوں کی لام بندی کر سکیں، صحیح منزلِ مقصود کا تعین کریں اور اس کا ادعا کریں، صحیح ماضی کو دریافت کریں تاکہ اس سے پیچھا چھڑا سکیں اور صحیح مستقبل کو تلاش کریں تاکہ اس کے لیے جدّ و جہد کر سکیں۔

میرا خیال ہے کہ ہم نے ان تمام امور کو کچھ کچھ سمجھنا شروع کر دیا ہے لیکن جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا

ہوں، اتنے موٴثر انداز سے نہیں اور نہ اس میں اتنے استقلال کا مظاہرہ کیا ہے جتنا کہ ہونا چاہیے تھا۔ وہ قوتیں، جو ہمارے خلاف آرا ہیں، ابھی تک مہیب اور بے پناہ حد تک طاقتور ہیں، عصری تاریخ نے ہمارے لیے جو الجھاؤ اور پراگندگی پیدا کر رکھی ہے، اس کا تو خیر ذکر ہی چھوڑیں، عرب ممالک، عظیم طاقتوں (سپر پاورز) اور ہمارے ان اتحادیوں کے ساتھ ہمارے بارے میں جن کا رویہ دوستانہ ہے اور جو بعض اوقات ہمارے لیے انتہائی اہم بن جاتے ہیں، معاملات میں بعض اوقات جو پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں، وہ ہمارے لیے زنجیر بن جاتی ہیں اور ہماری سرگرمیاں محدود ہو کر رہ جاتی ہیں۔ تاہم مجھے یہ نظر آتا ہے کہ چند ایک لازمی سچائیاں اب فلسطینی واقعیت کا ایک حصہ بن چکی ہیں اور انھی کے بل بوتے پر ہم اپنے مستقبل کی تعمیر کا کام شروع کر رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اسرائیلیوں کے برعکس اکثر فلسطینی اس بات کو خوب سمجھتے ہیں کہ ان کا فریق مخالف یعنی اسرائیلی یہودی قوم ایک ٹھوس سیاسی حقیقت ہے، مستقبل میں جس کے ساتھ انھیں رہنا ہے۔ اس کے مساوی ایک اور بات جس کا انھیں شدید احساس ہے، یہ ہے کہ فلسطین حقِ خودارادیت میں، محض مغربی کنارے یا غزہ کے فلسطینی شامل نہیں، بلکہ تمام کے تمام فلسطینی اس میں شامل ہیں۔ تنظیم آزادیٔ فلسطین کا عظیم ترین کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ہم سب میں یہ احساس پیدا کر دیا ہے کہ ہم سب ایک قوم ہیں اور یہ احساس 1967ء اور 1973ء کی جنگوں کے بعد ابھرا ہے۔ اگر فلسطینیوں کے متعلق کلیت [1] کا کوئی احساس موجود ہے اور اگر یہ احساس تنظیم آزادیٔ فلسطین کی ساخت اور طریقہ کار کی ٹھوس شکل میں ہمارے سامنے آیا ہے تو فلسطینیوں کے نئے مستقبل کے متعلق بھی تفہیم موجود ہے (یعنی جب سے انھوں نے اپنے آپ کو ایک متحد قوم سمجھنا شروع کیا ہے، انھیں ایک نئے مستقبل کی امید ہونے لگی ہے) اور وہ اس کا اظہار بھی کرتے رہتے ہیں۔ فلسطینیوں کے موٴقف میں یہ جو تبدیلی آئی ہے کہ انھوں نے سارے فلسطین کو آزاد کرانے کا خیال ترک کر دیا ہے اور اب انھوں نے اپنی توجہ کا مرکز فلسطین کے صرف ایک حصے کو بنا لیا ہے...... یعنی پہلے تو انھیں یہ امید تھی کہ وہ سارے فلسطین میں ایک سیکولر جمہوری حکومت قائم کر سکیں گے، وہ امید انھوں نے چھوڑ دی ہے اور اب وہ مغربی کنارے اور غزہ میں ایک فلسطینی ریاست کے قیام کے تصور کی طرف مائل ہو گئے ہیں...... تو بھی انھوں نے نہ تو اپنے حقِ خودارادیت کی منزل سے منہ موڑا ہے اور نہ اپنی اقدار کا دامن ہاتھ سے چھوڑا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم میں سے اکثر کو یہ خیال پریشان کرتا رہے گا کہ جافہ، حیفہ اور الجلیل کی حیثیت کبھی بھی دوبارہ وہ

---

[1] کلیت (Holism): وحداتِ فطرت کا نظریہ کہ فطرت (نیچر) مختلف یا متضاد عناصر پر مشتمل نہیں بلکہ اجزائے کل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایسے ہی فلسطینی مختلف ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے ہونے کے باوجود اپنے آپ کو کل (فلسطینی قوم) کا حصہ سمجھتے ہیں۔

نہیں ہو سکے گی جو انھیں 1948ء تک حاصل تھی اور یہ کہ ہم میں سے ہزاروں نے ایک مرتبہ جو کچھ کھو دیا، وہ ہمیشہ کے لیے کھو دیا ہے۔ اس کے باوجود (ہمیشہ ہمیشہ یہ احساس ستاتا رہے گا کہ) فلسطین میں، جہاں اب ہمیں کچھ بھی حاصل نہیں، ہمیں مساوی اقتدارِ اعلیٰ مل سکتا تھا۔ تاہم اگر کوئی مصالحت ہو بھی جاتی ہے اور ہمیں (ہمارے مطالبے کے مطابق) ایک ننھی منی مملکت (منی سٹیٹ) مل بھی جاتی ہے جہاں ہمارا اپنا جھنڈا ہوگا، اپنا پاسپورٹ ہوگا، اور اپنی قومیت ہوگی تو بھی مجھے یقین ہے کہ ہمارے سامنے جو ایک عظیم آدرش تھا کہ نسل یا مذہب کی بنا پر انسانوں (جن میں مرد اور خواتین دونوں شامل ہیں) کے مابین کوئی امتیاز نہیں برتا جائے گا، وہ ہمیشہ ہمارے پیشِ نظر رہے گا اور ہمارے افعال اور رویوں کو متعین کرتا رہے گا۔

میرا اپنا یقین...... میں اس کے حق میں اس کتاب کے آخری باب میں تفصیلی دلائل پیش کروں گا...... یہ ہے کہ اس مرحلے پر ایک آزاد اور خود مختار فلسطینی مملکت کی ضرورت ہے تاکہ گزشتہ ایک صدی کے دوران میں ہم نے ایک قوم کی حیثیت سے جو زندگی گزاری ہے، اس کی تاریخ کی تکمیل ہو سکے۔ ہم جو کچھ ہیں، ہم نے جو کچھ کہا ہے اور جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا ہے، اس کا مکمل جواز ایک مملکت کی صورت میں نہیں ڈھونڈا جا سکتا اور نہ مملکت اس کی تجسیم کر سکتی ہے۔ (یعنی جو دکھ ہم نے جھیلے ہیں، اگر ہمیں ایک مملکت مل بھی جائے، تو بھی ان کا مداوا نہیں ہو سکتا اور نہ مملکت ان دکھوں کی ایک ٹھوس صورت بن سکتی ہے۔) اس نقطۂ نظر کے معکوس نقطۂ نظر یہ ہے کہ اگر ایک مملکت حاصل ہو جائے، تو وہ سابقہ مصائب کا مداوا کر سکتی ہے۔ آئندہ کے لیے ان (مصائب) کے خلاف تحفظ دے سکتی ہے اور ان (مصائب) کی سابقہ تاریخ کی یادوں کو ایک ٹھوس صورت دے سکتی ہے۔ فلسطینی سمجھتے ہیں کہ یہودیوں کی علیحدہ مملکت کی تخلیق کے لیے اسرائیلی جس قسم کے نظریے گھڑتے رہے ہیں اور صیہونی اس مقصد کے حصول کے لیے عملی طور پر جو کارروائیاں کرتے رہے ہیں، ان کے پیچھے یہی نقطۂ نظر کارفرما تھا۔ یہودی خواہ وہ اندرونِ اسرائیل قیام پذیر ہوں اور خواہ وہ ابھی تک دُنیا کے مختلف ممالک میں منتشر ہوں، جب وہ فلسطینی مسائل سے جن کے زیادہ تر وہ خود موجب بنے ہیں، کنی کتراتے ہیں، تو وہ بہت کچھ کھو دیتے ہیں۔ انھیں ایک موقع ملا تھا کہ وہ ایک دوسری قوم کی معیت میں ایک مشترکہ سرزمین پر ایک مشترکہ (نہ کہ صرف اپنے) مستقبل کی مشترکہ تلاش میں مصروف ہو جاتے لیکن انھوں نے یقینی طور پر یہ موقع کھو دیا۔ فلسطینی مادرِ وطن کے لیے کام کرنے والا میں اب اکیلا شخص نہیں (میں جو اس مقصد کے لیے سرگرمِ عمل ہوں، تو اس کی وجہ میرا یہ ایمان ہے کہ اس صدی کے دوران میں ہماری تاریخ کے یہی مثبت معانی ہیں) بلکہ میرے کئی اور بھی رفقائے کار ہیں جو میری طرح یہ ایمان رکھتے ہیں کہ اس قسم کی مادرِ وطن کا قیام فلسطینی عربوں اور اسرائیلی یہودیوں کے مابین امن قائم کرنے کے لیے اولین اور غالباً انتہائی اہم قدم ہوگا۔ کیونکہ ہمسایہ

مملکتوں کے مابین امن کا مفہوم یہ ہے کہ ان کی سرحدیں مشترک ہیں، وہ آپس میں خیالات، وفود، اشیا وغیرہ کا باقاعدگی کے ساتھ تبادلہ کرتے ہیں اور ان میں باہمی مفاہمت بھی موجود ہے۔ پھر کون ہے جو یہ فرض نہیں کر سکتا کہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ سرحدیں ان انسانی روابط کے مقابلے میں جو ان قوموں کے مابین استوار ہوں گے، کم اہمیت کی حامل ہوں گی اور ان قوموں کے اختلافات مخاصمت کو کم ہوا دیں گے اور انھیں باہمی تبادلۂ خیالات پر زیادہ اکسائیں گے؟...... علاوہ ازیں ان اختلافات کی نوعیت اور اس کے ساتھ فلسطینی حقِ خودارادیت کی طرف پیش قدمی کی کیفیت میں بھی غیر معمولی تبدیلی رونما ہو چکی ہے۔ چنانچہ ہم پر یہ امر واضح ہو چکا تھا کہ اسرائیل اس سیاست کا جس میں ایک خاص قسم کی مؤثریت پائی جاتی ہے، نقطۂ عروج تھا اور نقطۂ عروج ہے۔ اس سیاست سے اسرائیلی یہودی بھی متاثر ہوئے اور فلسطینی عرب بھی۔ ان میں سے ایک یوں کہ وہ اس سے غیر مبہم طور پر متمتع ہوا ہے اور دوسرا یوں کہ وہ سراسر خسارے میں رہا ہے۔ چونکہ فلسطینیوں نے اس چیز کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اس لیے ان کے لیے اس کا مفہوم اور ہے اور جن لوگوں نے اس کا صرف علم حاصل کیا ہے، ان کے لیے اس کا مفہوم کچھ اور ہے۔ میں خود اپنی زندگی کے دو ڈرامائی طور پر مختلف اور متضاد تجربوں کا حوالہ دے سکتا ہوں۔ 1940ء کے عشرے کے وسط میں، جب میں عالم طفولیت میں سے گزر رہا تھا، میں اکثر اپنے بزرگوں کی سیاسی گفتگوئیں سنا کرتا تھا۔ ایک موقع پر جب ایسی ہی گفتگو ہو رہی تھی، تو میری توجہ خاص طور پر اس کی طرف مبذول ہو گئی اور میں اسے کبھی بھول نہیں پایا۔ ایک بزرگ شخص کے ساتھ ہمارے خاندانی مراسم تھے...... یہ بزرگ ایک وکیل تھے اور بیت المقدس کی عرب برادری میں انھیں ایک اہم مقام حاصل تھا۔ وہ اس بات سے بھی بہ خوبی آگاہ تھے کہ صیہونیت روز بروز ملک میں مضبوط ہوتی جا رہی ہے اور ایک ادارے کی حیثیت اختیار کرتی جا رہی ہے...... ہوا یوں کہ ایک روز بزرگ ہمارے گھر تشریف لائے۔ حسبِ معمول سیاسی گفتگو شروع ہو گئی۔ گفتگو کے دوران میں انھوں نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔ اب تک جتنی بھی بحث ہوئی تھی، اس کا موڈ بہت حوصلہ شکن تھا۔ سب کی متفقہ رائے یہی تھی کہ ''وہ (صیہونی) بے حد منظم ہیں۔ وہ تربیت حاصل کر رہے ہیں، وہ سرتاپا مسلح ہیں۔ یہ بالکل واضح ہے کہ ان کی نظریں ہماری جائدادوں اور ہماری املاک پر لگی ہوئی ہیں۔'' وغیرہ، وغیرہ پھر ان بزرگ نے لب کشائی کی اور بڑے رازدارانہ انداز سے گویا ہوئے: ''دوستو، گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اگر ہمارے اور ان کے مابین واقعی جنگ چھڑ گئی تو ہم خلیلوں کا جتھا لے آئیں گے اور وہ انھیں (صیہونیوں کو) مار مار کر بھگا دیں گے۔''

① خلیلی خبرون کے عرب باشندے تھے۔ یہ اپنی جنگجویانہ قوت کے لیے ہمیشہ مشہور رہے لیکن تھے بہت گوڑھ مغز۔ (مصنف)

صیہونیت کے بارے میں اس انتہائی احمقانہ گفتار کو میں برسوں فلسطینی سرزمین کو ہتھیانے کے لیے صیہونیوں کی جدّوجہد کے متعلق عربوں کے ردِعمل کا نچوڑ سمجھتا رہا۔ تاہم یہ بات بھی میرے فہم میں آتی ہے کہ اس کے متعلق میرا تنقیدی رویہ قدرے غیر منصفانہ ہے۔ اس صدی کے دوران میں عربوں کو جس قسم کے الجھاؤ، دباؤ اور متخالف مسائل کا سامنا کرنا پڑا ہے، وہ بے پناہ ہیں اور وہ چیزیں جو انھیں اس آزمائش کے لیے تیار کر سکتی تھیں، ان کی تاریخ یا معاشرے میں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ فلسطینی معاشرے کی تشکیل جاگیردارانہ اور قبائلی خطوط پر ہوئی تھی۔ تاہم اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اس کا اپنا کوئی التصاق نہیں تھا۔ وہ چیزیں جو معاشرے کے مختلف افراد اور طبقوں کو ایک دوسرے کے ساتھ چپکائے رکھتی ہیں، وہ اس میں موجود تھیں۔ تاہم جنگِ عظیم اول کے بعد اسے جس زبردست سہ رُخی دباؤ...... برطانوی تسلط، صیہونیوں کی سرزمین فلسطین پر نو آبادیاں قائم کرنے کے مساعی اور جدیدیت کا آغاز...... کا سامنا کرنا پڑا، اس سے اس کی قومی سالمیت آسانی کے ساتھ عہدہ برآ نہیں ہو سکتی تھی۔ کوئی بھی معاشرہ جو چار سو سالہ عثمانی حکومت کے بعد (اپنی آزادی کی اصطلاحوں میں سوچنے لگا ہو، اگر ان میں سے ایک یا دو دباؤوں سے بھی کامیابی کے ساتھ نپٹ سکتا، تو وہ اس کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہوتا۔ لیکن اگر ایک طرف صیہونی قومی سالمیت کے جذبے سے سرشار تھے، تو (دوسری طرف) عربوں کا یہ حال تھا کہ برطانوی انتداب کے زمانے میں، جو 1948ء تک قائم رہا، وہ استعماری حکومت کے بارے میں جن پالیسیوں پر کاربند تھے، وہ کبھی کبھی الجھاؤ کا شکار ہو جاتی تھیں (اور پھر ان میں واضح استعمار دشمن نظریے کا بھی فقدان تھا۔) مزید برآں معاشرے میں اس لیے بھی دراڑیں رونما ہونے لگی تھیں کہ ایک طرف تو ''نامور اور ممتاز'' شخصیتوں کی، جن کی صیہونی اور برطانوی مخالفت کرتے تھے، روایت پرستانہ قیادت تھی اور دوسری طرف عام کسان اور محنت کش تھے جو اس قیادت سے وفاداری کا دم تو ضرور بھرتے تھے لیکن معاشی اور معاشرتی اعتبار سے ان سے کٹے ہوئے تھے...... ان سب امور نے مل ملا کر ایسے تفرقوں کو جنم دیا جن کی عکاسی عربوں کی اس بارے میں تباہ کن حد تک نامکمل آگہی میں ہوتی تھی (یعنی عربوں کو اس بات کا علم ہی نہیں تھا) کہ فلسطینی معاشرے کا ڈھانچہ برقرار رکھنے کے لیے ایک شخص مؤثر طور پر کیا کر سکتا تھا (یا کیا کرنے کے قابل تھا۔)

تاہم اگر وہ معاشرہ خود نہیں، تو اس معاشرے کا تصور ابھی تک موجود ہے اور یہ ایک ایسا امر ہے جو انسان کو ہکا بکا کر دیتا ہے۔ فلسطین اپنی واپسی کی خواہش سے دستبردار نہیں ہوئے اور نہ انھوں نے اس کی متبادل صورت یعنی اپنے اردگرد کے عرب سمندر میں بلاتفریق گم ہونے اور اپنی شناخت کھو دینے کے بارے میں کبھی زیادہ سوچا ہے۔ عربوں کا کوئی طبقہ ایسا نہیں جس نے اتنے مختصر عرصے میں...... یہ عرصہ ایک نسل کی

زندگی سے بھی کم عرصے پر محیط ہے...... ایک طبقے (یا قوم) کی حیثیت سے اپنی تاریخ کے مفہوم پر اتنی گہرائی اور سنجیدگی کے ساتھ غور وفکر کیا ہو جتنا کہ فلسطینیوں نے کیا ہے۔ پھر دُنیا کے مختلف ممالک اور خطوں میں جو کثیر النسل معاشرے موجود ہیں اور ان میں سے اکثر کو جس خستہ وخراب مقدر میں سے گزرنا پڑا ہے اس کے باوجود فلسطینیوں نے ایک کثیر النسل معاشرے کے معانی کے متعلق جو گہرا اور سنجیدہ غور وفکر کیا ہے وہ اور کسی نے کاہے کو کیا ہوگا۔ یہی نہیں بلکہ جب پس منظر میں جلاوطنیاں، استعماری چیرہ دستیاں اور نوآبادیاتی بے دخلیاں موجود ہو، تو پھر قومی آزادی اور حق خود ارادیت کے کیا معانی بنتے ہیں، اس پر بھی انھوں نے بہت سوچا ہے۔ یہ تمام باتیں اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ فلسطینیوں نے اجتماعی طور پر بلوغت حاصل کر لی ہے لیکن ان میں یہ تمام باتیں اس لیے آئیں کہ انھوں نے اب یہ سمجھ لیا ہے کہ سیاسی طور پر مؤثر کیسے ہوا جاسکتا ہے اور یہ چیز اس قوم کی تاریخ میں ایک نیا واقعہ ہے۔

یہاں مجھے اپنے دوسرے تجربے کا ذکر کرنا ہے اور یہ تجربہ اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ سیاسی طور پر مؤثر ہونے کا مطلب کیا ہے، اس کا ڈرامائی انداز سے (نہ کہ ایک خاموش تماشائی کی حیثیت سے) مجھے علم کیسے ہوا۔ 1977ء کے موسمِ بہار میں ایک رکن کی حیثیت سے میں فلسطینی قومی کونسل کے، جو جلاوطن فلسطینیوں کی پارلیمنٹ ہے، اجلاس میں شریک ہوا۔ یہ اجلاس قاہرہ میں عرب لیگ کی عمارت میں منعقد ہوا تھا۔ کونسل کے ارکان تقریباً دوسو نوے نمائندوں پر مشتمل تھے۔ مغربی کنارے اور غزہ کے تقریباً ڈیڑھ سو نمائندے اس لیے شرکت نہ کر سکے کیونکہ اسرائیل نے یہ دھمکی دی تھی کہ اگر وہ قاہرہ گئے اور وہاں انھوں نے کونسل کی کارروائی میں حصہ لیا، تو انھیں واپس نہیں آنے دیا جائے گا۔ پھر بھی کونسل فلسطینیوں کے ہر طبقے اور فلسطینی قوم کے ہر فرد کی وسیع تر نمائندگی کر رہی تھی۔ قرار دادیں مرتب کرنے اور ان پر بحث کرنے سے پہلے ایک ہفتہ کھلے عام تقاریر ہوتی رہیں۔ ان تقاریر میں زیادہ تر ان واقعات کا جائزہ لیا گیا تھا جن میں فلسطینی ملوث ہوئے تھے۔ اصل موضوع جو زیرِ بحث آیا یہ تھا کہ تنظیم آزادیٔ فلسطین، جو حقیقتاً اس معاملے میں کونسل کے قانون ساز شعبے کی مجلس منتظمہ تھی، اپنے فرائض سے کس طرح عہدہ برآ ہوئی ہے۔ کونسل کا گزشتہ اجلاس 1974ء میں منعقد ہوا تھا اور اس اجلاس کے بعد کے برسوں کے دوران میں اہمیت سے بھرپور متعدد واقعات رونما ہو چکے تھے۔ لبنان میں جنگ چھڑ چکی تھی، بے شمار سفارتی اور سیاسی تبدیلیاں وقوع پذیر ہو چکی تھیں اور داخلی طور پر خود فلسطینی اسے متعدد رویوں میں ردّوبدل کر چکے تھے۔ سب سے اہم تبدیلی جو منظرِ عام پر آئی یہ تھی کہ اسرائیل کے پڑوس میں ایک نئی مملکت کے قیام اور جن اسرائیل (یہاں مراد صیہونی ہیں) ''فاختاؤں'' نے فلسطینی حقوق کی حمایت کی تھی، ان کے ساتھ ملاقاتیں کرنے کے فیصلے ہو چکے تھے۔

میں اس وقت سے اب تک حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہوں کہ اس حقیقت کے باوجود کہ اس وقت قاہرہ میں اخباری نامہ نگاروں اور دوسرے ذرائع ابلاغ کے نمائندوں کی فوج ظفر موج موجود تھی، لیکن ان میں سے ایک بھی اتنی فراست اور ژرف نگاہی سے بہرہ ور نہیں تھا کہ وہ ان تاریخ ساز واقعات کا ادراک کر سکتا جو وہاں رونما ہو رہے تھے۔ یورپ اور امریکا میں مشرقِ وسطیٰ کے ''ماہرین'' انبوہ در انبوہ موجود ہیں۔ کونسل کے اجلاس کو منعقد ہوئے مہینوں بیت گئے، لیکن ان میں سے اللہ کے کسی بندے کو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ وہ فلسطینیوں کے فیصلوں کی تہ تک پہنچ سکتے، سبھی نے اسی ناکامی اور نااہلی کا مظاہرہ کیا جو قاہرہ میں موجود ذرائع ابلاغ کے نمائندے ظاہر کر چکے تھے۔ حالیہ تاریخ کے دوران میں یہ پہلی مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ عرب دُنیا کا ایک وسیع تر نمائندہ قومی ادارہ ایک مکمل جمہوری انداز سے اہم مسائل پر حقیقتاً بحث مباحثہ کر رہا تھا۔ تنظیمِ آزادیٔ فلسطین کو تند و تیز تنقید کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ اس کی مجلس منتظمہ، یاسر عرفات اور دیگر (متعلقہ) اشخاص پر زبردست اعتراضات کی بارش ہو رہی تھی اور انھیں دقیق تنقیدی احتساب میں سے گزرنا پڑ رہا تھا۔ آپ کو ایک عرب ملک بھی ایسا نظر نہیں آئے گا جہاں اس قسم کی باتیں ہو سکتی ہوں، جہاں قیادت کا یوں مؤاخذہ کیا جاتا ہو اور اس کی ذمہ داری اور فرائض کو یوں کھلے عام منظم طریقے سے دیکھا پرکھا اور جانچا جاتا ہو، اس پر بحث کی جاتی ہو اور اس کا تجزیہ کیا جاتا ہو۔ اس کے متعلق شکوک وشبہات رفع کیے جاتے ہوں اور پھر ان کے بارے میں فیصلے کیے جاتے ہوں، یہاں یہ بات ذہن میں رکھنا چاہیے کہ قاہرہ میں جو مرد اور خواتین اکٹھے ہوئے تھے، وہ سبھی کے سبھی جلاوطن تھے، ان کا کوئی علاقہ نہیں تھا، کوئی وطن نہیں تھا۔ وہ سب کے سب کسی ایک یا دوسرے ملک میں قیام پذیر تھے جہاں سیاسی آزادی کے حالات ایک دوسرے سے مختلف لیکن بنیادی طور پر محدود تھے۔ تاہم متعدد احمقانہ تقریروں کے باوجود، جن کی پیش گوئی کی جاسکتی تھی، کونسل کی کارروائیوں کا زور، جیسا کہ میں سمجھ سکا، اس اجتماعی عزم پر تھا کہ ہر اس چیز کو، جو فلسطینی مسئلے کو ذرا بھی متاثر کرتی ہو، بالتفصیل سمجھنے کی پوری کوشش کی جائے گی۔ مجھے یہ ماننے میں تامل ہے کہ وہاں جتنے لوگ بھی موجود تھے، ان میں سے ایک بھی شخص ایسا تھا جو محض اتنی سی حقیقت پر کہ آخر کار ایک فلسطینی قومی کونسل معرض وجود میں آچکی تھی یا یہ کہ تنظیمِ آزادیٔ فلسطین نے معاشرتی، عسکری اور سفارتی پروگرام مرتب کر لیے تھے، لاابالی رجائیت یا محض عارضی حوصلہ افزائی کا شکار ہو گیا ہو۔ تاہم چونکہ فلسطینی وہ طبقہ ہیں جس کے وجود کو ماننے سے وہی لوگ انکاری ہیں، جنھوں نے انھیں اپنے وطن سے بے وطن کر دیا تھا۔ پھر یہ وہ طبقہ ہیں جس کے افراد دُنیا کے کونے کونے میں بکھر چکے ہیں اور یوں صورتِ حال بہت پیچیدہ اور گھمبیر ہو چکی ہے (پھر بھی جو لوگ کونسل کے اجلاس میں شریک ہوئے وہ شام، اردن، لبنان، سعودی عرب، کویت، مصر، لیبیا اور دیگر عرب ممالک ہی سے نہیں آئے

بلکہ یورپ، شمالی امریکا اور جنوبی امریکا کے دور دراز علاقوں سے بھی آئے تھے۔) پھر یہ وہ طبقہ بھی ہیں جو ابھی تک اپنے اس مقصد سے بھی، جو انھیں کم سے کم قابلِ قبول ہے اور جس سے وہ کسی صورت میں نیچے نہیں جا سکتے کہ اسرائیلی فوجیں ان کے وطن کے (بمشکل) تہائی حصے سے اپنی فوجیں ہٹا لے، کوسوں دور ہے۔ تو اس طبقے کے لیے یہ تمام باتیں (قومی کونسل کا قیام اور تنظیم آزادیٔ فلسطین کے پروگرام) بے حد اہمیت کی حامل ہیں۔ ہر وہ شخص، جو وہاں موجود تھا، یہ جاننے کے لیے بے تاب تھا کہ جدوجہد کس طرح جاری رکھی جائے گی اور اس سلسلے میں وہ تمام ممکنہ یا دستیاب جزئیات وتفصیلات بھی معلوم کرنا چاہتا تھا۔ مزید برآں...... اور یہ بات بڑی متاثر کن ہے...... اس بات کی کوشش کی جارہی تھی کہ اسرائیل اور یہودیوں سے کچھ اس طور نپٹا جائے کہ وقتی طور پر وہ بے شک ایک ایسی سیاسی حقیقت نظر آئیں جس سے دامن نہیں چھڑایا جا سکتا لیکن انجام کار انھیں ایک ایسی سیاسی حقیقت نہ تصور کیا جائے جس سے دامن چھڑانا ضروری ہو بلکہ انھیں ایک ایسا عنصر گردانا جائے جس کا وجود فلسطین کے سیاسی مقدر کی تفہیم کے لیے ناگزیر ہے۔ صیہونی تحریک جس کی عمارت فلسطینیوں کی موجودگی کے کامل انکار پر استوار کی گئی تھی، کبھی بھی گردن بلند کر کے یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ اس نے اس (فلسطینیوں کی موجودگی) کی کامل حقیقت کا اعتراف کرنے کے لیے کبھی اتنی مغز کھپائی کی ہوگی جتنی کہ قاہرہ میں فلسطینیوں نے خود اس (صیہونیت) کو تسلیم کرنے کے بارے میں کی تھی۔

مجھے یہ جو دو خالصتاً فلسطینی تجربے ہوئے، ان دونوں کے مابین جو سیاسی فاصلہ حائل ہے، وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بے حد گھمبیر ہے اگر میں یہ کہوں کہ اس فاصلے کو ماپا جا سکتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ میں کسی عامیانہ یا موقع پرستانہ طریقے سے "حقیقت پسند" بن گیا ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ جو میں نے دو مثالیں جن میں سے ایک کا تعلق 1940ء کے اور دوسری کا 1970ء کے عشرے سے ہے، پیش کی ہیں، دونوں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ دونوں مواقع پر فلسطینی جس مؤقف کا اظہار کر رہے تھے، وہ یہ تھا کہ وہ اپنے سیاسی اور انسانی حقوق گنوا رہے ہیں، تاہم موجودہ زمانے کے فلسطینی کو اس بات کا دوبارہ ادراک ہو رہا ہے کہ اس کے لیے کون سی چیز احتمالی ہے اور کون سی ممکن اور اس ادراک کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ وہ یہ خوب سمجھنے لگا ہے کہ وہ خود کیا ہے، وہ کس انداز سے مؤثر ثابت ہو سکتا ہے، وہ کہاں کھڑا ہے اور اسے زمانۂ حال میں، جس کے متعلق اس کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ خود تو یہ ماضی کی پیداوار ہے، لیکن یہ مستقبل کو اپنی کوکھ سے جنم دے گا، اپنی جدوجہد کو کس نہج پر چلانا ہے۔ تاہم یہ بات اپنی جگہ موجود ہے کہ آج فلسطین حقیقتاً جو کچھ ہے، اس پر یہ احساس حاوی ہے کہ اسے صیہونیت کے ہاتھوں براہِ راست کیا کیا مصائب برداشت کرنا پڑے، کیا کیا دکھ جھیلنا پڑے، کیا کیا زخم کھانا پڑے۔ اس کی یہ وہ تاریخ ہے، یہ وہ واقعیت ہے، جس سے وہ کسی صورت

بھی دامن نہیں چھڑا سکتا لیکن وہ اپنا کوئی مستقبل بھی اس وقت تک نہیں بنا سکتا جب تک وہ اپنی اس تاریخ اور اس واقعیت سے اوپر نہیں اٹھ جاتا، ماورا نہیں ہوجاتا۔ چنانچہ قاہرہ میں جو گھمسان کا رن پڑا، اس میں زیادہ تر توجہ اس مخصوص حقیقت پر، جو کہ اسرائیل ہے، مرکوز رہی، اس کے ساتھ ہی اس معاملے پر بھی خوب کھل کر بحث ہوگی کہ اس (اسرائیل کی حقیقت) نے فلسطینیوں کے ردِ عمل کو کس طرح متاثر، بلکہ ایک خاص حد تک اس کے لیے کیسے تشکیل کی ہے۔

چنانچہ اگر ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو (قاہرہ کے اجلاس میں) فلسطینی شعور و آگہی نے جو ایک قدم اوپر اٹھایا ہے، وہ یہ ہے کہ صیہونیت اور اسرائیل فلسطین کی مقامی آبادی کو اپنی چیرہ دستوں کا شکار بنانے کے لیے جس طرح آئے روز مؤثر طریقے سے کامیاب رہا ہے، اس کی اس (فلسطینی شعور) نے اجتماعی قومی اور تفصیلی تفہیم حاصل کی ہے، اس کی تاریخ اور سرگزشت مرتب کی ہے، اس کو خوب اچھی طرح کھنگالا ہے اور اس کے ساتھ مفاہمت کا ایک راستہ تلاش کیا ہے۔ فلسطین طریقے میں خوب صورت مستقبل کی جو جھلک نظر آتی ہے اور اس میں دونوں قوموں کے حقوق کو جس طرح تسلیم کیا گیا ہے، وہ صیہونی کورچشمی کا ایک جدلیاتی جواب ہے۔ یہ خوب صورت مستقبل کے خواب اور ایک دوسرے کے حقوق کو تسلیم کرنے کی کارروائیاں ابھی تعمیر کے مراحل میں سے گزر رہی ہی، لیکن ان دونوں نے مل کر فلسطینیوں کو اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ اس صیہونیت کا جس کا عمل اور کردار یہودیوں کو اپنی تنظیم میں ضم کرنا اور غیر یہودیوں کے خلاف امتیاز برتنا رہا ہے۔ تنقیدی جائزہ لے سکیں اور اس کا ایک متبادل پیش کر سکیں۔ لیکن جب تک حقیقی تاریخی تجربے کی اساس پر ایک محتاط تنقیدی جائزہ مکمل نہیں ہوجاتا، اس قسم کا کوئی متبادل پیش کرنا ممکن نہیں اور چنانچہ فلسطینیوں کے موجودہ پروگرام کی ایک بڑی شق یہ (1) ہے کہ حقیقت کی تعریف و توضیح تاریخی طور پر کی جائے۔ مثلاً یہ معلوم کیا جائے کہ صیہونیت نے اپنے ستم گزیدگان پر جو اثرات مرتب کیے ہیں، ان کی حقیقی نوعیت کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی صیہونیت نے جن لوگوں کو اپنے ثمرات سے مستفید ہونے کے لیے چُنا تھا، انھیں حقیقی معنوں میں فائدہ پہنچانے کے سلسلے میں اسے جو کامیابیاں حاصل ہوئیں، ان کا اعتراف کیا جائے۔ چنانچہ فلسطینی واقعیت میں جو تبدیلی کے آثار نظر آتے ہیں، وہ ان معنوں میں ہی کہ پہلے تو فلسطینی یہ پروگرام بناتے تھے کہ (صیہونیت

---

(1) میں یہاں ایک وسیع تر اتفاقِ رائے یا اجماع کا ذکر کررہا ہوں۔ آپ خواہ کتنی یہ قرار دادیں منظور کرلیں۔ کتنی ہی دستاویزات مرتب کرلیں، کتنے ہی رہنما یا دانشور علیحدہ علیحدہ بیانات دے دیں فلسطینی تو کیا، کوئی قوم بھی کسی بھی طریقے سے اس اجماع کو مناسب انداز سے پیش نہیں کرسکتی اور نہ اسے پیش کیا جاسکتا ہے۔ تاہم یہ اجماع اپنی جگہ موجود ضرور ہوتا ہے (مصنف)

کی) مزاحمت لاٹھیوں سے مسلّح جفاکش دیہاتیوں کے ذریعے کی جائے لیکن اب وہ اس قسم کی مزاحمت کے لیے جو پروگرام بناتے ہیں، ان کا نقطۂ آغاز یہ ہے کہ مقامی عرب فلسطینیوں کے خلاف صیہونیت جس طرح مؤثر رہی ہے، اسی طرح خود بھی مؤثر بننے کی کوشش کرنا چاہیے کہ اس طریقہ کار پر نظر ثانی کر کے اسے بہتر انداز میں اپنانا چاہیے۔ یوں یہ بات نمایاں ہوتی جا رہی ہے کہ فلسطینی مؤثر بننے کے لیے جو کارروائیاں کر رہے ہیں، ان میں انھیں بہ تدریج کامیابی حاصل ہو رہی ہے۔

چنانچہ فلسطینی ہونے کے لغوی طور پر ناقابلِ تخفیف اور تفاعلی معانی یہ ہیں کہ آپ کو ایک ایسی صیہونیت کے ساتھ گزارہ کرنا ہے جو

اوّل: فلسطین کے حصول کا ذریعہ بنی۔

دوم: فلسطینیوں کو اپنے گھر بار سے بے دخل کرنے اور انھیں ملک بدر کرنے کا ذریعہ ثابت ہوئی۔

سوم: اسرائیل کو ایک ایسی مملکت کے طور پر قائم رکھنے کا ذریعہ ہے جس میں فلسطینیوں کے ساتھ بحیثیت غیر یہودی سلوک کیا جاتا ہے اور جہاں وہ سرزمین پر اپنی مسلسل موجودگی کے باوجود (اسرائیل میں ساڑھے چھ لاکھ فلسطینی موجود ہیں) سیاسی طور پر جلاوطن ہی قرار پاتے ہیں۔

یہ جو مثالیں پیش کی گئی ہیں، اس کی اساس صیہونیت کے اس مقدمے پر ہے کہ فلسطین سے اس کے اکثریتی مقامی باشندوں کا انخلا عمل میں لایا جائے اور جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ اس بھیانک سچائی کو کسی طور پر بھی کم کر کے پیش نہیں کیا جا سکتا اور ہر نامور صیہونی رہنما نے بھی اس سچائی کا کھلے بندوں اور نہایت ایمانداری کے ساتھ اعتراف کیا ہے۔ جب آپ ایشیا کے کسی خطے میں ایک مملکت کی بنیاد رکھنا اور اس میں ایسے لوگوں کو آباد کرنا چاہتے ہوں، جن کی بیشتر تعداد ابتداً یورپ کے تارکین اوطان پر مشتمل ہو، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ان لوگوں کو، جو یہاں آباد تھے، باہر نکال رہے ہیں۔ صیہونیت کی سیدھی سادھی یہی ضرورت تھی اور یہی خواہش لیکن اس کے جو شاخسانے وجود میں آئے، وہ بے حد پیچیدہ ہیں۔ تاہم جہاں تک مقامی عرب فلسطینی کا تعلق ہے اور اس یہودی تارکِ وطن کا بھی، جس نے اس (فلسطینی) کی جگہ سنبھالی ہے، دونوں کے لیے ادل بدل کی اس حقیقت میں اصلاً کبھی کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی اور یہی وہ حقیقت ہے جہاں سے مشرقِ وسطیٰ میں تلاشِ امن کا کام شروع ہونا چاہیے لیکن جس کے ساتھ اس (تلاش) نے عہدہ برآ ہونے کی ابھی تک کوئی کوشش نہیں کی۔

چوتھا باب

کیمپ ڈیوڈ کے بعد مسئلۂ فلسطین

①

امورِ حوالہ: لفاظی اور قوت و توانائی

اس بات کی توقع رکھنا چاہیے کہ اب مشرقِ وسطیٰ اور عرب دُنیا کے متعلق جو بھی اور جہاں بھی ذکر اذکار ہوگا، اس میں سب سے زیادہ توجہ کا مرکز جو امور بنیں گے، وہ یا تو اس قسم کے پریشان کن سوالات ہوں گے کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے اور کیا نہیں ہونے والا...... خاص طور پر یہ سوال تو لازماً زیرِ بحث آئے گا کہ اسرائیل اور اسرائیل کے معاہدۂ امن اور فلسطینیوں کا کیا بنے گا؟...... یا پھر بحث و تمحیص کا موضوع وہ مثبت یا منفی لیکن مرصع اور مسحور کن بیانات، تفصیلات، اطلاعات اور داستانیں بنیں گی جن میں اس دور کا ذکر ہوگا جو کیمپ ڈیوڈ یا شاہ ① ایران کے زوال کے بعد شروع ہوا ہے۔ جب سے کارٹر انتظامیہ برسرِ اقتدار آئی ہے، مشرقِ وسطیٰ کے واقعات میں اتنا ڈرامائی الجھاؤ پیدا ہونا شروع ہو گیا ہے کہ ان کی کوئی کل سیدھی نظر نہیں آتی اور یہ تک پتا نہیں چلتا کہ وہ کس جہت کی طرف جا رہے ہیں حالانکہ ایرانی انقلاب کے بعد جو نئی صورتیں بننا

---

① ضمیمہ ملاحظہ ہو

شروع ہوئی تھیں، وہ روز بروز واضح سے واضح تر ہوتی جارہی تھیں، فضا سے دھند چھٹنے لگی تھی، اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ قطعی اور فیصلہ کن تبدیلی کے لیے زمین ہموار ہورہی ہے۔ مغرب کے متعدد تجزیہ نگار یہ استدلال کرتے ہیں کہ جنگِ عظیم دوم کے بعد عربوں کی سیاسی زندگی کو جن سامراج دشمن اور حصولِ آزادی کی خواہش سے بھرپور جذبات واحساسات اور خیالات سے غذا املا کرتی تھی، ان کا تعلق ان کے دلوں کی عمیق گہرائیوں سے تھا اوران میں جو قوت وتوانائی پائی جاتی تھی، وہ تقریباً رفیع و برتر تھی۔ لیکن اب اس قوت وتوانائی میں کمزوری کے آثار نمودار ہونے لگے ہیں۔ ① اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ قدیم حد بندیاں اور امتیازات جن کا احترام کیا جاتا تھا، تقویٰ اور پارسائی جس کو عملاً اختیار کیا جاتا تھا، مستحکم طبقے، سبھی اپنی اہمیت کھوتے جارہے ہیں اور میرے خیال میں یہ بات درست ہے کہ عرب فضا میں ایک نئی قسم کی قوم پرستی ابھر رہی ہے۔ یہ قوم پرستی اپنی نوعیت کے اعتبار سے محدود تر ہے اوراس میں دوسروں کے بارے میں کم دریا دلی کا مظاہر کیا جاتا ہے۔ یہ قوم پرستی نہیں بلکہ اسے آپ گروہ بندی یا دھڑے بندی کہہ سکتے ہیں۔ صدر سادات نے جس بے قراری لیکن جس سراسر اچنبھے میں ڈال دینے والے انداز سے اسرائیل کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور بعد میں اسی انداز سے اس سے صلح بھی کرلی، عرب دُنیا نے دیکھا کہ (صدر سادات کا یہ) تھیٹرانہ ② فعل ایک مرتبہ تو تھیٹر کے کارندوں کی تھیٹرانہ حرکات وسکنات اور لفاظی سے بھی بازی لے گیا ہے۔ امریکا کو جو اثر ورسوخ حاصل ہوا ہے، اس کی حیثیت اب ایک لہر کی نہیں رہی کہ آئی اور گزر گئی، بلکہ وہ ایک ادارے کی صورت اختیار کرگیا ہے (کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی ادارے کی طرح یہ بھی ہمیشہ یا کم ازکم ایک طویل عرصے تک قائم رہے گا۔) پھر اس اثر ورسوخ کو ضمانت ان بین الاقوامی معاہدوں نے فراہم کی ہے جن پر واشنگٹن اور میری لینڈ کی پہاڑیوں (کیمپ ڈیوڈ) میں دستخط ہوئے اور جنھیں وہیں مہر بند کیا گیا اور یہ وہ مقامات ہیں جو حتی الامکان حد تک سینائی کے میدان ہائے کارزار، فلسطین کے کھیتوں اور سنگتروں کے باغوں اور شام کی پہاڑیوں (جن کے متعلق حقیقتاً یہ معاہدے ہوئے تھے) سے دور تھے۔ لبنان، جو کسی زمانے میں عربوں کے ثقافتی اور سیاسی مناظرے کا

---

① اس نقطۂ نظر کی تائید میں امریکی جریدے ''فارن افیئرز'' کی جلد نمبر 57 شمارہ نمبر 2 (زمستان 79-1978ء) میں فواد عجمی کا مضمون ''پان عرب ازم کا خاتمہ'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ میرے خیال میں اس مضمون میں بلاضرورت سب کو ایک لاٹھی سے ہانک دیا گیا ہے۔

② تھیٹرانہ (Theatrical): ایسی گفتگو، رویہ یا حرکات وسکنات جیسی تھیٹر کے اداکار کرتے ہیں۔ اس کا مقصد، دوسروں کو بناوٹی انداز سے متاثر کرنا اور اپنی تشہیر کرنا ہوتا ہے۔

تعقلی مرکز تھا، اب بمشکل ایک وجود ہے۔ اس کے شہر اور دیہات زمین بوس ہو چکے ہیں۔ اس کے شہریوں کو قابلِ قبول حدود سے کہیں زیادہ سزا مل چکی ہے اور اس کے آدرش طنز و تعریض سے بھرپور یادداشتوں کے گچھوں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ اس (لبنان) کے علاوہ جدھر بھی آپ کی نظر پڑتی ہے، آپ کو غیر معمولی عرب دولت، غیر معمولی عرب الجھاؤ، غیر معمولی عرب جبر و تشدد کے حقائق دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کی صحبت بھی اختیار کرتے ہیں لیکن مجال ہے کہ ان میں ذرا بھی تغیر و تبدیلی آتی ہو اور ان سب کے باوصف، اور عربیت کی نام نہاد موت کے باوجود اور اس سے ماورا آپ کو یہ صاف نظر آتا ہے کہ ان لوگوں میں ابھی تک ایک عظیم عرب قوم میں ڈھلنے کے اجتماعی امکانات موجود ہیں۔ بظاہر یہی دکھائی دیتا ہے کہ یہ قوم اختلافات اور نااتفاقی کا شکار ہو چکی ہے۔ پھر بھی اس میں اتنی صلاحیت اور قوت موجود ہے کہ اب بھی اس کے باشندوں کے دلوں اور دماغوں میں ایک نئی جوت جگائی جا سکتی ہے، ان کی نئے سرے سے صف بندی کی جا سکتی ہے...... شرط صرف یہ ہے کہ انھیں مستقبل کے متعلق جو خواب دکھائے جائیں، وہ جھوٹے نہ ہوں بلکہ حقیقی اور سچے ہوں، یہ وہ حقیقت ہے جس کی اہمیت کبھی بھی گھٹا کر پیش نہیں کرنا چاہیے۔

تاہم اس امر کے باوصف کہ حالیہ مہینوں کے دوران میں مشرقِ وسطیٰ (اور اس کے مسائل) کے متعلق بے حد و حساب توجہ دی گئی ہے، اس توجہ میں کسی خاص قسم کا تجزیاتی وصف نہیں پایا جاتا۔ امریکا میں اخبارات، ماہرین، دانشوروں، اور سب سے بڑھ کر سرکاری پراپیگنڈہ کرنے والے حکام نے مشرقِ وسطیٰ کے ساتھ ایک ایسے تماشے کا سا سلوک کیا ہے جس کے متعلق یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ اسے دیکھ کر تماشائی بہت محظوظ ہوں گے اور زبردست جوش و خروش کا مظاہرہ کریں گے۔ (یہ کہا گیا کہ اس علاقے سے) امریکا کے مفادات وابستہ ہیں۔ اکثر اوقات یہ اشارے دیے گئے کہ عسکری اور تہذیبی اعتبار سے یہ خطہ بہت اہم ہے۔ شان و شوکت جاہ و جلال اور ڈرامے سے بھرپور (اخبارات میں) شہ سرخیوں کا سیلاب آ گیا...... کبھی سرخی لگتی، ''شہنشاہ کا تختہ الٹ گیا'' کبھی ''تھیٹرانہ چوٹی کانفرنس کا انعقاد'' اور کبھی بحری جنگی جہازوں کے بیڑے یا غیر مسلح الیف پندرہ (لڑاکا) طیاروں کی اچانک آمد کی نوید دی جاتی۔ آخر ان تمام باتوں کا بنیادی ڈھانچہ کیا تھا جس کے اندر یہ سب کچھ کیا جا رہا تھا؟ ایک طرف تو آویزش، جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھی، اب بھی پورے زور شور سے جاری تھی۔ دوسری طرف حالات نے ایسا زبردست پانسا پلٹا تھا کہ بالکل ہی ایک نئی قسم کا ماحول معرضِ وجود میں آ گیا تھا، اسرائیل، مصر اور امریکا کا آپس میں معاہدہ ہو چکا تھا، ایران میں حالات قلابازیاں کھا چکے تھے، نومبر 1978ء میں بغداد میں چوٹی کانفرنس منعقد ہو چکی تھی، افغانستان، ایتھوپیا، یمن اور مشرقِ بعید کے بعض ممالک میں صورتِ حال دگرگوں ہو رہی تھی۔ خطرناک ہتھیاروں کی تعداد محدود کرنے

کے متعلق مذاکرات کا ڈول ڈالا جا رہا تھا اور ایک جریدے کے بقول کیا دُنیا میں ایک نیا نظم (یا بدنظمی) وجود میں آ رہی ہے؟[1] تو ان حالات اور اس ماحول میں فلسطینی مسئلے کا سر پیر کیسے تلاش کیا جا سکتا تھا؟

خیر، ہم اپنی بات کا آغاز کچھ یوں کر سکتے ہیں کہ چین کے برعکس، کیوبا کے برعکس، ویت نام کے برعکس، بلکہ الجزائر کے بھی برعکس، مشرقی عرب دُنیا تاریخ، جغرافیے اور ثقافت میں کچھ عجیب انداز سے ایک درمیانی اور مخلوط حیثیت اور مقام کی مالک ہے۔ تیسری دُنیا کے متعدد دوسرے خطوں کے ساتھ عرب دُنیا کی مماثلت بھی ہے اور عدم مماثلت بھی۔ یوں الجزائری اور فلسطینی مزاحمت کے مابین متعدد امکانی مماثلتیں موجود ہیں لیکن انجام کار وہ دم توڑ دیتی ہیں۔ بعینہٖ جیسا کہ یہ بات درست ہے کہ اسرائیل مقامی عرب آبادی کے ساتھ جو سلوک روا رکھتا ہے، اس کی بنا پر وہ ایک آبادکاروں کی مملکت بنتا ہے اور جنوبی افریقہ سے مشابہ ہے۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ یہ بات بھی پوری طرح عیاں ہے کہ یہ کہنا کہ یہودیوں اور افریقہ کے نو آبادکاروں کے مابین کوئی مکمل مشابہت پائی جاتی ہے، کسی لحاظ سے بھی درست نہیں ہے۔ عرب دُنیا نہ تو ہندوستان، چین یا جاپان کی مانند ہے کہ ان ممالک میں تو نسبتاً یہ صلاحیت ہے کہ وہ اپنے دروازے پوری طرح مشرق یا مغرب کے لیے بند کر لیں لیکن وہ (عرب دُنیا) ایسا نہیں کر سکتی اور نہ یہ ان ممالک کی مانند ہے جہاں کے مختلف اداروں کو نسبتاً خود اختیاری حاصل ہے۔ یہ تمام امور اس من گھڑت سچائی میں مزید اضافے کا باعث بنتے ہیں کہ عرب دُنیا، تیسری دُنیا کے باقی ممالک سے آگے بھی ہے اور پیچھے بھی، ان سے مشابہ بھی ہے اور غیر مشابہ بھی، ان سے مختلف بھی اور ان سے مماثل بھی۔ چنانچہ زمان و مکان نے جو تفریقات، ناچاقیاں، دراڑیں، انقطاعات اور عدم تسلسل پیدا کر دیے ہیں، ان پر کسی بھی عظیم الشان اور رفیع الدرجات تصور...... مثلاً اسلام، عربیت یا قومی آزادی کے حصول کے تصورات...... کا نہ تو آسانی سے اطلاق ہوتا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ اس قسم کے تصورات کو عملی شکل دینے سے پہلے ہمیں ان کو دوبارہ تعریف و تشریح کرنا پڑے گی، ان معنوں میں نہیں کہ ہم ایک اساطیری ماضی (کہیں کہ ہے، پر نہیں ہے) کو بحال کرنا چاہتے ہیں، بلکہ ان معنوں میں کہ ہم زمانۂ حال اور ایک امکانی مستقبل میں زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ تعریف نو اور سیاسی اطلاق کے یہ مسائل وہ مسائل ہیں جو جدید عرب کلچر اور اس علاقے کے متعلق مغربی ماہرین کے تجزیوں میں بہت اہمیت اختیار کر گئے ہیں۔ لیکن عربوں کی جوشیلی، گرما گرم اور جذباتی بحثیں ہوں یا امریکا کے پالیسی سازوں

---

[1] جان سٹائن برگ (The New World (Dis)order) مطبوعہ جریدہ "سیون ڈیز" جلد سوم شمارہ نمبر 3، 30 مارچ 1979ء صفحات 14-16

اور اعلیٰ درسگاہوں سے وابستہ علما اور فضلا کا جذبات سے عاری تجزیہ، دونوں ہی صورتوں میں ٹھوس تجزیے کو تو اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا جاتا ہے اور ان کی جگہ نظریاتی رویے اپنی انتہائی مسموم قوت کے ساتھ جلوہ فگن ہو جاتے ہیں۔ (اور یوں سارا معاملہ گڈمڈ ہو جاتا ہے۔)

اب ایک اور ٹھوس بات لیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ عرب دُنیا کو صحیح طور پر دیکھا (اور سمجھا) جانا چاہیے تو اس سے ہمارا مطلب کیا ہوتا ہے؟ زیادہ تر اس کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ ہم عرب خطے کو دُنیا کا ایک علیحدہ حصہ کہہ سکتے ہیں جس کا اپنا تاریخی اتصاق اور اپنی ثقافتی شناخت ہے، پھر بھی عالم عرب اسی دُنیا میں ہے اور یہ ایشیا اور افریقہ کا، اور ایک مفہوم میں یورپ کا بھی، حصہ ہے۔ تاہم اگر ہم عربوں کی نظریاتی بحثوں کو سنیں، یا ان کے حالیہ ثقافتی اور معاشرتی افکار کا مطالعہ کریں تو ان میں ہمیں بے شمار ایسی باتیں نظر آئیں گی جن کا مقصد عالم عرب کو دُنیا کی ہر دوسری چیز علیحدہ کرنا ہے تا کہ بہ بانگِ دُہل یہ ثابت کیا جا سکے کہ عربی یا اسلامی اعتبار سے یہ فقید المثال ہے، گناہ و ثواب کی ایک مخصوص عربی قسم ہے اور اس (عرب دُنیا) کا ایک مخصوص مقدر ہے۔ اس قسم کے ہوائی قلعے تعمیر کرنے والوں میں ایسے مغربی ماہرین بھی بکثرت شامل ہیں جو مخصوص قسم کے اسلامی یا عرب ''ذہنی رویے،''① ایشیائی شخصیت یا ''اسلام'' کی مرجعت جیسے تصورات کا ڈھول پیٹتے رہتے ہیں اور انھیں بتکرار ہوّا بنا کر پیش کرتے رہتے ہیں (گویا کہ یہ یک لفظی تصورات ہر مسئلے، ہر مشکل کی توضیح کر سکتے ہیں۔) چنانچہ عرب اور فرنگی دونوں ہی اکثر اپنے آپ کو اس مقام پر پاتے ہیں جہاں انھیں ہر استدلال یا حقیقت کو مسترد کرنا پڑتا ہے جو ان کے پہلے سے کسی گھڑے گھڑائے تصور② سے مطابقت نہیں رکھتی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ بعض اوقات دلائل اور خیالات یوں نظر آنے لگتے ہیں۔ جیسے وہ ہوا روک ڈبوں③ میں بند ہوں اور بیرون دُنیا سے ان کا کوئی واسطہ ہی نہ ہو لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ ملفوف دلائل و خیالات اتنے زیادہ

---

① ذہنی رویہ: مصنف نے یہاں انگریزی لفظ mind set استعمال کیا ہے جس کا مطلب ایسا ذہنی رویہ یا رجحان ہے جو کسی صورتِ حال کے وجود میں آنے سے پہلے ہی اس کے متعلق آپ کا ردِعمل متعین کر چکا ہوتا ہے۔

② گھڑا گھڑایا تصور: یہاں مصنف نے انگریزی ترکیب reductive idea استعمال کی ہے۔ اصل لفظ reductionism ہے۔ فلسفے کی اس اصطلاح کے مطابق یہ ایک ایسا نقطۂ نظر ہے جو ہمیں یہ سمجھاتا ہے کہ کسی بھی نظام کو اس کے علیحدہ علیحدہ اجزا کی اصطلاحوں میں پوری طرح سمجھا جا سکتا ہے یا یہ کہ کسی بھی تصور کو نہایت آسان بنا کر پیش کیا جا سکتا ہے۔

③ ہوا روک (Hermetic) ڈبا: ڈبے کو اس طرح مہر بند کرنا کہ اس میں نہ تو ہوا داخل ہو سکے اور نہ اس سے باہر نکل سکے۔ اگر آپ اپنے خیالات میں بے حد ہٹ دھرم ہوں اور کسی معقول سے معقول بات کا بھی آپ پر اثر نہ ہوتا ہو تو آپ بھی خیالات روک کے ڈبے میں بند رہیں۔

زیادہ سیاسی مفہوم کے حامل نہیں رہتے جتنے کہ انھیں ہونا چاہیے تھا، اپنے تجزیے میں بھی وہ حقیقی اور جیتی جاگتی دُنیا کو کم ہی پیشِ نظر رکھتے ہیں اور ہماری توقع کے برعکس وہ اسے (اس دُنیا کو) اتنا آزاد اور خود مختار نہیں رہنے دیتے جتنا کہ ہماری نظر میں اسے ہونا چاہیے۔ بجائے اس کے کہ یہ سمجھنے کی کوشش کی جاتی کہ صحیح صحیح وہ کون سا انداز ہے جو ہر قومی تجربے یا ہر ثقافتی گروہ بندی کو باقی دُنیا سے مختلف بھی بناتا ہے اور اس کے باوجود اسے باقی دُنیا کے ساتھ ایک رشتے کی زنجیر میں منسلک بھی رکھتا ہے، وہ کون سا انداز ہے جو زمانے میں بھی اور انسانوں میں بھی تغیر برپا کرتا رہتا ہے، اکثر و بیشتر ہوتا یہ ہے کہ بہ اعتبار مجموعی مشرقِ وسطیٰ پر یا تو ایسی آرا (یا پالیسیوں) کا اطلاق کر دیا جاتا ہے جو ہر قوم پر موزوں آسکتی ہیں اور یوں وہ (مشرقِ وسطیٰ) کچھ ایسے طریقوں سے دوسری قوموں اور ثقافتوں سے مماثل نظر آنے لگتا ہے جن سے آپ (وہ لوگ جو یہ اطلاق کرتے ہیں) کی انا کی تسکین بھی ہو جاتی ہے (کہ ہائیں یہ تو ہم جیسے ہی ہیں) اور ان طریقوں کا سمجھنا بھی دشوار نہیں رہتا یا پھر معاملہ ہیچو ما دیگرے نیست کا بن جاتا ہے۔ (دوسروں کے مقابلے میں) آپ اپنے آپ کو برتر تصور کرنے لگتے ہیں اور یوں اپنے منہ میاں مٹھو بننے لگتے ہیں۔ اس رویے سے اس عندیے کا اظہار ہوتا ہے کہ تاریخ محض آپ کے ساتھ ہے اور اس سے جو چاہیں آپ استدلال کر سکتے ہیں۔

یہ باتیں حصولِ آزادی کے تصور اور اس (تصور) سے وابستہ امن، حریت، نمو اور انقلابی ترقی کے تصورات پر خاص طور پر صادق آتی ہیں۔ اس تجویز NOTION کے حق میں خوب دلائل دیے جا سکتے ہیں کہ اجتماعی طور پر عربوں کو جس چیز نے ان کی موجودہ حالتِ زار تک پہنچایا ہے، وہ ان کی یہ ناکامی تھی کہ وہ حصولِ آزادی کے متعلق ان خیالات کے جو انھوں نے دوسروں سے مستعار لیے تھے، اور ان خیالات کے جو انھوں نے تجربے کی بھٹی میں سے گزرنے کے بعد خود تشکیل دیے تھے، مابین امتیاز نہ کر سکے۔ صدر سادات کی ابتکاری، جو امریکی شرائط پر اسرائیل کے ساتھ معاہدے پر منتج ہوئی ہے، ایک مقصد یہ سوال پوچھا جانا تھا کہ آیا کھلے عام شکست تسلیم کرنے یا جنگ کرنے میں اپنی نااہلی [1] ظاہر کرنے سے حصولِ آزادی کے متعلق باتیں بنانا یا حصولِ آزادی کے ڈھول بجانا بہتر ہے، خاص طور پر جب ایسا کرنے سے آپ کو اسرائیل سے اپنا کھویا ہوا علاقہ بھی مل سکتا ہو اور زبردست امریکی امداد پر بھی ہاتھ صاف کیا جا سکتا ہو؟ اگرچہ اس بات کا امکان

---

[1] باہر جا کر تو آپ آزادی کی باتیں کرتے رہیں لیکن جب گھر واپس آئیں تو اپنے ہی عوام کو جبر و تشدد کا نشانہ بناتے رہیں۔ اوّل تو میدانِ جنگ کا رخ کرنے سے ہی احتراز برتیں اور اگر جانا بھی پڑے تو اچھی کارکردگی دکھانے کے بجائے وہاں سے دم دبا کر بھاگ آئیں۔ (مصنف)

کم ہی نظر آتا ہے کہ صدر سادات نے جو کچھ کیا، اس کا متبادل قبول کرلیا جائے گا تاہم یہ متبادل ابھی تک موجود ہے۔ بچہ بچہ جانتا ہے کہ قومی جنگ لڑنے کا مطلب کیا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ملک کے تمام وسائل...... انسانی اور مادّی...... مجتمع کیے جائیں اور ان کی لام بندی کی جائے، اس کا مطلب قربانی ہے اور اس کا مطلب ایسے رہنماؤں کی دستیابی ہے جو بصیرت، بالغ نظری، دور بینی اور حوصلے سے بہرہ ور ہوں۔ فی زمانہ اس قسم کے رہنماؤں اور اس قسم کی قومی تحریکوں کی مثالیں ذرا کم ہی ملیں گی۔ اکثر و بیشتر ان کا وجود محض زبردست قسم کی لفاظی یا مبالغہ آرائی اور میلو ① ڈراما سے بھرپور اندازِ بیان میں ہی ملتا ہے۔

موجودہ زمانہ عرب دُنیا سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ سے یہ سوال کریں کہ ''ہم کس قسم کی آزادی کے حصول کے لیے جدّوجہد کررہے ہیں (اور کیا یہ آزادی کا حصول ہی ہے جس کے لیے یہ ساری جدّوجہد ہو رہی ہے؟) اس کے ساتھ ساتھ عربوں کو یہ سوال بھی اپنے آپ سے پوچھنا چاہیے کہ ''جب یہ آزادی حاصل ہو جائے گی، تو پھر ہم کیا کریں گے؟'' یہاں ایک مرتبہ پھر اس بات کا اعادہ کردینا چاہیے کہ باطل مماثلوں پر مبنی درآمدہ جوابات سے کام نہیں چلے گا، ہاں، البتہ ایک مختصر مدّت کے لیے (جب گلا پھاڑ پھاڑ کر کی جانے والی تقاریر اور مرصع دُشنام طرازیاں اور دھمکیاں موجودہ مخمصوں کے جوابات کے طور پر تسلیم کرلی جائیں گی) یہ ضرور کارآمد ثابت ہوں گے۔ بہر حال، جیسا کہ جیرارد شالیاں ② نے اپنی تلخ کتاب ''تیسری دُنیا کا انقلاب'' میں استدلال کیا ہے کہ سیدھی سادھی اور مبالغے سے معرّیٰ حقیقت یہ ہے کہ تیسری دُنیا میں حصول آزادی کے لیے جو تحریکیں چلی ہیں، وہ ایسی حکومتوں کو معرضِ وجود میں لائیں جو کارنامہ تو کوئی سرانجام نہیں دے سکیں کیونکہ ان کے کرتا دھرتا معمولی فہم و فراست کے مالک لوگ تھے۔ البتہ اگر ان کا کوئی طرۂ امتیاز تھا تو یہ تھا کہ انھوں نے مملکت کی پرستش کو فروغ دیا اور غیر پیداواری (کام کی نہ کاج کی) نوکرشاہی اور ظالم و جابر پولیس کو امورِ مملکت پر حاوی کردیا۔ اگر یہ فرض بھی کرلیا جائے کہ فی الحال عرب دُنیا

① اس قسم کے ڈرامے میں ایسے واقعات پیش کیے جاتے ہیں جن کی ایک کڑی کو دوسری کڑی سے ملانے کے لیے کھینچ تان کرنا پڑتی ہے۔ خلافِ فطرت حالات و حادثات کی کشمکش دکھائی جاتی ہے اور زیادہ تر زور اس بات پر دیا جاتا ہے کہ اداکار اپنی گفتگو اور اپنے افعال میں ایسا رویہ اختیار کریں جو ناظرین پر رقت طاری کردے اور انھیں جذباتی تسکین پہنچادے۔ شعلہ بیان مقرر بھی باتوں کے ایسے طوطا مینا بناتے ہیں کہ حاضرین متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے اور یوں معمولی قد کاٹھ کے لوگ بھی بہت اہمیت حاصل کرلیتے ہیں اور معمولی تحریکیں ''عظمت'' کا ''جھومر'' اپنے ماتھے پر سجالیتی ہیں۔

② Gerard Chaliand: Revolution in the Third World Myths and Prospects (Viking Press, New York, 1977)

حصولِ آزادی کی منزل سے دور، بہت دور ہے، پھر بھی اس بات میں کوئی ہرج نہیں بلکہ یہ ایک خوبی کی بات ہوگی کہ ابھی سے یہ طے کرلیا جائے کہ مستقبل میں کن چیزوں سے احتراز کرنا ہوگا اور وہ کون سی چیزیں ہیں جن کا اپنانا قابلِ قبول ہوگا لیکن اس قسم کا غور وفکر فوراً یہ احساس دلادے گا کہ عربوں کے عصری، سیاسی اور معاشرتی کلچر میں انسانی طبقے کو جو مقام حاصل ہونا چاہیے۔توقع کے برعکس اس کے متعلق کوئی خاص تبادلۂ خیالات نہیں ہوا۔ نیز نوآبادیت کا دور گزر جانے کے بعد مملکت کی نوعیت اور کیفیت کیا ہوگی، اس پر بھی سنجیدگی کے ساتھ کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔ اس ناکامی کو دو بالکل ہی مختلف کتابوں ''مقدمات لدراسات المجتمع العربی'' از ہشام شربی [1] اور 1867ء اور 1936ء کے مابین ہسپانیہ کی نراجی تحریک کا مطالعہ [2] کو پہلو بہ پہلو رکھ کر ڈرامائی طور پر ثابت کیا جاسکتا ہے۔

ہشام شربی کی کتاب میں عرب معاشرے کی چیڑ پھاڑ کرنے کی کوشش کی گئی ہے تا کہ یہ ثابت کیا جاسکے کہ اس معاشرے کی خرابی یہ ہے اور اس خرابی کا علاج بھی کوئی نہیں کہ ساخت کے اعتبار سے یہ ابویانہ [3] ہے۔ تحکم پسند اور استبدادی ہے اور قدیم زمانے سے ہی خاندان کو اس میں مرکزی مقام حاصل ہے۔ شربی ایک بہت مشہور ومعروف اور باوقار عرب دانش ور ہیں اور امریکا میں پیشہ تدریس سے منسلک ہیں۔ انھوں نے جو تشخیص کی ہے، آپ اس سے اتفاق کریں یا نہ کریں، یہ آپ کی اپنی صوابدید پر منحصر ہے۔ پھر بھی کتاب کے اختتام پر ہمارے ذہنوں میں ایک سوال کلبلانے لگتا ہے اور ہمارا جی چاہتا ہے کہ شربی سے یہ پوچھیں، حضرت، اتنا تو بتادیں کہ آخر آپ خاندان کی جگہ کس کو دینا چاہتے ہیں؟'' آپ لاکھ سر پٹکیں، شربی کی کتاب آپ کو اس سوال کا کوئی جواب مہیا نہیں کرے گی۔

یہ درست ہے کہ اس قسم کے مبہم اشارے کتاب میں ضرور ملتے ہیں کہ اگر روایتی خاندان کا (ڈھانچہ)

---

(1) یہ کتاب دار المتحدہ بیروت نے 1975ء میں شائع کی تھی۔

(2) انگریزی میں کتاب کا نام The Spanish Anashists 1936 The Heroic Years, 1868-1936 ہے اس کا مصنف Murray Bookshin اور ناشر ہارپر اینڈ رو نیویارک ہے۔ 1978ء میں یہ کتاب دوبارہ چھپی تھی۔

(3) ابویانہ (Patriarchar): ایک ایسا معاشرتی یا سیاسی نظام، جس میں تمام اختیارات خاندان یا قبیلے کے سربراہ کو حاصل ہوتے ہیں۔ یہ سربراہ ہمیشہ مرد اور اپنے باپ کا سب سے بڑا بیٹا ہوتا ہے۔ قبیلے کے تمام افراد ایک دوسرے کے رشتہ دار ہوتے ہیں کہ ان کی شادیاں قبیلے سے باہر نہیں ہوسکتیں۔ سربراہ کے اختیارات کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا اور اس کا ہر لفظ واجب التعمیل ہوتا ہے۔ یہ نظام دُنیا کے متعدد ممالک میں مروج رہا۔ لیکن جدید تعلیم نے کافی حد تک اس کی جڑیں کاٹ دی ہیں۔ بلوچستان میں اب بھی یہ نظام قائم ہے۔ مری، بگٹی، مینگل اور دوسرے قبائل کے سربراہ کا حکم حکومت کے حکم پر فوقیت رکھتا ہے۔

تہس نہس کر دیا جائے تو عربوں کو آزادی، جمہوریت اور جدیدیت نصیب ہو جائے گی۔ لیکن یہ بھی بس اشارے ہی اشارے میں جو کوئی یہاں ہے اور کوئی وہاں ہے، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ کیوں؟ اس کی سیدھی وجہ محض یہ ہے کہ نہ تو شربی نے اس بارے میں کچھ تفکر کیا ہے اور حقیقتاً یوں نظر آتا ہے کہ سماجی امور کے متعلق سوچ بچار کرنے والے اہلِ فکر و نظر نے بھی...... بالخصوص ان لوگوں نے جو علمی انداز سے ان امور کا جائزہ لیتے ہیں...... کہ عربوں کو کس قسم کے انسانی معاشرے کے قیام کے لیے جدّوجہد کرنا چاہیے، کوئی بصیرت افروز نقطۂ نظر یا تصور پیش نہیں کیا۔ 1860ء اور 1936ء کے مابین ہسپانیہ میں جو نراجی [1] تحریک چلتی رہی، بک شن نے اس کا بڑا رقت انگیز مطالعہ پیش کیا ہے اور میرا خیال ہے کہ اس کی کتاب ہمیں بڑی بصیرت افروز باتیں فراہم کرتی ہے۔ اس زمانے میں لاکھوں ہسپانوی کسان اور محنت کش بنیادی طور پر افلاس اور پسماندگی کی چکی میں پس رہے تھے۔ اتنے میں نراجیت کی تحریک چل پڑی اور یہ تحریک ان کسانوں اور محنت کشوں کی اس خواہش کے اظہار کا ذریعہ بنی کہ کاش کہ وہ ایسی برادریاں تشکیل دے سکیں جو جبر و تعدی، مرکز پسند نوکر شاہیوں اور استبدادی حکومت کے چنگل سے آزاد ہوں۔ اگرچہ یورپی ممالک کی تمام دیگر تحریکوں کے ساتھ جو یوٹوپیت [2] اور مارکسزم سے متاثر تھیں، اس (نراجی تحریک) کے بظاہر روابط تھے لیکن کسی دوسرے مغربی ملک میں اس قسم کی تحریک موجود نہیں تھی۔ میں یہاں جو نکتہ اٹھانا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ دو مستثنیات کے علاوہ، جن میں سے ایک تو فلسطینیوں کی وہ کوشش تھی جو انھوں نے ایک نئی قسم کا معاشرہ منظم کرنے کے لیے اپنے خیالات ظاہر کرنے کے سلسلے میں کی تھی اور اس کوشش کو اب تقریباً فراموش کر دیا گیا

---

① نراجی تحریک یا نراجیت (Anarchism): بعض لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ حکومت، خواہ وہ کسی بھی روپ میں لوگوں پر مسلّط ہو، بیکار اور غیر ضروری ہے۔ ایسے لوگوں کو نراجی اور ان کے عقیدے کو نراجیت کہتے ہیں۔ ان لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ حکومت اور اس کے وضع کردہ قوانین و قواعد برائی زیادہ پھیلاتے ہیں اور بھلائی کم کرتے ہیں۔ اگر یہ قوانین و قواعد ختم کر دیے جائیں تو لوگ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون بھی کریں گے اور ان کا رویہ بھی بہتر ہوگا۔ نراجیت کو ماننے والے زمانہ قدیم سے چلے آرہے تھے۔ یونان کے رواقی فلسفی اس خیال کے حامی تھے کہ دُنیا میں نہ کوئی قوانین ہونے چاہییں اور نہ تعلیمی ادارے۔ افراد کے خلاف کوئی طاقت بھی استعمال نہیں ہونا چاہیے۔ اٹھارویں صدی میں انگریز فلسفی گوڈون، روسی مفکر میخائل بکونن اور بعض دوسرے یورپی علما نے حکومت کی تمام اقسام کے خلاف کتابیں لکھیں اور دلائل پیش کیے۔ یہ نظریہ فرد کو سرمایہ داری کے چنگل، ریاست کی محکومیت اور مذہبی اخلاق کے تسلط سے آزادی دلانے کا وعدہ کرتا ہے۔ اس نظریے کی مؤیدین نے روس کے زار الیگزنڈر، اطالیہ کے شاہ ہیمبرت، فرانس کے صدر کارنو، آسٹریا کی ملکہ الزبتھ اور امریکا کے صدر میکلے کو راہئ ملک عدم کیا۔

② Utopianism

ہے اور دوسری کوشش اس لبنانی قومی تحریک نے، جو 77-1975ء کی خانہ جنگی کے دوران میں منظرِ عام پر آئی تھی، کی تھی جو اس نے لبنانی معاشرے کی نئی صورتوں کے متعلق عوام الناس کو بحث مباحثے پر اکسانے کے لیے کی تھی۔ شاید یہ کوئی ایسی ٹھوس معاشرتی صورتیں ہوں گی جن کے لیے عرب دُنیا کے عوام، دانشوروں اور معاشروں نے کسی نہ کسی ٹھوس انداز سے جدّ وجہد کی ہوگی۔ زیادہ سے زیادہ جو ہوتا رہا اور ہو رہا ہے، وہ بس اتنا ہے کہ حصولِ آزادی اور عرب قوم کے متعلق مبہم خیالات و بیانات، جنھیں باہر کی دُنیا کی ہوا تک لگنے نہیں دی جاتی، اشاعت پذیر ہوتے رہے اور ہو رہے ہیں۔ میرا دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اس رویے کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ آپ ایسی اصطلاحات کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں جن کی مدد سے آپ اس قسم کی گفتگو یا بحث کا، خواہ یہ مملکت کے متعلق ہو، معاشرے کی ساخت سے یا خواہ عرب زندگی کی حقیقی صورتوں سے، آغاز کر سکیں لیکن آپ کو کوئی سرا ہاتھ نہیں آتا اور آپ کفِ افسوس ملنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتے۔[1] زیادہ سے زیادہ اگر آپ کو کچھ مل سکتا ہے تو وہ دو قسم کی لفاظی ہے۔ ان میں سے ایک لفاظی تو وہ ہے جس کا تعلق منفی تنقید استرداد، اور سب وشتم سے ہے۔ دوسری قسم کی لفاظی کا تعلق عربوں کی اجلال، ذات[2] خودستائی[3] اور خود پسندیدگی[4] سے ہے۔ لیکن ان دونوں ہی اقسام کی لفاظی کا تاریخ یا سیاست کے ساتھ کوئی خاص تعلق نہیں بنتا۔ دونوں ہی اپنی اپنی ذات کے گنبد میں کچھ اس طرح بند ہیں[5] کہ وہ ایک دوسرے کے لیے کوئی گنجائش نہیں نکال سکتیں اور وہ دونوں محض اس بات کی ضمانت دیتی ہیں کہ مستقبل میں عرب دُنیا کا جو خاکہ بنے گا، اس میں وہ ایک ایسی جگہ نظر آئے گی جس کے ساتھ کچھ بنتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں وہ ایک ایسی جگہ دکھائی دے گی جہاں مردوں اور عورتوں نے اس قدر ہاتھ پیر نہیں ہلائے کہ وہ اس انسانی معاشرے میں، جس کے لیے انھوں نے جدّ وجہد کی تھی، اپنے خیالات اور اقدار کے مطابق تبدیلیاں لا سکتے۔

عربوں کی عمومی ناکامیوں کی، جن کی عکاسی موجودہ صورتِ حال میں ہوتی ہے، تکمیل اس چیز سے ہوتی

---

[1] بہرحال چند مفکرین ایسے بھی ہیں جن کی تصانیف کو مستشنیات کے زمرے میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ ان میں سرفہرست مناف الرزاز کے رشحاتِ فکر ہیں لیکن بدقسمتی سے ان کا انگریزی میں کم ہی ترجمہ ہوا ہے۔ تاہم انور عبدالمالک نے فرانسیسی زبان میں دو کتابیں مرتب کی ہیں اور ان میں آپ کو عربوں کے حالیہ سیاسی اور ثقافتی افکار کی جھلکیاں مل جائیں گی۔ (مصنف)

[2] اجلالِ ذات (Self Glorification) اپنی بڑائی اور عظمت کے زعم میں گرفتار ہونا۔

[3] خودستائی (Self Admiration) اپنے منہ آپ میاں مٹھو بننا

[4] خود پسندیدگی (Self Approbation)

[5] Self Enclosed

ہے جسے کسی بہتر ترکیب یا لفظ کے فقدان کے پیشِ نظر عرب اور مشرقِ وسطیٰ کی دُنیاؤں میں ایشیا کے متعلق امریکی نقطۂ نظر یا امریکی بصیرت کہا جاسکتا ہے۔ امریکی اخبارات وجرائد، حکومت، اور علمی اداروں سے وابستہ دانشوروں کے خیالات میں کچھ تنوع تو نظر آجاتا ہے لیکن ہر جگہ آپ کو امریکی پالیسی اور امریکی مفادات کے متعلق اس (پالیسی) کے تصورات کی گہری چھاپ نظر آئے گی۔ یہ کہنا کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہے کہ اس پالیسی کے بڑے بڑے مقاصد بلکہ فرائض تیل کا حصول اور عوامی اور/ یا قومی میلانات، کے خلاف مسلّح اتحادات کا قیام ہیں۔ دُنیا کے متعلّق جان فوسٹر ڈلس ① نے جو رائے قائم کی تھی یہ اس کی طرف بھونڈے انداز کی معاودت ② ہے۔ موجودہ امریکی پالیسی کے متعلّق واضح ترین بیان نائب وزیر خارجہ ہیرالڈ ایچ سانڈرز ③ نے بارہ جون 1978ء کو ایوانِ نمائندگان ④ کی اس کمیٹی کے، جس کا کام یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کے امور کی نگرانی کرنا ہے، کھلے اجلاس میں اپنی تقریر کے دوران میں دیا تھا۔ سانڈرز نے عمومی انداز سے جو ''مفادات کی بنیادی فہرست'' گنوائی تھی، اس میں اور باتوں کے علاوہ مندرجہ ذیل امور شامل تھے:

تصادم وآویزش روکنے کی امریکی خواہش۔

''اسرائیل کی سلامتی، طاقت اور بہبود کے متعلّق ناقابلِ تنسیخ پیمان۔''

عرب دُنیا (خصوصاً بڑے عرب ممالک کی قوت اور اعتدال پسندی)'' کی اہمیت کا اقرار اور ''مشرقِ وسطیٰ کے عوام کے ساتھ ایک ایسی آویزش کو، جس نے ایک پوری نسل کو مصائب وآلام سے دوچار کیا ہے، ختم کرنے کے لیے امداد کا اخلاقی اور ہمدردی پر مبنی پیمان۔''

---

① جان فوسٹر ڈلس (Dulles) (1888ء۔1959ء) صدر آئزن ہاور کے زمانے میں (1952ء۔1959ء) امریکا کے وزیرِ خارجہ، انھیں فوجی معاہدے کرانے کا بہت شوق تھا۔ سنٹو اور سیٹو انھی کے دماغ کی پیداوار تھے۔

② معاودت (Reversion): اپنی پہلی حالت کی طرف لوٹ جانا۔

③ صدر کارٹر کے دور میں نائب وزیرِ خارجہ

④ امریکی کانگرس (پارلیمنٹ) دو ایوانوں پر مشتمل ہے۔ ایوانِ بالا کو 'سینٹ' کہتے ہیں۔ اس کے ارکان کی کل تعداد 100 ہے اور امریکا کی پچاس ریاستوں میں ہر ریاست عام انتخابات کے ذریعے اپنے دو نمائندے سینٹ میں بھیجتی ہے۔ سینٹ کے ارکان 6 سال کے لیے منتخب ہوتے ہیں۔ لیکن ہر دو سال کے بعد ایک تہائی ارکان کا دوبارہ انتخاب ہوتا ہے۔ یوں سینٹ ہمیشہ برقرار رہتی ہے۔ ایوانِ زیریں کو ایوانِ نمائندگان کہتے ہیں۔ اس ایوان میں ہر ریاست اپنی آبادی کے حساب سے اپنے نمائندے بھیجتی ہے اور ان کا انتخاب صرف دو سال کے لیے ہوتا ہے۔ مختلف امور پر غور وفکر کرنے کے لیے دونوں ایوان مختلف کمیٹیاں (مثلاً امورِ خارجہ یا امورِ دفاع کی کمیٹی) تشکیل کرتے ہیں۔ اصل اختیارات انھی کمیٹیوں کے پاس ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ کمیٹیاں جو رائے دیں، عام طور پر سینٹ یا ایوانِ نمائندگان اسے یوں کا توں قبول کر لیتے ہیں۔

ان مفادات سے ہم آہنگ سانڈرز نے امریکی پالیسی کے چار مقدمات کا اجمالی خاکہ بھی پیش کیا۔

اوّل: چونکہ مشرقِ وسطیٰ کے ساتھ ہمارے جو مفادات وابستہ ہیں، ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ اہم ہے، اس لیے واحد قابلِ عمل پالیسی صرف وہی ہو سکتی ہے جو ہمیں اس قابل بنا دے کہ ہم اپنے ان تمام مفادات کی بہ یک وقت پیروی کر سکیں......

دوم: گزشتہ چار برسوں کے تجربے نے یہ واضح کر دیا ہے کہ ہم ان تمام مفادات کی پیروی صرف انھی حالات میں کر سکتے ہیں۔ جب اسرائیلی عرب آویزش کے پُرامن تصفیے کے لیے کچھ پیش قدمی ہو......

سوم: گزشتہ چند برسوں کے دوران میں مشرقِ وسطیٰ کی بڑی اقوام اور مشرقِ وسطیٰ سے باہر کی عظیم طاقتوں کے مابین تعلقات میں یہ اہم تبدیلی واقع ہوئی ہے کہ ان کا رُخ اب واضح طور پر مغرب کی طرف ہو گیا ہے......

اس خطے میں روس کو واضح تفوق حاصل رہا ہے، یہاں سانڈرز نے اس کے خاتمے کا ذکر کیا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی بتایا کہ مشرقِ وسطیٰ کی اقوام مغرب کو اس لیے ترجیح دیتی ہیں۔ کیونکہ وہ انھیں ایسی ٹیکنالوجی اور انتظامی مہارتیں فراہم کرتا ہے جو ان ممالک کی ترقّی کے لیے ضروری ہیں۔'' اس نے اس بات کا بھی ذکر کیا (اور یہ بات بھی کوئی کم اہم نہیں) کہ ''امن اور ترقّی و نمو کے حصول کے لیے اعتدال پسند عرب رہنما امریکی تعاون کے خواہاں ہیں۔ ان کی کامیابی انتہا پسند قوتوں کے کردار کو محدود کر دے گی......

چہارم: ہم نے جو دوسرے وعدے وعید اور عہد و پیمان کیے ہیں، ان میں کسی قسم کی تخفیف کیے بغیر مشرقِ وسطیٰ میں امریکی مفادات کی تعریف کرتے وقت اس علاقے میں امریکا کے اقتصادی تعلقات کے نئے پہلوؤں کو سنجیدگی سے پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔

سانڈرز جو کھلے عام بیان دے رہا تھا، اس میں اس نے کچھ ہی دیر بعد یہ دعویٰ کیا کہ (صدر) سادات کے دورے کے بعد امریکا کی پالیسی یہ ہو گئی ہے کہ امریکا اب ''دونوں فریقوں کے مابین محض چٹھی رساں کا کردار ادا نہیں کرے گا بلکہ وہ اس سے بڑھ کر بھی کچھ کرے گا۔'' امریکا نے اسرائیل، مصر، اردن، شام، لبنان اور سعودی عرب کے ساتھ جو مذاکرات کرنا چاہے ان کے مرکزی نکات یہ تین نکات تھے۔

اوّل: امن کی نوعیت

دوم: اسرائیلی انخلا اور ''سلامتی کے اقدامات جو اس انخلا کے ساتھ ساتھ عمل میں لائے جائیں گے۔''

سوم: فلسطینیوں کا کردار

حالانکہ عرب مملکتوں اور اسرائیل دونوں ہی کے ساتھ ان امور پر امریکا کو سخت اختلاف یا اتفاق تھا،

گفتگو کا ڈول ڈالنے کی سوچی گئی۔ البتہ ایک نکتے کے متعلق سانڈرز کا رویہ بالکل قطعی تھا (یا کم از کم قطعی نظر آتا تھا) اور وہ یہ تھا کہ ہمارے نقطۂ نظر کے مطابق مغربی کنارے اور غزہ کا مستقبل یہ ہے کہ ان کی اردن کے ساتھ گہری وابستگی ہو۔ ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اس علاقے میں جس کی پہلے ہی قطع و برید ہو چکی ہے، ایک آزاد فلسطینی مملکت کا قیام جو اپنے دل کے کونوں کھدروں میں (فلسطین) واپسی کے جذبات پال رہی ہو، ① (مسئلے کا) حقیقی یا دیرپا حل ثابت نہیں ہوگا۔ ②

سانڈرز کے اس سارے بیان کی عمارت ''امن اور اعتدال پسندی'' کے ارد گرد کھڑی کی گئی ہے اور صاف ظاہر ہے کہ یہ ترکیب اس لیے وضع کی گئی ہے تاکہ ''انتہا پسندی'' قوم پرستی اور موجود عسکری، معاشرتی اور معاشی صورتِ حال کی مخالفت کو بروئے کار نہ آنے دیا جائے۔ میرے خیال میں اس سے بھی اہم تر یہ رائے ہے جس کا اگرچہ کھل کر اظہار تو نہیں کیا گیا لیکن بین السطور مطلب سعدی خوب واضح ہے کہ ہر قسم کی آویزش...... جائز یا ناجائز، معقول یا غیر معقول، حقیقی یا غیر حقیقی...... امریکا کے لیے ناخوب اور ناپسندیدہ ہے، کیونکہ ''ہمارے'' لیے یہ جو بات اہم ہے، وہ صرف یہ ہے کہ (علاقے میں) کوئی تبدیلی نہ ہونے پائے۔ مشرقِ وسطیٰ کا تیل حاصل ہوتا رہے، وہاں اشیائے کھپت کی جو وسیع و عریض منڈیاں ہیں، وہ امریکی کارپوریشنوں کی دسترس میں رہیں اور امریکی حکومت اور مشرقِ وسطیٰ کی ہر بڑی ''اعتدال پسند'' انتظامیہ کے مابین دو طرفہ تعلقات قائم رہیں، چنانچہ عربوں اور اسرائیلیوں کے مابین جو آویزش جاری ہے، اس میں تخفیف یوں نہیں ہونا چاہیے کہ جن مسائل نے اس آویزش کو جنم دیا ہے، ان کو حل کر دیا جائے بلکہ اس آویزش میں کمی اس طریقے سے آنا چاہیے جو امریکا سمجھتا ہے۔ بس اتنی سی بات ہے (جس کا خواہ مخواہ بتنگڑ بنایا جا رہا ہے) اگر اس عمل میں علاقائی، عسکری اور سفارتی مسائل بھی حل ہو جائیں تو سبحان اللہ (امریکا کو اس میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔) اسرائیل اور مصر کے مابین جو سمجھوتا کرایا گیا، اس کا مقصد سانڈرز کے الفاظ میں امریکا کو اس علاقے میں ''ایک قومی موجودگی...... نہ کہ محض حکومتی موجودگی'' ہی عطا کرنا نہیں تھا بلکہ ان تمام مقاصد کو بھی حاصل کرنا تھا جن کا ذکر ابھی اوپر آیا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ فوقیت ایسے عسکری استدقاق ③ قائم کرنے

---

① یہاں مصنف نے انگریزی زبان کا لفظ ''Irredentist'' استعمال کیا ہے اور یہ اس شخص کو کہتے ہیں جو اس بات کا پرچار کرتا ہو کہ وہ علاقے جو کسی زمانے میں اس کی اپنی قوم کی تحویل میں تھے لیکن اب ان پر غیروں نے قبضہ کر لیا ہے، باز یاب کرائے جائیں۔

② MERIP Reports کی جلد نمبر 70 شمارہ نمبر 8، ستمبر 1978 کے صفحات نمبر 15-13 پر ہیرلڈ سانڈرز کا بیان۔

③ استدقاق (Convergence): مختلف سمتوں سے ایک ہی نقطے یا مقام کی طرف پہنچنا۔

کے لیے مخصوص کی گئی جو امریکا کے لیے تو مساعد ہوتے اور رجائی طور پر انتہا پسندوں، قوم پرستوں، اور عوامی تحریکوں کے لیے، جو حالات کا ایک مختلف عینک سے جائزہ لیتی تھیں، نامساعد ہوتے۔ اس کا ٹھوس نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ اپنی جی حضوری کی بنا پر مصر اور اسرائیل مکمل طور پر امریکا کی صنعت اسلحہ سازی کے دست نگر ہوگئے ہیں۔

آئیں! امریکا کے پالیسی مفادات کو تھوڑا سا اور کھنگالیں۔ تیل اور جغرافیائی سیاست[1] کی اہمیت کی اساس جس عزم پر قائم ہے، وہ محض یہ نہیں کہ قوم پرستی اور انتہائی پسندی (یہ کبھی کھل کر نہیں بتایا جاتا کہ ان دونوں چیزوں سے مراد کیا ہے) کی مخالفت کی جائے بلکہ ان (مفادات) کے منطقی مخالفین کو شناخت کرنا ہے، اور یوں ایرانی اور فلسطینی تحریکوں جیسی قوتوں کے خلاف، جو کسی امریکی اتحاد کی مخالفت میں سرگرم عمل ہیں، غیر مشروط امریکی عداوت کا اعلان کرنا ہے اور مزید یہ کہ انسانی حقوق میں سرکاری دلچسپی کے باوجود،[2] جس کا اتنا زور وشور سے ڈھول پیٹا جاتا ہے، امریکا فعال طور پر ہر اس کوشش کے مخالفین کی صف میں شامل ہوجاتا ہے، جو چمچہ گیر حکومتوں (اس بات سے قطع نظر کہ وہ کتنی ہی جابر اور غیر مقبول کیوں نہ ہوں) کو تبدیل کرنے کے لیے کی جائے۔ ایران میں اس کا مطلب محض یہ نہیں تھا کہ امریکا شاہ کی حمایت کر رہا تھا بلکہ اس کا مطلب یہ بھی تھی کہ جنوری 1979ء میں شاہ کے ایران سے فرار کے بعد اس امید پر فوج کو تیل کی رسد پہنچائی گئی تا کہ مسلح افواج امام خمینی کے ساتھیوں کے خلاف انقلاب برپا کرسکیں گی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اردن، سعودی عرب اور کویت کی مخالفت کے علی الرغم اسرائیل اور مصر کے مابین ایک علیحدہ صلح نامے پر دستخط کرالیے جائیں۔ اس

---

① جغرافیائی سیاست (Geopolitics): یہ وہ مضمون ہے جس کا موضوع سیاست پر جغرافیے کے اثرات کا مطالعہ کرنا ہے۔ اس مضمون میں یہ بتایا جاتا ہے کہ کسی قوم کی پالیسی یہ ہونی چاہیے کہ وہ ایسے علاقے حاصل کرے اور انھیں اپنے قبضے میں رکھے جہاں اس کے افراد خوراک اگا سکیں، ضروری معدنیات تلاش کرسکیں اور جہاں وہ اپنے آپ کو بیرونی حملوں سے محفوظ تصور کریں۔ لیکن بعض اوقات یہ خطہ عسکری اعتبار سے اہم ہوتا ہے اور صرف اسی وقت کام آتا ہے جب جنگ جاری ہو۔ برطانیہ نے جبرالٹر پر صرف اس لیے اپنا قبضہ برقرار رکھا ہوا ہے کہ وہاں اس کا ایک بہت بڑا بحری اڈا ہے۔ یہ لفظ 1917ء میں سویڈن کے ایک باشندے نے گھڑا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ سکینڈے نیویا اور جرمنی کے باشندے متحد ہوجائیں۔ ہٹلر نے اس تصور کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر جرمنی کو جوع الارض کا اصول اپنا لینا چاہیے۔ بہر حال اس فلسفے کا ماحصل یہ ہے کہ سیاسی حالات جغرافیائی حالات کے تابع ہوتے ہیں۔

② امریکا کے مشہور ماہر لسانیات نوم چومسکی نے اپنی کتاب ''انسانی حقوق'' اور امریکا کی خارجی پالیسی (مطبوعہ سپوکن مین مکس، واشنگٹن 1978ء) میں اس سرکاری پالیسی کا بھانڈا بیچ چوراہے پھوڑ دیا ہے۔ (مصنف)

کا مطلب یہ تھا کہ ایسی حکومتوں کے ساتھ جو ظالم و جابر ہیں اور باقی دُنیا سے الگ تھلگ ہو چکی ہیں، امریکی مفادات کی وابستگی کا سلسلہ جاری رکھا جائے، جبکہ ان حکومتوں کی بڑی ''خوبیاں'' (یہ بات اسرائیل اور مصر، اور مصر پر بالخصوص صادق آتی ہے) یہ تھیں کہ وہ امریکی ہتھیاروں، قرضوں اور اس قسم کی تکنیکی مہارت کے خوش دل وصول کنندہ تھے جو عوام کی ایک وسیع اکثریت کو ٹرانسسٹر (آلات) کا تو مزید شیدائی لیکن سیاسی طور پر انھیں ناخواندہ بنا دے گی کیونکہ ان عوام کے مفادات کی آبیاری کنٹکی ① طریقے سے چکن فرائی کرنے (مرغ بھوننا) کے اجازت نامے ② حاصل کرنے، کوکا کولا اور ڈٹرائیٹ ③ کی ساختہ کاریں درآمد کرنے اور میریٹ ④ ہوٹلوں کے قیام سے نہیں ہو سکتی اور جہاں تک اس پالیسی کی ناکامی کا تعلق ہے جس کا عملی مظاہرہ متعدد ممالک...... ویت نام سے ایران، ایتھوپیا، افغانستان، پاکستان اور اردن تک...... میں ہو چکا ہے، اس (ناکامی) کو تو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ البتہ پالیسی کی نوک پلک دوبارہ سنواری گئی۔ اسے پہلے سے زیادہ مضبوط بنایا گیا اور اس میں رقوم بھی پہلے سے کہیں زیادہ لگائی گئیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ امریکا میں شاہِ ایران اور ایتھوپیا کے ہیل سلاسی جیسی ناکامیاں برداشت کرنے کی اہلیت لامتناہی ہے۔

یہ درست ہے کہ جب تک امریکا کو سادات اور بیگن جیسے پُراشتیاق اور بے قرار گاہک ملتے رہیں گے، امریکی پالیسی بلا روک ٹوک ان کے حق میں مرتب ہوتی رہے گی۔ لیکن یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایران

① کنٹکی (Kentucky): امریکا کی ایک ریاست کا نام۔ یہاں کی آدھی آبادی زراعت سے وابستہ ہے، مختلف فصلیں کاشت کرنے کے علاوہ یہاں کے لوگ مویشی بھی پالتے ہیں اور مرغبانی کی صنعت بھی چلاتے ہیں۔ چنانچہ یہاں کے بعض لوگوں نے مرغ بھوننے کے جو طریقے نکالے ہیں، انھیں بہت شہرت ملی ہے۔ متعدد ممالک کے تاجر اپنا کاروبار چمکانے کے لیے ان طریقوں کو استعمال کرنے کے حقوق حاصل کرتے رہتے ہیں۔

② اجازت نامہ (Franchise): ایک صنعت کار کسی تاجر کو اپنا مال فروخت کرنے یا دوسرے صنعت کار کو اس قسم کا مال بنانے کا جو اختیار دیتا ہے اسے فرنچائز FRANCHISE کہا جاتا ہے۔

③ ڈٹرائٹ (Deuriot): امریکی ریاست مشی گن کا ایک شہر، صنعت موٹر سازی کا سب سے بڑا مرکز، پیکارڈ، لنکن، کیڈلک، کرائسلر اور پلائی ماؤتھ کاریں یہیں بنتی ہیں۔

④ میریٹ (Marriot): یہ امریکی بھی خوب قوم ہیں۔ دُنیا کے مختلف سرمایہ دار بڑے بڑے ہوٹل تعمیر کرتے ہیں لیکن وہ انھیں چلانے کے حقوق امریکی کمپنیوں کے سپرد کر دیتے ہیں۔ یہ کمپنیاں اپنے نام سے یہ ہوٹل چلاتی ہیں۔ لاہور کا ہلٹن ہوٹل (ایواری) کراچی کا شیرٹن ہوٹل ''اسی قبیل کے ہوٹل ہیں۔'' میریٹ بھی ایک ایسی ہی کمپنی ہے۔ کراچی میں بھی ایک ہوٹل اس کے نام سے زیر تعمیر تھا، پھر پتا نہیں کیا افتاد آ پڑی کہ اس کی عمارت دس سال سے ادھوری پڑی ہے۔ آج کل وہاں شاید اُلو بول رہے ہیں۔

کے بعد جہاں اربوں ڈالر مالیت کے ہتھیار اور شاہ (اور اس کی خفیہ اور عام پولیس) کی حمایت میں دیے گئے متعدد پُرجوش بیانات عام طور پر غیر مسلّح لیکن بنیادی طور پر عوامی مخالفت کے آگے بند نہ باندھ سکے اور شاہ کے تخت و تاج کا تحفظ کرنے میں ناکام رہے، یا اسباق سیکھے گئے؟ غالباً جو کچھ سیکھا گیا، وہ براہِ راست اس معاہدے میں، جو مصر اور اسرائیل کے مابین کرایا گیا، ٹھوس شکل میں موجود ہے۔ اس معاہدے سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ امریکا کوئی غیر تھوڑے ہی ہے بلکہ وہ تو ان علاقائی حکومتوں جیسا ہی ہے (آپ کا جی چاہے تو ان میں سے کسی بھی حکومت کی جگہ امریکا کو بٹھادیں، کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ یہ سبھی ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں) جو غیر مبہم انداز سے یہ کہتی ہیں کہ وہ ان معاشی وسائل سے، جو دراصل دوسروں کی ملکیت ہیں، چمٹے رہنے کے لیے جنگ کرنے پر بھی آمادہ ہیں، جو ہر اس تحریک پر چڑھائی کرنے کے لیے تیار ہیں جو امن، اعتدال پسندی اور ترقّی کے متعلّق درآمدہ خیالات کے سامنے سرتسلیم خم کرنے پر راضی نہیں ہیں اور جو امریکا کے ان پیشگی اندازوں کے، کہ روس کیا کرنے والا ہے اور کیا نہیں کرنے والا ہے، احترام میں عوامی بہبود کو بھی داؤ پر لگانے کے لیے بے چین رہتی ہیں۔

موجودہ سیاق و سباق میں اس قسم کے پالیسی خطوط کی خامیوں کا تجزیہ کرنے بلکہ ان کی نشاندہی تک کرنے میں جو اصل مشکل پیش آتی ہے، وہ یہ ہے کہ ذرائع ابلاغ اور لبرل دانشوروں نے...... جنھیں ایک ایک ایسی حکومت مہمیز دیتی رہتی ہے جس کی مفادات کی مفت میں آبیاری ہوجاتی ہے...... امن، اعتدال پسندی جدیدیت اور ترقّی جیسے تصورات کو امریکا اور اس کے اتحادیوں کی مخصوص حکمتِ عملیوں کے لیے مخصوص کردیا ہے۔ آئی ایف، سٹون جیسے ممتاز صحافی اور تبصرہ نگار بھی، جو نہایت جوش و جذبے کے ساتھ اپنی آزاد رائے کا اظہار کرتے ہیں، ان معاہدوں اور فیصلوں کے خلاف جو کیمپ ڈیوڈ میں طے پائے تھے۔ ایک لفظ تک نہ کہہ سکے بلکہ اتنی دور نکل گئے کہ انھوں نے صدر کارٹر کو ایک ایپک ① ہیرو قرار دے دیا ② جیسا کہ ستمبر 1978ء کے بعد دوسرے لبرل کالم نگاروں ③ کے استدلال سے مترشح ہوتا ہے، عام خیال یہی تھا کہ ''ہمارے پاس جو

---

① ایپک (Epic): یہ اس طویل نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی شخص یا قوم کے شجاعانہ کارناموں کو تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے۔ ایسے واقعات جو مذہب یا حق و صداقت کی حمایت میں رونما ہوں، اس قسم کی نظم کے لیے خاص طور پر مناسب سمجھے جاتے ہیں۔ رزم ایپک کے لیے لازمی خصوصیت نہیں لیکن واقعات کا پُرشکوہ ہونا اور ان میں تسلسل کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اس لیے اس کا ترجمہ ''رزمیہ نظم'' غالباً درست نہیں ہے

② آئی ایف سٹون ''دی کیس فار کیمپ ڈیوڈ'' مطبوعہ ''نیویارک ریویو آف بکس'' مؤرخہ 28 اکتوبر 1978ء

③ اس نکتے کے بارے میں ایک اور صحافی انتھونی لوئیس خاص طور پر بہت پُرجوش تھا۔

کچھ ہے، وہ بس وہی ہے جو کیمپ ڈیوڈ (کے فیصلوں نے) نے ہمیں دیا۔'' اس کے علاوہ کسی اور چیز کے متعلق سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ ان فیصلوں کے علاوہ مشرقِ وسطیٰ میں قیام امن کے متعلق جو خیالات وتصورات پیش کیے جاتے ہیں، وہ بنیادی طور پر متشددانہ، رنگ میں بھنگ ڈالنے والے اور شرارت آمیز ہیں۔ درحقیقت نظر کچھ یہی آتا تھا کہ بیگن اور سادات کے مابین معاہدے کی صورت میں ایک قدم آگے بڑھایا گیا ہے اور نیز کیا پھر اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ آئندہ اسرائیل اور اس کے طاقتور ترین اور سب سے بڑے عرب حریف کے مابین کوئی جنگ نہیں ہوگی؟ نیز کیا اس سے یہ مطلب نہیں نکلتا تھا کہ دوسرے عرب ممالک جنھوں نے کیمپ ڈیوڈ کے معاہدوں کی مخالفت کی تھی، امریکا دشمن، امن دشمن اور یہود دشمن تھے؟ اور سب سے بہترین بات، کیا یہ صحیح نہیں تھا کہ فلسطین مسئلے کے نہ صرف وجود کے متعلق بلکہ اسے حل کرنے کے ایک طریق کار کے متعلق بھی اولین بار کھلے عام ایک بین الاقوامی سمجھوتا طے پایا؟ کیا کیمپ ڈیوڈ میں طے پانے والے معاہدوں کی ایک اضافی خوبی یہ نہیں تھی کہ ان کے ذریعے کمیونزم کو نکال باہر کرنے اور خوش کردار عربوں کے لیے امن اور خوشحالی کے اسباب فراہم کیے گئے تھے؟ تو کیا اب یہ دعویٰ نہیں کیا جائے گا کہ اپنی توانائیاں بیکار قسم کی جنگوں میں جھونکنے اور ضائع کرنے کے بجائے بالآخر عربوں اور یہودیوں کو امریکا کے زیر اہتمام (اور اس کے اشیر باد کے ساتھ) نئے، ترقّی پسند اور خوشحال معاشروں کی تعمیر کے کام میں جُت جانا چاہیے؟

ایک طرف تو اس قسم کے دلائل کا انبار لگایا جارہا تھا، لیکن ان دلائل کو جن اصطلاحات میں بیان کیا جارہا تھا، وہی نئے سوالات بھی ابھار رہی تھیں جن کا کسی کو کوئی جواب نہیں سوجھتا تھا۔ دوسری طرف یہ حال تھا کہ کیمپ ڈیوڈ کے معاہدوں کے جو عواقب، خاص طور پر وہ جن کا تعلق مسئلۂ فلسطین سے بنتا تھا، ظاہر ہونا تھے، ان کے بارے میں کامل خاموشی اختیار کرلی گئی بلکہ نہایت رعونت اور اکڑفوں کے ساتھ ان کو تسلیم کرنے سے ہی انکار کردیا گیا حالانکہ یہ رویہ تاریخی اصولوں کے سراسر خلاف تھا۔ مغربی کنارے، غزہ اور جولان کی پہاڑیوں میں اسرائیل جو بستیاں تعمیر کررہا ہے، کیمپ ڈیوڈ کے معاہدوں میں نہ صرف یہ کہ ان کا کوئی علاج نہیں سوچا گیا بلکہ ان کا ذکر تک نہیں کیا گیا لیکن آپ کو ڈھونڈے سے ایک بھی (مغربی) تبصرہ نگار ایسا نہیں ملے گا جس نے بھولے سے بھی اس فروگزاشت کا ذکر کیا ہو۔ کیمپ ڈیوڈ کے معاہدے کے بارے میں اسرائیلی پارلیمنٹ میں جو بحث ہوئی، اس میں بیگن نے واشگاف الفاظ میں یہ کہا کہ (کیمپ ڈیوڈ میں) جو تبادلۂ خیالات ہوا، جو سمجھوتے طے پائے وہ مصر اور ''عربوں'' کی نسبت اسرائیلی کے زیادہ حق میں جاتے ہیں (بیگن کے الفاظ میں) صحرائے سینا تو مصر کے حوالے کردیا جائے گا لیکن باقی (مقبوضہ) علاقے اسرائیل اپنی تحویل میں رکھے گا۔ کسی مبصر نے اس (دھاندلی) کے متعلق بھی ایک لفظ تک نہ کہا۔ ایک بھی صاحب الرائے شخص نے یہ خیال

ظاہر نہیں کیا کہ تنظیم آزادیٔ فلسطین اور نیز ایک ایک فلسطینی کے پاس نام نہاد حکومت خود اختیاری کے منصوبے ① کی مذمت کرنے کی وجہ موجود ہے۔ یہ منصوبہ تو فریب بھی نہیں بلکہ علانیہ اپنے مقاصد پر روشنی ڈالتا ہے کہ اس کے ذریعے فلسطینیوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسرائیل کے فوجی حکام کی ماتحتی میں کسی بنتوستان میں دھکیل دیا جائے گا حالانکہ بنتوستان جن اصولوں کے تحت قائم کیے جا رہے ہیں، (مثال کے طور پر) امریکا نے بھی ان کی زبردست مذمت کی تھی کیونکہ ان سے حقِ خود ارادیت کے اصولوں کی نفی ہوتی ہے۔ یہ درست ہے کہ کیمپ ڈیوڈ کے مذاکرات کے دوران میں اور ان کے بعد بھی یہی تاثر دیا گیا (ذرائع ابلاغ کے لیے "پس منظر" مہیا کرنے کے لیے جو اخباری کانفرنسیں منعقد کی جاتی تھی اور جن کے متعلق یہ امر بالکل واضح ہے کہ ان کے انعقاد کی باقاعدہ اجازت دی جاتی تھی، ان میں شرما شرما کر اور لجالجا کر یہ بات کہی جاتی تھی) کہ حکومت خود اختیاری کا منصوبہ اس "غیر متعاکس" عمل کی طرف پہلا قدم ہے جس کا مقصد انجام کار فلسطینیوں کو ان کے حقِ خود ارادیت سے بہرہ ور کرنا ہے۔ تاہم نہ تو کیمپ ڈیوڈ کی دستاویزات میں اس کا کوئی ذکر ہے اور نہ صدر سادات نے جو فلسطینیوں کے خود ساختہ مربی بنے ہوئے تھے، معاہدوں کے متن میں اس کا کوئی اندارج کرایا۔ البتہ ان معاہدوں کے ساتھ جو چند خطوط منتھی کیے گئے ہیں، انھوں (سادات) نے ان میں اس کا ذکر ضرور کیا تھا لیکن ان خطوط کے جواب میں اسرائیلیوں نے جو خطوط تحریر کیے تھے، ان میں اس پر خطِ تنسیخ پھیر دیا تھا اور یوں مغربی کنارے کے باشندے اور دوسرے فلسطینی آزادی کی جو آس لگائے بیٹھے تھے، اس پر پانی پھر گیا۔ ② (صدر سادات کے دورۂ اسرائیل کے ساتھ ہی جو خاکہ بننا شروع ہوا تھا، وہ اب ایک واضح صورت اختیار کرتا جا رہا تھا، تل ابیب سے بیت المقدس تک کار کے سفر کے دوران میں موشے دایان نے مصر کے قائم مقام وزیرِ خارجہ سے یہ کہا تھا "صدر سادات سے کہیں کہ وہ اسرائیل پارلیمنٹ کے سامنے جو تقریر کرنے والے ہیں، اس میں تنظیم آزادیٔ فلسطین کے ذکر کو بالکل حذف کر دیں۔ ③" 26 مارچ 1979ء کو معاہدوں پر دستخط کرنے کے سلسلے میں جو تقریب منعقد ہوئی، اس میں تقریر کرتے ہوئے سادات نے فلسطینیوں

---

① اسرائیل کسی قیمت پر بھی مقبوضہ عرب علاقوں سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں۔ وہ ان علاقوں کے عرب باشندوں کو صرف میونسپل سطح کے اختیارات دینا چاہتا ہے۔

② اس ضمن میں یہ خطوط قابلِ مطالعہ ہیں سادات کا خط کارٹر کے نام، کارٹر کا خط سادات کے نام، بیگن کا خط کارٹر کے نام اور کارٹر کا خط بیگن کے نام 18 ستمبر 1978ء کو کیمپ ڈیوڈ میں جو معاہدے طے پائے تھے، ان خطوط کی نقول ان کے ساتھ منسلک ہیں۔

③ ایک صحافی نے اس کی تفصیل فرانس کے ایک جریدے Le Monde Diplomatique دسمبر 1977ء میں دی تھی۔

کے کسی بھی ذکر سے عمداً اجتناب کیا مبادا اسرائیلی ''برافروختہ'' ہوجائیں۔) حکومت خود اختیاری کا یہ منصوبہ مفروضہ طور پر فلسطینیوں کو کیا دینا چاہتا تھا، اس کی اگر کوئی دوٹوک وضاحت ہوسکتی تھی تو وہ وہی ہوسکتی تھی جو اسرائیلی کرتے اور اسرائیلیوں کی قطعی اور فیصلہ کن وضاحت وہ تھی جس کا اظہار وہ اپنے عمل کے ذریعے کر رہے تھے۔ جس روز ''امن'' کے معاہدوں پر دستخط ثبت ہو رہے تھے، عین اسی روز اسرائیل نے اعلان کیا کہ مغربی کنارے پر، جہاں پہلے ہی جگہ جگہ یہودیوں کی 77 بستیاں تعمیر ہوچکی تھی مزید بیس (یہودی) بستیاں بسائی جائیں گی۔

مقبوضہ علاقوں میں اسرائیل جس پالیسی پر عمل کر رہا ہے، میں اس کا ذکر کچھ دیر کے لیے اٹھائے رکھتا ہوں۔ یہاں یہ سوال پوچھا جانا چاہیے کہ ''امن کا عمل''، فلسطینیوں کے ساتھ حقیقتاً جو سلوک روا رکھ رہا تھا اور اس کے متعلق فلسطینی (بلکہ پوری دُنیا کے بیشتر لوگ) جو کچھ کہہ رہے تھے یا جو کچھ ان پر بیت رہا تھا، حکومت (امریکا) اخبارات اور لبرل دانشوران کے درمیان کوئی تعلق کیوں قائم نہیں رہے تھے؟ جس روز واشنگٹن میں امن کے معاہدوں پر دستخط ہوئے، اس سے اگلے دن، ''نیویارک ٹائمز'' میں مغربی کنارے کے ایک قصبے حلحول کے متعلق جوناتھن کینڈل کی ایک رپورٹ شائع ہوئی، ہوا یہ کہ اس قصبے کے باشندوں نے پندرہ مارچ کو صلح نامے کے خلاف مظاہرے کیے۔ اس مظاہرے کے دوران میں اسرائیلی فوجیوں نے ایک اکیس سالہ محنت کش اور ایک سترہ سالہ طالبہ کو گولیوں سے بھون ڈالا۔ اس مظاہرے کی پاداش میں قصبے کے آٹھ ہزار باشندوں کو اجتماعی تعزیر کا سزاوار ٹھہرایا گیا۔ قصبے میں مسلسل 23 گھنٹے کا کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ ٹیلی فون کاٹ دیے گئے، تعلیمی ادارے اور کاروباری مراکز بند کر دیے گئے اور کھیتوں میں کام کرنے کی ممانعت ہوئی۔ کینڈل مزید رقم طراز ہے:

> باہر کے کسی شخص کو قصبے میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ مسلح اسرائیلی فوجیوں کی چوکس نگاہوں کے سامنے لوگوں کو دن میں ایک گھنٹے کے لیے اپنے گھروں سے باہر نکلنے کی اجازت دی جاتی ہے تاکہ خواتین کھانے پینے کی اشیا خرید سکیں، بچے ورزش کرسکیں اور مرد جنھیں زبردستی بیکار رہنے پر مجبور کیا گیا ہے، آپس میں گپ شپ لڑا سکیں۔
>
> ''اس سے مت بات کرو'' ایک اسرائیلی فوجی نے ایک رپورٹر سے چلّا کر کہا جس نے ایک گھنٹے کے وقفے کے دوران میں قصبے کی ایک مضافاتی شاہراہ پر ایک سن رسیدہ شخص سے بات کرنا چاہی تھی۔'' ان کے ساتھ کسی کو بات کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ (27 مارچ 1979ء)

1978ء کے دوران میں جب امریکا کے محکمہ خارجہ نے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے متعلق اپنی

رپورٹ شائع کی تو ''نیویارک ٹائمز'' نے حکومت کو آڑے ہاتھوں لیا اور اپنے ایک ادارے میں اسے جھاڑ پلائی کہ وہ مسائل کو خواہ مخواہ خلط مبحث کا شکار بنا رہی ہے (ایک طرف وہ امن امن پکار رہی ہے اور دوسری طرف ایذا رسانی کی ''داستانیں'' سنا رہی ہے۔) گویا کہ مؤقر اخبار یہ کہنا چاہتا ہو کہ اس قسم کے امور، جیسا کہ اس کے متعلق کینڈل نے اپنی رپورٹ بھیجی تھی، جن میں انسانی حقوق کے بارے میں تمام معاہدوں اور یادداشتوں کی مٹی پلید کردی گئی تھی، معمولی قسم کی غیر متعلقہ چیزیں تھے، میرے خیال میں اس سے بھی بدتر وہ مفروضہ تھا جو ''امن کے عمل'' کے متعلق تمام مباحث میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا کہ فلسطینیوں کو جو کچھ نہایت دریادلی کے ساتھ ان کی اپنی بھلائی کے لیے پیش کیا جارہا ہے۔ انھیں اس پر مطمئن ہو جانا چاہیے حالانکہ نہ ان سے کبھی مشورہ کیا گیا، نہ ان کی کہیں نمائندگی ہوئی اور نہ انھیں کبھی قابلِ توجہ سمجھا گیا اور یہ سب کچھ ایک ایسے وقت پر کہا جارہا تھا جب مقبوضہ علاقوں کے لاکھوں فلسطینی باشندے، تنظیم آزادیٔ فلسطین اور لغوی طور پر ہر مقام کے فلسطینی حکومت خود اختیاری کے منصوبے کو پائے استحقار سے ٹھکرا چکے تھے اور انھوں نے اپنے لیے حقِ خود اختیاری کے منصوبے کو پائے استحقار سے ٹھکرا چکے تھے اور انھوں نے اپنے لیے حقِ ارادیت اور آزادی کے جو اہداف مقرر کیے تھے، ان کے متعلق وہ اصرار کر رہے تھے اور اپنی آواز دُنیا کے کونے کونے میں پہنچا چکے تھے۔ سوال تو یہ ہے کہ آخر امریکا میں کسی بھی شخص نے بانگِ دہل یہ سوال کیوں نہیں اٹھایا کہ تقریباً چالیس لاکھ انسان جو کم و بیش دُنیا کے ہر مقام پر بکھرے ہوئے ہیں، آخر ابھی تک کیوں اپنے اس مؤقف پر ڈٹے ہوئے ہیں کہ وہ اپنی جلاوطنی ختم کرانے اور اپنے مقبوضہ علاقوں کو آزاد کرانے کے لیے، جن کے انھیں ناقابلِ انتقال حقوق حاصل ہیں، اپنی جگہ جاری رکھیں گے؟ اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں، اس پر واقعی عمل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور جو کچھ انھیں پیش کیا جارہا ہے، اس کے متعلق وہ واقعی یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ ان کے لیے ناقابلِ قبول ہے۔

اس کے بجائے بری زنسکی ① نے فلسطینیوں کو مطلع کیا کہ ان کی جماعت ''تنظیم آزادیٔ فلسطین'' ختم ہو چکی ہے۔ ''خدا حافظ، تنظیمِ آزادیٔ فلسطین'' انھوں نے فاتحہ پڑھ دی۔ صدر کارٹر، جنھوں نے عالی ظرفی کے ساتھ ارشاد فرمایا تھا کہ فلسطینیوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مستقبل کو متعین کرنے کی کارروائی میں شریک ہوں (جو کچھ کہا اور کیا جارہا تھا، اس کے پیشِ نظر یہ کوئی معمولی رعایت نہیں تھی) تاہم اس کے ساتھ ان کا یہ

① بری زنسکی (Zbigniew Brzezinsk) (1928ء): صدر کارٹر کے پولش نژاد سیاسی مشیر۔ عقیدے کے اعتبار سے یہودی ہیں۔

استدلال بھی تھا کہ ''ہمارے'' نزدیک تنظیم آزادیٔ فلسطین امریکا کی نازی پارٹی کوکلکس کلین ① اور کمیونسٹ پارٹی سے مشابہ ہے اور ''ہماری یہ خواہش ہے کہ اس کا وجود صفحۂ ہستی سے ناپید ہو جائے۔'' جب سے صدر کاٹر نے اپنا عہدہ سنبھالا ہے، وہ متعدد مواقع پر فلسطینیوں کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں لیکن جہاں تک ہمیں معلوم ہو سکا ہے، فلسطینیوں کے کسی نمائندے کے ساتھ بات چیت تو درکنار، انھوں نے ابھی تک اتنا بھی نہیں کیا کہ کسی بھی (ایرے غیرے ہی سہی) فلسطینی کو ملاقات کا شرف بخش دیتے۔ جہاں تک لبرل دانشوروں، امریکا کی امن پسند یہودی ''فاختاؤں'' شہری حقوق کے علم برداروں اور اس (امریکی) معاشرے میں اخلاقی اعتبار سے بلند و بالا شخصیتوں کا تعلق ہے......ان میں آپ کو ایک شخص بھی ایسا نہیں ملے گا جس نے فلسطینیوں کے حقوق کے بارے میں کبھی کسی علانیہ مؤقف کا اظہار کیا ہو گویا کہ فلسطینی ایک ایسی گالی ہیں جس سے شرفا اور نستعلیق کو احباب کی مجلس میں احتراز کرنا چاہیے، گویا کہ وہ فلسطینی شہری باشندے، جن کے ساتھ اسرائیل......خود دا اپنے اقرار کے مطابق......نہایت منظم طریقے سے وحشیانہ سلوک کر رہا ہے، بالکل وہ لوگ نہیں تھے جنھیں یورش آور صیہونیت نے اپنے گھروں سے بے دخل کیا اور اپنی املاک سے محروم کیا تھا۔ ہاں وہی صیہونیت جو ابھی تک ان کے بچے کھچے علاقوں کو بھی اپنی نو آبادیاں بنانے کے درپے ہے۔ جب بھی مناچم بیگن کی اخباری نمائندوں سے ملاقات ہوئی، اس سے کبھی یہ نہیں پوچھا گیا کہ اس نے ایک ایسے منشور کے بل بوتے پر، جس کا مقصد دریائے اردن کے مغربی اور مشرقی دونوں کناروں ② کا اسرائیل میں الحاق کرانا تھا، انتخابات میں کیسے کامیابی حاصل کر لی یا یہ کہ صیہونیت کے متعلق وہ جس اخلاقی جوش و خروش کا مظاہرہ کرتا ہے، اس کی وہ فلسطینی معاشرے کی تباہی و بربادی کے ساتھ کیسے مطابقت کرتا ہے؟ لیکن اس کے برعکس جب

---

① کوکلکس کلین (KuKlux Klan): صدر لنکن کے زمانہ صدارت (65-1861ء) کے دوران میں امریکا میں خانہ جنگی برپا ہوئی تھی۔ ملک کی جنوبی ریاستیں کپاس کی پیداوار کے لیے مشہور تھیں، وسیع و عریض زرعی فارم گوروں کی ملکیت تھے لیکن ان پر کام حبشی غلام......جنھیں افریقہ سے اغوا کر کے لایا جاتا تھا، کرتے تھے۔ صدر لنکن اور شمالی ریاستیں غلامی ختم کرنے کے حق میں تھیں۔ اس پر جنوبی ریاستوں نے بغاوت کر دی اور یوں خانہ جنگی کا آغاز ہوا۔ انجام کار جنوبی ریاستیں ہار گئیں۔ ملک کا اتحاد برقرار رہا اور غلامی سرکاری طور پر ختم کر دی گئی۔ لیکن بعض سفید فام اس پر خوش نہ تھے۔ انھوں نے نہ صرف صدر لنکن کو قتل کرا دیا بلکہ ایک خفیہ تنظیم کوکلکس کلین کے نام سے قائم کی۔ اس تنظیم کا مقصد دہشت گردی کے ذریعے گوروں کا تفوق برقرار رکھنا تھا۔ 1915ء میں اس کا دوبارا احیا ہوا۔ اب اس کا کام گوروں اور کالوں کے درمیانی نسلی تفریق برقرار رکھنا ہے۔

② بیگن کی پارٹی کے منشور کی اس شق سے صیہونیوں کے عزائم پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ دریائے اردن کا مشرقی کنارہ اردن میں واقع ہے اور اس لیے آج سے چند سال پہلے تک ملک کا نام ہی ''مشرق اردن'' تھا۔

کبھی یاسر عرفات کی اخباری نمائندوں کے ساتھ مڈبھیڑ ہوئی، ان پر ہمیشہ اس قسم کے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی گئی۔" کیا آپ یہودیوں کو سمندر میں دھکیل دیں گے؟ کیا آپ اسرائیل کو تسلیم کرلیں گے؟ تنظیم آزادیٔ فلسطین کا میثاق کیا ہے؟"...... لیکن کسی اخباری نمائندے کو کبھی اتنی توفیق بھی نہیں ہوئی کہ کھلم کھلا نہ سہی اشارتاً ہی کبھی اتنا کہہ دیتا کہ وہ (یاسر عرفات) اور فلسطینی، جن کی وہ نمائندگی کرتے ہیں، درحقیقت روزانہ ایک ایسی مملکت کے حملوں کا شکار ہو رہے ہیں جس کے سر پر انھیں نیست و نابود کرنے کا بھوت سوار ہے۔

یہ کہنا کوئی زیادتی نہیں ہوگا کہ مشرقِ وسطیٰ کے امن کے بارے میں امریکا میں کسی قسم کے اختلاف کے بغیر جو لفاظی استعمال کی جا رہی ہے، اس کے ڈانڈے اس خواہش سے جا ملتے ہیں کہ مسئلۂ فلسطین کے یا تو پر قینچ کیے جائیں یا پھر شاید کسی طرح اس کا ڈبا ہی گول کر دیا جائے۔ یہ جو قطعی حل کے طور پر مسئلے کا ڈبا ہی گول کر دینے کے متعلق سوچا جاتا ہے، پتا نہیں کہ یہ پیشگی منصوبہ بندی کے تحت ہو رہا ہے یا ویسے ہی، لیکن فلسطینی جس چیز کی اب مزاحمت کر رہے ہیں، وہ یہ ہے کہ مسئلۂ فلسطین دفن نہ ہونے پائے۔ چنانچہ آج کل "امن" کو جو یہ معنی پہنائے جا رہے ہیں کہ مسئلۂ فلسطین کی اہمیت کم کر دی جائے یا اسے بالکل ہی ختم کر دیا جائے، اگر کوئی فلسطینی اس سے متفق ہوتا نظر نہیں آتا، تو کسی کو قطعاً کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ایک حقیقت ہے اور یہ اس وقت اور بھی زیادہ حیرتناک دکھائی دینے لگتی ہے جب ہمیں یہ یاد آتا ہے کہ صیہونی نوآبادکاری کے خلاف اپنی صد سالہ جدّوجہد کے دوران میں فلسطینی عوام نے اپنی صفوں میں ایک بھی کوئز لنگ [1] پیدا نہیں کیا اور ان کا کوئی نمائندہ بھی معاند قوتوں کی زبردست سے زبردست تنظیم کے بھی سامنے، جس کے تقدّس پر مغربی طاقتوں نے بھی اپنی مہر ثبت کر دی ہو، گھٹنے ٹیکنے کے لیے تیار نہیں اور نہ وہ اس بات پر آمادہ ہے کہ فلسطینی ان (معاند طاقتوں) کا دم بھرنے لگیں۔ حقیقی معنوں میں مشرقِ وسطیٰ میں امن کا قیام صرف دو راستے ہی اختیار کرنے سے ممکن ہے اور ان دونوں راستوں کے مابین جو خلیج حائل ہے، فی الحال بالکل انھی حقیقی معنوں میں ان کا پاٹا جانا ناممکن ہے۔ ایک راستے کا آغاز کیمپ ڈیوڈ سے ہوتا ہے اور اس کا اختتام ایک ایسی "حکومت خود اختیاری"

---

(1) کوئز لنگ (Widkun Quisling): 1887ء میں ایک یورپی ملک ناروے میں پیدا ہوا۔ یہ اپنے ملک کا میر جعفر تھا کہ اس نے جنگِ عظیم دوم کے دوران میں جرمنی کو اپنا ملک فتح کرنے میں مدد دی تھی۔ پہلے یہ فوجی افسر بنا اور پھر سیاستدان۔ 1931ء میں وہ ناروے کا وزیرِ دفاع مقرر ہوا۔ تاہم دو سال بعد وہ اپنے عہدے سے مستعفی ہوگیا اور اس نے اپنی فاشی پارٹی قائم کرلی۔ جب جرمنی نے 1940ء میں ناروے پر حملہ کیا، تو یہ ان کا مددگار بن گیا اور اس کے عوض ملک کا وزیرِ اعظم مقرر رہا۔ تاہم جنگ کے بعد 1945ء میں وہ گرفتار ہوا۔ اس پر غداری کے الزام میں مقدمہ چلا اور پھر اسے گولی مار دی گئی۔ اس نے دُنیا کی زبانوں کو ایک نیا لفظ "کوئز لنگ (یعنی غدار)" دیا ہے۔

پر ہوتا ہے جو غیر معین عرصے تک اسرائیل، مصر اور امریکا کی تحویل میں رہے گی۔ اس کا جو یقینی نتیجہ برآمد ہوگا، وہ یہ ہوگا کہ آویزش جاری رہے گی، ہتھیاروں کی فراہمی (اور استعمال) میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہے گا اور امریکا اور اس کے حواریوں کے خلاف عوامی طاقتیں عددی اعتبار سے بڑھتی رہیں گی۔ اس راستے کے پیچھے جو حکمت کارفرما ہے وہ یہ امید ہے کہ طاقت میں اتنی ترغیب ہے کہ اس کے سامنے حق خود ارادیت کے حصول کے لیے فلسطین عزم (خود بخود) چکنا چور ہو جائے گا۔ بس اتنی سی بات ہے۔ اس میں نہ کوئی ہیر پھیر ہے اور نہ اگر مگر۔ تاہم اس بات سے قطع نظر کہ آپ جدیدیت، ترقّی اور امریکی امداد کے وعدوں سے حقیقت کو خواہ کتنا ہی حسین بنا کر کیوں نہ پیش کریں، بنیادی مسئلے پر جو سودے بازی ہو رہی ہے، اس کے ضرر رساں پہلوؤں کی شدّت میں کوئی تخفیف نہیں کر سکیں گے اور یہ سودے بازی کیا ہے، فلسطینیوں سے یہ عہد و پیمان کیا جارہا ہے کہ آپ کی قومی عدم آزادی کا سلسلہ جاری رہے گا۔

اس راستے کے کنارے کنارے جو ''نشاناتِ راہ لگائے گئے ہیں، ہر فلسطینی کے لیے ان کا مفہوم سمجھنا نہایت آسان ہے، اگرچہ (مثال کے طور پر) آپ کو شاید ہی کوئی ایسا امریکی ملے گا، جسے ان علامتوں کو، جن کے ذریعے یہ نشانات ظاہر کیے جاتے ہیں، سمجھانے کے لیے کوئی مناسب ہدایت نامہ فراہم کیا گیا ہو۔ لیکن جب یہ بات پیش نظر رکھی جائے کہ 1970ء کے بعد کے چند سالوں کے دوران میں فلسطینیوں کو چار بڑی جنگیں لڑنا پڑیں، ① (یہ جنگیں، شام، اردن، اسرائیل اور لبنانوں کے دائیں بازو نے شروع کی تھیں اور ان میں انھیں اکثر و بیشتر امریکا کی کھلم کھلا حمایت حاصل تھی جو ابھی تک اپنے آپ کو فلسطینی حق خود ارادیت کی تائید کرنے کے لیے آمادہ نہیں کر سکا۔) ② تو فلسطینیوں کے جنگجویانہ رویہ سمجھنے میں کم دشواری پیش آئے گی۔ اس قسم کی پالیسی اپنانے کے بعد ایران میں جو کچھ ہوا...... جہاں امریکا نے عوام کی زبردست اکثریت کے خلاف اپنے آپ کو ایک جابر کٹھ پتلی کے ساتھ وابستہ کر لیا تھا...... اگر اس کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس قسم کا راستہ اختیار کرنے کے، جس میں امریکا کو کہیں زیادہ براہِ راست سرمایہ کاری کرنا پڑ رہی ہے، نتائج نہایت بھیانک ہوں گے۔ علاوہ ازیں، اسرائیل نے ایک ایسے مصر کے ساتھ علیحدہ معاہدہ امن کر لیا ہے جو بظاہر اس بات پر خوش ہے کہ اسے اب لیبیا کے خلاف چکّر چلانے کی کھلی چھٹی مل گئی ہے اور اسے ان سیاسی اور

---

① 1980ء کے عشرے کے دوران میں لبنان میں فلسطینی پناہ گزینوں کو جن آزمائشوں میں سے گزرنا پڑا، ان کے بعد اس قسم کی جنگوں کا کوئی شمار ہی نہیں رہا۔ (مترجم)

② اگر ان اخراجات کو پیشِ نظر رکھا جائے جو امریکا کو فلسطینیوں کو منظرِ عام سے اوجھل کرنے کے سلسلے میں برداشت کرنا پڑے ہیں۔ تو امریکا کا یہ موقف اتنا نامعقول بھی نظر نہیں آتا۔ (مصنف)

معاشرتی ذمہ داریوں سے بھی چھٹکارا مل گیا ہے جنھیں اس کے رہنماؤں نے امریکا سے علیک سلیک بڑھانے کے لیے ترک کر دیا ہے (چنانچہ اب) اسرائیل فلسطینیوں اور بچی کھچی عرب قوم پرستی کے خلاف مزید جارحانہ کارروائیاں کرنے کے لیے تیار بیٹھا ہے۔ امریکا سے اسے تقریباً غیر محدود اسلحہ دھڑا دھڑ پہنچ رہا ہے۔ اپنی قوم کی اس حقیقی ضرورت کو، کہ کسی نہ کسی وقت اسے عرب دُنیا کے ساتھ کوئی نہ کوئی سمجھوتا کرنا ہی ہوگا، پس پشت ڈال کر اسرائیل اب مستقبل کا سامنا کر رہا ہے۔

ان تمام امور کے پیش نظر یہ مفروضہ کیسے قائم کرلیا گیا ہے کہ ان سے مشرقِ وسطیٰ میں جامع امن کے قیام کی راہ ہموار ہوگئی ہے، آسانی سے سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ ہر وہ جائزہ جو نہایت دیانتداری سے لیا گیا ہو، اس راستے کے صحیح ہونے کی تصدیق کر دے گا جس کا میں ذکر کرتا چلا آرہا ہوں اور جس کے بارے میں اقبال احمد [1] نے حال ہی میں تحریر کیا ہے۔ ''یہ ورثے میں پائی ہوئی ان جبلتوں کی ایک مثال ہے جو رہنماؤں کو اتنا کورچشم بنا دیتی ہے کہ وہ تاریخ کے عمل کو صحیح طور پر نہیں دیکھ سکتے۔ [2] کیا ہر اس چیز کی مخالفت میں جس میں مقبول عام قوم پرستی کا خفیف سا شائبہ بھی موجود ہو، امریکی رہنما اتنے کورچشم ہو چکے ہیں (ویت نام اور ایران کے واقعات کے بعد تو یہ حال ہو گیا ہے کہ کسی کو اتنی بھی فرصت نہیں رہی کہ ان رہنماؤں کے رویے پر ذرا تنقیدی جائزہ ہی لیں، ان کی اس کورچشمی اور بے بصیرتی کو آنکھیں بند کر کے قبول کرلیا جاتا ہے) کہ وہ اپنے ردِ عمل کا کسی اور صورت میں اظہار کرنے سے قاصر ہو چکے ہیں، ماسوا اس کے کہ وہ مزید اسلحہ دھڑا دھڑ فروخت کرتے یا مہیا کرتے رہیں اور یا پھر اسرائیلی مصری معاہدۂ امن جیسی مزید سکیموں پر سرمایہ کاری کرنے کے لیے اپنی کوششیں تیز سے تیز تر کر دیں؟

یہ ضد، یہ ہٹ دھرمی، یہ تمرد خاص طور پر حوصلہ شکن ہے اور اسے ایک ایسی لفاظی کے ذریعے امریکی عوام کے سامنے پیش کیا جاتا ہے جو ذہانت کے منہ پر ایک طمانچہ ہے۔ یہ سب کچھ ایک ایسے وقت پر کیا جا رہا ہے جب کہ دوسرے مواقع...... دوسرا راستہ جس کا میں نے اوپر ذکر کیا تھا...... واضح طور پر موجود ہیں میں اس راستے کی حقیقتیں آئندہ صفحات پر بیان کروں گا۔ یہاں میں صرف اس حقیقت کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں کہ ہر

---

[1] اقبال احمد نہایت ذہین وفطین پاکستانی دانشور ہیں اور وہ ''واشنگٹن انسٹی ٹیوٹ فار پالیسی سٹڈیز'' سے وابستہ ہیں۔ (مصنف)
اقبال احمد کئی مرتبہ پاکستان بھی آچکے ہیں اور اپنے لیکچروں میں، جو انھوں نے مختلف مواقع پر یہاں دیے، ان خطرات کی نشاندہی کر چکے ہیں جو پاکستان کو درپیش ہیں۔ وہ پاکستان کی موجودہ خارجہ پالیسی کے بھی بہت بڑے نقاد ہیں۔ (مترجم)

[2] روزنامہ ''نیویارک ٹائمز'' مؤرخہ 26 مارچ 1979ء

عرب مملکت اقوامِ متحدہ کی قراردادِ نمبر 242 کو اس علاقے میں امن کی اساس کے طور پر قبول کر چکی ہے۔ تنظیمِ آزادیٔ فلسطین اس بات کا عندیہ دے چکی ہے کہ اگر امریکا فلسطینیوں کے حقِ خود ارادیت کی حمایت میں، جس کا نقطۂ عروج ایک آزاد مملکت کا قیام ہوگا، اعلان کر دے تو وہ جوابی کارروائی کے طور پر امن کے متعلق نہایت ٹھوس تجاویز پیش کر دے گی۔ مزید برآں جدید فلسطینی تاریخ میں پہلی مرتبہ مندرجہ ذیل امور کا ظہور ہوا ہے:

(الف) صحیح، سچی اور جائز فلسطینی قیادت

(ب) فلسطینی قومی اتفاقِ رائے (اجماع)

(ج) ان دونوں صورتوں میں نہ صرف اپنے حق خود ارادیت کے خدّ وخال (ان خطوط پر جن کا تعین فلسطینی قومی کونسل نے اپنے گزشتہ تین اجلاسوں 1974، 1977 اور 1979ء میں کیا تھا) کی وضاحت کرنے کی بلکہ اپنے مؤقف کو کچھ اس طرح تبدیل کرنے کی صلاحیت تاکہ فعال انداز سے امن کو فروغ دیا جا سکے۔

یہ امور تو اپنی جگہ موجود ہی ہیں۔ ان کے علاوہ دو اور باتیں بھی ہیں:

1۔ امریکا کے ساتھ مستقبل میں تعلقات استوار کرنے کے متعلق عرب قیادت کا واضح جھکاؤ ''اعتدال پسندی'' کی طرف ہے۔

2۔ اس کے باوجود کہ امریکا عرب قومیت کی مخالفت کرتا چلا آ رہا ہے (اور اس کی اس مخالفت کا عرصہ پوری ایک نسل پر محیط ہے) یہی عرب قیادت اب بھی اس بات پر آمادہ ہے کہ اسے امریکا کے متعلق جو حُسنِ ظن تھا، اسے برقرار رکھا جائے۔

اگر ان تمام امور اور باتوں کو یکجا کر کے دیکھا جائے تو پھر امریکیوں کو ایک ایسی پالیسی کی طرف جو پہلے کی نسبت زیادہ فراخ دلی پر مبنی ہو اور جس میں خبطِ عظمت کا احساس بھی نسبتاً کم ہو، کشاں کشاں کھنچے جانا چاہیے۔

اب سوال یہ ہے کہ امریکا کب تک نیک عزائم اور امن کی زبان استعمال کرتا رہے گا جبکہ عملاً وہ اس زبان کے بالکل متضاد مقاصد کے حصول کے راستے پر گامزن ہے؟ اپنے متعدد دوسرے پیش روؤں کی طرح صدر کارٹر بھی ہر شخص کو یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ تنگ نظری، عسکریت دھڑے بندی اور مداخلت کاری کے ذریعے کسی وقت بھی ایک منصفانہ اور جامع امن کا مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ میرا نکتہ یہ ہے کہ جب تک آپ ان اصطلاحوں کے ساتھ، جو محدود مفاہیم کی حامل ہیں چمٹے رہیں گے، کوئی تبدیلی عمل میں نہیں لا سکیں گے کیونکہ اس قسم کی تبدیلی کی اساس اس امر پر رکھی جا رہی ہے (اور تاریخی طور پر بھی یہی ہوتا رہا ہے) کہ فلسطینی اپنے قومی وجود سے دستبردار ہو جائیں۔ ان دو باتوں کے مابین جو ناقابلِ قبول گرہ لگائی جا رہی ہے، جب تک اس کی تفہیم نہیں کی جائے گی، التباسات، تشدد اور انسانی جانوں کے ضیاع کا سلسلہ جاری رہے گا۔

②

مصر، اسرائیل اور امریکا معاہدے میں اور کیا کچھ شامل تھا؟

جب 26 مارچ 1979ء کو واشنگٹن میں جمی کارٹر، انوار السادات اور مناحم بیگن تمتماتے چہروں کے ساتھ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اس معاہدۂ امن پر، جس کے متعلق یہ مفروضہ قائم کرلیا گیا تھا کہ وہ مشرقِ وسطیٰ کی مشکلات و مصائب کے خاتمے کا نقطۂ آغاز بن جائے گا، دستخط کرنے کے لیے تیار کھڑے تھے تو اس لمحے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس مہیب، دہشت ناک اور پیچ در پیچ تاریخ کو صفحۂ ہستی سے محو کرنے کی فکر میں ہیں جس نے انھیں اتنی کامیابی اور طمطراق کے ساتھ عالمی سٹیج کے عین مرکز میں لا کھڑا کیا تھا (اور تمام دُنیا کی نگاہیں ان پر لگی ہوئی تھیں۔) تصویر کا یہ رُخ جس سے یہ عندیہ ملتا تھا کہ اب آویزش اور مخاصمت کے دور کا خاتمہ ہو جائے گا، کتنا طاقتور نظر آتا تھا۔ لیکن افسوس، صد افسوس یہ تصویر حقائق کی سچی تصویر نہیں تھی بلکہ یہ تو ایک مسلسل جدل کے متعلق جس کے خلاف امریکا نے اپنی بے پناہ قوت براہِ راست جھونک دینے کا سرکاری طور پر پہلی مرتبہ عہد و پیمان کیا تھا، بس ایک قسم کی ٹیلی ویژن کی اشتہاری فلم تھی اور اس سے زیادہ وہ کچھ اور ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ (جب ادھر معاہدۂ امن پر دستخط ثبت ہو رہے تھے۔) عین اسی وقت لگ بھگ ایک سو امریکی فوجی مشیر شمالی یمن کی حکومت کو جنوبی یمن کے خلاف اپنی جنگ جاری رکھنے کے لیے اپنے مشوروں سے نواز رہے تھے۔ جہاں تک خطے کے باقی ممالک کا تعلق ہے، وہاں بھی امریکا ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھا تھا۔ وہ نہایت خاموشی اور رازداری کے ساتھ ہر اس طبقے، جماعت یا حکومت کی جو عوامی ''بدنظمی''، عدم استحکام، یا نام نہاد

بحران کے خلاف صف آرا تھی، دامے، درمے اور سخنے مدد بھی کر رہا تھا اور انھیں ہلہ شیری بھی دے رہا تھا (جہاں تک سعودی عرب اور اردن کا تعلق ہے، وہ ان کی ناز برداری بھی کر رہا تھا اور چاپلوسی بھی۔) خود اپنی تاریخ کے جن عوامل......آزادی اور انسانی حقوق کے حصول اور جبر و استبداد سے رہائی پانے کی جدّ و جہد......کو امریکا کبھی خراجِ تحسین پیش کرنے سے نہیں چوکتا، مشرقِ وسطیٰ کے بارے میں اس نے جو مؤقف اختیار کرلیا تھا، اس کے پیشِ نظر یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ وہاں وہ ایسے طبقوں کی حوصلہ افزائی کرتا جو اپنے لیے انھی چیزوں کے حصول کے لیے برسرِ پیکار تھے۔ جب حال یہ ہو کہ ایک طرف تو عوام کے ذہنوں میں اسلامی سرکشی کے خلاف نفرت، کراہت اور خوف کے جذبات بھی کوٹ کوٹ کر بھرے جا رہے ہوں ① اور دوسری طرف ان قیمتوں کے خلاف، جو عربوں نے اپنے تیل کی مقرر کی تھیں، غم وغصہ میں اضافہ ہو رہا ہو، انتظامیہ کی اسی کوشش کو جو مصری اسرائیلی معاہدے کو ایک معرکے کی چیز بتا کر پیش کرنے کے ضمن میں کی جا رہی تھی، عام سوجھ بوجھ پر مبنی اچھی خاصی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ مارچ کے اواخر میں ''نیویارک ٹائمز'' اور کولمبیا براڈ کاسٹنگ سسٹم ② نے مشترکہ طور پر ایک محدود رائے شماری ③ کا انتظام کیا۔ جب اس رائے شماری کا تجزیہ کیا گیا تو انکشاف ہوا کہ (امریکی) عوام کی ایک بھاری اکثریت اس معاہدے سے قطعاً متاثر نہیں ہوئی تھی۔ اس کی (امریکا کو) جو قیمت چکانا پڑ رہی تھی، عام لوگوں کے تخمینے کے مطابق وہ بہت زیادہ تھی۔ مصر اور اسرائیل کو اسلحہ کی فراہمی

① اسلامی مشرق سے مغربی تہذیب کو جو نام نہاد خطرات لاحق ہیں، ان کے متعلق لاتعداد مضامین، مقالات اور کتب منظرِ عام پر آتی رہتی ہیں اور ہر شخص کی نظروں سے گزرتی رہتی ہیں۔ (مصنف)

② امریکا میں ریڈیو اور نشریات کا انتظام نجی اداروں کی تحویل میں ہے۔ جس شخص کی جیب میں چند پیسے ہوں وہ اپنا ریڈیو یا ٹی وی سٹیشن کھول لیتا ہے۔ آمدنی کا ذریعہ اشتہارات ہیں۔ لیکن جن کمپنیوں کی قومی اور بین الاقوامی سطح پر اہمیت حاصل ہے۔ وہ ''کولمبیا براڈ کاسٹنگ سسٹم (C.B.S) امریکن براڈ کاسٹنگ کمپنی (A.B.C) اور ''نیشنل براڈ کاسٹنگ کارپوریشن (N.B.C) ہیں۔

③ یہ دیکھنے کے لیے کہ مختلف معاملات کے بارے میں عوام کیا سوچتے ہیں، محدود رائے شماری کا انتظام کیا جاتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ مختلف طبقوں کے چیدہ چیدہ افراد کو خطوط بھیج دیے جاتے ہیں یا رائے شماری کرانے والے اپنے نمائندے بالمشافہ ملاقات کے لیے روانہ کر دیتے ہیں۔ اس طریقے سے جو آرا موصول ہوتی ہیں، انھیں عوام کی رائے تصور کرلیا جاتا ہے۔ کیونکہ رائے دینے والوں کا تعلق ہر طبقے سے ہوتا ہے۔ عام انتخابات سے پہلے اس قسم کی رائے شماری کا خاصہ رواج چل پڑا ہے۔ سب سے پہلے اس طریقے کو امریکا کے ایک شخص جارج ہوریس گلپ (Gallup) (سال پیدائش 1901ء) نے استعمال کیا تھا، اس لیے اس قسم کی رائے شماری کو ''گیلپ پول'' کہا جاتا رہا۔ اب جو شخص یا ادارہ یہ رائے شماری کراتا ہے، وہ اپنا نام ساتھ لگا دیتا ہے۔

کے لیے جو رقوم مہیا کی جانا تھیں (اس سلسلے میں مختلف اندازے لگائے گئے ہیں جو پانچ ارب اور پندرہ ارب ڈالر کے مابین ہیں) ان کے بارے میں عوام کے ایک بہت بڑے طبقے نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ 70 فیصد سے زیادہ جواب دہندگان کو یہ بات پسند نہیں آئی کہ امریکا نے اسرائیل کو آئندہ پندرہ سالوں تک تیل مہیا کرنے کا قول دیا ہے۔ ①

تاہم جیسا کہ میں بار بار عرض کر چکا ہوں، یہاں ایک ایسا تناقضہ پایا جاتا ہے، جس سے صرفِ نظر کرنا بڑی بددیانتی ہوگی۔ جمی کارٹر پہلے صدر تھے، جنھوں نے اگرچہ تجریدی طور پر ہی سہی لیکن پہلی مرتبہ سنجیدگی کے ساتھ فلسطینی قوم کا ذکر کیا تھا۔ شمعون پیریز ② جیسے مخالف پارٹیوں سے تعلق رکھنے والے اسرائیلی رہنماؤں نے بھی پہلی مرتبہ فلسطینی حقوق اور یا مفادات کا ذکر کرنا شروع کر دیا تھا اور یہ اس بات کی علامت تھی کہ معاملہ ماضی کے مقابلے میں خاصا مختلف ہو چکا ہے چنانچہ یہ امر تسلیم کر لیا گیا کہ فلسطینی ایک ایسی موجودگی ہیں جن کے ساتھ سنجیدگی سے نپٹنا ہوگا۔ تاہم یہاں ہمیں یہ بھی ماننا ہوگا کہ مخالف پارٹیوں کے ان رہنماؤں کو سیاسی طور پر اتنا سخت دھچکا لگا اور ان کا اپنا وجود اس قدر مسلسل خطرے کی زد میں رہا کہ انھیں عرب دُنیا کے باہر اپنے مؤقف اور ضروریات کے چیدہ چیدہ نکات کا ابلاغ کرنے میں سخت دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن جب فضا اس قسم کی ہو چکی تھی، تو پھر معاہدے میں انھیں نظر انداز کیوں کر دیا گیا اور یا اگر ان کے بارے میں کوئی توجہ دی گئی تو وہ نہ ہونے کے بغیر کیوں تھی؟ اور کیا کچھ وقوع پذیر ہونے والا تھا جس کے بارے میں آنکھیں بند کر لی گئیں؟

آئیں۔ ہم اپنی گفتگو کا آغاز مصر کے حوالے سے کرتے ہیں۔ صدر سادات کے متعلق لوگوں کا رویہ یہ ہے کہ وہ خواہ مخواہ کج بحثی پر اُتر آتے ہیں (عرب دُنیا میں ان کی مخالفت ہیں اور مغرب میں ان کی حمایت میں دلائل کے ڈھیر لگا دیے جاتے ہیں۔) چنانچہ وہ بھی ایک ایسی تمثال (امیج) بن چکے ہیں جس کی نہ کوئی تاریخ ہو اور نہ کوئی سیاسی مفہوم۔ یہ بہت دنوں پہلے کی بات ہے۔ 1971ء میں اقوامِ متحدہ کے سیکریٹری جنرل کے

① تفصیلات کے لیے روزنامہ "نیویارک ٹائمز" کا شمارہ مؤرخہ 29 مارچ 1979ء ملاحظہ فرمائیں۔

② اسرائیل کی لیبر پارٹی کا سربراہ پیریز خود بھی اسرائیل کا وزیرِ اعظم رہ چکا ہے۔ اسرائیل میں دراصل زیادہ عرصہ لیبر پارٹی ہی برسرِ اقتدار رہی ہے۔ 1970ء کے عشرے کے وسط میں بیگن کی لیکوڈ پارٹی اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ 1984ء میں بیگن سیاست سے ریٹائر ہوگیا۔ اس کے بعد جو انتخابات ہوئے، اس میں کسی پارٹی کو واضح اکثریت حاصل نہ ہو سکی۔ چنانچہ لیبر پارٹی اور لیکوڈ پارٹی کو مخلوط حکومت بنانا پڑی۔ معاہدے کے مطابق پہلے دو سال پیریز وزیرِ اعظم رہا۔ آج کل وہ اسی مخلوط حکومت میں وزیرِ خارجہ ہے۔ تاہم فلسطینیوں کے متعلق ان دونوں پارٹیوں میں اچھا خاصا اختلافِ رائے پایا جاتا ہے۔

نمائندے کی حیثیت سے سویڈن کے سفارت کار گنار جارنگ مشرقِ وسطیٰ کا دورہ کر رہے تھے۔ جارنگ کے ساتھ اپنی ملاقات کے دوران میں ہی سادات نے یہ وعدہ کر لیا کہ اگر انھیں (مفتوحہ) علاقہ [1] واپس کر دیا جائے تو اس کے عوض میں وہ اسرائیل کو تسلیم کر لیں گے اور اس کے ساتھ نارمل تعلقات قائم کر لیں گے۔ انھوں نے اپنی سیاست میں مصر کی جو مرکزی پشت پناہ بنائی ہے، اس میں فلسطینی شعبے کی حیثیت ایک ضمیمے سے بڑھ کر نہیں۔ ہاں، اپنے اس رویے میں وہ صدر ناصر سے بھی، اور شامی بعث [2] پارٹی کے ارکان سے بھی جو عالمِ عرب میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کے سلسلے میں مصر کے حریف تھے، مختلف ہیں [3] تاہم ان دونوں کے فلسفوں [4] کو عالمِ عرب میں اپنا تفوق برقرار رکھنے کے لیے دو نئے حریفوں کی چشمک کا سامنا کرنا پڑا۔ ان میں سے ایک حریف تو سادات کا مصر اور دوسرا تیل کی دولت سے مالا مال سعودی عرب تھا اور ایک لحاظ سے یہ دونوں نئے حریف عربوں کے اس کیمپ سے تعلق رکھتے ہیں جسے غیر قوم پرست کیمپ کہا جا سکتا ہے۔ اب تک عالمِ عرب میں عموماً جس انداز کی سیاست چلائی جا رہی تھی، وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ماورائے ممالک تھی اور ہمہ عربیت پر زور دیتی تھی لیکن بیسویں صدی میں یہ پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ 1970ء کے عشرے میں مختلف ممالک نے اپنی انفرادی حیثیت سے پَر پُرزے نکالنا شروع کر دیے اور وہ کوشش کرنے لگے کہ ان کی چھاپ ساری عرب دُنیا پر لگ جائے۔ 1973ء میں سادات نے اسرائیل کے خلاف جس جنگ کا آغاز کیا تھا، اس میں ان کی کوشش یہ تھی کہ اسے مصر کی سیاسی جنگ کے طور پر لڑا جائے اور انھوں نے جس موقع پر اسے شروع کیا تھا، اس کا انتخاب بھی بڑی احتیاط سے کیا گیا تھا تاکہ بعد میں پیش آنے والے واقعات میں امریکا کو بھی براہِ راست ملوث کیا جا سکے۔ جب بعد ازاں سادات نے یہ کہا کہ مصر اور اسرائیل کے مابین جو رکاوٹیں حائل ہیں، وہ نفسیاتی نوعیت کی ہیں تو در حقیقت وہ یہ کہہ رہے تھے کہ اس صدی کے دوران میں ایک بھی ایسا عرب رہنما منظرِ عام پر نہیں آیا جس نے صیہونیت سے عہدہ برآ ہونے کے لیے خود اس کا اپنا علاقہ منتخب کیا ہو۔ یہ

---

[1] یہاں مراد مصر کے علاقے صحرائے سینا ہے جس پر 1967ء کی جنگ کے دوران میں اسرائیل نے قبضہ کر لیا تھا۔ تاہم مصر اور اسرائیل کے معاہدۂ امن کی شرائط کے تحت اسرائیل نے اسے واگزار کر دیا ہے۔

[2] بعث پارٹی ایک بائیں بازو کی جماعت ہے۔ یہ مختلف ممالک میں کام کرتی ہے۔ لیکن ہر ملک میں اس کا اندازِ سیاست دوسرے ملک کی پارٹی کے اندازِ سیاست سے مختلف بلکہ متضاد ہے۔ شام اور عراق دونوں کے حکمران بعث پارٹی کے ارکان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن ان کی آپس میں کبھی نہیں نبھی۔

[3] ملاحظہ فرمائیں میلکم کر (Ker) کی کتاب The Arab Cold War (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس لندن، 1967ء)

[4] یہاں صدر ناصر اور بعث پارٹی کے فلسفے مراد ہیں۔

علاقہ کون سا تھا اور کہاں تھا؟ یہ علاقہ دراصل مغرب کا وہ نفسیاتی اور ثقافتی میدان تھا جہاں صیہونیت بلاشرکتِ غیرے حکمران تھی اور صیہونیت وہاں اس لیے بلاشرکتِ غیرے حکمران تھی کیونکہ عربوں نے وہاں کبھی قدم رکھنے کی جرأت ہی نہیں کی تھی۔ یہ کہ سادات نے وہاں صیہونیت کے مقابلے پر آنے کا قصد کیا تھا، اسرائیل سے دور مغربی شعور میں اپنے لیے تائید وحمایت حاصل کرنا چاہا تھا۔ ان کا ایک کارنامہ تھا اور 1973ء کی جنگ اس سلسلے کی پہلی اہم چال تھی جس نے انجامِ کار انھیں پہلے بیت المقدس اور بعد میں واشنگٹن پہنچانا تھا۔ لیکن سادات نے اپنی انتہائی تخلیقی چال بے دردی کے ساتھ ضائع کر دی۔

یقیناً ان کا یہ پروگرام سراسر مصری تھا اور یہ محض اتفاق کی بات نہیں تھی کہ اس کا بڑا حصہ جمال عبدالناصر کے پروگرام، ورثے اور عرب دُنیا میں ان کے مقام کو تھیٹرانہ انداز سے منہدم کرنے پر مشتمل تھا۔ سادات نے جو حکمتِ عملی وضع کی تھی، اس کے مؤثر ہونے کا انحصار اس بات پر نہیں تھا کہ اسرائیل کے ساتھ براہِ راست ٹکر لی جائے بلکہ اس بات پر تھا کہ اسرائیل کو امریکا میں تائید وحمایت کی جو اجارہ داری حاصل تھی، اس کا توڑ کیا جائے۔ اس کا استدلال یہ تھا کہ جب تک وہ اپنی ابتکاری برقرار رکھ سکیں گے اور دُنیا کی نگاہوں کا مرکز بنے رہیں گے، اسرائیل اپنے ردِعمل کا اظہار اس طور کرے گا کہ جن علاقوں پر اس کا قبضہ ہے، وہاں وہ اپنی گرفت مضبوط بنانے کی کوشش کرتا رہے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انھیں اسرائیل کے مؤقف میں شگاف ڈالنے کا موقع دستیاب ہوتا رہے گا۔ اس حد تک تو یہ بات واضح تھی کہ امریکا کی براہِ راست امداد اور حمایت کے بغیر اسرائیل کوئی جنگ نہیں لڑ سکتا تھا۔ یہ بات بھی واضح تھی کہ سادات امریکا، اسرائیل اور مصر کو آپس میں نتھی کرنے کی جتنی کوشش کریں گے، ان کی اپنی پوزیشن اتنی ہی مضبوط ہوگی اور اس کے مقابلے اسرائیل کی پوزیشن اتنی ہی کمزور ہوگی۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر انھوں نے سوویت یونین کے ساتھ اپنے تمام تعلقات اور روابط بالکل منقطع کر لیے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سادات پہلے عرب رہنما تھے۔ جنھوں نے صیہونیت کو اپنے ان مؤقفوں سے، جن پر وہ پہلے ڈٹی ہوئی تھی، پسپائی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا اور یہی ان کی ہمہ وقت حکمتِ عملی رہی۔ ان کے مقابلے میں سعودی عرب کے حکمرانوں کی بے پناہ دولت، جس کا سنبھالنا بھی دشوار ہوتا جا رہا تھا، ان کے اپنے پاؤں کی زنجیر بن چکی تھی اور پھر اس تفاوت نے جو ان کی دولت اور ان کی سیاسی اور فوجی قوت کے مابین پایا جاتا تھا، انھیں بالکل اپاہج بنا دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ کچھ بھی کرنے کے قابل نہ رہے۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہی کر سکتے تھے کہ کسی ہنگامی صورتِ حال سے نپٹ لیں یا لبنان کے دائیں بازو اور تنظیمِ آزادیٔ فلسطین جیسی ایک دوسرے سے متصادم قوتوں کو عام طور پر زبردست مالی امداد فراہم کر کے عالمِ عرب

میں مخالفت کی طوفانی لہروں کو محدود کرنے کی کوشش کریں اور یہی انھوں نے کیا۔ یوں مصر اور سعودی عرب دونوں ہی عرب قوم پرستی کی اس آگ کو سرد کرنے کی کوشش کرنے لگے، جو ابھی شدید طور پر بھڑک رہی تھی، جسے لبنان کے تصادم نے اور ہوا دے دی تھی اور یوں اسے مزید بھڑکا دیا تھا۔ چنانچہ فیصلہ کن اور قطعی اہمیت کا حامل سال 1975ء کا سال تھا کیونکہ یہی وہ سال ہے جس کے دوران میں مصر اور شام کے راستے جو 1973ء کی جنگ میں ایک دوسرے کے حلیف تھے ایک دوسرے سے مختلف ہونا شروع ہو گئے اور دونوں کے مابین اختلافات کی جو خلیج حائل ہونے لگی تھی، اب وہ فیصلہ کن انداز سے اتنی وسیع و عریض ہو چکی تھی کہ اس کا پاٹنا ناممکن ہو گیا۔ اوّل الذکر کام سینائی [1] دوم نے کیا اور مؤخر الذکر لبنانی جنگ نے سر انجام دیا۔ صدر سادات نے سینائی دوم کی صورت میں جو قدم اٹھایا تھا، وہ اس لیے اٹھایا تھا تا کہ وہ اپنا کھویا ہوا علاقہ واگزار کر سکیں۔ شام کو بھی کڈھب صورتِ حال کا سامنا تھا کہ اسے بھی اپنے کھوئے ہوئے علاقے واپس لینا تھا۔ لیکن مصر کے برعکس وہ اپنے اس مسئلے کا جائزہ عربوں کی اصطلاحوں میں لیتا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ اپنے کھوئے ہوئے علاقوں کو ایک جامع سمجھوتے کے بعد واگزار کرائے۔ ان دونوں نے اس معاملے میں جو جو مؤقف اختیار کیا، آج تک وہ ایک دوسرے کے متضاد ہے اور آج کل لبنان میں شام جس طور ملوث ہے، اس سے (اس کے حمایتیوں کی نظروں میں) عرب بین الاقوامیت کی اہمیت عیاں ہوتی ہے جب کہ اس کے مخالفوں کے نزدیک لبنان نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس پالیسی کے نتائج دلدل میں دھنسے جانے کے مترادف ہیں۔ (شام لبنان میں جو کچھ کر رہا تھا اس کے پیچھے) شامی بعثیوں کی یہ سوچ کارفرما تھی کہ عرب قوم پرستی کو ان تمام کوششوں پر، جو اجتماعی عرب حلقہ بندی (جس کے بعثی اپنے آپ کو نگران تصور کرتے تھے) کی زنجیر کو توڑنے اور اس سے باہر نکلنے کے لیے کی جائیں، تفوق حاصل ہے (چنانچہ شام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ لبنان میں مداخلت کرے اور ان فریقوں کے خلاف جن کے متعلق وہ سمجھتا ہے کہ وہ عرب حلقہ بندی سے باہر نکلنا چاہتے ہیں، جنگ کرے) چنانچہ وہ اسی جوش جذبے کے ساتھ وہ مصری تخصیص پسندی [2] اور سب سے بڑھ کر فلسطینی قوم پسندی

---

① یہ معاہدہ سابق امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر کی کوششوں سے اسرائیل اور مصر کے مابین یکم ستمبر 1975ء کو طے پایا تھا، اس کے تحت فریقین نے جنگ بندی کا احترام کرنے اور اپنے اختلافات پُرامن طریقوں سے طے کرنے کا عہد کیا تھا۔ امریکا یہ معاہدہ کرانے میں اس لیے بے چین تھا کیونکہ عربوں نے تیل فروخت نہ کرنے کا جو عہد کیا تھا۔ ہنری کسنجر نے اپنے الفاظ میں اس کا نتیجہ یہ نکالا تھا کہ ''پانچ لاکھ امریکیوں کو اپنی ملازمتوں سے ہاتھ دھونا پڑتے تھے۔ قومی پیداوار میں دس ارب ڈالر کی کمی واقع ہوئی۔ قیمتوں میں جو بے تحاشا اضافہ ہوا، وہ اس پر مستزاد ہے۔ دی مڈل ایسٹ 79-1914 از ٹی۔ بی فرنیرز

② تخصیص پسندی (Particularism) یا فرقہ پرستی: کسی فرقے یا انتظامی علاقے مثلاً صوبے کے خاص مفادات کے ساتھ پُرجوش عقیدت اور وفاداری کا اظہار کرنا اور پورے ملک (یا خطے) کے مفادات سے نظریں پھیر لینا۔

سے جس کے مقاصد عربوں کے نزدیک ان کی مقدس ترین متاع ہیں، بھی ٹکر لینے کے لیے تیار تھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس کی فوجوں نے جون 1976ء میں تنظیم آزادیٔ فلسطین کے ٹھکانوں پر، جس کے متعلق صدر اسد کا خیال تھا کہ اس نے فلسطینی قوم پرستی کے مقاصد سے غداری کی ہے، زبردست چڑھائی کردی۔

اس سیاسی معاہدے نے، جس کے خدوخال اکتوبر 1976ء میں ریاض کانفرنس میں متعین کیے گئے تھے۔ سعودیوں کے زیرِ اہتمام مصر، شام اور تنظیمِ آزادیٔ فلسطین کو دوبارہ مگر بالکل عارضی طور پر ایک دوسرے کو تعلقات کی لڑی میں پرو دیا تھا۔ پھر جمی کارٹر کا ستارہ طلوع ہوا اور وہ اقتدار کی سند پر متمکن ہو گئے۔ انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ فلسطینیوں اور جامع امن کے بارے میں بیانات کا تانتا باندھ دیا۔ ادھر عرب دُنیا کی بےبسی ملاحظہ فرمائیں۔ کیا حکومتیں، کیا عوام، سبھی ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔ ان میں سے کوئی بھی ان بیانات کی اہمیت کا نہ تو صحیح اندازہ لگا سکا اور نہ ان کا کوئی تدارک کر سکا۔ چنانچہ صدر کارٹر کا برسرِ اقتدار آنا اہم تبدیلیوں کا سبب بنا۔ ایک موقع تو ایسا بھی آیا جب یہ بات تقریباً یقینی نظر آتی تھی کہ صدر کارٹر..... خواہ یہ ان کے مزاج کی وجہ سے تھا یا پھر انھوں نے حالات کا جو تجزیہ کیا تھا، اس نے انھیں یہ راہ سجھائی تھی..... (مشرقِ وسطیٰ کی) آویزش کے حل کے بارے میں عرب قوم پرستوں (یعنی شام کے بعثیوں) کے استدلال سے اتفاق کرنے لگے ہیں۔ وسط نومبر 1977ء تک ہر چیز ناگزیر طور پر اس بات کی طرف اشارہ کرتی نظر آتی تھی کہ شامی طرزِ فکر کو (صحیح) تسلیم کرلیا جائے گا۔ ماہ مئی میں جنیوا میں صدر اسد کے ساتھ اپنی ملاقات کے بعد صدر کارٹر نے نہ صرف یہ کہا کہ "میں ان (صدر اسد) سے بہت متاثر ہوا ہوں۔" بلکہ قرائن سے اندازہ ہوتا تھا کہ امریکا اس بارے میں بہت بےچین ہے کہ نہ صرف عرب منظم اور متحد انداز سے جنیوا امن کانفرنس کی حمایت کریں بلکہ تنظیمِ آزادیٔ فلسطین بھی اس کانفرنس میں شرکت کرے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس ضمن میں سوویت یونین کا تعاون حاصل کیا جائے۔ اکتوبر کے اوائل تک اس امر کے بارے میں کسی قسم کے شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہ رہی کہ عرب بمقابلہ اسرائیل خطوط پر جنیوا کانفرنس لازماً منعقد ہوگی۔ دوطرفہ تعلقات کی جس پالیسی کو ہنری کسنجر نے پروان چڑھایا تھا، یہ اس کے خاتمے کی علامت تھی۔ لیکن اس سے مصر اور اسرائیل خائف ہو گئے۔ انھیں یہ امکان نظر آنے لگا کہ (اگر جنیوا کانفرنس منعقد ہوئی تو) ایک ایسے سیاسی تصفیے کی راہ ہموار ہونے والی ہے جس کے ذریعے عربوں کی اکثریت فلسطینیوں کے ساتھ اتحاد کرلے گی اور دونوں عظیم عالمی طاقتیں اسرائیل کے خلاف ہو جائیں گی۔

چنانچہ یکم اکتوبر 1977ء کو امریکا اور سوویت یونین نے جو مشترکہ بیان جاری کیا، صدر سادات نے اس کی اسرائیلیوں سے کم مخالفت نہیں کی۔ اس بیان نے نہ صرف مسئلہ فلسطین کو مصری علاقے کی واپسی کے مسئلے

کے ہم پلہ بنا دیا بلکہ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ شام ہمہ عربیت (پان عرب ازم) کی جس پالیسی پر گامزن تھا، وہ بھی واضح طور پر کامیاب رہی تھی۔ 1977ء کے اوائل میں مصر میں خوراک کی ناکام دستیابی کی وجہ سے جو ہولناک ہنگامے اور فسادات ہوئے تھے، ان کے بعد صدر سادات یہ خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے کہ

الف: اپنے کھوئے ہوئے علاقوں کو واپس لینے اور حالتِ جنگ کو ختم کرنے کے کام کو معرضِ التوا میں ڈال دیں۔

ب: فسادات نے جن وسیع پیمانے کی ترقّی پسندانہ اور مخالفانہ امروں کے بند کھول دیے تھے، مصر کے دروازے ان پر وا ہو جائیں کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے اور وہ ٹھیک ہی سمجھتے تھے کہ ان کا تعلق اس قسم کے سیاسی رجحانات سے ہے جس قسم کے (رجحانات) فلسطینیوں سے وابستہ کیے جاتے ہیں۔

ج: ان کے ملک کو معاشی اور معاشرتی طور پر جس تباہ کن انتشار اور توڑ پھوڑ کا اندیشہ لاحق تھا، اسے نظر انداز کر دیا جائے۔

چنانچہ 1977ء کے دوران میں انھوں نے جو کچھ کیا...... مثلاً جولائی میں ان کا لیبیا پر حملہ...... اس کا ایک ہی مقصد تھا کہ انھیں کسی طرح امریکا کی توجہ اور خوشنودی حاصل ہو جائے۔ یہ الگ بات ہے کہ جب تک انھوں نے یہ اعلان نہیں کیا کہ میں 17 نومبر کو بیت المقدس کے دورے پر روانہ ہوں گا'' امریکا نے انھیں اپنی غیر منقسم اور سنجیدہ توجہ کا مرکز نہیں بنایا۔ ان کے محولہ بالا اعلان سے ایک بھونچال آ گیا اور ہر چیز تبدیل ہو گئی۔

امریکی انتظامیہ کا یہ دعویٰ کہ ''صدر سادات کا یہ اعلان ہمارے لیے بالکل غیر متوقع تھا۔'' میرے خیال میں درست نہیں کیونکہ کم از کم گزشتہ سات سالوں کے دوران میں جن کا عرصہ 1977ء کے اواخر تک محیط ہے، صدر سادات جو کچھ کرتے رہے تھے، وہ اس بات کی غمازی کرتا تھا کہ وہ یک طرفہ طور پر اسرائیل کے ساتھ صلح کا ڈول ڈالنے کے لیے پوری طرح (ان کے ناقدوں کے استدلال کے مطابق کامل ڈھٹائی اور بے حیائی کے ساتھ) تیار ہیں۔ بہر حال امریکا جو کچھ کہتا تھا وہ ٹھیک ہی کہتا ہوگا۔ تاہم اس (امریکا) نے نہایت سرعت کے ساتھ اپنے آپ کو نئی صورتِ حال کے مطابق ڈھال لیا۔ اس نے فوراً اپنی ترجیحات کا از سرِ نو تعین کیا تاکہ اسرائیل اور مصر کے مابین ایک علیحدہ معاہدے کی راہ ہموار ہو سکے۔ اس ضمن میں اس نے جو پہلی کارروائی کی، وہ یہ تھی کہ اقوامِ متحدہ کے ایوانوں میں مسئلۂ فلسطین نے جو شکل و صورت اختیار کی تھی، وہ اس سے دستکش ہو گیا۔ اس کے بعد امریکا اور سوویت یونین کے مشترکہ بیان اور جنیوا کانفرنس میں فلسطینیوں کو نمائندگی دینے کے مسئلے سے بھی، جس پر سب فریقوں نے اتفاق کیا تھا، کنارہ کشی اختیار کر لی گئی۔ خود سادات نے بھی...... ان

کے بارے میں یہ سبھی کو معلوم ہے کہ وہ اپنی نجی محفلوں میں یہ کہتے نہیں تھکتے تھے کہ یاسر عرفات سے کسی بات کی ''توقع کرنا'' محض خام خیالی ہے۔ اپنے آپ کو تنظیم آزادئ فلسطین اور بچی کھچی عرب قومیت سے علیحدہ کرنے میں مطلق ذرا دیر نہ لگائی۔ اندرون مصر حکومت کے مخالف تمام قوم پرست عربوں کی زبان بندی کر دی گئی اور فلسطینی تحریک کے مقاصد کو نئے الفاظ کا جامہ پہنایا گیا تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ سادات اس کے سب سے بڑے مربی ہیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اسرائیل اور امریکا خواہ کسی بھی رعایت کے طلبگار ہوں، مصر کے لیے اس کا مہیا کرنا کوئی ناممکن امر نہیں۔ سادات نے بہت سوجھ بوجھ اور ہوشیاری کے ساتھ اس حقیقت پر تکیہ کیا کہ (تنظیم آزادئ فلسطین کے علاوہ) ان کے مخالفین یا تو اپنے ہی ممالک میں اتنے غیر مقبول تھے کہ وہ ان (سادات) کے خلاف کسی قسم کی مہم جوئی کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے یا پھر وہ (سعودی عرب اور اردن) اتنے کمزور اور ناتواں تھے کہ ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم کی تصویر تھے۔ زیادہ سے زیادہ ان میں اگر کوئی ہمت تھی تو بس اتنی کہ بڑی فروتنی اور بے بسی کے ساتھ ان کی ابتکاری میں شامل ہونے سے انکار کر دیں۔

مجھے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ اسرائیلیوں کے ساتھ صدر سادات کا رابطہ نومبر سے قبل ہی استوار ہو چکا تھا اور یہ کہ انھوں نے سب سے پہلے ان معاشی فوائد پر اتفاق کیا جو انھیں اسی صورت میں حاصل ہو سکتے تھے اگر وہ امریکا کی اشیرباد سے آپس میں مشترکہ اتحاد کر لیں۔ وہ آپس میں جس قسم کا اتحاد کرنا چاہتے تھے، اس کے متعلق انھیں یقین تھا کہ سعودی عرب کھل کر تو نہیں لیکن اندرونِ خانہ اس کی ضرور حمایت کرے گا، کیونکہ یہ تمام فریقوں کو مشترکہ خوشحالی کی ضمانت دیتا تھا۔ اس کے فوری فوائد تو ان دونوں ممالک کے فوجی حلقوں اور عام صارفین نے سمیٹنا تھے۔ لیکن اس کے دوررس نتائج یہ نکلنا تھے (اور یہ اس کا سب سے بڑا فائدہ تھا) کہ اس نے مشرقِ وسطیٰ کو امیر ① اور غریب'' ② ممالک میں تقسیم کر دینا تھا اور مؤخر الذکر وہ ممالک تھے جن میں انتہا پسندی اور ہمہ عربیت محدود ہو کر رہ جائے گی اور یوں ایک دن اس کا قلع قمع کرنا آسان ہو گا۔

مزید برآں سادات اپنی توانائیاں نہ صرف افریقہ...... چاڈ، زائرے اور صومالیہ میں مصر پہلے ہی چوری چھپے اپنی ٹانگ اڑا چکا تھا...... پر مرکوز کر سکیں گے بلکہ مصر کو ایک نئی سہ فریقی دُنیا کا حصہ بنانے پر بھی صرف کر سکیں گے۔ اگست 1978ء تک سادات اس حد تک آگے جا چکے تھے کہ انھوں نے فرانس اور آسٹریا کو اپنا

---

① Haves

② have-notes انگریزی میں یہ دونوں الفاظ ان لوگوں یا قوموں کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ جو (1) ہر قسم کی مادی آسائشوں سے مالا مال ہوں اور (2) بالکل تہی دامن اور نادار ہوں۔

جوہری فضلہ [1] دفن کرنے کے لیے اپنا مغربی صحرا دستیاب کر دیا تھا۔ ستمبر تک، جب کیمپ ڈیوڈ میں امریکا، اسرائیل اور مصر کے سربراہی اجلاس کا انعقاد ممکن ہوا، ایرانی واقعات نے سادات کے اس عزم میں پختگی پیدا کر دی تھی کہ چاہے کچھ بھی ہو، وہ اسرائیل اور امریکا کے ساتھ صلح کر لیں گے حالانکہ یہ بات بھی واضح تھی کہ عرب ممالک کے سربراہوں کی چوٹی کانفرنس منعقدہ بغداد (خاص طور پر دس سال کی محاربت کے بعد شام اور عراق کا متوقع انضمام) [2] ایرانی سرکشی اور بغاوت، اور تنظیم آزادیٔ فلسطین اور ایران کا اتحاد، [3] جو ابھی اپنے ابتدائی مراحل طے کر رہا تھا، ایسے امور تھے جنھوں نے مل ملا کر ان کے اس عزم کو کڑی آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ خشم ناک اور تند و تیز سطحی لفاظی کے باوجود ستمبر 1977ء اور مارچ 1979ء کے مابین ہر عرب مملکت کا ہر دوسری عرب مملکت کے ساتھ رابطہ قائم تھا۔ بظاہر یہ نظر آتا تھا کہ ان میں سے ہر ایک ہر دوسری کو اپنی طاقت اور ذمہ داری کے احساس سے مرعوب کرنا چاہتی ہے، اس طریقے سے بھی امریکا اور اسرائیل کے حق میں نکتہ طرازی کی جا سکتی تھی۔ ان سب باتوں کے پیچھے ایک ہی خیال کام کرتا نظر آتا تھا کہ مصر اور اسرائیل کے مابین جو علیحدہ معاہدہ ہو رہا ہے، امریکا کو اس کے دلکش متبادل پیش کیے جائیں۔ کسی بھی عرب مملکت نے اس بارے میں نہ تو ذرا بھی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا اور نہ اس کے ضمیر کو ذرا سی بھی ٹھیس پہنچی کہ وہ اسرائیل کے پہلو بہ پہلو زندگی بسر کرنے اور امریکی امداد اور دوستی کے عوض سوویت یونین کے ساتھ اپنے تعلقات منقطع کرنے کے لیے تیار ہے اور یہ بات تقریباً ہر مملکت پر صادق آتی ہے۔

تاہم امریکا اپنی اس پالیسی کے ساتھ چمٹا رہا جو اس نے مصری اور اسرائیلی امن کے متعلق تشکیل کی تھی

---

[1] بعض کارخانوں اور تنصیبات میں جو جوہری (ایٹمی) ایندھن استعمال ہوتا ہے، امتدادِ زمانہ کے ساتھ وہ بیکار ہو جاتا ہے۔ اس بیکار ایندھن کو جوہری فضلہ کہتے ہیں چونکہ یہ فضلہ بھی جوہری شعاعیں پیدا کرتا ہے جو انسانوں اور دوسری جاندار مخلوق کے لیے بے حد ضرر رساں ہیں، اس لیے اسے ٹھکانے لگانا اور اس سے جان چھڑانا مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔ بعض ممالک اسے سمندر اور بعض غیر آباد علاقوں میں دفنا دیتے ہیں لیکن خطرے کی گھنٹی پھر بھی بجتی رہتی ہے۔ آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ صدر سادات نے اس فضلے کو اپنے علاقے میں بے شک وہ صحرا ہی تھا، دفنانے کی سہولت دے کر کتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا۔

[2] شام اور عراق کے اس انضمام کی بیل سرے نہ چڑھ سکی اور یہ ممالک آج بھی ایک دوسرے سے اتنا ہی دور ہیں جتنا کہ کبھی پہلے تھے۔

[3] تنظیم آزادیٔ فلسطین اور ایران کی دوستی بھی زیادہ دیر نہ چل سکی اور ایران عراق جنگ کی بھینٹ چڑھ گئی۔ پھر لبنان کی شیعہ عمل ملیشیا فلسطینیوں کو جس طرح لبنان سے باہر نکالنے کے درپے ہے اور اکثر ان کے کیمپوں پر حملے کرتے رہتی ہے۔ اس نے بھی اس سلسلے میں کچھ کردار ادا کیا ہے۔

اور جس کی ترجیحات کو زیادہ سے زیادہ محدود کر دیا گیا تھا۔ اس پالیسی کے بارے میں اس کا استدلال یہ تھا کہ یہ جامع تصفیے کی راہ میں پہلا قدم (ثابت) ہوگی۔ پتا نہیں امریکا یہ ارادتاً کر رہا تھا یا غیر ارادی طور پر، لیکن وہ جو کام بھی کرتا تھا، اس سے یہی مترشح ہوتا تھا کہ وہ ہر اس چیز کی حمایت کر رہا ہے جو اسرائیل اور مصر کے بارے میں یا تو ہٹ دھرمی پر مبنی تھی یا پھر اس کا مقصد رجعتِ قہقری اختیار کرنا تھا۔ امریکا کی اس بے لوچ پالیسی کا، جس پر وہ نہایت ثابت قدمی اور استقامت کے ساتھ عمل پیرا تھا، میرے خیال میں تباہ کن نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اس نے فلسطینیوں، عرب عوام اور باقی دُنیا کو اس (امریکا) سے بے گانہ کر دیا جن کی دانست میں ایرانی انقلاب کے ردِعمل میں امریکی پالیسی مدافعانہ بھی ہوگئی تھی اور اس کا رُخ بھی ''دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تُو'' کی طرف ہو گیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ امریکی پالیسی کی یہ تعبیر نادرست نہیں ہے۔ عربوں کی اکثریت تو ایک طرف رہی، ان یورپی باشندوں کی نگاہوں میں بھی، جو آزاد سوچ بچار کے مالک تھے، سادات اپنے آپ کو امریکی شعور پر کچھ اس طور سوار کرانے میں کامیاب رہے تھے کہ ان کے متعلق (امریکا میں) یہ سمجھا جانے لگا تھا کہ وہ رہتے تو بے شک تیسری دُنیا میں ہیں لیکن درحقیقت وہ وفاشعار امریکی ہیں اور پوری تندہی اور لگن کے ساتھ امریکی مفادات کی آبیاری کر رہے ہیں اور معلوم ہوتا تھا کہ امریکا ایک بار پھر اپنی اس مہلک عادت کا شکار ہوگیا ہے جس کا اظہار وہ ہمیشہ یوں کرتا رہا کہ اس نے صحیح معنوں میں مقبولِ عام، ہردلعزیز اور نمائندہ رہنماؤں کو تو کبھی اپنے قریب بھی پھٹکنے نہیں دیا اور مارشل کی، [1] چیانگ کائی شیک [2] اور محمد رضا شاہ پہلوی جیسے لوگوں کے دام تزویر میں آنے کو احسن خیال کیا اور سب سے تباہ کن بات یہ ہوئی کہ سادات، بیگن اور رضا شاہ جیسے رہنماؤں کی حمایت کرنے کے جو نتائج وعواقب ظہور میں آنا تھے، وہ (امریکا) ان کا اندازہ لگانے میں بُری طرح ناکام رہا۔ یہ رہنما تو امریکا کے کندھوں پر سوار ہو کر اپنا اُلّو سیدھا کرنا چاہتے تھے اور صرف وہ اقدامات کرنے پر تُلے ہوئے تھے جن کی مدد سے ان کے فوری مقاصد (عام طور پر انتہائی غیر مقبول) کی تکمیل ہو سکتی اور زیادہ تر یہ مقاصد کیا تھے؟ یہی کہ اپنے اقتدار کو جوں کا توں برقرار رکھا جائے۔

---

① کی (Nguyen Kao Ky): جنوبی ویت نام کا ایک سیاسی رہنما، جب امریکا ویت نام کی جنگ میں الجھا ہوا تھا تو کی نے پٹھو صدر کے فرائض سرانجام دیے لیکن انجام کار اسے ملک سے فرار ہونا پڑا۔

② چیانگ کائی شیک (1887ء۔1975ء): چین کا غیر مقبول صدر، چینی کمیونسٹ رہنما ماؤزے تنگ کی فوجوں کے سامنے اس کی فوجیں ٹھہر نہ سکیں اور 1949ء میں اسے ملک سے فرار ہونا پڑا۔ تاہم اس کی تائیوان (فارموسا) کے جزیرے میں امریکی امداد سے اپنی حکومت قائم کرلی۔ اب بھی اس جزیرے پر اس کے بیٹے اور ساتھیوں کی حکومت ہے۔ چین نے بھی اس جزیرے پر جو اس کا حصہ ہے قبضہ کرنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ اسے ڈر ہے کہ کہیں امریکا سے جنگ نہ چھڑ جائے۔

بلکہ اسے دوام بخشا جائے اور یہ وہ بات تھی جو امریکا کے پلے نہیں پڑتی تھی (اور اب بھی نہیں پڑتی۔) اس پر تو بس ایک ہی دھن سوار تھی کہ ان رہنماؤں کو ہر قسم کی امداد بہم پہنچا کر ان کے عزائم کو مزید مستحکم بنایا جائے۔

کسی دوسرے ملک پر یہ بات اتنی صادق نہیں آتی، جتنی کہ یہ اسرائیل پر صادق آتی ہے۔ اولین اور میری دانست میں فالِ بد سے معمور علامت وہ تعجیل تھی جو مناچم بیگن کو اس کی انتہا پسندی اور دہشت گردی کے مقام سے اٹھا کر اسے نیک نام بنانے کے لیے برتی گئی اور سادات اور امریکی جس عمل کا آغاز کرنا چاہتے تھے، یوں اس میں اس (بیگن) کی شمولیت کی گنجائش نکالی گئی۔ یہ بات بیگن کے حق میں جاتی ہے کہ اس نے کسی کو بھی کوئی ٹھوس مراعات نہیں دیں۔ اس کا یہ ایمان تھا کہ مقبوضہ علاقوں پر اسرائیل کا قبضہ برقرار رہنا چاہیے وہ فلسطینی عربوں کو قلیوں سے بہتر مقام دینے کے لیے تیار نہیں تھا اور کسی قسم کی لگی لپٹی رکھے بغیر اس نے یہ بات جتا دی تھی کہ ایک برتر مغربی مملکت کی حیثیت سے علاقے میں اسرائیل کی سیادت قائم رکھی جائے گی۔ اپنی وزارت عظمیٰ کے دوران میں اس نے اقوامِ متحدہ کی قرار داد نمبر 242 کے بارے میں اسرائیل کے مؤقف میں مؤثر طور پر تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ اس (اسرائیلی) شخص نے، جسے بعد میں اس (بیگن) نے اقوامِ متحدہ میں اپنے ملک کا نمائندہ مقرر کرنا تھا، 1977ء میں امریکی سینٹ کی ایک کمیٹی کے سامنے یہ استدلال کیا کہ اسرائیل کو مقبوضہ علاقوں کو اپنے قبضے میں رکھنے کا پورا پورا حق حاصل ہے اور یہ کہ اسرائیل ان علاقوں میں جو کارروائیاں کر رہا تھا، ان سے جنیوا یا کسی دوسری کنونشن کی کوئی خلاف ورزی نہیں ہوتی تھی اور ویسے بھی اس کنونشن کا نہ تو وہاں اطلاق ہوتا ہے اور نہ ہوگا۔ ① دریں اثنا اسرائیل نے جنوبی افریقہ، چلی ② اور نکاراگوا ③

① امریکی سینٹ کی عدالتی کمیٹی کی تارکین وطن کی سب کمیٹی کے سامنے اسرائیل کی مغربی کنارے پر یہودی بستیاں تعمیر کرنے کی کارروائیوں کے متعلق یہود ابلوم (Blum) کا بیان (18,17 اکتوبر 1977ء) صفحات نمبر 26-24

② ریاست ہائے متحدہ امریکا (USA) کے جنوب میں امریکی براعظم میں جتنے ممالک واقع ہیں ان میں سے بیشتر میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ وہ بھی (برازیل اور جزائر غرب الہند بشمول گیانا کے ماسوا) ہسپانوی زبان بولتے ہیں کیونکہ یہ نسلاً بھی زیادہ تر ہسپانوی ہی ہیں۔ صدر جیمز منرو (1817۔25ء) کے زمانے میں امریکا نے ان تمام ممالک کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا تھا اور یورپی ممالک کو ایک قسم کا حکم دے دیا تھا کہ یہاں کسی قسم کی مداخلت نہ کریں۔ اس اصول کو منرو اصول (Doctrine) کہتے ہیں۔ اس اصول میں پہلی دراڑ 1959ء میں پڑی جب کاسترو نے کیوبا کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ چلی کے 1970ء کے عام انتخابات میں ایک کمیونسٹ رہنما سلوادور آیاندے گوسنز صدر منتخب ہو گئے۔ امریکا یہ کڑوی گولی نگل نہ سکا اور اس کا شہ پر فوج نے نہ صرف حکومت کا تختہ الٹا دیا بلکہ آیاندے کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔ تب سے اب تک اس ملک پر فوج کی حکمرانی چلی آ رہی ہے۔

③ نکاراگوا میں بھی ستمبر 1979ء میں بائیں بازو کے لوگ برسرِ اقتدار آ گئے، امریکا ان سے بھی جان چھڑانے کی فکر میں ہے۔......

کے ساتھ اپنے تعلقات مضبوط تر کر لیے، جبکہ اس کے فوجی رہنما یہ بار بار کہتے نہیں تھکتے تھے کہ اسرائیل ایک فاتح مملکت ہے اور یہ کہ عربوں (بالخصوص فلسطینیوں) کے متعلق اس کی پالیسی یہ ہے کہ انھیں غیر معین عرصے کے لیے دوبارہ مفتوح بنا لیا جائے۔ 19 جنوری 1979ء کو جب (اسرائیلی افواج کے) چیف آف سٹاف (سربراہ) جنرل ایتان سے ''جودیہ اور سماریہ'' (مغربی کنارے) میں یہودی بستیوں (کی تعمیر) کے متعلق سوال کیا گیا، تو اس نے جواب دیا کہ اسرائیل اس طریقے (یہودی بستیوں کی تعمیر) سے نہ صرف اس علاقے (مغربی کنارے) کو مستقل طور پر اپنے قبضے میں رکھنے کی تدابیر کر رہا ہے بلکہ ان عربوں پر بھی قابو پانے کی کوشش کر رہا ہے جو باسی تو الجلیل ① کے ہیں لیکن وہ اس علاقے میں زمینوں اور ملازمتوں پر قبضہ کرنے غیر قانونی طور پر یہاں آنے اور تشدد کی کارروائیاں کرنے کے عمل میں مصروف ہیں۔'' یہاں اس امر کو دھیان میں رکھنا ضروری ہے کہ وہ فلسطینی جن کا ذکر جنرل ایتان کر رہا تھا، نو وارد لوگ نہیں تھے بلکہ گزشتہ تیس سالوں سے (خاصے ابتر اور رذیل حالات میں) وہیں (اندرون اسرائیل) مقیم ہیں لیکن اس کے نزدیک یہ حقائق کافی نہیں تھے۔ وہ تو بس اس حقیقت کا اعادہ کرنا چاہتا تھا: ''ہم اسرائیل کے قیام سے قبل اس ملک کو فتح کرنے آئے تھے اور اس مقصد کے (حصول کے) لیے مملکت (اسرائیل) کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ②

چونکہ اسرائیل کی مصر کے ساتھ حقیقی معنوں میں کوئی علاقائی آویزش نہیں تھی۔ چنانچہ سادات کے ساتھ ایک ایسے سینائی کی واپسی کا، جہاں مصر کو فوجیں رکھنے یا قلعہ بندیاں تعمیر کرنے کی اجازت نہیں ہوگی، وعدہ کرنا نسبتاً آسان تھا۔ اس معاہدے کی وجہ سے اسرائیل نہایت آسانی کے ساتھ جو مزید فوائد حاصل کر سکتا تھا، وہ یہ تھے:

صیہونیت کو اپنا جواز مل جاتا۔ وہ اپنے اس جواز کو منوانے کی گزشتہ سو سال سے کوشش کر رہی تھی (لیکن کسی عرب نے اسے گھاس نہیں ڈالی تھی۔)

سب سے بڑی عرب مملکت کو بے اثر بنا دیا جاتا اور پورے عالم عرب میں اسرائیل کو جو الگ تھلگ زندگی گزارنا پڑ رہی تھی، اس کا خاتمہ ہو جاتا۔

......اور وہ حکومت کے باغیوں کو جنھیں contras کہا جاتا ہے، سی آئی اے کے ذریعے مالی امداد دیتا رہتا ہے لیکن ابھی تک وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

① الجلیل 1967ء سے قبل ہی اسرائیل میں شامل تھا اور یہ وہ علاقہ ہے جہاں اسرائیلی فلسطینیوں کی سب سے زیادہ تعداد آباد ہے۔

② "Yediot A haronot" january 19,1979

امریکا کے ساتھ ''سلامتی'' کا ایک ''ہمہ گیر'' معاہدہ ہو جاتا۔

آئندہ پندرہ برسوں کے لیے تیل کی فراہمی یقینی ہو جاتی۔

تقریباً پندرہ ارب ڈالر مالیت کا اسلحہ اور دیگر امداد مل جاتی۔

ایک ایسی وسیع و عریض منڈی دستیاب ہو جاتی جہاں آسانی سے اپنا مال کھپایا جا سکتا تھا۔ اسے اپنے قابو میں رکھا جا سکتا تھا اور من مانے طریقے سے اس کا استحصال کیا جا سکتا تھا۔

لاتعداد غیر تربیت یافتہ اور سستے مزدور مہیا ہو جاتے۔

لیکن جہاں مسئلہ علاقے کا تھا تو اس ضمن میں انتہائی غیر معمولی اقدامات کیے گئے تا کہ ان پر اسرائیل کا تسلط برقرار رکھا جا سکے۔ اسرائیل جو کچھ کہہ رہا تھا اور جو کچھ وہ مغربی کنارے پر کر رہا تھا، چند ایک مستثنیات کو چھوڑ کر امریکی اخبارات و جرائد نے ان پر کوئی خاص توجہ نہ دی۔ صحافت کی تاریخ میں اس قسم کی قبیح اور شرمناک تغافل کی شاید ہی کوئی مثال ملے گی۔ فلسطینیوں کو جس قسم کی حکومت ''خود اختیاری'' پیش کی جا رہی تھی، اسے اس طور دکھانے کے لیے کہ یہ لفظ کے مفہوم کے ساتھ کچھ مشابہت رکھتی ہے، امریکی ذرائع ابلاغ نے مغربی کنارے اور غزہ میں اسرائیل کی چیرہ دستیوں اور جبر و تشدد، یہودی بستیوں کی تعمیر اور وہاں اپنی حیثیت کو مستحکم بنانے کے لیے اس کی کارروائیوں کو جائز ٹھہرادیا اور اس سلسلے میں دلائل کے انبار لگا دیے۔ اس سے بھی بدتر بات یہ ہوئی کہ اسرائیل مقبوضہ عرب علاقوں کے بارے میں جس پالیسی پر عمل پیرا تھا، اس پر نہ تو امریکی ذرائع ابلاغ نے کسی قسم کی نکتہ چینی کی اور نہ کیمپ ڈیوڈ میں طے پانے والے معاہدوں کے متن میں اس پر کوئی گرفت ہوئی، چنانچہ جب فلسطینیوں اور اردن نے اس حکومت ''خود اختیاری'' کے عمل میں شریک ہونے سے انکار کر دیا تو ان کی یہ حرکت معقولیت سے عاری، بے استحقاق اور بے دلیل نظر آئی۔ مغربی کنارے اور غزہ میں جو کچھ ہو رہا تھا، جب اسرائیل کو یقین ہو گیا کہ مصر اور امریکا اس کے متعلق لب کشائی نہیں کریں گے، تو اسے (اسرائیل کو) محسوس ہوا کہ اب اسے کھلی چھٹی مل گئی۔ اب اس کا جو جی چاہے گا، وہ اس کا نہ صرف اظہار کر سکے گا یا اس کے متعلق منصوبہ بندی کر سکے گا، بلکہ اسے عملی جامہ بھی پہنا سکے گا اور اس نے یہ سارے کام...... جیسا کہ اسرائیل کے جبر و تشدد تلے زندگی بسر کرنے والے فلسطینیوں کو علم ہے کیونکہ انھیں ان کا براہِ راست تجربہ ہوا ہے...... کر کے بھی دکھا دیے۔

تاریخی طور پر صیہونیت کا ہمیشہ یہ معاملہ رہا ہے کہ اس کے لیے عام اصولوں کی نسبت جزئیات (تفصیلات) کہیں زیادہ اہم رہی ہیں۔ جب صیہونیت ان جزئیات کو قوت اور قانونی ''حقائق'' دونوں کا لبادہ اوڑھا دیتی ہے، تو اسے یقین ہونے لگتا ہے کہ اس کی یہ نوتخلیق حقیقتیں دوام حاصل کر لیں گی۔ اس پروگرام کو

عملی جامہ پہنانے کے لیے لیبر پارٹی نے جو کچھ کیا تھا، اس کو مزید آگے بڑھانے کے لیے بیگن نے برسرِاقتدار آنے کے بعد اپنی تمام مخصوص قانونی صلاحیتیں صرف کر ڈالیں۔ (مثال کے طور پر) اس کی پالیسی سابق لیبر وزیراعظم جنرل رابین کی پالیسی سے صرف ان معانی میں مختلف تھی کہ بیگن محض طاقت یا/ اور فی البدیہہ اقدامات پر کہیں کم اعتبار کرتا تھا۔ اس کے نزدیک مقبوضہ یا زیرِانتظام علاقوں کی حیثیت بھی تبدیل ہوگئی۔ وہ سمجھتا تھا کہ ان علاقوں کو ''آزاد'' کرایا گیا ہے۔ اس کے ساتھ اس نے 26 دسمبر 1977ء کو اسمٰعیلیہ ① میں صدر سادات سے یہ اعتراف بھی کرا لیا کہ اسرائیل نے 1967ء میں عربوں پر حملہ کیا تھا وہ اپنے دفاع کے لیے ② تھا۔ ان دونوں باتوں نے اسے یہ سمجھنے اور کہنے کے قابل بنا دیا کہ اسرائیل نے عربوں کا جو علاقہ ہتھیایا تھا، قانون کی نگاہوں میں اس پر قبضہ کرنا جائز تھا۔ یہاں یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ جب ڈیوڈ بن گوریان نے 1948ء میں مملکتِ اسرائیل کے قیام کا اعلان کیا تھا، تو اس نے اپنے اعلان میں اسرائیل کی سرحدوں کا کوئی ذکر کرنے سے عمداً احتراز کیا تھا۔ ③ ان وسعت پذیر سرحدوں کو قانونی طور پر جائز اور صحیح قرار دینے کے لیے بیگن نے کہیں زیادہ مہارت اور چابک دستی کا مظاہرہ کیا۔ مزید برآں جب اس نے فلسطینی حکومت ''خود اختیاری'' کے سلسلے میں اپنے منصوبے کا اعلان کیا تو اس نے (مقامی فلسطینی) باشندوں کے لیے ''حکومت خود اختیاری'' اور اس علاقے پر، جہاں وہ رہائش پذیر تھے، قانونی اقتدارِ اعلیٰ کے مابین امتیاز برتنے کے سلسلے میں نہایت احتیاط سے کام لیا۔ اپنے نظریاتی گرو ولادی میر جبوتنسکی ④ کی طرح وہ اس بات کا اعتراف کر رہا تھا کہ اگر یہودی ایک ادنیٰ قوم کے متعلق کسی قسم کی پریشانی کا اظہار کریں گے، تو وہ ایک ناپسندیدہ (بلکہ بے حد ضرر رساں) حرکت کے مرتکب ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اس علاقے پر جس کے متعلق (اس کی دانست کے مطابق) خداوند نے کہیں نہ کہیں فرمایا تھا کہ یہ ان کا ہے، اختیار برقرار

---

① نہر سویز کے کنارے مصر کی بندرگاہ اور شہر۔

② یہ وہ استدلال ہے جس کی صدائے بازگشت بآسانی نہ صرف دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے امریکیوں کی تحریروں اور گفتگوؤں میں ملتی ہے بلکہ وہ لوگ بھی جو اپنے آپ کو لبرل یا بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے کہتے ہیں، اسی نقطۂ نظر کے حامی ہیں بلکہ ان کا تو اوڑھنا بچھونا بھی یہی استدلال ہے۔ ان لوگوں نے اسرائیل کو جارحانہ حملے کے الزام سے جس طرح بری الذمہ قرار دیا ہے، اس کی ایک مثال مائیکل والزر (Walzer) کی کتاب Just and Unjust Wars (مطبوعہ بیسک بکس، نیویارک 1977ء) میں ملتی ہے تاہم نوم چومسکی اور رچرڈ فاک (Falk) نے اپنے مضامین میں والزر کے دلائل کی دھجیاں بکھیر دی ہیں۔ (مصنف)

③ بن گوریان سوانح حیات از مائیکل بارزہر (Bar Zohar) مطبوعہ ویڈن فلڈ اینڈ نکلسن، لندن 1978ء، صفحہ 161

④ ولادی میر جبوتنسکی (Jabotinsky)

رکھنے اور وہاں یہودی بستیاں تعمیر کرنے کا حق اسرائیل کے لیے محفوظ رکھا۔ مذہبیت، قانونی موشگافیوں اور سوفسطائیت [1] کے اس امتزاج کے متعلق امریکا کے ذرائع ابلاغ، اعلیٰ تعلیمی اداروں اور لبرل طبقے نے اپنے منہ میں گھنگھنیاں ڈال رکھی ہیں اور ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی تصویر بنے ہوئے ہیں اور یہ سب کچھ ایک ایسے وقت میں ہو رہا ہے جب وہ ایران میں اسلامی ''زیادتیوں'' کے خلاف زبردست غم و غصّے کا اظہار کر چکے ہیں، انھی ایام میں جب روح اللہ خمینی کی اسلامی جمہوریہ کے امکانی معانی کے متعلق غیر مختتم، اکثر و بیشتر جہالت اور لاعلمی پر مبنی، روح فرسا تحقیقاتی مقالوں کا طوفان اُمڈ آیا تھا، بیگن مختلف امور کے بارے میں خالص مذہبی نقطۂ نظر سے اظہارِ خیال کر رہا تھا لیکن کسی نے ذرا بھی کوشش نہ کی کہ وہ یہ معلوم کرتا کہ آخر ان باتوں سے اس (بیگن) کی مراد کیا ہے۔ جب حالت یہ ہو تو پھر جب وہ (بیگن) یہ کہتا پھرتا تھا کہ لوگوں کو تو حکومت ''خود اختیاری'' حاصل ہو گی لیکن وہ جس سرزمین پر رہتے ہیں، اسے اس قسم کی کوئی ''خود اختیاری'' نہیں دی جائے گی تو اس سے اس کی کیا مراد تھی، اس کی تفصیلات معلوم کرنے کی کسے فرصت ہوتی۔

یہ بات اسرائیلی صحافیوں اور سیاسی شخصیتوں کے حق میں جاتی ہے کہ ان امور کے بارے میں ان کا رویہ بہت سچا، کھرا اور بے لاگ تھا، وہ جو بات کہتے تھے، ڈنکے کی چوٹ کہتے تھے۔ تاہم جیسا کہ ہمیشہ ہوتا آیا ہے، الفاظ کی نسبت اعمال زیادہ مؤثر انداز سے عزائم کا اعلان کر رہے تھے۔ کیمپ ڈیوڈ کانفرنس کے فوراً بعد بیگن نے مزید بستیوں کی تعمیر پر زور دینا شروع کر دیا۔ اس نے (بستیوں کی تعمیر کے) اس منصوبے کو جنرل ایرک شیرون [2] کے قابل ہاتھوں میں دے دیا۔ اس زمانے میں شیرون وزیرِ زراعت تھا اور وہ ان لوگوں میں شامل تھا جو عربوں کے بارے میں نہایت جارحانہ رویہ رکھتے ہیں اور انھیں کسی قسم کی کوئی رعایت دینے کے لیے قطعاً تیار نہیں۔ [3] اس کے ''کارناموں'' میں فلسطینیوں کی شہری آبادیوں پر اس کے متعدد سفاکانہ اور

---

① سوفسطائیت (Casulstry): مذہبی یا اخلاقی اصولوں کا عیارانہ لیکن گمراہ کن یا غلط اطلاق

② جنرل شیرون بعد میں بیگن کی کابینہ میں وزیرِ دفاع مقرر ہوا۔ 1985ء میں جب لبنان کی عیسائی ملیشیا نے اسرائیل کی امداد اور تائید سے فلسطینیوں کے کیمپوں کو تاخت و تاراج کیا اور وہاں بے پناہ قتل و غارت کی، تو یہ جنرل شیرون ہی تھا جس نے یہ سب کچھ کرایا تھا۔ جب اس قتلِ عام کے لیے ساری دُنیا نے اسرائیل کی مذمت کرنا شروع کر دی، تو شیرون کو اپنے عہدے سے مستعفی ہونا پڑا۔ اسرائیلی حکومت نے یہ کہہ کر اپنی جان چھڑائی کہ جنرل شیرون نے یہ ساری کارروائی اپنی صوابدید پر کی تھی اور اس (حکومت) سے اس نے کوئی اجازت یا اختیار نہیں لیا تھا۔

③ مصنف نے ان لوگوں کے لیے انگریزی لفظ Hawk (شکرہ) استعمال کیا ہے۔ وہ لوگ جو امن کے پجاری ہوں ''فاختائیں (Doves) کہلاتے ہیں تو وہ لوگ جو خارجہ پالیسی میں سخت گیر بلکہ جارحانہ پالیسی اختیار کرنے کے حامی ہوں، ''شکرے'' کہے جاتے ہیں۔

قاتلانہ حملے میں شامل ہیں۔ ③ خیر 1978ء کے اواخر تک اسرائیل صرف مغربی کنارے پر 77 بستیاں تعمیر کر چکا تھا اور وہاں کے کل رقبے کا تقریباً ستائیس فیصد حصہ ضبط کر چکا تھا۔ جبکہ یہ بات درست ہے کہ کیمپ ڈیوڈ کی دستاویزات میں یہ تصریح کردی گئی تھی کہ مقبوضہ علاقوں میں اسرائیلی افواج مقیم تھیں، پانچ سالوں پر محیط عبوری مدّت کے دوران میں ان میں تخفیف کردی جائے گی، لیکن اس (اسرائیلی افواج کا قیام) سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ اس علاقے میں اسرائیلی آبادکاروں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ ان آبادکاروں کا ہراول دستہ ''گش ایمونیم'' (Gush Emunium) کہلاتا تھا۔ یہ انتہائی متعصب اور متشدد یہودیوں کا ٹولا تھا۔ اس کے سامنے ''اسلامی'' جتھوں کا جوش وخروش اور تشدد ماند پڑ جاتا ہے بلکہ وہ مثبت طور پر نرم اور بامروّت نظر آتے ہیں۔ معتبر ذرائع کے مطابق عرب بیت المقدس سمیت مقبوضہ علاقوں میں اس ٹولے کے افراد کی تعداد نوے ہزار تک پہنچ چکی ہے جب کہ مزید لاکھوں افراد کو ادھر بھیجنے کے منصوبے بنائے جارہے ہیں۔

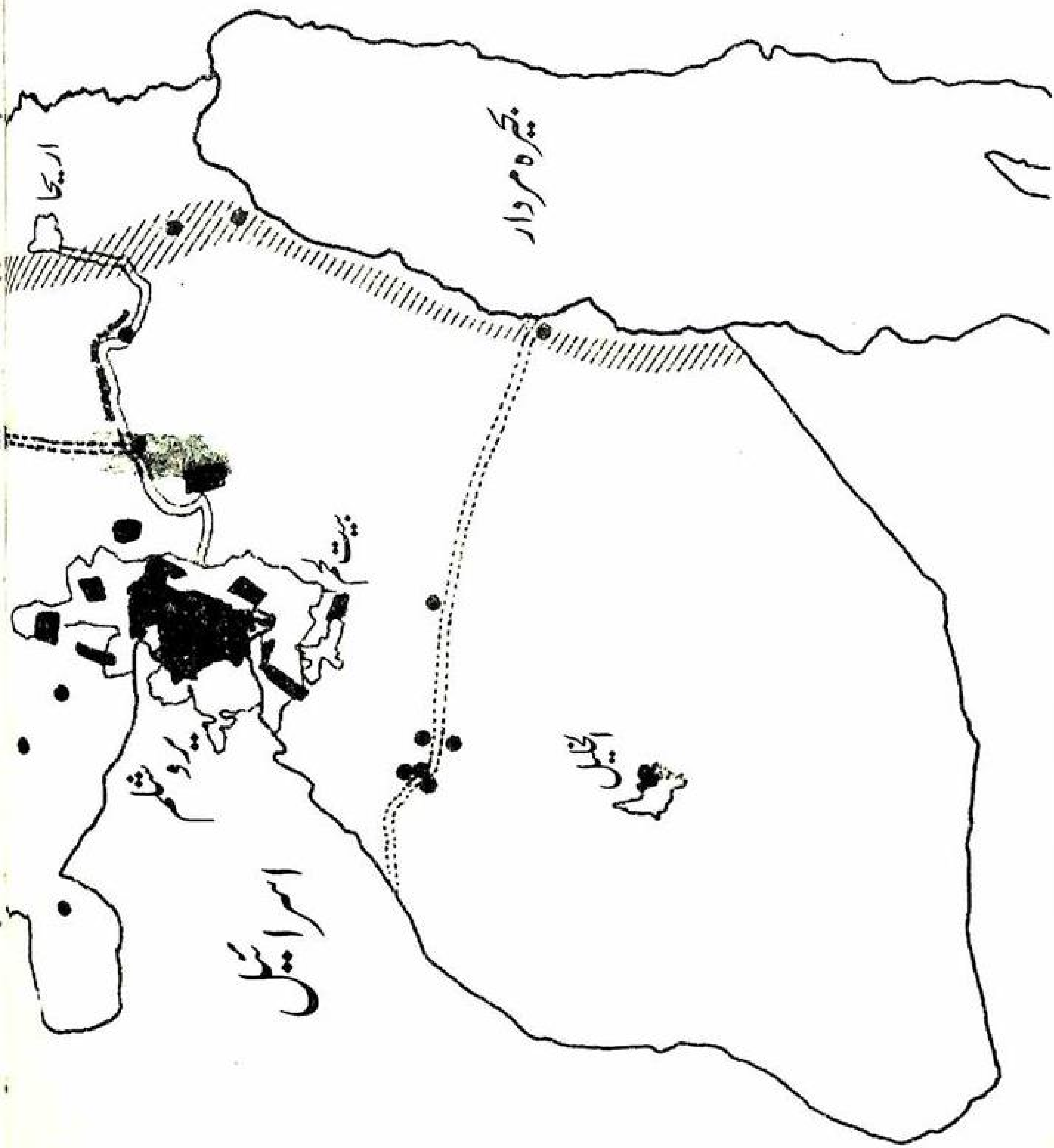
فلسطینیوں کے اذہان میں اس بارے میں مطلق کوئی شک وشبہ نہ رہا کہ ان کے لیے جس حکومت ''خوداختیاری'' کا اہتمام کیا جارہا ہے، اس کا مقصد انھیں محض چند مخصوص علاقوں میں محدود کرنا ہے، جن کا نظم و نسق چلانے میں نہایت احتیاط اور غور وفکر کے بعد قوانین اور ضوابط تشکیل دیے جائیں گے اور ان پر عمل کرتے وقت تمام جزئیات کا پوری طرح خیال رکھا جائے گا اور جیسا کہ ایک دانشور نے، جو غریب قومیت پرسند کی حیثیت رکھتا ہے اور تل ابیب یونیورسٹی میں بطور ایک مضمون اس کی تدریس کرتا رہا ہے، کہا تھا کہ اس منصوبے کا مقصد ''فلسطینیوں کی قومی آرزوؤں اور امنگوں کا گلا گھونٹنا اور ان کے ذہنوں سے فلسطینی قومیت کا کیڑا نکالنا ہے۔'' ② قصۂ زمین برسرِ زمین کے مصداق، اس بات کو یقینی بنانے کے لیے مغربی کنارے پر کئی اہم اقدامات کیے جارہے تھے۔ ③ اسرائیل کی سوچ یہ تھی کہ سبز لکیر (قبل 1967ء کی سرحد) کے مشرق میں

---

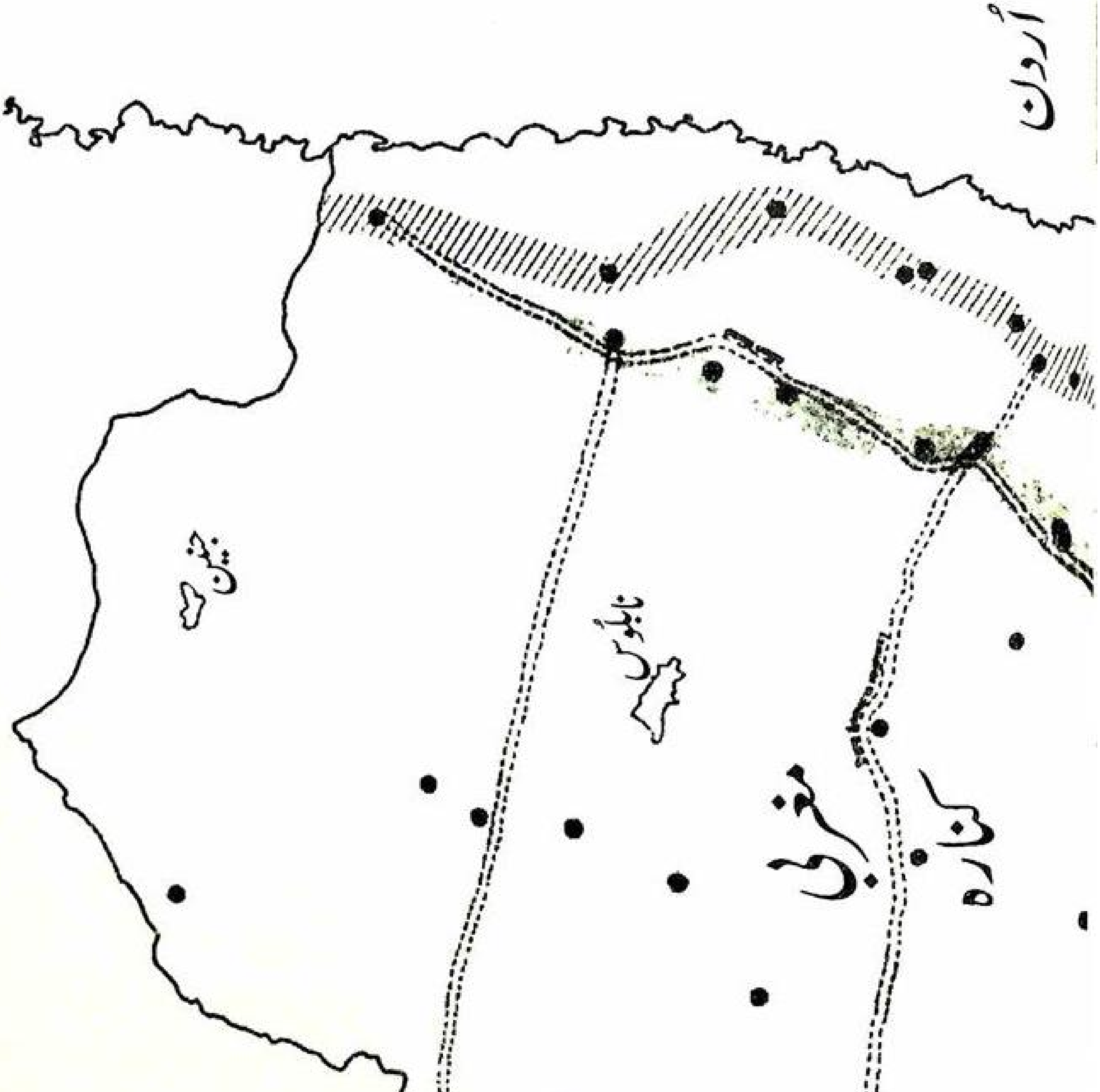
① اسرائیل کے بدنامِ زمانہ ''یونٹ نمبر 11 میں شیرون نے جو کارنامے سرانجام دیے، اس کی تفصیل ایک مضمون Voice of Zionism میں دیکھی جاسکتی ہے اس مضمون کو جریدہ ''مڈل ایسٹ انٹرنیشنل'' کمرہ نمبر 105 گرینڈ بلڈنگز، ٹریفالگر سکوائر لندن نے شائع کیا تھا۔ ویسے جس شمارے میں یہ مضمون شائع ہوا تھا اس پر کوئی نمبر، مہینا درج نہیں تھا۔ (مصنف)

② کلفٹن بیلی نے اس کا حوالہ اپنے ایک مضمون مطبوعہ ''یروشلم پوسٹ'' مؤرخہ 22 فروری 1979ء میں دیا ہے۔

③ مقبوضہ علاقوں میں اسرائیل جس طرح عربوں کی زمینیں ہتھیا اور وہاں یہودی بستیاں تعمیر کر رہا ہے، اس کے متعلق پال کیرنگ (Quiring) کی ایک رپورٹ ''اسرائیلی بستیاں اور فلسطینیوں کے حقوق'' کے عنوان سے جریدہ مڈل ایسٹ انٹرنیشنل'' کے شمارہ نمبر 87 (ستمبر 1978ء) اور شمارہ نمبر 88 اکتوبر 1978ء میں شائع ہوئی تھی۔



مغربی کنارے میں غیر قانونی اسرائیلی آبادکاری کا نقشہ



• غیر قانونی اسرائیلی آبادیاں

اسرائیل کا جو علاقہ واقع ہے، وہ اس وقت تک حملوں کی زد میں رہے گا جب تک خاص اسرائیل کے متوازی خود مغربی کنارے میں دفاعی اقدامات اختیار نہیں کر لیے جاتے۔ اس مقصد کے لیے مغربی کنارے کو شمالاً جنوباً اور شرقاً غرباً سڑکوں کے ایک سلسلے کی تعمیر کے ذریعے مختلف علاقوں میں تقسیم کرنا تھا بلکہ پہلے ہی تقسیم کیا جا چکا ہے۔[1] (نقشہ ملاحظہ فرمائیں) یہ شاہراہیں نہ صرف فوج کے لیے رسائی کا کام دیں گی (اور سب کچھ صدر سادات اور صدر کاٹر کی دریا دلی اور مہربانی کی بدولت ہوا جو انھوں نے کیمپ ڈیوڈ کے ''ڈھانچے'' کی حدود میں رہ کر دکھائی) بلکہ چوتھائی ربع[2] دائرے کی شکلوں کے ان علاقوں کی بیرونی سرحدوں کا تعین بھی کر دیں گی جن کے اندر فلسطینی آبادی کا محصور کر دیا جانا تھا۔ چنانچہ فلسطینیوں کے ہر قابلِ لحاظ گروپ کو اس طریقے سے محصور کر دینے والی یہ سڑکیں اس بات کو بھی یقینی بنا دیں گی کہ اس علاقے پر اسرائیل کا فوجی تسلط جاری رہے گا۔ علاوہ ازیں، اسرائیلی بستیوں کا قیام ان سڑکوں کو اور بھی مضبوط بنا دے گا۔ جیسا کہ شیرون نے ایک انٹرویو میں جو اسرائیلی روزنامہ ''معارف'' کے شمارے مؤرخہ 26 جنوری 1979ء میں شائع ہوا تھا، کہا تھا کہ ''وہاں نہ صرف (یہودی) بستیوں کا قیام عمل میں آنا چاہیے بلکہ ایسی سڑکیں بھی تعمیر ہونا چاہییں جو قصبوں اور ان بستیوں کے مابین علاقائی تسلسل کو یقینی بنا دیں۔ پھر صرف سڑکوں کی تعمیر کافی نہیں ہے بلکہ فوجی چوکیوں اور تربیت گاہوں کا قیام بھی لازمی ہے تاکہ عسکری نقطۂ نظر سے تمام سہولتیں دستیاب ہو سکیں۔'' یوں صیہونیت کے تسلسل اور فلسطینیوں کے عدم تسلسل کے منصوبے پروان چڑھائے جا رہے تھے۔

چونکہ اسرائیل کی آبی ضروریات کا تقریباً تیس فیصد حصہ مغربی کنارے سے فراہم کیا جاتا ہے، اس لیے (فلسطینیوں کو) حقِ خود اختیاری ملے یا نہ ملے، کوئی پروا نہیں، اسرائیل کے استعمال کے لیے آبی وسائل لازماً حاصل ہونا چاہییں۔ چنانچہ آب رسانی کا یہ مربوط نظام مغربی کنارے کی میونسپل مقتدرہ سے بالکل علیحدہ کام کر رہا ہے۔ مغربی کنارے اور غزہ کی سلامتی کی موجودہ صورتِ حال کے پیشِ نظر (اسرائیلی) فوجی گورنر کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ ہر تحریر کو سنسر کر سکتا ہے، مشتبہ تخریب کاروں کو ملک بدر یا نظر بند کر سکتا ہے یا ان کے گھروں کو مسمار کرنے کا حکم دے سکتا ہے بلکہ عملی طور پر وہ ہر وہ اقدام کر سکتا ہے جس کا مقصد مملکتِ اسرائیل کا تحفظ کرنا ہو۔ لیکن جیسا کہ ''ہع رتیز'' کے چودہ اور سولہ جنوری 1979ء کے شماروں میں ایک صحافی نریف شف

---

① اسرائیل نے خود اسرائیل کے اندر اور مغربی کنارے سے سڑکوں کا جو جال بچھا دیا ہے اسے وہ عسکری نقطۂ نظر سے ''ریڑھ کی دُہری ہڈی'' کہتا ہے۔ ایک ہڈی تو خود اسرائیل کے اندر ہے اور دوسری مغربی کنارے پر۔

② چوتھائی (quadrant): ایک ایسی شکل جو قوس اور ان دو نصف قطروں سے محصور ہو جو ایک دوسرے کو زاویۂ قائمہ بنا کر کاٹتے ہیں۔

نے تحریر کیا تھا کہ ''جو چیز یقینی ہے، وہ یہ ہے کہ اگر فلسطینیوں کو حکومت ''خوداختیاری مل گئی'' تو اس سے اسرائیلی حکومت اور فوج کو یہ اختیار مل جائے گا کہ وہ معاملات کی موجودہ صورت کو کم و بیش غیر معین عرصے کے لیے جاری رکھ سکیں۔'' کیمپ ڈیوڈ کے معاہدوں کی شرائط کے تحت اسرائیل کو یہ حق حاصل ہے کہ سیاسی ''تخریب کاری'' کے خلاف نبرد آزما ہوسکتا ہے۔ اسرائیل کے نزدیک یہ سیاسی تخریب کاری کیا ہے؟ شف نے بالکل ایمانداری سے اس سوال کا جواب دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اسرائیل ہر اس چیز یا کارروائی کو سیاسی ''تخریب کاری'' کا نام دیتا ہے جو کسی بھی امکانی طریقے سے فلسطینی ریاست کے قیام میں مددگار ثابت ہوسکتی ہو۔ چونکہ فوج مغربی کنارے پر مقیم رہے گی، اس لیے نظر بندیوں، ملک بدریوں اور اجتماعی سزاؤں کا سلسلہ بھی جاری رہے گا۔ ایک ایسی حکومت ''خود اختیاری'' میں جس کی حکمران کونسل اسرائیلی، فلسطینی، اردنی اور مصری نمائندوں پر مشتمل ہوگی۔ ''سلامتی کی کارروائیاں'' کس طرح عمل میں آئیں گی۔ شف نے اس کا جو پیشگی اندازہ لگایا ہے، وہ درج ذیل ہے:

(مغربی کنارے اور غزہ میں) عام سلامتی (جنرل سیکورٹی) کے حکام جاسوسی کا ایک عمدہ اور پیچیدہ جال بچھانے میں کامیاب رہے ہیں ہم یہ مفروضہ قائم کرسکتے ہیں کہ حکومت خود اختیاری کے دور میں بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا لیکن مسئلہ محض معلومات اکٹھی کرنے کا نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان معلومات کا مصرف کیا ہوگا؟ کیا انھیں (اسرائیلی حکام کو) اپنی مرضی سے کام کرنے کی اجازت ہوگی یا ان کی سرگرمیاں معلومات جمع کرانے اور صورتِ حال کو جاننے تک محدود کر دی جائیں گی؟

جاسوسی کے ذریعے حاصل شدہ معلومات کے صحیح مصرف کو یقینی بنانے کے لیے تاکہ تخریب کاروں (ان فلسطینی قوم پرستوں کے لیے، جو آزادی کے خواہاں ہیں، شف اسرائیلیوں کا سٹینڈرڈ کوڈ لفظ استعمال کرتا ہے۔) کے خلاف جنگ کی جاسکے۔ ضرورت ایسے خاص حالات کی ہے جن کے ڈانڈے دوسرے پہلوؤں سے جا ملتے ہیں۔ ایک مضبوط مقامی پولیس فورس، جس کا کیمپ ڈیوڈ کے معاہدوں میں ذکر ہے، کافی نہیں ہے۔ فلسطینی پولیس کے افسروں اور اسرائیل کے سلامتی کے حکام کے مابین مشاورت کافی نہیں ہے۔ سلامتی کے نقطۂ نظر سے جو بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے، وہ یہ ہے کہ کوئی بھی شخص جو دہشت گردوں کے خلاف سینہ سپر ہونا چاہتا ہے۔ وہ ان لوگوں کو، جن کے بارے میں دہشت گردی یا عناد کا شبہ ہو، گرفتار کرنے کا حق دوسروں کے سپرد نہیں کرسکتا۔

ایک ایسے فلسطینی پولیس افسر کو، جسے ان لوگوں کے متعلّق جن پر دہشت گردی کی کارروائیاں کرنے کا شبہ ہو، اسرائیل کے سلامتی کے حکام سے معلومات حاصل ہوتی ہیں ہر وقت اپنی جان کے لالے پڑے رہیں گے۔ اگر وہ دہشت گردوں کو یہ نہیں بتا دیتا کہ وہ خطرے کی زد میں ہیں۔ چنانچہ اس قسم کی گرفتاریوں کے سلسلے میں مقامی (یعنی فلسطینی) پولیس کا تعاون حاصل کرنا محض ایک رسمی ضابطے کی کارروائی ہونا چاہیے اور اس بارے میں کسی شک وشبہ کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہونا چاہیے کہ مستقبل میں بھی سلامتی سے متعلّق تمام امور کی پوچھ گچھ کا کام اسرائیل کے عام سلامتی کے حکام کے سپرد رہے گا۔ اگر ہم حکومت خود اختیاری کے علاقوں اور خود اسرائیل میں دہشت گردوں کے خلاف، جنگ میں کامیاب ہونا چاہتے ہیں، تو اس کی بنیادی شرط یہی ہے۔ جہاں تک دہشت گردوں کے خلاف عدالتوں میں استغاثے دائر کرنے اور ان پر مقدمات چلانے کا تعلق ہے، تو صورتِ حال مختلف ہو جاتی ہے، کیونکہ یہ وہ امور ہیں جن کے بارے میں اسرائیل اور حکومت خود اختیاری کے حکام کے مابین مکمل تعاون ہو سکتا ہے۔ عدالتی امور میں بھی تعاون کی راہیں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ لیکن استغاثے دائر کرنے اور مقدمات چلانے کی نسبت یہ زیادہ نازک موضوع ہے۔ اس شعبے میں اسرائیل کو کچھ ترجیح حاصل ہونا چاہیے اور یہی بات اس کمیٹی کے اسرائیلی ارکان کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ جس کے سپرد پناہ گزینوں کو واپسی کی اجازت دینے کا کام ہو گا اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ وہ (کمیٹی کے اسرائیلی ارکان) ان ہدایات اور احکام کی تعمیل کریں گے جو عام سلامتی کے (اسرائیلی) حکام انھیں دیں گے۔ (حع رتیز مؤرخہ 12 جنوری)

اسرائیل فلسطینیوں کو جس قسم کی حکومت خود اختیاری کی پیشکش کر رہا ہے، اس کے متعلّق یہ مفروضہ قائم کر لیا گیا ہے کہ اس سے فلسطینیوں کے حق خود ارادیت کے مطالبات پورے ہو جائیں گے، حالانکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ وہ ہر معاملے میں اپنی ٹانگ اونچی رکھنا چاہتا ہے اور اصل اختیارات سے دستبردار ہونے کے لیے قطعاً تیار نہیں۔ (1) چنانچہ شف اپنے مضمون کا اختتام یوں کرتا ہے۔ ”اب یہ بات واضح ہو جانا چاہیے کہ اسرائیل کی سلامتی کا نظام فلسطینی زندگی کے تمام پہلوؤں پر اثر انداز ہو گا۔ اب ہم یہ بہ خوبی سمجھ سکتے ہیں کہ

(1) اس سلسلے میں فرانس کے جریدے Le Monde Diplomatique کے جنوری 1979ء کے شمارے میں Amnon Kapeliock کا مضمون پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ (مصنف)

حکومت خود اختیاری کے متعلق یہ نقطۂ نظر، جس کی محولہ بالا انداز سے توضیح کی گئی ہے، کس طرح فلسطینیوں کے خلاف اسرائیلی عناد اور مخاصمت سے موافقت رکھتا ہے۔ لیکن قاری بے سود ان دلائل و براہین کی تلاش کرتا ہے جن کے مطابق یہ مفروضہ قائم کر لیا گیا ہے کہ یہ منصوبہ فلسطینیوں کے لیے جنھیں اس کی سختیاں اور تکلیفیں جھیلنا پڑیں گی، قابلِ قبول ہوگا۔ اسرائیل کا کوئی قول و فعل (بالخصوص جو کچھ بیگن کہتا ہے، وہ تو بالکل نہیں، فلسطینیوں کو یہ آس باندھنے کی قطعاً اجازت نہیں دیتا کہ حکومت "خود اختیاری" مسلسل فوجی تسلط و تغلب سے بڑھ کر کوئی چیز ہوگی۔ یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہنا چاہیے کہ حکومت "خود اختیاری" کا اطلاق صرف ان فلسطینیوں پر ہوگا جو مغربی کنارے اور غزہ میں رہائش پذیر ہیں۔ فلسطینیوں کی واپسی کے متعلق دفعات میں صرف ان فلسطینیوں کا ذکر کیا گیا ہے جو 1967ء کی جنگ سے قبل مغربی کنارے اور غزہ میں رہتے تھے لیکن اس جنگ کے بعد انھیں باہر ہانک دیا گیا تھا۔ اندازاً ان فلسطینیوں کی تعداد ڈیڑھ لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ چونکہ واپسی کے ان "جائز دعویداروں کو بھی اسرائیلی جانچ پرکھ کی بھٹی میں سے گزرنا ہوگا، اس لیے یہ بات بالکل واضح ہے کہ ان بیس لاکھ سے زائد فلسطینیوں کے لیے، جن کا تعلق غزہ یا مغربی کنارے سے نہیں، اور جو اب جلاوطنی کے ایام گزار رہے ہیں، یہ ناممکن ہے کہ وہ واپسی کا خواب بھی دیکھ سکیں۔ موشے دایان کے الفاظ میں، ان فلسطینیوں سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ جہاں ہیں، وہیں مقیم رہیں گے۔ چنانچہ جیسا کہ ایک نامور فلسطینی مصنّف نے تحریر کیا ہے، کیمپ ڈیوڈ کی دستاویزات میں جس حکومت خود اختیاری کا ذکر کیا گیا ہے، کسی قسم کے ابہام یا شک و شبہ کے بغیر اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ:

"فلسطینی قوم کی ایک قلیل تعداد (مجموعی طور پر ایک تہائی سے بھی کم) کو اپنے وطن کے ایک قلیل حصے (جو مجموعی رقبے کے پانچویں حصے سے بھی کم ہے) پر اپنے حقوق کی ایک قلیل مقدار (جس میں خود ارادیت اور مملکت کا درجہ حاصل کرنے کے حقوق شامل نہیں) عطا کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے اور اس وعدے کی تکمیل بھی، ایک ایسے قدم بہ قدم عمل کے ذریعے، جس میں اسرائیل کو کسی بھی سمجھوتے کے بارے میں فیصلہ کن انداز ے استرداد (ویٹو) کا اختیار حاصل ہوگا، کئی سالوں کے بعد ہوگی۔ اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ فلسطینیوں کی ایک زبردست اکثریت کو یہ سزا سنا دی گئی ہے کہ وہ اپنی فلسطینی قومی شناخت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئی ہے۔ وہ سدا جلاوطنی کی زندگی گزاریں گے، ان کے پاس کوئی ملک نہیں ہوگا۔ جسے وہ اپنا ملک کہہ سکیں گے اور وہ مدام فلسطین سے ہی نہیں بلکہ ایک دوسرے سے بھی دور اور الگ تھلگ رہیں گے...... وہ ایک ایسی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوں گے جس میں نہ تو کوئی قومی امید ہوگی اور نہ وہ کسی قسم کے

مفہوم کی حامل ہوگی۔ ①

اسرائیل اور مصر کے معاہدے نے کسی قسم کے ابہام کے بغیر اس صورتِ حال کو مقدس بنا دیا ہے۔ امریکا کے لبرل دانشوروں کا استدلال یہ ہے کہ

الف: موجودہ صورتِ حال میں فلسطینیوں کو زیادہ سے زیادہ یہی کچھ دیا گیا ہے اور اس لیے انھیں آمنا و صدقنا کہہ کر اسے قبول کر لینا چاہیے۔

ب: علاوہ ازیں اگر ایک مرتبہ حکومت خود اختیاری کا عمل شروع ہو گیا۔ جس میں عام انتخابات منعقد ہوا کریں گے، سیاسی زندگی معمول پر آ جائے گی، وغیرہ...... حالات غالباً ایسا رخ اختیار کر لیں گے کہ وہ ارتقا کی منازل طے کرنے لگیں گے اور یوں ایک دن وہ فلسطینی مملکت کا روپ دھار لیں گے۔

یہ مملکت یونہی وجود میں نہیں آئے گی بلکہ کسی پودے کی طرح آہستہ آہستہ نمو پاتی رہے گی اور یوں ایک دن وہ قطعی شکل اختیار کرنے لگی۔ اس کا کنایتاً ذکر امریکی صحافی انتھونی لوئیس نے اپنے ایک ہمدردانہ مقالے ''اور اب فلسطینی''، مطبوعہ ''نیویارک ٹائمز'' مؤرخہ 26 مارچ 1979ء میں کیا تھا۔ لیکن اس قسم کے دلائل و براہین، ان تین عناصر کو پیشِ نظر نہیں رکھتے جنھوں نے فلسطین کے سوال کو وہ مسئلہ بنا دیا ہے جو کہ وہ آج کل صحیح معنوں میں بن چکا ہے۔ وہ عناصر یہ ہیں:

(1) صیہونیت کی یہ اصلیت کہ وہ ایک منظم طریقے سے یہودیوں کے حق میں اور غیر یہودیوں کے خلاف کام کرتی ہے۔

(2) فلسطینی تاریخ کی یہ اصلیت کہ یہ (فلسطینی تاریخ) اٹکل پچو واقعات کا ایک مختلف العناصر مجموعہ نہیں ہے بلکہ صیہونیت کے ہاتھوں فلسطینیوں کو جس بے دخلی کا سامنا کرنا پڑا، یہ اس کے مربوط تجربے کا بیان ہے۔ نیز یہ کہ فلسطینی لڑتے بھڑتے حقِ خود ارادیت کی منزل کی طرف جس طرح قدم بہ قدم بڑھ رہے ہیں، (یہ فلسطینی تاریخ) اس جدوجہد کو جدلیاتی اصولوں کے مطابق منطقی انداز سے پیش کرتی ہے۔

(3) صیہونیت اور فلسطینیوں کے مابین آویزش کی اصل حقیقت۔ یہ آویزش کسی غلط فہمی کا نہیں بلکہ مخالف قوتوں کے مابین حقیقی مخالفت کا نتیجہ ہے مزید برآں اس آویزش کی جڑیں ایک مخصوص (علاقے میں) پیوست ہیں۔ اس کی اپنی ایک ٹھوس تاریخ ہے اور یہ مختلف قسم کے متعدد علاقائی بین الاقوامی اور ثقافتی عوامل یکجا کرنے کا موجب بن رہی ہے۔

---

① فیاض صابغ: معاہدہ کیمپ ڈیوڈ اور مسئلہ فلسطین'' جرنل آف پیلسٹائن سٹڈیز''، جلد نمبر 8 شمارہ نمبر 2 (زمستان 1979ء)

ایک طرف ان تینوں عناصر کی ژولیدگی اور پیچیدگی ہے اور دوسری جانب نیک نیت پالیسی سازوں کی رجائیت ہے جس کا وہ بعض مواقع پر اظہار کرتے رہتے ہیں، تو ان دونوں (ژولیدگی اور رجائیت) میں جو تضاد پایا جاتا ہے، وہ ایک امید شکن ستم ظریفی کا حامل ہے۔ اس ستم ظریفی کی کاٹ میں اس وقت اور بھی شدید اضافہ ہوجاتا ہے جب بظاہر فلسطینیوں کی حکومت خود اختیاری کی کامیابی کو اس بات کے ساتھ مشروط کردیا جاتا ہے کہ تنظیمِ آزادیٔ فلسطین اپنا گلا گھونٹ لے...... یا کم از کم منظرِ عام سے اوجھل ہوجائے...... اور اس کی جگہ وہ "معقول" فلسطینی کوئز لنگ (غدارانِ وطن) سنبھال لیں جو غیر معین عرصے کے لیے سیاسی خواجہ سرا بننے کے لیے تیار ہوں۔ ابھی تک تو کوئی ایسا کوئز لنگ سامنے نہیں آیا۔ مستقبل کا حال خدا جانے۔ اس بارے میں کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی کہ آئندہ بھی لوگ (غدار بننے کے اس تصور) کی اس طرح مزاحمت کرتے رہیں گے۔

اب ہمیں اپنے آپ سے یہ سوال کرنا ہوگا کہ کیمپ ڈیوڈ کی دستاویزات اور اسرائیلی، مصری معاہدے میں جس قسم کے انتظامات کی تصریح کی گئی ہے۔ اس کو بہ یک زبان اور متحدہ طور پر مسترد کرنے کے علاوہ...... فلسطینیوں نے کیا کیا اور کیا کہا ہے۔ یہ وہ ڈراما ہے جس کے متعلق لوگوں کو بہت کم علم ہے اور جس کا اب مجھے ذکر کرنا ہوگا۔

③

فلسطینی اور علاقائی واقعیتیں

جب میں نے قبل ازیں یہ کہا تھا کہ مشرقِ وسطیٰ ایک مخلوط مشرقی خطہ ہے تو اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ مسئلۂ فلسطین فی نفسہٖ اس قسم کے دوسرے تمام مسائل سے قطعی مختلف ہے اور یوں یہ کچھ عجیب اور نرالا سا نظر آتا ہے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ثقافتی، سیاسی اور تاریخی اعتبار سے وہ جس خطے کے ساتھ منسلک ہے، اس کی کچھ اپنی نرالی خصوصیات ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیں کہ جہاں تک فلسطینیوں کا تعلق ہے تو یقینی طور پر ان کی سوچ یہ ہے کہ انھیں جس بے دخلی سے دوچار ہونا پڑا، اس کا ذمہ دار وہ استعمار ہے جس نے آباد ہونے کی نیت سے ان کے وطن پر یورش کی تھی۔ ستم رسیدگان کی حیثیت سے ان کے ساتھ جو کچھ بیتا یہ نقطۂ نظر صرف اسی سے مطابقت رکھتا ہے۔ لیکن یہ نقطۂ نظر نہ تو یورپ کی یہود دشمن ہولناک اور سفاکانہ کارروائیوں کو پیشِ نظر رکھتا ہے اور نہ موجودہ سیاق و سباق میں ان حقائق کو خاطر میں لاتا ہے کہ

یہودیوں کے نزدیک اسرائیل ایک ایسی مملکت ہے جس نے حقیقی معنوں میں زبردست کارنامے سرانجام دیے ہیں۔

اسرائیل کے باشندے اور دُنیا کے بہت سے دوسرے ممالک اس (مملکت اسرائیل) کے ساتھ پیمانِ وفا باندھ چکے ہیں۔

اسرائیلی صیہونیت اور فلسطینی مزاحمت ان خالص، مصفّیٰ اور نسبتاً غیر پیچیدہ اوصاف سے عاری ہے جو

جنوبی افریقہ کی سیاہ فام اکثریت کی سفید فام اقلیت کے خلاف جدّوجہد کا طرۂ امتیاز ہیں۔

پھر یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ایک مسئلہ بن گئی ہے کہ اس قسم کی دوسری تحریکوں کے برعکس عربوں کے حصولِ آزادی کی تحریک کو نسبتاً آسانی سے اور کافی زیادہ سرمایہ فراہم ہو رہا ہے۔ تقریباً غیر محدود سرمایے کی محض موجودگی اور دستیابی ایک ایسی چیز ہے جو حصولِ آزادی کے تصور سے کوئی لگا نہیں کھاتی، بلکہ اس کے منافی معلوم ہوتی ہے۔ میرے خیال میں اس بارے میں کوئی خاص دلیل دینے کی ضرورت نہیں کہ جس چیز کو عام طور پر عربوں کی حصولِ آزادی کی جدّوجہد کہا جاتا ہے، اس کے متعلق گفتگو کرتے وقت یہی مسئلہ...... جو اگرچہ کیفیت کے اعتبار سے اتنا شدید نہیں ہے...... پیش آتا ہے۔ اپنے نکتے کو مستعد انداز سے پیش کرنے کے لیے ضروری ہے کہ لفاظی کے اس سیاق و سباق میں ہم یہ سوال اٹھائیں کہ ترکیب ''عربوں کی آزادی'' کے صحیح صحیح معانی کیا ہیں؟ (اس سوال کا اٹھایا جانا اس لیے بھی ضروری ہے کیونکہ ایک طرف تو ''عربوں کی آزادی'' کے متعلق باتیں بنائی جاتی ہیں اور دوسری طرف حال یہ ہے کہ عین اسی وقت مغربی معیشتوں نے تیل کی دولت سے مالا مال عرب مملکتوں کو بڑی خوشی کے ساتھ اپنا شریکِ کار بھی بنالیا ہے حالانکہ ان ممالک کی سیاسی زندگی آزادی کی چھاپ سے نمایاں طور پر عاری ہے اور پھر ان میں سے ان مملکتوں نے بھی جو اپنے آپ کو انقلابی کہلوا کر خوش ہوتی ہیں، فلسطینی جدّوجہد کی تائید وحمایت میں جس رویے کا مظاہرہ کیا ہے، اس کی زیادہ سے زیادہ صرف یہی تعریف کی جاسکتی ہے کہ ان کا یہ رویہ خالی از عیوب نہیں۔)

پھر بھی میں اپنی اس کتاب اور (اپنی دوسری کتاب) ''اورینٹلزم'' میں جو کچھ کہہ چکا ہوں، اس کی دوبارہ یہاں تکرار کرنا چاہوں گا کہ عرب دُنیا کے متعلق بالعموم اور فلسطینیوں کے متعلق بالخصوص مغرب میں جو بحث ہوتی ہے اس میں خلطِ مبحث سے اس قدر کام لیا جاتا ہے اور اس میں غیر منصفانہ جانبداری برتنے کا رجحان اتنا غالب ہے کہ فلسطینی اور عرب حقیقتاً جن حالات میں سے گزر رہے ہیں انھیں سمجھنے کے لیے زبردست کوشش درکار ہوگی۔ میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ ان کوششوں کے نتائج اچھے برآمد ہوتے ہیں یا بُرے۔ مجھے اندیشہ صرف یہ ہے کہ فلسطینی، صیہونی آویزش کے پیچیدہ حالات کو منصفانہ انداز سے پیش کرنے کی سعی میں شاید میں اتنا کچھ نہ کرسکوں۔ جس سے وہ زبردست غبار ہٹ جائے جو کذب وافترا کے انبار، تحریفات اور ارادی لاعلمیوں نے ہماری جدّوجہد کی حقیقت کے گرد تان رکھا ہے۔ شاید اس قسم کا کوئی سیدھا سادہ کلیہ موجود نہیں جو اس قسم کے معاملوں میں سچائی کے ظہور میں مددگار ہوسکے اور یقیناً میں مزید یہ کہنا چاہوں گا کہ جہاں تک میرا تعلق ہے، مجھے اس بارے میں پختہ یقین ہے کہ فلسطین جس مقصد کے حصول کے لیے جدّوجہد میں مصروف ہیں، اس میں تاریخی اور اخلاقی اعتبار سے اتنی جان اور استعداد موجود ہے کہ اس

کے متعلق غلط بیانیاں کرنے اور اسے توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی جو بھی اور جتنی بھی مساعی کی جائیں گی، انجام کار وہ دم توڑ جائیں گی اور جدّوجہد آگے نکل جائے گی اور اپنی منزل پر پہنچنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ عوام کے متعلّق جو کچھ مصنّفین تحریر کرنے کی جدّوجہد کرتے ہیں، صرف وہ نہیں، بلکہ عوام کی یہ اپنی جدّوجہد ہوتی ہے جو یقیناً انجام کاران کی تاریخ متعین کرتی ہے۔ تاہم تحریروں کی کچھ نہ کچھ اپنی اہمیت ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض نکات پیش کرنا ضروری ہیں۔

پہلا نکتہ یہ ہے کہ فلسطینیوں کے متعلّق اس تمام تر زبانی جمع خرچ کے باوجود سیاسی، صحافتی بلکہ ثقافتی سطح پر بھی یہ رجحان عام ہے کہ ان کے بارے میں سنجیدہ گفتگو اور بحث کو ہمیشہ معرضِ تعویق میں ڈال دیا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ سرکاری اداروں سے وابستہ جارج بال [1] جیسی ذہین و فطین شخصیتوں کا یہی وتیرہ ہے اور اس نے اپنے مضمون ''مڈل ایسٹ چیلنج''، میں، جو یکم اپریل 1979ء کو ''نیویارک ٹائمز'' کے ادارتی صفحہ کے بالمقابل [2] صفحہ پر شائع ہوا تھا، یہی نکتہ پیش کیا تھا۔ اسرائیل اور مصر کے معاہدۂ امن کا تحفظ کرنے اور اسے تقدیس عطا کرنے کے لیے امریکی حکومت جس قابلِ فہم جوش و خروش کا مظاہرہ کر رہی ہے، وہ تعویق والتوا کے اس رجحان کی محض حمایت ہی نہیں کرتا، بلکہ غالباً اس کا مقصد اس سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ (اگر ایسا نہیں تو) پھر حکومت اس مہمل اور نامعقول تصور سے کیوں چمٹی ہوئی ہے کہ تنظیمِ آزادیٔ فلسطین سے کنی کترا کر نکلا جا سکتا ہے جبکہ یہ بات بالکل عیاں ہے (جیسا کہ اعلیٰ سرکاری حکام نجی طور پر یہ کہہ رہے ہیں) کہ تنظیمِ آزادیٔ فلسطین ہی تو فلسطینی مسئلہ ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی بالکل مساوی طور پر واضح ہے کہ اس امر کا ذرہ برابر امکان بھی موجود نہیں کہ کبھی کوئی متبادل قیادت منصۂ شہود پر نمودار ہو سکے گی۔ تنظیمِ آزادیٔ فلسطین اتنی جائز اور نمائندہ جماعت ہے کہ اس قسم کی کسی (متبادل) قیادت کے ظہور پذیر ہونے کا کوئی احتمال سرے سے موجود ہی نہیں۔ (معاہدہ) سینائی دوم کی شرائط اور اس سمجھوتے کی رو سے جو اسرائیل اور ہنری کسنجر کے مابین طے پایا تھا، امریکا اس وقت تک تنظیمِ آزادیٔ فلسطین کو نہ تو تسلیم کرے گا اور نہ اس سے کسی قسم کی کوئی بات چیت کرے گا، جب تک کہ مؤخر الذکر اقوامِ متحدہ کی قرارداد نمبر 242 کو منظور اور اسرائیل کو تسلیم نہیں کر لیتا۔ اس انتہائی علمی [3] بےلوچ اور سخت گیر شرط نے جس نے نہایت بے شرمی، ڈھٹائی اور ناشائستگی کے ساتھ ایک عظیم

---

① صدر کارٹر کے زمانے میں امریکا کا نائب وزیرِ خارجہ۔

② مغربی اخبارات کے ادارتی صفحہ کے بالمقابل صفحہ پر جو مضمون شائع ہوتا ہے، وہ بہت اہم تصور کیا جاتا ہے۔ پاکستان میں یہ انداز روزنامہ ''نیشن'' نے اپنایا ہے۔

③ علمی (Academic): بعض تحریریں اتنا عالمانہ رنگ لیے ہوتی ہیں کہ حقیقت کی دُنیا سے ان کا تعلق برائے نام ......

ملک (امریکا) کو اس کی ایک اپنی چمچہ مملکت (اسرائیل) کے گھڑی میں تولہ اور گھڑی میں ماشہ جھکی اور تنک مزاجانہ رویوں کے سامنے سرنگوں کر رکھا ہے اور جس نے فلسطینیوں کے معاملے کو محض پناہ گزینوں کا مسئلہ بنا دیا ہے، امریکا کے سیاسی اکھاڑے میں تنظیم آزادیٔ فلسطین اور نتیجتاً فلسطینیوں کے مؤقف کو جائز قرار دینے کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر دی ہیں۔ اس کا انجام البتہ یہ ہوا ہے کہ جس التوا کا ذکر جارج بال نے کیا ہے، اس (شرط) نے اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے اور ہاں، اس نے ایک اور کارنامہ جو سرانجام دیا ہے وہ یہ ہے کہ اس نے اسرائیل اور اس کے امریکی حمایتیوں کی، جو بالکل چکنے گھڑے ہیں اور ہرگز ٹس سے مس نہیں ہوتے، یہ حوصلہ افزائی کی ہے کہ وہ ہر وقت طوطے کی طرح یہی رٹ لگائے رکھتے ہیں، چھوڑیں صاحب، تنظیم آزادی فلسطین تو کیا سارے فلسطینی دہشت گرد ہیں، انتہا پسند ہیں، غیر ذمے دار ہیں۔

اور یہ محض خالی خولی لفاظی نہیں، بلکہ مسئلہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اس کے پیچھے متعدد وجوہات کام کر رہی ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ چند ایک مستثنیات کو چھوڑ کر تمام ذرائع ابلاغ اور دانشوروں کے طبقے نے من حیث المجموع ہمیشہ یہی نقطۂ نظر اختیار کیا ہے۔ حال ہی میں ایک ٹیلی ویژن کمپنی نے جس کی نشریات سارے ملک میں دیکھی جاتی ہیں، ایک زبردست اقدام یہ کیا کہ اس نے فلسطینیوں کے متعلق ایک ایسی فلم، جو غیر ہمدردانہ نہیں تھی حقیقتاً ایک ایسے وقت پر دکھانے کا اہتمام کیا جب ناظرین کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو ٹیلی وژن کی نشریات دیکھنے کی فرصت ہوتی ہے۔ اس فلم میں فلسطینیوں کے کردار کی تصویر کشی کی گئی تھی اور یہ بتایا گیا تھا کہ ''دہشت گرد'' آخر کیوں دہشت گرد بنے ہیں (یعنی دہشت گردی اختیار کرنے کے لیے ان کے پاس کچھ وجوہ ہیں۔) فلم کے آغاز کے قبل راوی نے ایک تقریر کی (اس قسم کی تقریر کی پہلے سے کوئی روایت یا نظیر موجود نہیں تھی۔) اپنی تقریر میں راوی نے ناظرین کو یہ یقین دلایا کہ ''ہم دہشت گردی سے نہ تو چشم پوشی کر رہے ہیں اور نہ اسے معاف کر رہے ہیں اور یہ امر بھی کوئی کم اہم نہیں کہ اس فلم کے پیش کرنے میں کسی تجارتی ادارے کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ ① (کمپنی نے اپنے خرچ پر یہ فلم پیش کی تھی۔) میرے خیال میں سیدھی سادھی حقیقت یہ ہے کہ وہ امریکی، جو یہ محسوس کرتے ہیں کہ انھیں اسرائیل کی بطور ایک مملکت حمایت کرنا

......رہ جاتا ہے یا پھر ان میں جو باتیں کہی جاتی ہیں، وہ ناقابل عمل ہوتی ہیں۔ چنانچہ ہر وہ چیز جو ناقابل عمل ہو یا جس کا حقائق سے برائے نام واسطہ ہو، اس پر انگریزی کا لفظ Academic چسپاں کر دیا جاتا ہے۔

① چونکہ امریکا میں ریڈیو اور ٹیلی وژن کی نشریات نجی اداروں کی تحویل میں ہیں، اس لیے ان کی آمدنی کا واحد ذریعہ اشتہارات ہیں۔ چنانچہ تجارتی اداروں کے تعاون کے بغیر کسی پروگرام کو پیش کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

چاہیے، اس بات سے قطعاً لاعلم ہیں کہ فلسطینی وہاں رہتے تھے جہاں آج کل اسرائیل قائم ہے اور یہ کہ وہ اس لیے پناہ گزیں نہیں بنے تھے کہ وہ یہودیوں کے دشمن تھے بلکہ انھیں اس لیے پناہ گزیں بننے پر مجبور ہونا پڑا کیونکہ ان میں سے بیشتر کو اسرائیل نے ٹھڈے مار کر باہر نکال دیا تھا۔ اس صورتِ حال (امریکیوں کی لاعلمی) نے صیہونی پراپیگنڈے کی خوب مدد کی ہے اور یہ اسی صورتِ حال کی برکت ہے کہ کسی اختلافی نقطۂ نظر پر سنجیدگی سے توجہ دینا تو بہت دور کی بات ہے، اسے سننا بھی گوارا نہیں کیا جاتا۔ چنانچہ اگر کوئی (امریکی) شخص فلسطینی حقوق کے بارے میں کوئی بات کرنا چاہتا ہے تو اس پر یہ لازم ہے بلکہ وہ مجبور ہے کہ وہ اس زندانی ڈھانچے کو تسلیم کرے جو کیمپ ڈیوڈ کے معاہدوں نے مہیا کیا ہے یا پھر وہ ان باتوں کے متعلق معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرے کہ تنظیم آزادیٔ فلسطین کے میثاق کا مفہوم کیا ہے؟ ''عرب'' یہودیوں کو کیوں ہلاک کرتے ہیں؟ یا یہ کہ اسرائیل ظالم و جابر مسلمانوں کے ساتھ، جن کی سوچ اور اعمال قرونِ وسطیٰ کے لوگوں کے سے ہیں، کیوں گزارہ کرنے پر مجبور ہے، دریں اثنا حکومت فلسطینی ''انتہا پسندی''......عراق اور لیبیا جیسی مملکتوں کو الگ تھلگ کرنے کی جو کوششیں کی جا رہی ہیں، ان کا یہاں ذکر نہ ہی کیا جائے تو بہتر ہے......کو ان پالیسیوں کی ترویج کے لیے، جن میں اس نے بے دھڑک اور ناعاقبت اندیشانہ انداز سے سرمایہ کاری کی ہوئی ہے، اپنی پوری قوت سے استعمال کر سکتی ہے اور جب اس کا جی چاہتا ہے تو اسی ''انتہا پسندی'' کو یہاں نہ بنا کر فلسطینیوں، عراقیوں اور لیبیا والوں پر فوجی حملے کر سکتی ہے۔

چنانچہ فلسطینیوں اور دوسرے عربوں کو جس انداز سے شیطان بنا کر پیش کیا جاتا ہے، اس سے ایک مفید مطلب حاصل ہو جاتا ہے۔ ورنہ اسرائیل کی اس وحشیانہ یلغار کے بارے میں، جو اس نے مارچ 1978ء میں جنوبی لبنان پر کی تھی، ① امریکا اور اس کے دانشور طبقے نے جو مکمل خاموشی اختیار کیے رکھی، اس کی توجیہ کیسے کی جا سکتی ہے؟ امریکا کے اتحادیوں (اسرائیلی، لبنان کے عیسائی وغیرہ) کو یہ کھلی چھٹی دی جا رہی تھی کہ وہ شہری باشندوں کے خلاف کلسٹر بموں ② جیسے امریکی ہتھیاروں سے مسلح ہو، زبردست ''انسدادی'' جنگوں کا آغاز کر

---

① اسرائیل نے صرف جنوبی لبنان پر وحشیانہ حملے کرنے پر اکتفا نہیں کی بلکہ 1982ء میں اس نے تقریباً سارے لبنان کو روند ڈالا اور بیروت میں فلسطینی پناہ گزینوں کے کیمپوں کو اس نے اور اس کے اتحادیوں نے جس طرح فضائی، بحری اور بری بمباری کا نشانہ بنایا، اس کی مثال ذرا مشکل سے ہی ملے گی۔ عالمی رائے عامہ کے دباؤ کے تحت اسرائیل نے 1983ء میں بیروت سے اپنی فوجیں واپس بلا لیں لیکن جنوبی لبنان میں وہ ابھی تک ڈیرہ جمائے ہوئے ہے۔

② کلسٹر (Cluster) بم: ایک قسم کا بموں کا گٹھا جس میں دھماکوں کے ساتھ پرخچے ہو جانے والے اور آگ لگانے والے بم ملے جلے ہوتے ہیں۔

سکتے ہیں تاکہ یہ ثابت کیا جاسکے کہ ''انتہا پسندی'' اور ''دہشت گردی'' سزا سے بچ نہیں سکتی جب امریکا کے اسرائیل جیسے اتحادی ایسی جنگیں چھیڑتے ہیں جن کا مقصد نہایت ڈھٹائی اور بے شرمی کے ساتھ اپنے مخالفین کا قتلِ عام ہوتا ہے (ایسا ہی ایک قتلِ عام انڈونیشیا نے اپنے ایک صوبے ''تیمور'' کی شہری آبادی کا کیا تھا) تو اس کے متعلق ایک لفظ تک نہیں کہا جاتا اور مکمل سکوت اختیار کرلیا جاتا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا ہے کہ اسرائیل کی پیٹھ ٹھونکی جاسکتی ہے کہ وہ سوویت یونین کے یہودیوں کی حمایت کرتا رہے جو اپنی حکومت کے نقطۂ نظر سے متفق نہیں ہیں (اور وہاں سے اسرائیل آنا چاہتے ہیں) یا پھر وہ فلسطینی قوم پرستی کو بیخ و بن سے اکھاڑتا ہے کیونکہ مغرب کی نگاہ میں یہ دونوں مقاصد بہت ''احسن'' ہیں۔

عام بحث مباحثہ، پالیسی کی تشکیل اور ثقافتی گفتگوئیں، جس دائرے کے اندر کی جاتی ہیں، وہ روز بروز تنگ سے تنگ تر ہوتا جارہا ہے، چنانچہ نقطۂ نظر کو محدود کرنے والا ایک رجحان ایسے ہی ایک دوسرے رجحان کی آبیاری کرتا اور اسے مضبوط تر بناتا ہے۔ اس رویے نے جس سانحے کو جنم دیا ہے، اس کا سب سے بڑا شکار فلسطین کا مسئلہ ہے جو کہ مشرقِ وسطیٰ اور عرب ممالک کی جدید سیاست کا انتہائی زبردست اور طاقتور عنصر ہے۔[1] لیکن اس مسئلے کے بارے میں امریکا کے لوگوں کی دلچسپی میں اتنی کمی پہلے کبھی نہیں آئی تھی جتنی کہ اب آئی ہے۔ اس کی وجوہات کیا ہیں، ان کا ذکر کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ چنانچہ میں مندرجہ ذیل صفحات میں صرف اتنی کوشش کروں گا کہ جن کارروائیوں میں عرب اور فلسطینی ملوث ہیں، ان کا مفہوم واضح کرسکوں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ میرے قارئین شاید امور کو ذرا اس انداز سے سمجھ سکیں گے جس انداز سے مشرقِ وسطیٰ کی ایک زبردست اکثریت انھیں دیکھتی ہے اور ممکن ہے کہ یوں بحث مباحثے اور گفتگو کے لیے ایک وسیع تر اور صحیح تر تناظر بہ تدریج سامنے آجائے۔ بعض اوقات ایسے ہوتا ہے کہ مجرد مسائل کو یوں پیش کیا جاتا ہے جیسے وہ جیتی جاگتی چیزیں ہوں اور ان کے متعلق نعرے بھی ایسے لگائے جاتے ہیں جیسے روایتی طور پر جیتے جاگتے انسانوں کے متعلق لگائے جاتے ہیں۔ مسئلۂ فلسطین بھی کچھ ایسا ہی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ سیاسی اور انسانی سطح پر اس سے یوں نپٹا جائے جیسے یہ فوری توجہ کا مستحق ہو۔ سب سے بڑھ کر جو کام میں کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ میں اس کتاب میں جو باتیں کہتا چلا آرہا ہوں۔ ان کو کہنے کا سلسلہ جاری رکھوں، مطلب سعدی یہ ہے کہ میں مسئلۂ فلسطین کی تفصیل یوں بیان کرنا چاہتا ہوں کہ یہ ایک مسئلہ ہے جس نے خالص انسانی وجوہ کی بنا

---

[1] اس ضمن میں مائیکل سی ہڈسن کی کتاب Arab Politics (عرب سیاست) مطبوعہ ییل یونیورسٹی پریس نیو ہیون (امریکا) (1977ء) کا مطالعہ مفید رہے گا۔ (مصنف)

پر بے شمار لوگوں کو متاثر کیا ہے، یہ وہ چیز ہے جو محض وقوع پذیر نہیں ہوئی بلکہ یہ لوگوں کے ذہنوں اور روحوں میں رچ بس گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ مسئلہ حرکی اور تاریخی بھی ہے۔

میں دو باتوں کو خاص طور پر وضاحت سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے ابھی ابھی جو کچھ کہا ہے، اگر اس کو صحیح مان لیا جائے تو یہ دونوں باتیں اتنی اہم بن جاتی ہیں کہ کیمپ ڈیوڈ کے بعد کے حالات کا جو تجزیہ کیا جاتا ہے، اس میں عام طور پر انھیں پیشِ نظر نہیں رکھا جاتا۔ لیکن اگر کوئی شخص مشرقِ وسطیٰ کی صحیح اور اصلی سیاسی حقیقتوں کا ادراک حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ انھیں سمجھنے کی بھرپور کوشش کرے۔ ان میں سے اولین بات تو یہ ہے کہ 1967ء کے بعد فلسطینی مؤقف میں بعض انتہائی اہم تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں اور اس نے نئے خطوط پر نمو پائی ہے۔ ان تبدیلیوں کا ذکر پہلے ہو چکا ہے...... تاہم انھیں سیاسی طور پر وہ اہمیت نہیں دی جاتی جن کی کہ وہ مستحق ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں بڑے بڑے تاریخی عمل رونما ہوئے ہیں۔ اگر مسئلۂ فلسطین پر اس انداز سے غور کیا جائے کہ یہ (مسئلہ) ان تاریخی عملوں کے ساتھ ایک مضبوط رشتے میں بندھا ہوا ہے تو اس کی اصلی اور سچی مرکزیت اور قوت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے یا اس مرکزیت اور قوت کو بہتر انداز سے سمجھا جا سکتا ہے۔

میں نے اس کتاب کا آغاز اس اختلاف کو زیرِ بحث مسئلہ بنا کر کیا تھا جو فلسطین کی دو حیثیتوں کے مابین پایا جاتا ہے۔ ان میں ایک حیثیت تو تاریخی حقیقت (جو اب موجود نہیں رہی) کے اعتبار سے ہے اور دوسری اس سیاسی جدوجہد کے اعتبار سے جس کا مقصد فلسطینیوں کے لیے، جن کا نہ تو کوئی ملک ہے اور نہ کوئی مناسب قومی وجود، حقِ خود ارادیت حاصل کرنا ہے۔ ایک وقت وہ آیا جب فلسطین نام کا کوئی ملک روئے زمین پر باقی نہ رہا۔ پھر ایک وقت وہ آیا جب فلسطینی اپنے حقِ خود ارادیت کے حصول کی خاطر اٹھ کھڑے ہوئے اور عملی جدوجہد میں مصروف ہو گئے۔ ان دونوں اوقات کے مابین جو وقفہ حائل ہے، اس کے دوران میں اچھی خاصی تاریخ کو وقوع پذیر ہونا تھا اور اس تاریخ کی ایک اچھی خاصی واردات خود فلسطینیوں کے ساتھ پیش آنا تھی۔ ان فلسطینیوں...... ہمارے سیاسی رہنماؤں کی زبان میں میرے والدین کی نسل...... کے لیے جنھوں نے حقیقتاً فلسطین گنوایا، فلسطین، عرب فلسطین یا فلسطین عربیہ تھا۔ کسی بھی قابلِ لحاظ انداز سے یہ نسل اس حقیقت کو تسلیم نہیں کر سکتی تھی کہ فلسطین اسرائیل بن چکا ہے اور یا یہ کہ ان کے عرصۂ حیات کے دوران میں یہ دوبارہ بھاری عرب اکثریت کا ملک نہیں بن پائے گا۔ 1948ء اور 1967ء کے درمیانی عرصے میں عرب دُنیا کی بیشتر سیاسی اور ثقافتی زندگی اسی قسم کے تصورات کی عکاسی کرتی تھی۔ اسرائیل نے جو کہ بہ یک وقت ہمارے تمام عوارض کا ناقابلِ بیان سبب بھی تھا اور ایک حقیقت بھی جسے ہم نے سب سے کم پہچانا تھا، غیر معمولی حد تک

عربوں کی توانائیوں کو ہڑپ کرلیا تھا۔ یہ کابوس کی طرح ہمارے سروں پر سوار ہوگیا تھا۔ ہم جو کچھ کرتے تھے اسی کے حوالے سے کرتے تھے۔ عربیت کیا ہے؟ اس کی حدود اس کے حوالے سے متعین ہوتی تھیں۔ ہمارے دشمن (استعمار، مغرب وغیرہ) کون ہیں؟ انھیں ہم اسی کے حوالے سے پہچانتے تھے۔ ہماری نگاہوں میں کون سے عرب ممالک کی حکومتیں جائز ٹھہرتی تھیں؟ اس کا فیصلہ بھی کم وبیش ان کے ہر اس فعل سے ہوتا تھا جو وہ ''صیہونیت'' کے خلاف جدّوجہد کے نام پر انجام دیتی تھیں۔ ان برسوں کی تاریخ...... ان اداروں اور رسوم و رواج کے تناظر میں، جنھیں استعمار پہلے ہی ٹیڑھا میڑھا بنا چکا تھا اور جن کا رخ بھی وہ تبدیل کر چکا تھا، اور جنھیں اسرائیل اور نااہل جابر فوجی حکومتوں کے مابین غیر مساوی آویزش نے اور بھی ٹیڑھا میڑھا بنا دیا تھا...... ابھی لکھی جاتا ہے۔ ① لیکن (ان برسوں کی) تاریخ نے فلسطینیوں کو کچھ بھی تو نہیں دیا سوائے ان فلسفوں اور سیاسی جماعتوں کے جن کی اساس اس قسم کے عظیم اور فرحت بخش نعروں پر رکھی گئی تھی کہ ہمیں دوبارہ ''عرب قوم'' بننا ہے جس کا ماضی نہایت درخشاں تھا اور ہمیں عرب فلسطین دوبارہ حاصل کرنا ہے۔

1967ء کے بعد ڈرامائی طور پر جو کچھ وقوع پذیر ہوا۔ اس کے پیشِ نظر ہی میں ان تمام امور کا تذکرہ کر رہا ہوں۔ ناصر ازم، بعث ازم، عرب قوم پرست تحریک، اسلامی بنیاد پرستی ② اور بائیں بازو سے تعلق رکھنے والی تقریباً ساری پارٹیوں کا سلسلۂ جنگ جون (1967ء) کے بعد زمین بوس ہوگیا۔ اگرچہ (ان میں سے) بعض طبقے ابھی تک مراعات یافتہ زندگی گزار رہے ہیں لیکن اس شکست نے ان کا جس طرح پڑا کیا ہے، اس سے وہ ابھی تک سنبھل نہیں سکے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ جن معاشرتی، سیاسی اور ثقافتی حقیقتوں پر ان کی توجہ

---

① اس سلسلے میں کچھ کام شروع بھی ہو چکا ہے۔ ایک بہت نفیس مضمون باربرا کلکاس (Kalkas) نے Diverted Institutions: A Remiter-pretation of the process of Industrialization in Nineteenth Certury Egypt کے عنوان سے لکھا ہے یہ مضمون ''عرب سٹڈیز کوارٹرلی'' کی جلد اول شمارہ اول (زمستان 1979ء) میں صفحات نمبر 48-28 پر شائع ہوا۔

② بنیاد پرستی (Fundamentalism): اصل میں یہ تحریک اس صدی کے آغاز میں امریکا کے پروٹسٹنٹ طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگوں، بالخصوص ایک وکیل اور سیاسی رہنما ولیم برائن (Bryan) نے چلائی تھی۔ اس کا مقصد اس نظریے کو فروغ دینا تھا کہ انجیل کا ایک ایک لفظ لفظاً و معناً درست ہے۔ یہ تحریک یہ بھی چاہتی تھی کہ عقائدِ جدیدہ کی بجائے عقائدِ قدیم دوبارہ مروج ہوں۔ اس کے پانچ اصول یہ تھے (1) انجیل کی مطلق سچائی (2) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کنواری ماں کے بطن سے تولید (3) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قبر سے اٹھایا جانا (4) انسان کی نجات اور (5) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دوبارہ ظہور۔ چنانچہ اسلامی ممالک میں احیائے اسلام کی جتنی بھی تحریکیں چلیں یا چل رہی ہیں، مغرب ان سب کو بلاتمیز ''بنیاد پرست'' قرار دے دیتا ہے۔

اور مساعی مرکوز تھیں، ان کے ساتھ ان کا رابطہ محض جزوی تھا۔ جہاں تک باقی باتوں کا تعلق ہے، یہ محض ایسے فلسفے تھے جنھیں دُنیا کے مختلف خطوں اور تاریخ کے مختلف ادوار سے مستعار لیا گیا تھا۔ انھیں نہ تو ہضم کیا گیا تھا اور نہ ان کی مناسب و موزوں انداز سے تدوینِ نو کی گئی تھی تا کہ وہ ان عصری تقاضوں کو، جو اُن کے سپرد کیے گئے تھے، پورا کر سکیں۔ کسی بھی مشرقی عرب ملک (حتیٰ کہ خود مصر میں بھی نہیں) میں نو آبادیاتی دور اور نو آبادیات کے اختتام کے دور کے مابین فیصلہ کن انقطاع عمل میں نہیں آیا تھا۔ یوں کہیں کہ استعمار اور نو آبادیات کا زمانہ تولد گیا تھا۔ لیکن اس کے آثار و باقیات ختم نہیں کیے جا سکے تھے۔ ان کا اب بھی چلن تھا۔ اگر الجزائر کا (مثال کے طور پر) مصر، شام یا عراق سے موازنہ کریں تو بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ حکومت میں جو بھی، جہاں بھی اور جب بھی کوئی تبدیلی رونما ہوئی، وہ محض چہروں کی تبدیلی بن کر رہ گئی۔ اس میں کلام نہیں کہ طبقاتی ڈھانچوں، ثقافتی گروہ بندیوں اور معاشی اداروں میں نہایت اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ لیکن یہ تمام تبدیلیاں کبھی بھی ایک ایسے مقام کو نہیں چھو سکیں کہ ہر چیز زیر و زبر ہو جاتی اور ایک انقلابی کایا پلٹ ممکن ہو جاتی۔ ان معنوں میں بھی عرب مشرقِ وسطیٰ ایک وسطی مقام ہی رہا اور یوں وہ دُنیائے اوقیانوس کے مجموعی بورژوازی استحکام اور مابعد جنگ کی تیسری دُنیا کے طوفانی انقلابات کے مابین دونوں سے تقریباً ایک قسم کے مساوی فاصلے پر قائم رہا۔

جمال عبدالناصر اپنی نسل کے واحد رہنما تھے جنھوں نے تیسری دُنیا کے استعمار دشمن تصور پر سنجیدگی سے توجہ دی لیکن انھوں نے بھی بائیں بازو اور سوویت یونین میں صرف اسی وقت واپسی کا اظہار کیا جب مغرب نے انھیں دھتا بتا دیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ (تلخ) حقیقت ہمیشہ ان کی سیاست پر اثر انداز ہوتی رہی۔ ایک لحاظ سے اس نے انھیں ایک عظیم رہنما بنا دیا لیکن ایک دوسرے لحاظ سے یہ ان کے پاؤں کی زنجیر بھی بن گئی اور یوں ان کا دائرۂ عمل بہت محدود ہو گیا۔ عرب سیاسی زعما کی صفوں میں ان کی بہت سے مقلدین اور پیروکار بھی تھے۔ بجائے اس کے کہ ناصر انھیں اپنے پیچھے چلاتے، کئی معاملات میں الٹا انھوں نے ان کی تقلید کی اور یوں انھوں نے بھی ان کی طرح اپنے ملک میں ایک سچی اور کھری اپوزیشن کو پنپنے نہیں دیا اور سارا زور مملکت کی سلامتی کے ایک ایسے نظام کی تشکیل پر لگا دیا جو بھاری بھرکم بھی تھا اور جس پر اخراجات بھی بے تحاشا ہو رہے تھے۔ اس مملکت کے مخالفین کی صفوں میں ایک تجریدی تصور، جسے ''صیہونیت'' کہتے ہیں امریکا (جس سے پینگیں بڑھانے کے لیے مصر بہت بے قرار تھا)، مصر کے بائیں بازو اور ہر اس عرب رہنما کو، جو مصری بالادستی کو خوش دلی سے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا، شامل کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ مارکسزم (مارکسیت) کو کبھی بھی مصر میں مضبوطی سے پاؤں جمانے کا موقع نہ مل سکا، حالانکہ ایک دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ ناصر کے دورِ اقتدار

کے دوران میں یہ مصری اور عرب ثقافت ہی تھی جس نے عام طور پر دوسری حکومتوں اور مملکتوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر سیاسی طور پر ہراول دستے کا کردار ادا کیا۔ ① تاہم ناصر دیوقامت شخصیت تھے۔ اپنی تمام خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود انھوں نے عربوں کو طویل خوابِ خرگوش سے بیدار کیا اور ان کی توانائیوں کو بحال کیا۔ اس عمل کے دوران میں انھوں نے مصر کو عرب دُنیا کا نقطۂ ماسکہ بنا دیا جبکہ اپنی عرب لطافت سے محروم ہو جانے کے بعد سادات کا مصر نائیجیریا یا برازیل کی طرح ایک وسیع لیکن بے حیثیت ملک کا درجہ اختیار کر گیا ہے۔

جیسا کہ میں قبل ازیں ذکر کر چکا ہوں کہ 1967ء سے قبل فلسطینی سیاست نمو کے ایسے مراحل میں سے گزر رہی تھی، جو ان لہروں کے، جو عرب دُنیا میں چل رہی تھیں متوازی بھی تھے اور ان سے بے پناہ طور پر متاثر بھی۔ جب 1967ء کے بعد فلسطین کی تحریکِ مزاحمت نے زور پکڑا اور اس میں تیزی آئی، تو یہ عرب دُنیا میں ایک ایسی اولین سیاسی تحریک کے طور پر ظہور پذیر ہوئی جس نے اندرون فلسطین یہودیوں سے براہِ راست ٹکر لی تھی۔ 1948ء اور 1967ء کے مابین مغربی کنارے پر اردنی حکومت کے دورِ اقتدار کے دوران میں فلسطینی قومیت پھلتی پھولتی رہتی تھی۔ ② لیکن پھر جب اس علاقے پر بھی اسرائیل کا قبضہ ہو گیا تو فلسطینی مسئلے نے نیا رخ اختیار کر لیا۔ اب فلسطینیوں کو اسرائیلی صیہونیت کے خلاف براہِ راست زبردست ٹکر لینا تھی۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ 1948ء میں فلسطینی صیہونیت کی جو مخالفت کر رہے تھے، وہ سیاسی اعتبار سے نہ مربوط تھی اور نہ مؤثر۔ ملک سے محرومی کی صورت میں جو نقصان اٹھانا پڑا اسے زیادہ تر عربوں کا نقصان تصور کیا گیا اور جیسا کہ میں قبل ازیں عرض کر چکا ہوں کہ صیہونیوں نے جو پالیسیاں وضع اور اختیار کی تھیں، ان کا مقصدِ عظیم ملک کو عربوں سے خالی کرانا، نہ کہ ان پر حکومت کرنا تھا۔ 1967ء کے بعد یہ صورتِ حال تبدیل ہو گئی۔

اس حقیقت کے باوجود کہ فلسطینی جلاوطن ہیں اور دُنیا کے مختلف مقامات پر بکھرے ہوئے ہیں، فلسطینی تحریکِ مزاحمت (جو بعد ازاں تنظیمِ آزادیٔ فلسطین کے نام سے معروف ہوئی) نے مشرقِ وسطیٰ کے متعلق ایک ایسا تصور اور اس کے مستقبل کے بارے میں ایک ایسا خاکہ تشکیل دیا جو ماضی کے تمام تصورات سے قطعی طور پر مختلف تھا۔ اس تصور کے تحت فلسطین کو ایک ایسی سیکولر جمہوری مملکت بنانا مقصود تھا جس میں عرب اور

---

① اس موضوع پر بہترین کتاب انوار عبدالمالک کی تصنیف ''مصر ایک فوجی معاشرہ ہے،'' انگریزی میں اس کا ترجمہ چارلس مارکھم (Markham) نے کیا تھا اور رینڈم ہاؤس، نیویارک نے 1928ء میں اسے شائع کیا تھا۔

② 1949ء اور 1967ء کے مابین فلسطینی قوم پرستی کا جائزہ سال مشعل نے اپنی کتاب East Bank West Bank The Palestinians Jordan 1949 میں لیا ہے۔ اسے ییل یونیورسٹی پریس نیوہیون نے 1978ء میں شائع کیا۔

یہودی دونوں مل جل کر رہ سکیں۔ اگر چہ اس تصور میں کیڑے نکالنا اور اس کی ہنسی اڑانا بعض لوگوں کی تقریباً عادتِ ثانیہ بن چکا ہے لیکن کوئی ایسا سنجیدہ طریقہ نظر نہیں آتا جس کی مدد سے اس کی زبردست اہمیت کو گھٹا کر پیش کیا جا سکے۔ اس تصور کے ذریعے وہ سب کچھ قبول کر لیا گیا جو عربوں اور فلسطینیوں کی کئی نسلیں قبول نہیں کر سکی تھیں...... یعنی اس تصور کے واسطے سے یہ اقرار کر لیا گیا کہ فلسطین میں ایک یہودی قوم، جس نے لڑ بھڑ کر ایک ملک حاصل کر لیا تھا، موجود ہے...... لیکن اس تصور نے یہودیوں کو محض قبول ہی نہیں کیا بلکہ وہ اس سے بھی کہیں آگے نکل گیا۔ فلسطینی تصور نے وہ حل پیش کیا ہے جو میرے خیال کے مطابق کثیر الاقوام مشرقِ وسطیٰ کا واحد ممکنہ اور قابلِ قبول مقسوم ہے۔ اس کے ذریعے ایک ایسی مملکت کا قیام مقصود ہے جس کی اساس سیکولر انسانی حقوق پر ہوگی۔ اس مملکت میں کسی مذہبی یا اقلیتی طبقے کو اپنی بالادستی قائم کرنے اور دوسروں کو امورِ مملکت سے دور رکھنے کی اجازت نہیں دی جائے گی اور نہ اس میں جغرافیائی سیاست کے اصولوں پر مبنی وحدت، ① جس کو بہت مثالی بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور جس کا شام کے قوم پرست پرچار کرتے نہیں تھکتے، قائم کرنے کا موقع دیا جائے گا، ایک ایسے خطے میں، جہاں سیاست کا کاروبار یا تو استعمار اور یا مذہب کے بل بوتے پر چلتا تھا، مذہبی اور غیر فوجی آویزشوں نے معاشرتی زندگی کی تنظیم کے لیے ایک نئی اساس فراہم کرنا ہی تھا۔ موجودہ حالات کے پیشِ نظر فلسطین (اسرائیل) کو مختلف ناموں سے پکارا جا سکتا ہے۔ اسے یہودی مملکت ② بھی کہا جا سکتا ہے۔ بعض لوگوں کے خیال میں یہ وہ مملکت ہے جو قومی سلامتی کے بارے میں بہت حسّاس ہے اور بعض سمجھتے ہیں کہ یہاں ایک اقلیت کی حکمرانی ہے۔ ان تمام تصورات پر صرف ایک تصور ہی تفوق حاصل کر سکتا ہے اور یہ وہ تصور ایک سیکولر جمہوری معاشرے کے قیام پر زور دیتا ہے۔ اس معاشرے میں تمام قوموں کے لیے گنجائش نکال لی جا سکے گی اور وہ مل جل کر سارے ملک کی عظیم تر بھلائی کے لیے کام کریں گے۔

---

① جغرافیائی سیاست کن اصولوں پر کام کرتی ہے۔ ان کی وضاحت اوپر کی جا چکی ہے۔ شامی قوم پرست شاید ایسی سیاست کے قائل ہیں جس میں غیر عربوں (یا یہودیوں) کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔

② یہاں مصنف نے انگریزی ترکیب Ghetto state استعمال کی ہے۔ Ghetto کسی شہر کے اس محلے کو کہتے ہیں جو ہماری کچی آبادیوں کی طرح ہر قسم کی شہری سہولتوں سے محروم ہو۔ امریکا میں اس قسم کے محلوں میں عام طور پر اقلیتی طبقے کے افراد رہائش پذیر ہوتے ہیں۔ نیو یارک شہر کا محلہ ہارلم (Harlem) جہاں زیادہ تر حبشی باشندے رہتے ہیں، اس طرح کا بدنام ترین محلہ ہے۔ لیکن بیسویں صدی سے قبل یورپ میں یہودیوں سے اتنی نفرت کی جاتی تھی کہ انھیں الگ تھلگ محلوں میں رہنے پر مجبور کر دیا جاتا تھا۔ ان محلوں کو "یہودی باڑے" Ghetto کہا جاتا تھا۔ اس رعایت سے اسرائیل کو Ghetto state کہہ سکتے ہیں۔

فلسطینیوں نے فلسطین کے مستقبل کے متعلّق یہ جو خاکہ پیش کیا ہے، اس کی راہ میں متعدد مشکلات اور مسائل سنگِ گراں بن کر حائل ہو چکے تھے، بنیادی طور پر بہت کم لوگ ایسے تھے جو اس تصور کو قبول کرنے کے لیے آمادہ تھے اور وہ جچے تلے اور صحیح ذرائع تو کسی کے بھی پاس نہیں تھے جن کے ذریعے اس تصور کو عملی شکل دینا ممکن ہوتا لیکن بہت سا کام تو اس وقت ہو چکا تھا جب یہ (تصور) تشکیل و ترتیب کے مراحل میں سے گزر رہا تھا اور اس کی نوک پلک سنواری جا رہی تھی۔ عربوں نے فلسطین کو ہمیشہ اس تناظر میں دیکھا کہ یہ ایک عرب ملک ہے لیکن اب کے بار پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ اس میں ایک دوسری ثقافت کی قلم ① بھی لگا دی گئی۔ اس خطے کی جدید تاریخ میں پہلی مرتبہ...... اور میرے نزدیک یہ امر بے پناہ قدر و قیمت کا حامل ہے...... انسانی اور سیاسی مواد سے عہدہ برآ ہونے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ ماضی میں ان سے نپٹنے کے لیے درآمد شدہ یا مطلقیت بلا استثنیٰ پر مبنی فلسفوں (مثلاً صیہونیت اور عربیت) سے کام لیا جاتا تھا (فلسطینیوں کی سوچ میں) یہ جو اتنی بڑی تبدیلی رونما ہوئی ہے، مغرب کا ایک بھی سیاسی تبصرہ نگار اس کا مفہوم نہیں سمجھ سکا۔

یہی نہیں، خود صیہونی بھی اس کو سمجھنے میں ناکام رہے ہیں۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کے متعلّق جو فی زمانہ بحث و تمحیص ہوتی ہے۔ اس میں فلسطینیوں کی سوچ کی اس تبدیلی کو اتنی اہمیت بھی نہیں دی جاتی جتنی کہ کتاب کے حاشیے پر کسی تحریر کو حاصل ہوتی ہے۔ فلسطینیوں کے متعلّق یہ مفروضہ قائم کر لیا گیا کہ وہ جاہل دہشت گرد ہیں۔ ان کے میثاق کے متعلّق یہ فرض کر لیا گیا کہ انھوں (فلسطینیوں) نے یہودیوں اور صیہونیت کا نام و نشان تک مٹا دینے کا جو عزم کر رکھا تھا، اس (میثاق) سے یہ ظاہر ہو گیا ہے کہ ان کے اس (عزم) میں ذرہ برابر تبدیلی نہیں آئی ہے۔ اب تو مخالفین کی یہ عادت بن گئی ہے کہ وہ سیکولر جمہوری ریاست کے تصور کو قتلِ عام کے مترادف قرار دینے لگے ہیں۔ ② دریں اثنا اسرائیل ابھی تک فلسطینیوں کو غیر یہودی کہہ کر پکارتا رہا اور یا...... اور یہ بہت اہم واقعہ ہے...... پھر انھیں ''ارتیز اسرائیل کے عرب'' کہنے لگا۔ دریں اثنا اسرائیل نے باقی ماندہ فلسطین کو اپنی نو آبادی بنانے کا کام جاری رکھا اور لاکھوں فلسطینیوں پر فوجی حکام حکومت

---

① یہاں مصنف نے انگریزی لفظ Acculturation استعمال کیا ہے۔ جب کسی تہذیب، ثقافت یا فرد کا دوسری تہذیبوں، ثقافتوں یا افراد سے واسطہ پڑتا ہے، تو اس میں کچھ تبدیلیاں پیدا ہونے لگتی ہیں۔ اس عمل کو Acculturation کہتے ہیں جب فلسطین میں یہودی اور عرب مل جل کر رہیں گے، تو وہ اس عمل میں سے بھی گزریں گے۔

② اس نقطۂ نظر کو سب سے زیادہ ''ماہرانہ'' انداز سے یہودی جنرل یہوشفاعت حرکابی نے پیش کیا ہے۔ اسرائیلی فوج میں اس کی تصنیفات کا مطالعہ لازمی قرار دے دیا گیا ہے اور مغرب میں اسرائیلی سفارت خانے انھیں باقاعدگی کے ساتھ لوگوں کو پیش کرتے رہتے ہیں۔ اس کی کتاب ''فلسطینی اور اسرائیل''، مطبوعہ کیٹر (Keter) پریس، یروشلم کا مطالعہ فرمائیں۔ (مصنف)

کرتے رہے لیکن مغرب کے لبرل دانشوروں کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ اسرائیلی فلسطینی بچوں کا استحصال کرتے رہے۔ وہ فلسطینی جو اندرونِ اسرائیل کام کرتے تھے، انھیں رات کو وہیں، جہاں وہ کام کرتے تھے، مقفل کر دیا جاتا رہا، تحقیقات اور تفتیش کے دوران میں انھیں باقاعدہ ایذائیں پہنچائی جاتی رہیں۔ اسرائیل اور مقبوضہ عرب علاقوں میں خصوصی قوانین کا اطلاق صرف عربوں پر ہوتا رہا اور یہودیوں کو ان سے مستثنٰی قرار دیا جاتا رہا۔ یہ باتیں کیوں ہوتی تھیں اور کیسے ہوتی تھیں، مجال ہے جو ان لبرل دانش وروں نے ان کے بارے میں جھوٹے منہ بھی ایک لفظ تک کہا ہو۔[1] اس کے برعکس ان امور کے بارے میں ریاکاری اور منافقت کی زبان استعمال کرنا باعثِ عزت اور باعثِ فخر خیال کیا جاتا تھا اور بڑے زور شور کے ساتھ یہ ڈھنڈورا پیٹا جاتا تھا، واہ واہ کیا کہنے اسرائیلی قبضے کے۔ یہ تو بہت نافع اور شفیق ہے بلکہ یہاں تک کہا جاتا تھا کہ اسرائیلی قبضے سے فلسطینیوں کو بے تحاشا معاشی فوائد پہنچے ہیں اور ان (نام نہاد) معاشی فوائد کے بارے میں بہت نکتہ چینی کی جاتی تھی (کہ یہ فلسطینیوں کو کیوں حاصل ہو رہے ہیں)۔ ادھر لبنان میں فلسطینی کیمپوں پر باقاعدگی کے ساتھ گولہ باری ہوتی رہی، ان پر گولیاں چلتی رہیں اور ان پر نیپام بم گرائے جاتے رہے۔ معلوم ہوا کہ جنگ کی یہ سختیاں ''دہشت گردوں'' کے ٹھکانوں کی ''صفائی'' کی خاطر ہو رہی ہیں۔

جب ہم گزشتہ دس سال کی تاریخ پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں تو یہ معلوم کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ آخر فلسطینیوں سے صحیح صحیح توقع کس بات کی کی جا رہی تھی اس کے دوست اور اتحادی یہ چاہتے تھے کہ ان کے حقوق کسی نہ کسی حد تک بحال ہو جائیں لیکن ایسے ممالک، اقوام، اداروں یا اشخاص کی تعداد بہت کم تھی جو اس بات کی حمایت کرتے تھے کہ فلسطینیوں کو اس سے کچھ زیادہ مل جائے جس کا بین السطور وعدہ اقوامِ متحدہ کی قرارداد نمبر 242 میں کیا گیا تھا۔ چنانچہ تنظیمِ آزادیٔ فلسطین کو جو مسئلہ درپیش تھا، وہ یہ تھا کہ اسے جس حلقۂ انتخاب کی رہنمائی کرنا تھی، اس کے رائے دہندگان کی بیشتر تعداد ان جلاوطنوں پر مشتمل تھی جو مغربی کنارے یا غزہ سے نہیں آئے تھے (مثال کے طور پر وہ لاکھوں فلسطینی، جو لبنان میں مقیم ہیں، حیفہ، جافہ اور الجلیل سے آئے تھے) اس کے ساتھ ہی مغربی کنارہ اور غزہ وہ واحد مقامات تھے جہاں فلسطینی قومیت کے خواب کے شرمندۂ تکمیل ہونے کے امکانات تھے۔ تاہم فلسطینی اپنے قومی مقاصد کے حصول کے لیے جتنا زیادہ دباؤ ڈالتے تھے، اتنا ہی

---

[1] اس سلسلے میں کتاب The Market of Arab Children in Israel: A Collection by the Israel League for Human and Civil Rights کا مطالعہ مفید رہے گا۔ کتاب پوسٹ آفس باکس نمبر 14192 تل ابیب کے پتے پر مل سکتی ہے اور یہ 1978ء میں شائع ہوتی تھی۔ اس بارے میں ایک تفصیلی نوٹ پہلے بھی دیا جا چکا ہے۔

زیادہ جوابی دباؤ ان کے خلاف استعمال کیا جاتا تھا اور آویزش کا رخ اتنا ہی زیادہ ان کی طرف ہو جاتا تھا۔ اردن اور لبنان اس آویزش کی دو گراں ترین مثالیں ہیں۔ ہر دن جو گزرتا جا رہا تھا، اس کے ساتھ یہ حقیقت واشگاف ہوتی جا رہی تھی کہ اگر فلسطینی اپنا حق خود ارادیت حاصل کرنا چاہتے تھے تو انھیں فلسطینی آزادی (کے تصور) کو عربوں کی حمایت کے ساتھ مربوط کرنا پڑے گا۔ تاہم اس ربط کا امکان کم ہی نظر آتا تھا کیونکہ اکثر دونوں کا ایک دوسرے کے ساتھ متشددانہ تصادم ہو جاتا ہے۔

دریں اثنا فلسطین پر اسرائیل کا تسلط قائم تھا اور وہ بعض اوقات محض اس لیے کہ اس کی پالیسی ہی یہی تھی اور بعض اوقات محض اس لیے کہ انتہا پسند پہل کر جاتے تھے، مقبوضہ علاقے کو اپنی مستقل نو آبادی بنانے کے پرانے تصور پر قائم رہا۔ مغربی کنارے اور غزہ پر حکومت کرنے کی وجہ سے ایسے نو آبادیاتی ادارے وجود میں آ گئے جنھیں اتنے سال گزرنے کے بعد برقرار رکھنا ہر حکومت اپنی پیش رو حکومت سے کہیں زیادہ اپنا فرض خیال کرتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اسرائیل کو اپنی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایسے یہودی شہریوں سے واسطہ پڑا جو فلسطینیوں کو ایک مسئلہ تصور کرتے تھے اور جس سے ان کے خیال کے مطابق نپٹنا ضروری تھا۔ اسرائیل میں، یورپ میں، امریکا میں، متعلقہ یہودیوں (ہر قسم کی مختلف وجوہات کی بنا پر) کو فلسطینیوں کی حقیقت کا احساس ہونے لگا۔ لاریب، فلسطینیوں کی مزاحمت اور ان کے جارحانہ رویے (جو بعض اوقات دہشت گردی کا روپ دھار لیتا تھا) نے بھی اپنا کردار ادا کیا لیکن یہ حقیقت بھی اپنا کام کر گئی کہ عام یہودیوں کے سامنے ہی اسرائیلی فوجی فلسطینیوں کے ساتھ نہایت ناروا سلوک کرتے تھے۔ وہ انھیں (فلسطینیوں کو) یوں بندوقوں کے کندھے مارتے، کچوکے لگاتے اور حوالۂ زندان کرتے دیکھتے تھے جیسے وہ (جیتے جاگتے) انسان نہ ہوں، بلکہ خالی خولی اجسام ہوں۔ میری رائے میں فلسطینیوں کی مستقل مزاجی اور ثابت قدمی سے بڑھ کر اور کوئی شے اہم نہیں تھی۔ حالانکہ انھیں مفتوح بنا لیا گیا تھا، دھکے مار مار کر ملک سے باہر نکال دیا گیا تھا اور دُنیا کے مختلف مقامات پر منتشر ہونے پر مجبور کر دیا گیا تھا، وہ پھر بھی منظرِ عام سے غائب نہیں ہوئے تھے۔ وہ اب بھی اپنے آپ کو فلسطینی کہتے تھے۔ وہ اب بھی اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ انھیں فلسطین واپس جانے کا اختیار حاصل ہے۔ خواہ انھیں کتنے ہی سہانے خواب دکھائے جائیں انھیں کتنے ہی انعام و اکرام کا لالچ دیا جائے، انھیں اب بھی اس خیال سے وحشت اور بے چینی محسوس ہونے لگتی تھی کہ کوئی اسرائیل (یا کوئی عرب بھی) ان کا آقائے ولی نعمت اور فرماں روا ہو سکتا ہے، محض اس لیے کہ صیہونیت تاریخی طور پر فلسطینیوں کو ہمیشہ نظر انداز کرتی چلی آئی تھی۔ 1960ء کے عشرے کے اواخر اور 1970ء کے عشرے کے دوران میں فلسطینی سیاست نے جب نیا رخ اختیار کر لیا، تو اسرائیلی تلملا اٹھے کہ ہائیں، فلسطین تو دہشت ناک حد تک زیادہ تعداد میں مصروف عمل ہیں۔ یہ

تصور قبول کرنا کہ فلسطینی بھی موجود ہیں۔ایک بات تھی لیکن اس بارے میں عملی تجاویز کرنا کہ آخر ان کے ساتھ کیا کیا جائے......جس کا مطلب یہ تھا کہ ایک ایسی جگہ تلاش کی جائے جہاں انھیں آباد کیا جاسکے اور یوں انھیں اسرائیل کے علاقوں سے دور رکھا جاسکے......ایک دوسری بات تھی۔

یہ بات مان لینا چاہیے کہ اسرائیلی اور ان کے معاونین اس بارے میں تو فصاحت و بلاغت کے دریا بہاتے رہے اور بڑے ترغیبی ذرائع اور تراکیب استعمال کرتے رہے کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ یہودیوں کی ایک اپنی الگ مملکت ہو لیکن انھوں نے یہ سمجھنے کے لیے اپنی ذہانتوں کا عشرِ عشیر بھی استعمال نہیں کیا کہ فلسطینی منظرِ عام سے اوجھل ہونے اور کسی کو پریشان نہ کرنے یا اس کا ناک میں دم نہ کرنے کے لیے کیوں آمادہ نہیں ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ چونکہ فلسطینی منظرِ عام پر موجود ہیں، اس لیے ان کا منظرِ عام پر موجود ہونا ہی اس بات کی علامت ہے کہ فلسطینیوں کا ایک وجود ہے اور یہ کہ انھیں فلسطین کے خواہ ایک حصے پر ہی سہی، اپنی قومیت کو بروئے کار لانے کا حق حاصل ہے، تو (صیہونیوں کے نزدیک) اس کا مطلب یہ ہوگا کہ صیہونی حقوق اور دعاوی سچے نہیں، رائے عامہ کی عدالت میں ان کی تکذیب کی جاسکتی ہے اور جیسا کہ گش ایمونم ① کے متشدد حامیوں نے زیادہ صاف گوئی اور استبازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک موقع پر کہا تھا کہ اس بات کو تسلیم کرلیا جائے کہ یہودیوں کو "نابلوس یا حبرون میں" آباد ہونے کا کوئی حق حاصل نہیں تو اس کا سیدھا سادہ مطلب یہ ہوگا کہ کل کلاں فلسطینی جافہ یا حیفہ میں آباد ہونے کا مطالبہ کرنے لگیں گے (اور آپ کو ان کا یہ مطالبہ ماننا پڑے گا۔) وہ صیہونی بھی، جو اپنے آپ کو "امن کی فاختائیں" کہتے تھے، جنھیں مغربی کنارے پر اسرائیلی بستیوں (کے قیام) کے متعلق ضمیر کی خلش محسوس ہوتی تھی اور جو فلسطینیوں کی حق تلفیوں کی تلافی کرنے کی سچی ضرورت محسوس کرتے تھے، یہ کہتے ہوئے گھبراتے تھے کہ مغربی کنارہ اور غزہ فلسطینیوں کے حوالے کیا جاسکتا ہے تاکہ وہ وہاں اپنی مملکت قائم کرسکیں۔ جودیہ اور سماریہ صحرائے سینا نہیں تھے (ان کے دل کا چور یہ کہتا تھا کہ) اگر ان کے متعلق یہ تسلیم کرلیا گیا کہ وہ فلسطینی (علاقے) ہیں تو پھر کیا یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں نہیں ہو جائے گی کہ اسرائیل درحقیقت نتیجہ ہے تسخیر کا اور اس امر کا کہ اس کے باشندوں نے دراصل دوسروں کو اپنے گھروں سے نکال دیا تھا اور ان کی جگہ خود قابض ہوگئے تھے؟ انفرادی ضمیر اور انتہائی

---

① مغربی کنارے اور غزہ کے مقبوضہ علاقوں میں جب اسرائیل نئی بستیاں تعمیر کرنے کا اعلان کرتا ہے تو سب سے پہلے ایک ہراول دستہ بھیجا جاتا ہے۔ اس دستے کے ارکان کا تعلق ایک انتہائی متعصب اور متشدد جماعت سے ہوتا ہے۔ اس جماعت کا نام گش ایمونم ہے۔

بائیں بازو کی سیاست کے علاوہ اسرائیلی یا صیہونی سیاست میں کوئی عنصر ایسا نہیں جس کے دل میں فلسطینیوں کے لیے کوئی نرم گوشہ ہو یا وہ ان کے لیے کوئی گنجائش نکالنے کے لیے آمادہ ہو۔ ان (فلسطینیوں) کے لیے کوئی علاقہ، کوئی سیاسی یا معاشرتی مقام خالی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ باقی دُنیا سمجھتی رہی کہ مغربی کنارہ اور غزہ فلسطینیوں کے حوالے کیے جاسکتے ہیں لیکن اسرائیلی یہی کہتے رہے کہ ایسا کرنے سے اسرائیل کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہوجائے گا۔ بظاہر وہ اس بات پر اصرار کرتے تھے کہ اگر ان علاقوں (غزہ اور مغربی کنارہ) میں فلسطینی مملکت قائم کردی گئی تو وہ اسرائیل پر حملے کرنے کا اڈا بن جائے گی لیکن اصل حقیقت، جس کی تمرّد اور ہٹیلے پن سے پردہ پوشی کی جارہی تھی، یہ تھی کہ صیہونیت نے فلسطین کے کسی بھی حصے پر اپنے کسی حریف کے حق کی موجودگی سے ہمیشہ انکار کیا تھا (اور وہ اب بھی اپنے اس انکار پر قائم تھی۔) جس طرح ایک فلسطینی ریاست (اسرائیل کے لیے) ایک زبردست سیاسی خطرہ تھی، اسی طرح فلسطینی قوم پرستی بلکہ خود فلسطینی بھی خطرے کی علامت تھے۔

دہشت گردی کے متعلق جو گفتگو کی جاتی رہی، اس کا مقصد مخمصے سے توجہ ہٹانا تھا۔ فلسطینیوں کو دہشت گردی کے مماثل ٹھہرانے کے لیے اسرائیلی اور مغربی باشندے جو مہمیں چلاتے رہے ہیں، وہ بھی ان حقائق کی پردہ پوشی نہ کرسکیں کہ

(الف): فلسطینی دہشت (گردوں) نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ جانی نقصان کم سے کم ہو اور

(ب): جیسا کہ اسرائیل کے جنرل گور (GUR) نے مئی 1978ء میں یہ اعتراف کیا تھا کہ اسرائیل کی سرکاری فوجی پالیسی یہ ہے کہ اجتماعی طور پر زیادہ سے زیادہ فلسطینی شہری باشندوں کو حملوں کا نشانہ بنایا جائے۔

تاہم 1974ء میں فلسطینی قیادت نے ایک اہم فیصلہ کیا کہ گو یہ بات بالکل عیاں ہے کہ (فی الحال) عرب فلسطین کی بحالی ناممکن ہے لیکن اس کے ساتھ ہی 1973ء کی جنگ نے یہ بات ممکن بنادی ہے کہ اگر عربوں کے عسکری اور سیاسی دباؤ کو کسی حد تک یکجا کردیا جائے تو اسرائیلی بالادستی میں کچھ نہ کچھ دراڑیں ڈالی جاسکتی ہیں۔ مزید برآں رباط کانفرنس نے اس حقیقت پر، جو پہلے ہی عیاں تھی، مہر تصدیق ثبت کردی کہ تنظیم آزادیٔ فلسطین امکانی طور پر فلسطینیوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ چنانچہ جب نومبر 1974ء میں یاسر عرفات اقوامِ متحدہ تشریف لائے، تو اس قسم کے تصورات کو کہ مسئلۂ فلسطین کا کوئی خالص فوجی حل ہوسکتا ہے، ترک کیا جاچکا تھا۔ اپنی تاریخ میں پہلی مرتبہ فلسطینی کم وبیش شعوری طور پر بین الاقوامی سیاسی اکھاڑے میں اترے جب کہ صیہونی یہ کام ان سے تقریباً ایک سو سال پہلے ہی کرچکے تھے۔

تنظیم آزادیٔ فلسطین نے بار بار اس بات کی تکرار کی کہ وہ مغربی کنارے اور غزہ میں ایک فلسطینی مملکت قبول کرنے کے لیے تیار ہے۔ 1940ء اور پھر 1977ء میں قومی کونسل کے جو دو اجلاس منعقد ہوئے، ان میں

ساری (فلسطینی) قوم کو اس تصور کا پابند بنا دیا گیا اور اس تصور کے ساتھ بین السطور یہ وعدہ بھی وابستہ تھا کہ ایک ہمسائے کے طور پر اسرائیل کو تسلیم کر لیا جائے گا لیکن یہ تبدیلیاں بڑی مشکلات کے بعد عمل میں آئیں۔ عرفات اپنے حلقۂ انتخاب کی اکثریت سے یہ درخواست کر رہے تھے کہ وہ اپنے گھروں، املاک اور حقوق کی اصطلاحوں میں نہ سوچیں کیونکہ وہ انھیں ناقابلِ تنسیخ طور پر اسرائیلی ہاتھوں کھو چکے ہیں بلکہ وہ یہ دیکھیں کہ انھیں کون سے نئے سیاسی فوائد...... مملکتی حیثیت، قومیت، حکومت، جیسے حقوق جن سے فلسطینیوں کو محروم رکھا گیا تھا...... حاصل ہوں گے۔ ان کے مخالفین کا استدلال یہ تھا کہ انھوں نے ''صیہونی استعمار'' کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے ہیں۔ استردادی محاذ نے ہر مقام پر غیر مختتم انقلابی جدّ و جہد شروع کرنے کا مطالبہ کیا گویا کہ وہ یہ ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے کہ عرفات جو کچھ کہتے اور کرتے ہیں، اس سے فلسطینی امنگیں سکڑ جاتی ہیں جبکہ استردادی فلسفہ انھیں وسعت اور کشادگی دیتا ہے۔ عرفات اور تنظیمِ آزادئ فلسطین جو سیاسی پیشکش کر رہے تھے، صیہونیوں نے انھیں نظر انداز کر دیا۔ سرکاری طرزِ فکر کو صاف ہٹ دھرمی سے جاری رکھا گیا اور اس میں مُو برابر فرق نہ آیا، بار بار یہی اصرار کیا جاتا رہا:

فلسطینی نام کی کوئی مخلوق روئے زمین پر موجود نہیں۔
تنظیمِ آزادی فلسطین ایک نازی ٹولا ہے اور
عرفات بچوں کا قاتل ہے۔

اسرائیلی فاختاؤں نے ایک سطح پر تنظیمِ آزادئ فلسطین کو تسلیم کرنے کی کوشش کی لیکن دوسری سطحوں پر وہ اس سے دور ہٹتے چلے گئے۔ تنظیم سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ وہ مسلح جدّ و جہد ترک کر دے اور اسرائیل کو پیشگی تسلیم کرے۔ عرفات سے یہ تقاضا کیا گیا کہ وہ عملاً ایسے اقدامات کریں جو ثابت کریں کہ وہ (اس قسم کی) مراعات دینے کے لیے تیار ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ تنظیمِ آزادئ فلسطین میں درحقیقت جو تبدیلی رونما ہوئی تھی، اس کی کوئی قدر نہ کی گئی۔

اس تبدیلی کے جواب میں دوسرا فریق جو اقدام کرتا، ظاہر ہے کہ ردِ عمل کے طور پر تنظیم بھی کوئی نہ کوئی کارروائی کرتی۔ لیکن کسی نے یہ سوچا تک نہیں کہ تنظیم نیک خواہشات کا جواب نیک خواہشات سے دے سکتی ہے۔ دریں اثنا اسرائیل نے مغربی کنارے اور غزہ میں زیادہ سے زیادہ بستیاں تعمیر کرنے کا جو منصوبہ بنایا تھا، اس پر کام جاری رہا۔ اس کے ساتھ ان دونوں علاقوں میں ''متبادل''، فلسطینی قیادت تخلیق کرنے کے لیے گاہے گاہے کوششوں کا سلسلہ جاری رہا۔

1974ء اور 1977ء کے مابین کے تین سالوں کے دوران میں امریکا نے حیران کن انداز سے تخریبی

اور غیر ذمے دارانہ طرزِ عمل کا مظاہرہ کیا۔ ہنری کسنجر اور ان دو صدور[1] نے، جن کے تحت انھوں نے اپنے سرکاری فرائض سرانجام دیے تھے، نسبتاً ایک مختصر عرصے کے دوران میں اسرائیل کو اتنا زیادہ اسلحہ فراہم کر دیا جو اس سے قبل اسے اپنی تاریخ میں کبھی دستیاب نہیں ہوا تھا۔ امریکا نے عمداً یہ پالیسی اختیار کر رکھی تھی کہ فلسطینیوں کو نظر انداز کر دیا جائے، علاقے میں عربوں کے قوم پرستانہ جذبے میں سینڈھ لگائی جائے اور اس کی تراش خراش کر کے اسے قابلِ قبول بنانے کی کوشش کی جائے اور سیاسی تحریک کو مجبور کیا جائے کہ وہ دو فریقی، قدم بہ قدم عمل کو تسلیم کر لے۔ مسئلۂ فلسطین ہمیشہ امریکا کی داخلی سیاست کا مسئلہ بنا رہا تھا اور اب کوشش یہ کی جا رہی تھی کہ کسی طرح اس کی کچھ اس طور کایا پلٹ کر دی جائے کہ یہ مصری، شامی یا سعودی پالیسی (کی بھول بھلیوں) میں گم ہوتا نظر آئے۔ اس بات کے اشارے ملتے ہیں کہ کسنجر کے خیالات اتنی دور نکل گئے تھے کہ یہ تک سوچا جانے لگا کہ سی آئی اے[2] کو لبنانی جنگ میں اس طرح جھونکا جائے کہ لبنانی جنگ طویل سے طویل تر ہوتی چلی جائے اور یوں تنظیمِ آزادیٔ فلسطین اس کی آگ میں بھسم ہو کر رہ جائے۔[3] مشرق میں ایران امریکی پالیسی کا حصار تھا۔ مغرب میں اسرائیل کی دفاعی صلاحیتیں اتنی وسعت اختیار کر گئیں کہ وہ شاہِ (ایران) کے دفاعی انتظامات کی تکمیل کرنے لگیں۔ اس طریقے سے امریکا اس بات کا اہتمام کر رہا تھا کہ سوویت یونین کے لیے یہ علاقہ ایک طویل عرصے کے لیے ممنوعہ علاقہ بن جائے اور خود اپنے پنجے وہاں نہایت مضبوطی سے گاڑ لیے جائیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کی یہ کوشش بھی تھی کہ ان قوم پرست اور انتہا پسند تحریکوں کا، جو ابھی تک غیر مقبول حکومتوں کے لیے خطرہ بنی ہوئی تھیں، گلا گھونٹ دیا جائے۔[4]

---

① صدر رچرڈ نکسن (74-1967ء) اور صدر جیرالڈ فورڈ (77-1974ء)

② سی آئی اے (سنٹرل امریکن ایجنسی) امریکا کا (بدنام زمانہ) بین الاقوامی جاسوسی کا ادارہ۔ یہ ادارہ محض جاسوسی ہی نہیں کرتا بلکہ پسندیدہ حکومتوں کے تختے بھی الٹواتا رہا ہے۔

③ تفصیلات راجر مورس کی کتاب ''غیر یقینی عظمت، ہنری کسنجر اور امریکا کی خارجہ پالیسی'' (ہارپر اینڈ رو، نیو یارک 1977ء) کے صفحہ نمبر 261 پر دیکھی جا سکتی ہیں۔ (مصنف) لبنان میں جنگ کی چنگاریاں ابھی تک سلگ رہی ہیں۔ تنظیم آزادیٔ فلسطین اور خود یاسر عرفات کو اسرائیلی اور لبنانی عیسائی ملیشیا کے حملوں کے دوران میں جن آزمائشوں میں سے گزرنا پڑا، اس کی مثال کم ہی ملتی ہے۔ تاہم پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہیں جا سکتا۔ تنظیم اور یاسر عرفات اب بھی بقید حیات ہیں اور دھڑلے سے اپنے مشن کی تکمیل میں مصروف ہیں۔

④ اس عرصے کے دوران میں امریکا جس پالیسی پر عمل پیرا رہا ہے۔ اس کا معقول ترین تجزیہ اقبال احمد کے مضمون ''واشنگٹن کیا چاہتا ہے؟'' میں کیا گیا ہے۔ یہ مضمون ایک کتاب ''مشرقِ وسطیٰ کی کٹھالی (Crucible) عرب اسرائیلی جنگ اکتوبر 1973ء کے مطالعات'' مرتبہ نصر ایچ عردی (مدینہ پریس، ولمٹ (Wilmette) الی نوائے، 1975ء) میں شامل ہے۔ ......

فلسطینیوں نے عالمی برادری اور امریکا کو اشاروں کنایوں میں جو پیغامات دیے تھے، انھیں عمداً پائے استحقار سے ٹھکرا دیا گیا۔ اب جب کہ تنظیمِ آزادیٔ فلسطین اقوام متحدہ کی قرار داد نمبر 3236 (22 نومبر 1974ء) سے جس میں اس کے اس بین الاقوامی حق کی ضمانت فراہم کی گئی تھی کہ وہ خود ارادیت کے حصول کے لیے زور دے سکتی ہے اور جس میں اسے فلسطینیوں کی واحد جائز نمائندہ جماعت تسلیم کر لیا گیا تھا، مسلّح ہو چکی تھی، اس نے پہلے کی نسبت زیادہ اعتماد کے ساتھ یہ کوشش کی کہ امریکا کے ساتھ سلسلہ جنبانی کی کوئی صورت پیدا ہو جائے مثلاً 1975ء اور 1976ء کے دوران میں تنظیم نے امریکی شہریوں کے تحفظ کے لیے ہر وہ کارروائی کی جو حتّی الامکان اس کے بس میں تھی۔ 22 جنوری 1976ء کو تنظیم نے سلامتی کونسل کی اس قرار داد کی علانیہ حمایت کی جس میں اس شق کا اعادہ کیا گیا تھا کہ ''ایسے حالات پیدا کیے جانے چاہییں جن میں فلسطینی عوام کو یہ موقع مل سکے کہ وہ اپنے غیر منفک اور نا قابلِ انتقال حقِ خود ارادیت کو، جس میں اقوامِ متحدہ کے منشور کے مطابق فلسطین میں ایک آزاد سلطنت قائم کرنے کا حق بھی شامل ہے، بروئے کار لا سکیں۔'' قرار داد میں کسی اگر مگر کے بغیر واضح طور پر مزید کہا گیا تھا کہ اس علاقے کی تمام مملکتوں کو امن چین سے رہنے اور اپنی علاقائی سالمیت اور آزادی برقرار رکھنے کا پورا پورا حق حاصل ہے...... یہ صریحاً اور کاملاً ایک غیر مبہم بیان تھا اور اس میں یہ بات تسلیم کر لی گئی تھی کہ اسرائیل کو زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔ لیکن اقوام متحدہ میں امریکی سفیر ڈینیل پی موئنیہان ① نے ایک لفاظی سے بھرپور لیکن احمقانہ تقریر کی اور اس کے ساتھ اس قرار داد کو ویٹو ② کر دیا (اس پر خطِ تنسیخ پھیر دیا۔)

جب صدر کارٹر برسرِ اقتدار آئے اور انھوں نے مارچ 1977ء میں کلنٹن ③ کے مقام پر اہم ''فلسطینی''

......جرنل آف پیلسٹائن سٹڈیز'' جلد دوم، شمارہ نمبر 3 (بہار 1973ء) میں میرے مضمون ''امریکا اور مشرقِ وسطیٰ کی قوتوں کی کشمکش'' کا مطالعہ بھی مفید رہے گا۔ (مصنف)

① ڈینیل پی موئنیہان (Meyrihan): امریکا کا ایک ''لبرل'' یہودی دانشور ہے، امریکی سینٹ کا رکن بھی رہا ہے اور بھارت میں امریکا کا سفیر بھی۔ اس ناتے پاکستان کے خلاف بھی اپنے دل کی بھڑاس نکالتا رہتا ہے۔

② اقوام متحدہ کا اصل با اختیار ذیلی ادارہ ''سلامتی کونسل'' پندرہ ارکان پر مشتمل ہے۔ اس کے دس ارکان تو اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی، جس کا ہر ملک رکن ہے، دو سال کی میعاد کے لیے منتخب کرتی ہے (ہر سال پانچ ارکان منتخب ہوتے ہیں) لیکن پانچ ارکان...... امریکا، روس، چین، برطانیہ اور فرانس...... اس کے مستقل ارکان ہیں۔ اگر چودہ ارکان بھی ایک قرار داد یا معاملے کی تائید کر دیں لیکن ایک مستقل رکن نہ کر دے تو وہ قرار داد منظور نہیں ہو سکتی۔ قرار داد کو اس طریقے سے نامنظور کرنے کے عمل کو ''ویٹو'' یا حقِ استرداد کہتے ہیں۔

③ کلنٹن (Klinton): امریکا کی ریاست ''میساچوسٹس'' کا ایک قصبہ

اعلانات کیے تو تنظیم آزادیٔ فلسطین کا ردِعمل انتہائی مثبت تھا۔ اس وقت فلسطینی قومی کونسل کا اجلاس قاہرہ میں ہو رہا تھا اور اس ادارے کے سامنے عرفات نے جو اصل تقریر کی، اس میں انھوں نے نہایت احتیاط کے ساتھ کارٹر کے بیانات پر تنظیم آزادیٔ فلسطین کے خوشگوار ردِعمل کا اظہار کیا۔ اجلاس کے مجموعی لب و لہجہ نے فلسطینیوں کو اس مقام پر لا کھڑا کیا جہاں وہ امریکا کے ساتھ بات چیت کرنے کے لیے بالکل آمادہ نظر آنے لگے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ یہ وہی امریکا ہے جو روایتاً فلسطینی امنگوں اور آرزوؤں کا مخالف رہا ہے۔ اسی سال بعد ازاں معاملات اور بھی سعد نظر آنے لگے۔ کسنجر نے سینائی دوم کے اسرائیلی امریکی ضمیمے میں ایک شق تحریر کی تھی۔ اس میں یہ کہا گیا تھا کہ امریکا اس وقت تک تنظیم آزادیٔ فلسطین کو تسلیم نہیں کرے گا اور نہ اس سے کسی قسم کی بات چیت کا روادار ہوگا جب تک کہ وہ اقوامِ متحدہ کی قرارداد نمبر 242 پر صاد نہیں کر دیتی۔ اب یہ قرارداد نمبر 242 ایک ایسی سیاسی دستاویز ہے جو فلسطینیوں کے لیے کبھی بھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔

اس قرارداد کو تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ فلسطینی مسئلے کے قومی پہلو سے انکار کر دیا گیا ہے کیونکہ قرارداد نمبر 242 صرف ''پناہ گزینوں'' کا ذکر کرتی ہے۔ پھر بھی 1977ء کے موسم گرما کے اواخر تک سعودی، مصری اور شامی پیغام رسانوں کی وساطت سے قرارداد نمبر 242 کے متعلق امریکا اور تنظیم آزادیٔ فلسطین کے مابین ایک قسم کا سمجھوتا طے پا چکا تھا۔ تنظیم نے قرارداد تسلیم کرنے کی حامی بھر لی تھی لیکن ساتھ ایک ''شرط'' لگا دی تھی کہ امریکا اور تنظیم کے مابین جو سمجھوتا طے پایا ہے اس میں ایک شق یہ رکھی جائے گی کہ اقوام متحدہ کی قرارداد نمبر 242 میں فلسطینیوں کے حقوق کا، جو غیر منفک اور ناقابلِ انتقال ہیں، کوئی ذکر نہیں۔ بہر حال تنظیم نے قرارداد نمبر 242 کو تسلیم کرنے کی جو حامی بھری اس کے جواب میں امریکا نے یہ عندیہ دیا کہ وہ تنظیم آزادیٔ فلسطین کو تسلیم کر لے گا۔ اس سے بات چیت کرے گا اور فلسطینیوں کے حق خود ارادیت کے متعلق کوئی واضح بیان دے گا۔ اگست کے اواخر میں پتا نہیں کیا پیچ آن پڑا کہ امریکا نے تنظیم آزادیٔ فلسطین کو عین آخری موقع پر یہ اطلاع دی کہ وہ تنظیم سے ''مکالمے'' سے آگے اور کچھ نہیں کرے گا۔ چنانچہ قرارداد نمبر 242 (کی کڑوی گولی) نگلنے کا انعام فلسطینیوں کو حق خود ارادیت کے حصول کی صورت میں نہیں ملنا تھا بلکہ امریکا کے ساتھ گفتگو کرنے کا اعزاز حاصل ہونا تھا اور یہ اعزاز بھی اگر مگر سے خالی نہیں تھا۔

ظاہر بات ہے کہ تنظیم آزادیٔ فلسطین اس بنیاد پر قرارداد نمبر 242 تسلیم نہیں کر سکتی تھی کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوتا کہ یہ سیاسی منفعت سے دست کشی اختیار کی جا رہی ہے۔ فلسطینی قومی مسئلہ سارے فلسطینیوں کا مسئلہ نہیں رہا بلکہ اس میں تخفیف ہوگئی ہے اور اب یہ پناہ گزینوں کے نئے مسئلے میں تبدیل ہو گیا ہے، گویا کہ

''مُڑ گھر کے کھوتی بوہڑ تھلے۔''① جب صدر سادات نے بیت المقدس کا سفر اختیار کیا، اس سے ایک ماہ قبل تنظیمِ آزادیٔ فلسطین اور امریکا کے مابین بالواسطہ رابطوں کے ذریعے ایسے طریقے دریافت کرنے کی مساعی کی جارہی تھیں جن کے سہارے جنیوا کانفرنس میں فلسطینی شرکت ممکن ہوجاتی لیکن 19 نومبر کو یہ کوشش اچانک ترک کردی گئیں۔

اس کے باوجود عرفات مستقل مزجی کے ساتھ اشارے کنایے دیتے رہے۔ انھوں نے متعدد مواقع پر زور دے کر اس بارے میں فلسطینی رضامندی کا اظہار کیا کہ وہ ایک مملکت قبول کرلیں گے، اسرائیل کو بالفعل② تسلیم کرلیں گے اور امریکا کے ساتھ براہِ راست معاملہ بھی طے کرلیں گے لیکن وہ یہ تمام امور صرف اسی صورت میں بروئے کار لائیں گے ''اگر'' جیسا کہ انھوں نے ایک موقع پر مجھ سے بات چیت کرتے ہوئے کہا، ''مجھ سے ناممکنات کا تقاضا نہیں کیا جاتا۔'' مئی 1978ء میں عرفات نے ''نیویارک ٹائمز'' کے نمائندے انتھونی لوئیس کو بتایا کہ میں ایک مملکت قبول کرنے اور اس کے بعد اسرائیل کے پڑوس میں امن چین کے ساتھ رہنے کے لیے تیار ہوں۔'' انھوں نے یہی بات جنوری 1979ء میں امریکی کانگریس (ایوانِ نمائندگان) کے ایک رکن پال فنڈلی سے کہی۔ اس کے باوجود ناممکنات کا تقاضا جاری رہا۔ اسرائیل کو پیشگی تسلیم کرو۔ تنظیمِ آزادیٔ فلسطین کے میثاق میں ترمیم کرو۔ اپنے ہتھیار پھینک دو۔ تنظیمِ آزادیٔ فلسطین کے میثاق میں ترمیم کرو۔ اپنے ہتھیار پھینک دو۔ تنظیمِ آزادیٔ فلسطین کو توڑ دو۔ سادات کی پیشکش قبول کرو اور کسی پیشگی شرط کے بغیر قاہرہ کا طواف کرو۔ جب بھی اور جہاں بھی...... لبنان میں عرب دُنیا کے دوسرے مقامات پر، مغربی کنارے اور غزہ میں، امریکا میں، عرفات کے عوام کو مسلسل حملوں کا نشانہ بنایا گیا۔ 1978ء کے موسم گرما کے دوران میں اور پھر 1979ء کے اوائل میں تحریک میں ان کے ذاتی معاونین کے خلاف قتل کی مہمیں چلائی گئیں۔ انھوں نے جنوبی لبنان میں تیس ہزار اسرائیلی فوجیوں کا مقابلہ کیا۔② عربوں کی سیاسی حمایت نے

① یہ پنجابی محاورہ انگریزی محاورے Back to square one کا ترجمہ ہے۔ دونوں کا مطلب ایک ایسی صورتِ حال ہے جہاں معاملات وہیں آپہنچتے ہیں جہاں سے ان کا آغاز ہوا تھا۔

② انگریزی میں حکومتوں اور مملکتوں کے لیے دو الفاظ de facto اور de jure استعمال ہوتے ہیں۔ وہ حکومت جو بالفعل موجود ہو لیکن اس کے موجود ہونے کا کوئی قانونی جواز نہ ہو۔ وہ DE FACTO (بالفعل) حکومت متصور ہوگی۔ عام طور پر مارشل لا کی حکومتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ لیکن جن حکومتوں کی موجودگی کا آئینی اور قانونی جواز ہو وہ DE JUREU حکومت کہلائے گی۔ مؤثر حکومت وہی ہوگی جو دونوں اعتبار سے موجود ہوں۔

③ 1982ء میں تنظیمِ آزادیٔ فلسطین اور یاسر عرفات کو اس سے بھی زیادہ مشکل صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا جب وہ بیروت......

لفاظی سے غیر لفاظی کا لب ولہجہ اختیار کرلیا اور اس کے باوجود صدر کارٹر کا یہ اصرار تھا کہ ''فلسطینی مسئلے کے تمام پہلوؤں'' پر توجہ دینا ہوگی گویا کہ یہ ''تمام پہلو'' ...... یا اس معاملے کی اصل روح ...... کہیں بیرونی خلا میں چکّر لگا رہے ہیں اور اس بات کے منتظر ہیں کہ ان کے زمین پر اترنے کے کب اور کیا انتظامات کیے جاتے ہیں۔

کیمپ ڈیوڈ کی دستاویزات میں ایک بات بھی ایسی نہیں تھی جو فلسطینیوں یا اردن کے شاہ حسین کے لیے حوصلہ افزائی کا محرک بنتی۔ جب زیرِ بحث علاقے میں اسرائیلی بستیوں کی بھرمار ہوتی جارہی تھی، جب صدر سادات کو بیرونِ مصر کوئی سنجیدہ کردار ادا کرنے کی صلاحیت سے مؤثر طریقے سے محروم کردیا گیا تھا (معاہدے نے انھیں عرب دُنیا میں بالکل تن تنہا کردیا۔ ان کے افعال کے اس منطقی نتیجے کو اسرائیل اور امریکا نے پہلے سے بھانپ لیا ہوگا) (فلسطینیوں کے لیے) بہترین حکمتِ عملی یہی ہوسکتی تھی کہ وہ استرداد پر ڈٹے رہیں...... اسے بہرحال کسی قسم کی پالیسی نہیں کہا جاسکتا۔ اس صورتِ حال میں حزنیہ اور طربیہ دونوں قسم کی ستم ظریفی کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ ایک طرف سادات بڑے دبنگ اور دھانسو لہجے سے یہ اعلان کرتے پھرتے ہیں کہ فلسطینیوں کے حقوق بازیاب کرکے رہیں گے لیکن انھیں غالباً اس بات کا اندازہ نہیں کہ سوویت یونین کی تائید کے بغیر، عرب حمایت کے بغیر، اپنے اسرائیل کے ساتھ معدود معاہدے سے ماورا امریکی حمایت کے بغیر، وہ زیادہ سے زیادہ زبانی جمع خرچ ہی کرسکیں گے۔ دوسری طرف یہ نظر آتا ہے کہ امریکا ابھی تک اس بارے میں متذبذب ہے کہ اسے مستقبل میں جو کردار ادا کرنا ہے، اس کے خطوط کیا ہوں گے۔ اسے دخل درمعقولات دینا چاہیے یا اس سے احتراز کرنا چاہیے؟ یا اس کی یہ امید کہ انجام کار سعودی عرب اور اردن راہِ راست پر آجائیں گے، بارآور ہوگی یا نہیں؟ یا اس نے ''مسئلۂ فلسطین کے تمام پہلوؤں'' کو پیشِ نظر رکھنے کا اپنے آپ کو جس طرح پابند بنالیا ہے اور یہ پابندی اب جس طرح اس کے گلے کا ہار بن چکی ہے، کیا وہ اس پر قائم رہے گا یا نہیں؟ مزید برآں، فلسطینی واضح طور پر، اور اس کا ثبوت فراہم کیا جاسکتا ہے، امن کی طرف پیش قدمی کرنے کے لیے آمادہ نظر آتے ہیں (بہرحال وہ کون سی قوم ہے جو اپنی فلاکت ونکبت پر ڈٹے رہنے کی اتنی پابند ہوچکی ہے کہ وہ اس میں کسی قسم کی تخفیف کرنے کے لیے سنجیدگی سے سوچ بچار نہیں کرے گی؟)

......میں فلسطینی پناہ گزینوں کے کیمپوں میں عیسائی ملیشیا کے، جس کی اسرائیل پورے زور وشور سے پشت پناہی کررہا ہے اور سے مالی اور فوجی امداد کے علاوہ باقاعدہ فوجی دستے بھی فراہم کررہا تھا، گھیرے میں آگئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب یاسر عرفات زندہ بچ نہیں نکل سکیں گے۔ فلسطینیوں کا بے پناہ جانی اور مالی نقصان ہوا لیکن عرفات اور ان کے ساتھی بیروت سے نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔

جبکہ لفظاً اور معناً دونوں اعتبار سے زمین ان کے پاؤں تلے کھسکتی جارہی ہے۔ امریکا، مصر اور تنظیم آزادیٔ فلسطین ایک دوسرے کے خلاف برسرِپیکار ہیں اور ان کی اس آویزش سے فائدہ اسرائیل اٹھا رہا ہے۔

اس ملک (امریکا) میں منظم یہودی حلقۂ انتخاب نے بادل ناخواستہ معاہدے کا خیر مقدم کیا ہے اور اس پر جو نکتہ چینی بھی کی ہے، وہ بھی دبی دبی زبان سے کی ہے ''(کمنٹری'' کے شمارہ برائے مارچ 1979ء میں تھیوڈور ڈریپر کا مضمون ''مشرقِ وسطیٰ میں کس قسم کا معاہدہ امن نہیں ہونا چاہیے'' ملاحظہ فرمائیں۔) اس کو تسلیم کرنے کے حق میں جو دلائل دیے جاتے ہیں، وہ یہ ہیں کہ اس سے مصر بے اثر ہو جاتا ہے اور اسرائیل کو کچھ مہلت مل جاتی ہے۔ جبکہ اسے نکتہ چینی کا ہدف اس لیے بتایا جاتا ہے کیونکہ (نکتہ چینوں کے خیال کے مطابق) اس سے فلسطینیوں کے حقِ خود ارادیت کے بروئے کار آنے کا امکان پیدا ہو گیا ہے۔ امریکا کے صیہونیوں نے اس مفروضے کو صحیح مان لیا ہے۔ لیکن یہ طبقہ (امریکی صیہونی) وہ طبقہ ہے جو شاہ سے بھی زیادہ شاہ کا وفادار ہے۔ چنانچہ جس طرح آنکھیں بند کر کے یہ طبقہ اسرائیلی پالیسیوں پر آمنا و صدقنا کہتا ہے، خود اسرائیلی بھی کیا کہتے ہوں گے۔ اس معاملے میں ان سے اگر کوئی لگّا کھاتا ہے تو وہ اسرائیل کا انتہائی دایاں بازو ہے جس کی نظروں میں ہر وہ چیز...... بلکہ ان کا وجود بھی...... جس کا تعلق فلسطینیوں سے بنتا ہے، ایسی تباہی کی علامت ہے جس کا شاید کوئی مداوا نہیں۔ اس بات سے قطع نظر کہ اس قسم کا نقطۂ نظر فہم و فراست سے کلیتاً عاری ہے لیکن جب ''نیوری پبلک'' اور ''کمنٹری'' جیسے جریدے بھی اس قسم کا پرچار کرنے لگیں ① تو دال میں کالا کالا نظر آنے لگتا ہے اور دانشورانہ سطح پر یہ نقطۂ نظر منتقمانہ اور کینہ خواہانہ دکھائی دینے لگتا ہے۔ یہ نقطۂ نظر فلسطینیوں سے کس جوابی کارروائی کا تقاضا کرتا ہے؟ یہی نا کہ وہ صرف یہ کہنے پر اکتفا کریں کہ ''حضور، آپ نے اپنی توپوں کے دہانے کھول دیے اور ہمیں ہمارے اپنے وطن سے باہر دھکیل دیا اب آپ وہاں تشریف فرما ہیں، ہم آپ کی موجودگی کو تسلیم کرتے ہیں اور اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ ہم اب فلسطینی نہیں رہے، ہم تو مختلف النوع عرب پناہ گزیں ہیں جن کے حقوق اس لیے منسوخ ہو گئے کہ وہاں (فلسطین میں) دوسرے

---

① اور تعجب کی بات یہ ہے کہ اس معاملے میں ''نیوری پبلک''، ''کمنٹری'' سے بھی زیادہ ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتا ہے (مصنف)
''نیوری پبلک'' امریکا کا ایک ہفتہ وار رسالہ ہے۔ یہ امریکا کے بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے اور لبرل دانشوروں کا ترجمان ہے۔ ویسے تو اس کی اشاعت محدود ہے لیکن اس کی تحریریں ''ٹائم''، ''نیوز ویک''، ''یو ایس اینڈ نیوز'' جیسے مقبول عام ہفتہ وار رسالوں سے زیادہ قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔ یہ خود بھی ان مقبول عام رسالوں کا سب سے بڑا ناقد ہے۔ ایک طویل سلسلۂ مضامین میں اس نے یہ ثابت کیا تھا کہ یہ رسالے زیادہ تر جھوٹ کا پلندہ یا زیادہ سے زیادہ ''نیویارک ٹائمز'' کا عام فہم چربہ ہوتے ہیں'' کمنٹری'' بھی لبرل طبقوں کا رسالہ ہے۔

عرب ممالک کے یہودی پہنچ گئے ہیں۔ آپ مہاپرش ہیں، مہاگنی ہیں، آپ کا کوئی ثانی نہیں۔ ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میدان سے پسپائی اختیار کرتے ہیں'' یا پھر ''کنٹری'' اور ''نیوری پبلک'' کا لاجواب نقطۂ نظر کیا فلسطینیوں سے اور نہیں کہتا کہ ''ہم نے تمھاری شکایت سماعت کرلی ہیں، چھی چھی، یہ تو بڑی بُری بات ہوئی کہ آپ کو نکال دیا گیا (سچ پوچھیں تو جب تک انڈے توڑے نہیں جائیں گے، آملیٹ کیسے بنے گا۔) لیکن بہرحال آپ چلے تو گئے۔ آپ ایک پسماندہ دہشت گرد قوم ہیں اور آپ ضرورت سے زیادہ مطالبات پیش کرتے رہتے ہیں۔ اگر ہم نے آپ کو ایک انچ بخش دیا تو آپ ایک میل کا تقاضا کرنے لگیں گے۔ ہم یہ بات مان ہی نہیں سکتے کہ آپ بھی کہیں موجود ہیں۔ کیونکہ اگر ہم نے آپ کی موجودگی کا اعتراف کرلیا تو اس بات کا خطرہ لاحق ہوجائے گا کہ دُنیا کی نظروں میں اور اس سے بھی بدتر یہ بات کہ خود ہماری اپنی قوم کی نظروں میں ہمارا اخلاقی اعتبار ضرورت سے زیادہ کھوجائے گا۔ آپ کو صرف اسی پر مطمئن ہوجانا چاہیے جو ہم آپ کو عطا کرتے ہیں اور جو کچھ ہم آپ کو عطا کرتے ہیں وہ حقیقتاً دو کوڑی کا بھی نہیں ہوگا۔''

جہاں تک امریکا کے سرکاری رویے کا تعلق ہے، وہاں بھی معاملے کی نوعیت کچھ اسی قسم کی ہے۔ کچھ عرصہ قبل صدر کارٹر کو یہ یاددلانا ممکن تھا کہ آپ نے جن باتوں کے سہارے اقتدار حاصل کیا، ان میں مشہور عالم بروکنگز رپورٹ (1975ء) ① بھی شامل تھی اور آپ کے منشور کی ترجیحات میں اسے ایک بلند مقام حاصل تھا۔ آخر اسے بلند مقام کیوں نہ ملتا کیونکہ ماہرین کی جس کمیٹی نے اس رپورٹ کو تحریر کیا تھا اس میں آپ کی قومی سلامتی کے مشیر بری زنسکی بھی شامل تھے۔ پھر بری زنسکی کے نائب ولیم کوانڈٹ (Quandt) بھی اس کمیٹی کے ایک رکن تھے۔ لیکن اب تو یہ (رپورٹ) زمانۂ پارینہ کی ایک بھولی بسری نشانی بن کر رہ گئی ہے۔ اسرائیل اور مصر کے معاہدے نے جو مزین اور خوبصورت پردے تخلیق کیے ہیں، انھوں نے شام، عراق، تنظیم آزادیٔ فلسطین، بلکہ سعودی عرب اور اردن کو بھی اوٹ میں پہنچادیا ہے (اور وہ آپ کو نظر ہی نہیں آتے) (اسرائیل اور مصر کے معاہدے کے نتیجے میں) صیہونیت کو بالآخر وہ سب کچھ مل گیا، جس کی وہ گزشتہ ساٹھ سال سے متمنی تھی، یعنی کہ ایک عرب مملکت نے اس کے جائز ہونے پر اپنی مہر تصدیق ثبت کردی تھی

---

① امریکا میں مختلف پرائیویٹ ادارے قومی یا بین الاقوامی امور کے متعلق تحقیق وتفتیش کا کام کرتے رہتے ہیں۔ ان میں سے ایک ادارے کا نام بروکنگز (Brooking) انسٹی ٹیوشن ہے۔ اسرائیلی عرب تنازعے کے تناظر میں مشرق وسطیٰ کے امور کے بارے میں جائزہ لینے کے لیے اس ادارے نے بعض ماہرین کی خدمات حاصل کیں۔ ان ماہرین کی رپورٹ ''مشرق وسطیٰ میں امن کی طرف'' کے عنوان سے 1975ء میں شائع ہوئی تھی۔ عرف عام میں اسے ''بروکنگز رپورٹ'' کہتے ہیں۔

لیکن اپنی اس حرکت سے وہ دوسرے عرب ممالک سے الگ تھلگ ہوگئی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام باتوں کی معنویت امریکا پر ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ یہ مفروضہ قائم کرلیا گیا ہے کہ اگر وہ اس خطے میں اسلحے کے انبار لگاتا رہا اور ''امن کے عمل'' کے متعلق بے حد و حساب وعدے کرتا رہا، تو کیمپ ڈیوڈ معجزاتی انداز سے نیم گرم پانی سے تند و تیز شراب میں تبدیل ہوجائے گا۔ ②

جہاں تک خطے کا اپنا تعلق ہے، وہاں کی اہم اور اصل حقیقتیں کیا ہیں؟ 1967ء کے بعد پہلی مرتبہ اس بات کا امکان پیدا ہوا ہے کہ امریکا اور معاہدے میں شریک اس کے حلیفوں کی کارروائیوں کے جواب میں کوئی صحیح معنوں میں مقبولِ عام عرب قوم پرست ردِ عمل بہ تدریج نمو پا جائے اور یہ چیز اس بات کی علامت ہے کہ اس خطے میں ایک غیر معمولی تغیرِ عظیم کی لہر اٹھ سکتی ہے۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ مسئلۂ فلسطین اب محض کھوئے ہوئے علاقوں کی بازیابی کا مسئلہ نہیں رہا بلکہ اس سے بہت کچھ زیادہ بن چکا ہے۔ یہ علاقے کی تقریباً تمام عرب، اسلامی یا تیسری دُنیا کے عوامی (اس لفظ کے لفظی معنوں میں) مسائل کو آپس میں منسلک کرنے کا واسطہ بن گیا ہے۔ اب جو بڑے بڑے سوال سامنے آرہے ہیں، ان میں ایک بڑا سوال یہ ہے کہ کیا یاسر عرفات اور تنظیم آزادیٔ فلسطین غیر معین عرصے کے لیے اس مسئلے کو حدود میں بند کرنے پر آمادہ ہوجائیں گے؟ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں، اس کا ایک اشارہ اس جواب میں ملتا ہے جو فروری کے بعد ایران نے فلسطینیوں کو دیا تھا۔ کچھ اور اشارے بھی کم طاقتور نہیں ہیں۔ 1976ء کے اواخر میں کویتی پارلیمنٹ کو محض اس لیے برخاست کر دیا گیا کیونکہ وہاں مسئلۂ فلسطین نے نتھر کر کچھ ایسی صورت اختیار کر لی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوئی ایسی چیز ہے جس نے اپوزیشن اور حکومت کو یک جان کر دیا ہے۔ تنظیم آزادیٔ فلسطین نے اس صورتِ حال سے کوئی (جائز یا ناجائز) فائدہ نہ اٹھایا حالانکہ یہ بات ظاہر ہے کہ اگر وہ چاہتی تو ایسا کر سکتی تھی۔ علاقے کے اکثر ممالک میں اخبارات و جرائد پر سخت پابندیاں عائد ہیں تاہم ایسی تنقید کے لیے، جس کا مقصد مملکت کے حکام پر دباؤ ڈالنا ہوتا ہے، فلسطین ایک قابلِ قبول استعارہ بن چکا ہے اور یہ استعارہ اپوزیشن کی رگوں میں ایک نیا خون دوڑا دیتا ہے اور وہ پہلے سے بڑھ چڑھ کر اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہو جاتی ہے۔ مارچ 1979ء میں عرب ملکوں کی جو کانفرنس بغداد میں منعقد ہوئی تھی، وہ سادات، اسرائیل اور امریکا کے خلاف متحدہ مؤقف اختیار کر چکی تھی لیکن یہ تنظیم آزادیٔ فلسطین ہی تھی جس نے بھاری بھرکم، بھدے اور بے ڈول

---

① اس مسئلے کو بلیغ انداز سے Amnon Kapeliovk نے اپنے ایک مضمون Le Pari میں پیش کیا ہے۔ یہ مضمون اپریل 1979ء میں ایک فرانسیسی جریدے Le Monfe Diplomatique میں شائع ہوا تھا۔ (مصنف)

عرب ''ڈھیلے''[1] کو ہراول لا کھڑا کیا۔ (تاہم ان باتوں کے باوجود) روز نئی سے نئی پوشیدہ لہریں...... علاقائی فرقہ بندیاں، قومیتوں کے مسائل، اسلامی احیا کے بے شمار (اکثر و بیشتر افسوسناک حد تک عقل و خرد سے عاری) صورتیں، دولت کی غیر مساوی تقسیم کے اہم مسائل، جنھیں بعض اوقات جنسی[2] اور گروہی جبر کے ساتھ منسلک کر دیا جاتا ہے...... سر اٹھاتی رہتی ہیں (نتیجہ؟ مسئلۂ فلسطین وہ اہمیت حاصل نہیں کر پاتا جس کا وہ مستحق ہے۔)

یہ سب کچھ جو ہو رہا ہے، اس میں خطرہ یہ نہیں کہ کوئی انقلابی تبدیلی رونما ہو جائے گی، بلکہ یہ ہے کہ عدم التصاق طوالت اختیار کر جائے گا اور جہاں تک تنظیم آزادئ فلسطین کا، جواب ایک ٹھوس قومی حقیقت بن چکی ہے، تعلق ہے، مسئلۂ فلسطین کے ضمن میں وہ جن دعاوی کو بار آور دیکھنا چاہتی ہے، اندیشہ یہ ہے کہ ان کا حصول طویل عرصے کے لیے معرضِ التوا میں پڑ جائے گا۔ مصر اور اسرائیل کے مابین جو شتر مرغ نما معاہدہ[3] طے پایا ہے، اس میں فلسطینیوں کے لیے کسی قسم کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی۔ چنانچہ اس قسم کے معاہدے مسئلہ کا نہ تو کوئی فوری اور نہ کوئی دور رس حل پیش کر سکتے ہیں۔ البتہ اس معاہدے کا ایک نتیجہ یہ برآمد ہوگا کہ دونوں ممالک (مصر اور اسرائیل) میں سے ہر ایک اپنی مخصوص داخلی حرکیات کے مطابق موجودہ سیاق و سباق میں اپنی عسکری، نظریاتی اور سیاسی مشنری کو علاقے کے خلاف مضبوط بنا لے گا...... اور اس طریقے سے وہ خطے کا حصہ کم بنے گا اور اپنی ذات کے گنبد میں زیادہ بند ہو جائے گا۔ وہ اپنے آپ کو خواہ کتنا ہی اسلحہ بند قلعہ کیوں نہ بنا لے لیکن وہ رہے گا دوسروں سے بالکل الگ تھلگ اور ایسے ایسے طریقوں سے دوسروں کے حملوں

---

① عربوں کو ڈھیلے سے اس لیے تشبیہ دی گئی ہے کہ مشترکہ خصوصیات اور اوصاف کے باوجود عربوں کا اتحاد کوئی واضح صورت اختیار نہیں کر سکا۔

② اواخر اگست (1987ء) کے پاکستانی اخبارات کی یہ خبر دلچسپی سے خالی نہیں کہ پاکستان کی وفاقی پولیس FIA نے رحیم یار خاں کے ایک باشندے کو اس الزام میں گرفتار کیا ہے کہ وہ چالیس پینتالیس بچوں کی (جن کی عمر میں دو سے 15 سال تک بتائی جاتی ہیں) اپنے لواحقین سے خرید کر عرب ریاستوں میں سمگل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ چھوٹے بچوں کو اونٹوں کی پشت کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے اور جب یہ اونٹ (جو مختلف ریسوں میں حصہ لیتے ہیں) دوڑتے ہیں تو بچوں کی چیخیں نکلنا شروع ہو جاتی ہیں، چیخوں کی آواز پر اونٹ اور تیز دوڑتے ہیں۔ اس منظر سے عرب شیوخ خوب لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ایک الزام یہ بھی ہے کہ ان بچوں کو جنسی تشدد کا نشانہ بھی بنایا جاتا ہے۔

③ کہا جاتا ہے کہ خطرے کو دیکھ کر شتر مرغ اپنی گردن ریت میں دبا لیتا ہے۔ مصر اور اسرائیل کا معاہدہ حقائق سے روگردانی کی ایک مثال ہے۔

کا ہدف بنے گا جن کا اس وقت تصور کرنا بھی محال ہے۔

اوامر و نواہی بالکل واضح ہیں۔ میں ان کا ایک اجمالی خاکہ پیش کرتا ہوں۔

جیسا کہ میں نے اس کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، مسئلۂ فلسطین ایک ایسا معاملہ ہے جس کی ایک اپنی تفصیلی تاریخ ہے اور یہ تاریخ 40 لاکھ کے 40 لاکھ باشندوں کی زندگی سے عبارت ہے۔ آپ لاکھ کوشش کریں، جتنا جی چاہے قانونی، عسکری، ثقافتی، نفسیاتی یا منطقی ذرائع استعمال کریں، اسے (اس تاریخ کو) منظرِ عام سے اوجھل نہیں کر سکیں گے۔ تاہم ایک اور نکتہ اور یہ ایک مثبت نکتہ ہے، جس پر میں اصرار کرنا چاہتا ہوں، یہ ہے کہ مسئلۂ فلسطین ایک ٹھوس تاریخی مسئلہ ہے جسے انسانی اصطلاحات میں سمجھا جا سکتا ہے، یہ کوئی دیو پیکر، نفسیاتی بلا نہیں جو ساری دُنیا کو تباہی کے غار میں دھکیلنے کے لیے پر تولے بیٹھی ہو۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ اسے پیش بالکل اسی انداز سے کیا جاتا ہے (جیسے یہ واقعی کوئی دہشت ناک بلا ہو۔) صیہونیت نے پہلے تو فلسطین کے مقامی باشندوں کے وجود ہی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا لیکن جب اس نے ان کے وجود کو تسلیم کیا بھی تو اس نے یہ پخ لگا دی کہ ''ہم ان مقامی باشندوں کے وجود کو تو تسلیم کرتے ہیں لیکن انھیں کوئی سیاسی یا قومی حقوق نہیں دیے جا سکتے۔'' جب کبھی یہ مقامی باشندے اپنے حقوق کا مطالبہ کرتے تھے تو نہایت منظم طریقے سے اہلِ مغرب کے کانوں میں یہ بات ڈالی جاتی تھی بلکہ انھیں یہ ہدایت دی جاتی تھی کہ ان حقوق کے حصول کی خاطر جو جدّ و جہد ہو رہی ہے، اسے وہ (اہلِ مغرب) دہشت گردی، قتلِ عام اور یہود دشمنی کے مترادف سمجھیں۔ یہ نری خرافات یا مہمل باتیں نہیں ہیں بلکہ اس بات کا اجازت نامہ بھی ہیں کہ گزشتہ ایک صدی سے فلسطینیوں کے خلاف جو متشددانہ کارروائیاں کی جا رہی ہیں، ان کا سلسلہ ایک مزید طویل مدت کے لیے جاری رکھا جا سکتا ہے اور کم و بیش ایک غیر معین عرصے کے لیے تاریخ اور سچائی سے آنکھیں چرائی جا سکتی ہیں۔ اس سے بھی بدتر بات یہ ہے کہ اس قسم کے رویہ سے مزید تشدد، مزید مصائب و آلام، مزید ضیاع، سلامتی کے مزید لیکن بے سود انتظامات کا سلسلہ چلتا رہے گا۔

آج کل امریکا میں جو صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے کہ مسئلۂ فلسطین کے متعلق عقلی اور منطقی طریقے سے بات کرنا قریب قریب ناممکن ہو گیا ہے، اس سے نہ تو اس ملک کی اور نہ یہودیوں کی کوئی خدمت ہو گی۔ مجھے جو ناقابلِ تردید حقیقت نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ منفیت کا، انکار کا، خوف کا رویہ ہر سطح کے لوگوں کے رگ و پے میں رچ بس چکا ہے...... صیہونی اور امریکی جس مستقل مزاجی سے فلسطینیوں کے خلاف مصروفِ عمل تھے، اس کا نتیجہ یہی نکلنا تھا...... لیکن اس رویے کا انجام یہ ہو گا کہ لوگ مزید خوف و ہراس کا شکار ہوں گے اور امن کے لیے حالات نسبتاً کم سازگار ہوں گے۔ کیا یہ ستم ظریفی کی بات نہیں کہ ایک طرف تو حکومت امریکا اپنے ملک

میں تنظیم آزادیٔ فلسطین کے ارکان کو بلاقدغن سفر کرنے اور آزادانہ اپنا مؤقف بیان کرنے کی اجازت نہیں دیتی ① جبکہ اس کے ساتھ ہی وہ دوسری طرف یہ کہتے نہیں تھکتی کہ فلسطین مشرقِ وسطیٰ کی ساری آویزش کی جڑ ہے۔ آخر میں اس بات کا احساس کرنا ہوگا کہ فلسطینی کبھی بھی منظرِ عام سے ناپید نہیں ہوں گے۔ علاوہ ازیں امریکا کو سرکاری طور پر یہ بات لازماً تسلیم کرلینا چاہیے کہ فلسطینیوں اور ان کے نمائندوں سے جنھیں دُنیا متفقہ طور پر صحیح نمائندے قرار دیتی ہے، جو اندیشہ لاحق ہے، محض جھوٹ موٹ یہ ظاہر کردینے سے کم نہیں ہوگا کہ یہ دونوں (فلسطینی اور ان کے رہنما) مل کر بھی کوئی خاص اہمیت اختیار نہیں کرتے۔

اکثر یہودیوں کے دلوں میں یہ جو خوف بیٹھا ہوا ہے کہ اسرائیل اپنی سلامتی کے جو انتظامات کر رہا ہے، وہ اصل میں قتلِ عام کی ان کوششوں کے خلاف تحفظ ہے جو مستقبل میں یہودی قوم کے خلاف کی جاسکتی ہیں۔ اس بارے میں مجھے ان سے ہمدردی بھی ہے اور میں اپنی بساط کے مطابق ان کے اس خوف کو سمجھتا بھی خوب ہوں لیکن یہاں یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ کسی طریقے سے بھی ایک مطمئن زندگی نہیں گزاری جاسکتی جس کی بڑی تشویش ماضی کو دوبارہ وقوع پذیر ہونے سے روکنا ہے۔ صیہونیت کے نزدیک فلسطینی ایک سابقہ تجربے کے مترادف بن چکے ہیں جو موجودہ تخویف کی صورت میں دوبارہ مادی شکل اختیار کرچکا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ایک قوم کی حیثیت سے فلسطینیوں کا مستقبل اس تخویف کے پاس رہن رکھ دیا گیا ہے اور یہ چیز فلسطینیوں اور یہودیوں دونوں کے لیے تباہ کن ہے۔ میں نے یہاں فلسطینیوں کو پیش کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ اس لیے کی ہے کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے اجتماعی تجربے، اشیا کے بارے میں ہماری اجتماعی سوجھ بوجھ، ہماری اجتماعی امنگوں اور سب سے بڑھ کر ہماری اصلی اور موجودہ (تاریخی ہونے کی بنا پر) حقیقت کی اصطلاحوں میں ان کے خیالات واحساسات کی ترجمانی کی جاسکتی ہے۔ میں نے اس کتاب میں جو کچھ کہا ہے اس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہ لیا جائے کہ یہ ایک طرح سے فلسطینی اور یہودی تاریخ کا اعتراف ہے...... جو کافی عرصے سے ایک دوسرے کے خلاف غضب ناک طور پر برسرِپیکار ہیں لیکن بنیادی طور پر ان میں ایسے عناصر موجود ہیں کہ ان کی آپس میں مصالحت ہوسکتی ہے، بشرطے کہ دونوں قومیں ایک دوسرے کو مشترکہ سیاسی تناظر میں رکھ دینے کی کوشش کریں۔ دوسرے فریق کے متعلق پوشیدہ اور غیر بیان شدہ

---

① اس موضوع پر 12 اپریل 1979ء کو روزنامہ ''واشنگٹن پوسٹ'' میں ایک اداریہ شائع ہوا تھا، اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ (مصنف) امریکا نے تنظیم آزادیٔ فلسطین کو واشنگٹن میں اپنا ایک دفتر قائم کرنے کی اجازت دے رکھی تھی، 18 ستمبر 1978ء کو اسے بھی بند کرنے کا حکم دے دیا گیا۔

اندیشوں اور غلو سے بھرپور کٹر مذہبی واہموں میں مبتلا ہونے کی بجائے بہتر یہی ہے کہ آویزش کا پورا اقرار کرلیا جائے۔

اگر مجھے یہ یقین نہ ہوتا کہ آج فلسطینی قومی تحریک نے قومی امنگوں کے ایک مخصوص مجموعے کی صورت میں ایک واضح شکل اختیار کرلی ہے اور اب یہ تحریک انھی امنگوں کے گرد گھومتی ہے تو فلسطینیوں کو صیہونیت کا جو تجربہ ہوا ہے، میں اس کا ذکر اتنی تفصیل سے نہ کرتا، چنانچہ میرا مقصد گڑے مردے اکھاڑنا نہیں بلکہ ماضی کو اس قدر واضح طور پر دیکھنا ہے تاکہ اس سے آگے نکلا جاسکے۔ ایک قوم کی حیثیت سے ہمیں جو ٹھوس تجربہ حاصل ہوا ہے، فلسطینیوں کی قومی امنگیں اسی سے پھوٹی ہیں اور ان کا اس (تجربے) کے ساتھ گہرا رابطہ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ امنگیں قابلِ حصول ہیں بشرطے کہ ہماری تاریخ، اسرائیل کی حقیقت، باقی عرب دُنیا کی حقیقت اور بین الاقوامی سیاسی ہیئت کو تسلیم کرلیا جائے۔

یہ کہنا کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہے کہ صیہونیت کے خلاف ہم جس جدّوجہد میں مصروف ہیں اس کے بارے میں مغرب پہلی مرتبہ ہمارا نقطۂ نظر سننے کے لیے آمادہ دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ ہمیں چاہیے کہ اس موقع سے پورا فائدہ اٹھائیں اور اس کے سامنے (اپنا نقطۂ نظر) کھل کر بیان کریں۔ صیہونیت کے خلاف ہماری جدّوجہد نے جو بین الاقوامی تھیٹر تخلیق کیا ہے، ہمیں اس میں لازماً کھڑے ہونا چاہیے تاکہ ہم اپنے پیغام کو ڈرامائی طور پر دور ونزدیک پہنچاسکیں۔ مغرب میں بالخصوص ہماری یہ کوشش ہونا چاہیے کہ ہم صیہونیت کے پُرزور حامی لبرل طبقے (جس میں یہودی اور غیر یہودی دونوں شامل ہیں) کی توجہ، جو اب تک صیہونیت کے ستم رسیدگان سے منہ پھیرے رہا ہے، اپنی طرف مبذول کراسکیں۔ مغربی کنارے اور غزہ میں اسرائیل کے قابض حکام اور فوجی آئے دن جو (شرمناک) کارروائیاں کرتے رہتے ہیں اور لبنان میں اسرائیلی جس طرح شہری باشندوں کو اپنے حملوں کا نشانہ بناتے رہتے ہیں، ان کے متعلق یہودی دانشور جو روایتی طور پر انسانی حقوق کی مہموں میں ہراول دستے کا کردار سرانجام دیتے رہتے ہیں، اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرنے کے لیے ایک انگلی تک نہیں اٹھاتے۔ ادیبوں، مصنفوں، دانشوروں، عالموں اور پیشہ ور اشخاص[1] کے اس طبقے نے اپنے انسانی مشن سے بےوفائی کی ہے، مثلاً 1978ء کے موسم بہار کے دوران میں اسرائیلی فوجوں نے جس طرح کلسٹر بم گرا کر جنوبی لبنان سے اڑھائی لاکھ شہری باشندوں کو اپنے گھروں سے نکلنے پر مجبور کیا، آخر اس

① اس طبقے میں اساتذہ، صحافی، انجینئر، ڈاکٹر، دندان ساز، اکاؤنٹینٹ، اداکار، گلوکار، موسیقار، کھلاڑی وغیرہ شمار کیے جاسکتے ہیں۔

کی مذمت میں کھلے عام ایک بھی بیان کیوں نہ شائع ہوا اور نہ نشر ہوا۔ اس قسم کی چیرہ دستیاں اور شرمناک کارروائیاں ہر روز ہو رہی ہیں، پھر بھی کسی کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی اور ان کے متعلق ایک لفظ نہیں کہا جاتا۔ کیا اس سکوت اور خاموشی کا مناسب جواب اس استدلال میں تلاش کیا جا سکتا ہے کہ اسرائیل جو کہ دہشت گردوں میں گھرا ہوا ہے، کسی غلطی کا ارتکاب نہیں کر سکتا یا کم از کم ایسی حرکت نہیں کر سکتا جس کے متعلق ذمہ دار یہودیوں کو تنقیدی انداز سے لب کشائی کی ضرورت محسوس ہو؟

دوم، مشرقِ وسطیٰ کے امن کے بارے میں جو سیاسی اور ثقافتی بحث و تمحیص ہوتی رہتی ہے ہمیں اس میں بھرپور حصہ لینا چاہیے۔ ہم اس بات پر قناعت نہیں کر سکتے کہ ہمیں مصر کا درجہ مل گیا ہے اور نہ یہ خالی خولی تکرار ہماری تالیفِ قلب کا باعث بن سکتی ہے کہ فلسطینی مسئلہ مشرقِ وسطیٰ کی چیستاں میں مرکزی مقام رکھتا ہے (یا نہیں رکھتا ہے۔)

ان دونوں فرائض کی بجا آوری میں ہم پہلے ہی اچھی خاصی پیش رفت کر چکے ہیں۔ یہ بات ہمارے لیے قومی فخر کا باعث ہے کہ جلاوطنی کی زندگی بسر کرنے اور مختلف ممالک میں تتر بتر ہونے کے باوجود آج کا فلسفی کسی دوسرے عرب کی نسبت سیاسی جمہوریت کے طور طریقوں سے زیادہ بہتر انداز سے آشنا ہے۔ یہودیوں اور عربوں دونوں کے لیے مستقبل کس قسم کا ہونا چاہیے۔ اس کی تفصیلات کے متعلق مثبت انداز سے سوچنے اور بات کرنے والے فلسطینیوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ عربوں کا کوئی دوسرا طبقہ سیاسی تاریخ کے عمل کو اتنی اچھی طرح نہیں سمجھتا جس قدر کہ فلسطینی سمجھتے ہیں اور کسی دوسرے طبقے کے بارے میں اتنا وثوق سے نہیں کہا جا سکتا جتنا کہ ہمارے طبقے کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ قومی زندگی میں جمہور کی براہِ راست شرکت کو جاری رکھے گا۔ یہی وجہ ہے کہ فلسطینی مشن کا ایک پہلو یہ ثابت کرنا ہے کہ اداروں اور نظریات کے بل بوتے پر جو غلبہ حاصل کیا جاتا ہے، وہ کتنا بودا ہوتا ہے اور یہ کہ انتہائی مظلوم و مقہور لوگ بھی ایک ایسے سیاسی خاکے کا تصور پیش کر سکتے ہیں جس کی تشکیل میں کشادہ دلی، وسعت ظرفی اور بے تعصبی کا مظاہرہ کیا گیا ہو۔ حالیہ برسوں کے دوران میں اپنی جلاوطنی اور فلاکت و نکبت کے باوجود سر کردہ فلسطینی گاہے بگاہے ایک ایسے مستقبل کا ذکر کرتے رہے ہیں جب فلسطین ایک ایسے ملک کا روپ دھار لے گا جہاں دو معاشرے ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو امن، اخوت اور ہم آہنگی کی فضا میں زندگی بسر کر رہے ہوں گے۔ غالباً وقت آنے پر اس قسم کی صورت ناگزیر ہوگی۔ البتہ فی الحال یہ زمانہ بہت دور نظر آتا ہے۔ لیکن اگر مزید فلسطینی، مزید یہودی اور مزید امریکی، قصہ مختصر اگر مزید لوگ مسئلۂ فلسطین کا جائزہ اس انداز سے لیں کہ یہ فلسطینی عربوں اور اسرائیلی یہودیوں کی مشترکہ بہبود کا مسئلہ ہے تو پھر ایسا دن توقع سے بہت پہلے طلوع

ہو جائے گا۔

جہاں تک میرا تعلق ہے تو میرا یہ ایمان ہے کہ فلسطینی مشن امن کا مشن ہے اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ ہمارے عوام کی ایک بھاری اکثریت بھی اسی خیال کی حامی ہے۔ ہم محض جلاوطنوں کی ایک آبادی نہیں جو اپنی بحالی اور قومی حقِ خود ارادیت کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی ہے بلکہ ہم وہ لوگ ہیں بے شک جن کا قومی وجود تلف ہو چکا تھا لیکن اسی اتلاف سے ہم نے ایک قوم کی حیثیت سے اپنے آپ کو از سرِ نو تخلیق کیا ہے اور ہماری قومی جماعت، تنظیمِ آزادیٔ فلسطین اس بات کی علامت ہے کہ ہم نے مستقبل کے بارے میں جو خواب دیکھا ہے، وہ اپنی نوعیت کا واحد خواب ہے۔ (ابھی تک کسی اور فرقے یا فریق نے اس کا متبادل تصور پیش نہیں کیا) اور اس خواب پر ہمیں جو پختہ یقین ہے، تنظیمِ آزادیٔ فلسطین اس کی بھی علامت ہے۔ اگر اسرائیل کی برّی اور فضائی افواج سے تنظیمِ آزادیٔ فلسطین کا موازنہ کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ کس طرح پناہ گزین کیمپوں میں مقیم ہمارے شہری باشندے تنظیمِ آزادیٔ فلسطین کی حمایت کرتے ہیں اور خوشی خوشی اپنے آپ کو اسرائیلی طیاروں کی بمباری کا ہدف بنا لیتے ہیں تو یہ بات صاف طور پر عیاں ہو جائے گی کہ فلسطینی جس مقصد کو سامنے رکھ کر سوئے دار چلے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے فولاد اور خالص قوت کے مقابلے میں امن اور انسانی عزم کا انتخاب کیا ہے۔ شاعروں، ادیبوں، مصنفوں، دانشوروں اور جنگ جوؤں کی حیثیت سے سیاسی سٹیج پر ہماری موجودگی نے پوری عرب برادری اور تیسری دُنیا کو وہ توانائی اور قوت بخشی ہے جو ان کا کوئی سیاسی نظریہ انھیں فراہم نہیں کر سکا تھا۔ بالآخر فلسطینی مشن بنیادی طور پر افراد کا مشن بن جاتا ہے...... یہ فرد کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ یہ یاسر عرفات جیسا رہنما بھی ہو سکتا ہے، سمیح القاسم جیسا شاعر بھی ہو سکتا ہے، یا یہ فرد لبنان، غزہ، الناصرہ یا ڈٹرایٹ کے ہزاروں مخلص اور اپنی دھن کے پکے مردوں اور عورتوں میں سے کوئی بھی شخص ہو سکتا ہے...... چنانچہ یہی وہ افراد ہیں جو دُنیا کے سامنے، صیہونیت کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو سکتے ہیں اور اس قسم کے سوالات پوچھ سکتے ہیں: کیا تم مجھے اس لیے نیست و نابود کر دینا چاہتے ہو تاکہ تم کسی اور کے لیے جگہ بنا سکو؟ اگر تمھارے یہی عزائم ہیں تو پھر تمھیں ایسا کرنے کا کیا حق ہے؟ آخر یہ بات کیوں درست ہے کہ ایک یہودی، جو شکاگو میں پیدا ہوا تھا، اسے تو ترکِ وطن کر کے اسرائیل جانے کا حق حاصل ہے جبکہ ایک فلسطینی، جو جافہ میں پیدا ہوا تھا، پناہ گزین بن گیا ہے؟ فلسطینی کی اصل قوت کا راز یہی ہے کہ وہ ایک فرد کی حیثیت سے اپنے انسان ہونے پر اصرار کرتا ہے...... اور انسان کی یہی وہ ایک علیحدہ فرد ہونے کی حیثیت ہے جس کا اس لیے پٹرا ہو جاتا ہے تاکہ کسی عظیم اور پُر شکوہ منصوبے کو پروان چڑھایا جا سکے۔ چنانچہ فلسطینی ایک چھوٹے سے قطعۂ زمین کے لیے جسے ضد اور ہٹیلے پن سے فلسطین کہا جاتا ہے، ڈٹا ہوا ہے یا پھر وہ امن کے

ایک ایسے تصور کے ساتھ چمٹا ہوا ہے جس کی اساس نہ تو کسی ایسے منصوبے پر ہے جس کا مقصد ایک قوم کو نا قوم میں تبدیل کرنا ہو[1] اور نہ جغرافیائی سیاست کے کسی ایسے واہمے پر ہے جس کا مقصد (نام نہاد) توازنِ طاقت پیدا کرنا ہو، بلکہ (اس کے اس تصور امن کی اساس) مستقبل کے متعلق ایک ایسے سہانے خواب پر ہے جس کے مطابق فلسطین میں دونوں قوموں کے لیے جن کا اس پر حق مستند اور صحیح ہے، گنجائش ہوگی، نہ کہ صرف یہودیوں کے لیے۔

متبادل (حل) کے بارے میں میں لازماً منہ پھٹ ہوں، دُنیا کے کسی دوسرے خطے کی نسبت مشرقِ وسطیٰ میں اسلحہ کی بھرمار کہیں زیادہ ہے اور سیاسی طور پر جنگ کے لیے بھی یہ خطہ دوسرے خطوں کی نسبت کہیں زیادہ کمربستہ ہے۔ اس وقت اسرائیل جنوبی افریقہ کے جوہری پروگرام میں اس کی مدد کر رہا ہے اور جوہری ہتھیاروں کی تحدید کے معاہدے پر بھی اس نے دستخط نہیں کیے ہیں۔ (اس وقت مشرقِ وسطیٰ میں) کم از کم آدھی درجن مملکتیں ایسی ہیں جن کی حکومتوں کو داخلی اور خارجی قوتوں سے سنجیدہ خطرات لاحق ہیں۔ امریکا کچھ ایسے طریقوں سے اس خطے کو اپنے گلے کی زنجیر بنا چکا ہے کہ اس سے پیچھا چھڑانا اس کے لیے ممکن نہیں رہا۔ ایسا کیوں ہوا؟ عام امریکی تو اسے کیا سمجھتے، شاید خود حکومت کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی ہوگی، خیر، وہاں تیل ہے، منڈیاں ہیں، جغرافیائی سیاست سے وابستہ ''مفادات'' ہیں، جوہری ہتھیار بنانے یا نہ بنانے کا حق انتخاب ہے، غرضیکہ سبھی کچھ داؤں پر لگا ہوا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ میں روس نے بھی امریکا کے ساتھ ''بچھا'' ڈالا ہوا ہے اور یوں مسائل کی تعداد دوگنا ہوگئی ہے۔ ادھر لوگوں کا یہ وتیرہ بن چکا ہے کہ جب وہ بھاری بھرکم مسائل کے اس ڈھیر کا تجزیہ کرنے بیٹھتے ہیں تو اپنے آپ کو زیادہ تر ایسے پیش پا افتادہ اور فرسودہ نظریاتی دلائل سے مسلح کر لیتے ہیں جو تکلیف دہ حد تک سادہ ہوتے ہیں جیسے انھیں استعمال کرنے والے بالکل کورچشم ہو چکے ہوں۔ مثلاً اسرائیل نے اپنے شہریوں کو ''یہودیوں اور غیر یہودیوں'' میں تقسیم کرنے کی سرکاری طور پر جو پالیسی اپنا رکھی ہے، اس سے وہ اب تک سرِمو بھی انحراف نہیں کرتا اور نہ اس نے اسے منسوخ کرنے کی کوشش کی ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کے متعلق سوچ بچار کی جو بھی کوششیں ہوئی ہیں، ان میں انصاف پسندی، حقیقت شناسی، ترحم اور دردمندی کے تصورات نے سنجیدہ کردار تو کیا ادا کرنا تھا، اکثر و بیشتر ان کے سرے سے ذکر ہی نہیں کیا گیا۔ اب تک اس خطے پر کچی پکی قوم پرستی اور عظیم طاقتوں کے مفادات جیسے عمومی تصورات ہی کی حکمرانی رہی ہے۔

---

[1] صیہونیوں نے فلسطینیوں کے ساتھ یہی کیا۔ انھوں نے اپنی طرف سے یہ پوری کوشش کی کہ انھیں ایک قوم سے نا قوم میں

تبدیل کر دیں۔ اس میں انھیں کچھ کامیابی بھی ہوئی۔ فلسطینی ققنس کی طرح اپنی راکھ سے پھر اُبھرے اور ایک متحدہ قوم کی حیثیت سے دوبارہ نمودار ہوئے۔ بہر حال وہ یہودیوں کے ساتھ یہ سلوک نہیں کرنا چاہتے۔ (مصنف)

رہی یہ بات کہ لوگوں کی بحیثیت افراد بھی کچھ انسانی حقوق ہوتے ہیں، تو اسے آج تک کسی نے شاید ہی کبھی کوئی اہمیت دی ہو اور آخری گزارش یہ ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں لڑاکا طیاروں یا رائفل کے کندوں سے امن قائم نہیں کیا جا سکتا، اس مقصد کے لیے بہت سادہ اوزار استعمال کرنا ہوں گے اور یہ اوزار وہ جدّوجہد ہے جو بنی نوعِ انسان کے مفادات کی خاطر شعوری طور پر عقلی انداز سے شروع کی جائے گی۔ حقیقتاً مسئلۂ فلسطین کا تقاضا یہی ہے کہ مشرقِ وسطیٰ (کے ممالک)، امریکا بلکہ ساری دُنیا مل جل کر اس مسئلے کا حل تلاش کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے۔ اس سلسلے میں بحث مباحثے کیے جائیں، تقریریں کی جائیں، تصنیفات تحریر کی جائیں، ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کیا جائے تاکہ فیصلہ کن طور پر منصفانہ اور صحیح جوابات دستیاب ہو سکیں۔ گریز، احتراز، ٹال مٹول، قوت، خوف اور لاعلمی سے مزید کام نہیں چلے گا۔

④

غیر یقینی مستقبل

دو باتیں یقینی ہیں: اسرائیل کے یہودی بھی رہیں گے اور فلسطینی بھی رہیں گے۔ اعتماد و یقین سے اس سے کچھ زیادہ کہنا نری حماقت ہوگی اور خواہ مخواہ اپنے آپ کو خطرے میں پھنسانا ہوگا۔ مجھے اس بارے میں کوئی خاص شبہ نہیں کہ امریکا مصر اور اسرائیل پر یہ زور دیتا رہے گا کہ وہ فلسطینیوں کی حکومت خود اختیاری کے متعلق آپس میں مذاکرات کریں۔

فی الحال اردن ان مذاکرات میں شریک ہونے سے احتراز کرے گا لیکن اس کا یہ احتراز صرف قلیل مدّت کے لیے ہوگا (بالآخر وہ بھی اس کھیل میں شریک ہوجائے گا۔)

بگین کا رویہ روز بروز سخت سے سخت تر ہوتا جائے گا۔

کوئی فلسطینی بھی، جس کی تھوڑی بہت بھی حیثیت ہے، اس ناخوشگوار عمل میں شریک نہیں ہوگا لیکن جو تغیرات رونما ہو سکتے ہیں، ذرا ان پر بھی غور فرمائیں۔

مصر ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ہے۔ کیا سادات کی مخالفت میں اضافہ [1] ہوجائے گا؟ کیا یہ حکومت باقی عرب دُنیا سے الگ تھلگ رہ کر زیادہ عرصہ تک اپنی بقا قائم رکھ سکے گی؟ [2] فی الحال سعودی عرب اور اردن

---

① اسرائیل سے معاہدہ کرنے کی پاداش میں صدر سادات کو اندرونِ مصر بھی اچھی خاصی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور آخر 1981ء میں ایک فوجی پریڈ کے دوران میں ان کے مخالفین انھیں گولیوں سے بھوننے میں کامیاب رہے۔

② صدر سادات کے جانشین صدر حسنی مبارک بھی اپنے پیش رو کی پالیسیوں پر علم پیرا ہیں۔ مصر کے اسرائیل کے ساتھ تعلقات قائم ہیں تاہم ان تعلقات میں وہ گرم جوشی نہیں رہی جو صدر سادات کے زمانے میں تھی۔ پھر مصر اب اتنا الگ تھلگ ......

جس حالت میں سے گزر رہے ہیں، وہ خاص طور پر نازک ہے لیکن اس میں لازماً تبدیلی آئے گی۔ کیا ان میں سے کوئی ایک یا دونوں ہی امریکی دباؤ کی مزاحمت کر سکیں گے؟ کیا ان کے حکمران خاندان اپنے داخلی مسائل پر قابو پا سکیں گے اور یوں اپنی سیادت باقی رکھ سکیں گے؟ کیا ایرانی انقلاب اپنے اثرات کو زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کرا سکے گا؟ ایرانی خود کئی مہینوں تک اکھاڑ پچھاڑ کا شکار رہے گا۔ جس سے اس خطے، عالمی معیشت اور جغرافیائی سیاست پر گہرے اور دوررس اثرات پڑیں گے۔ شام اور عراق کے جس اتحاد کی پیش گوئی کی گئی ہے اور جس سے بہت سی توقعات وابستہ کر لی گئی ہیں، ممکن ہے کہ وہ عرب سیاست میں اپنا کردار ادا کر سکے اور ممکن ہے کہ نہ کر سکے۔ (دونوں میں سے) ہر ایک ملک کی اپنی علاقائی ترجیحات کے بارے میں سوجھ بوجھ اتنے عجیب انداز سے انفرادی رنگ لیے ہوئے ہے (لبنان میں شام نے جو کردار ادا کیا ہے، اس کا ایران کے بارے میں عراقی رویہ سے مقابلہ کریں) کہ یہ بتانا کہ اتحادِ بغداد کا حتمی نتیجہ کیا برآمد ہوگا، ناممکن ہے۔ ①

آئندہ برسوں میں سعودی عرب جو رویہ اختیار کرے گا، وہ زبردست اہمیت کا حامل ہوگا۔ میں نہیں سمجھتا کہ (سعودی عرب کا) شاہی خاندان (جو اس وقت اندرونی طور پر اختلافات کا شکار ہے) کسی عرب مملکت یا ادارے سے اپنے تعلقات مکمل طور پر منقطع کرے گا۔ سوال صرف یہ ہے کہ خطے میں ایک یا دوسرے زاویہ فکر کو منوانے کے لیے سعودی حکمران کتنا معاشی دباؤ ڈال سکیں گے۔ جہاں تک لیبیا جیسی سیماب وش، گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ، حکومتوں کا تعلق ہے، تو ان کے متعلق صحیح اندازہ لگانا اور بھی مشکل ہے۔ اس امکان کو تو یقیناً رد نہیں کیا جا سکتا کہ لیبیا کو شاید سادات۔ یا شاید بعض دوسرے حلقوں کی طرف سے شدید حملوں کا سامنا کرنا پڑے لیکن اس کی تیل کی دولت آسانی سے مصر کے حوالے نہیں کی جا سکے گی۔ جسے (مصر کو) امریکا کے موجودہ منصوبوں کے مطابق معاشی طور پر کمزور ہی رکھا جائے گا۔ ایک پریشان کن احتمال یہ بھی ہے کہ اردن کی موجودہ غیر یقینی صورتِ حال سے کہیں اسرائیل کو اس پر حملہ کرنے کی ترغیب ہی نہ مل جائے۔ اس قسم کے حملے کا امکان اس وقت اور بھی بڑھ جاتا ہے اگر اسرائیل یہ سوچنے لگے کہ (اردن کے) ہاشمی خاندان نے

......ملک بھی نہیں رہا۔ اگرچہ عرب لیگ کے اجلاسوں میں وہ اب بھی شریک نہیں ہو سکتا لیکن اسلامی کانفرنس کی تنظیم کا وہ دوبارہ رکن بن گیا ہے، اسے یہ رکنیت دلانے میں پاکستان کے سابق صدر محمد ضیاء الحق کا بڑا ہاتھ تھا۔

① شام اور عراق کے مجوزہ معاہدے کی بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ دونوں الگ الگ اپنی راہوں پر گامزن رہے۔ عراق کئی سالوں تک ایران کے ساتھ جنگ میں الجھا رہا ہے جبکہ شام لبنان میں فلسطینیوں کے خلاف کارروائیاں کرتا رہتا ہے۔ شام کے ایران کے ساتھ اور عراق کے تنظیم آزادئ فلسطین کے ساتھ تعلقات خاصے خوشگوار ہیں۔

فلسطینیوں کے متعلق جو حکمتِ عملی اختیار کر رکھی ہے، اس (حملے) کے ذریعے اسے (اردن کے شاہی خاندان کو) اس (اردنی حکمتِ عملی) میں لچک پیدا کرنے کے لیے مجبور کیا جاسکتا ہے۔

امریکی پالیسی کی طرح اسرائیلی سیاست بظاہر بہت مستحکم اور پُرعزم معلوم ہوتی ہے لیکن ممکن ہے کہ حقیقتاً ایسا نہ ہو۔ موشے دایان جیسی شخصیتیں شام اور تنظیمِ آزادیٔ فلسطین کو اشارے کنایے کر رہی ہیں۔ لیکن ان کے خلاف جو احتجاجی آوازیں (امریکا میں بھی اور اسرائیل میں بھی) بلند کی گئی ہیں وہ کانوں کے پردے پھاڑنے کے لیے کافی ہیں۔ اسرائیل کے سرکاری مؤقف میں کسی قسم کی قابلِ لحاظ تبدیلی پیدا کیے بغیر ہی اس قسم کی ابتکاریاں غیر معین مدت کے لیے جاری رکھی جاسکتی ہیں۔ 1978ء کے موسم بہار میں اسرائیل نے جنوبی لبنان پر جو حملہ کیا، اس کے بعد نہایت سنجیدگی کے ساتھ اس امر پر غور کیا گیا کہ فلسطینیوں کو حتمی حل کا نشانہ بنا دینا چاہیے۔ فلسطینیوں کے حامیوں کی نگاہوں میں کیمپ ڈیوڈ کا معاہدہ ایک قسم کا سیاسی پھندا ہے جو اس قسم کے قنوطی نقطۂ نظر کو قابلِ قبول بنا دیتا ہے (کہ صیہونی فلسطینیوں کا قلع قمع کرنے پر تلے بیٹھے ہیں۔) اب بڑا سوال یہ ہے کہ فلسطینی حقِ خود ارادیت کے متعلق اسرائیل اور امریکا کے نقطہ ہائے نظر کس حد تک ایک دوسرے کے قریب آئے ہیں۔ ایک مزید پیچیدگی مصر کے کردار نے بھی پیدا کر دی ہے۔ وہ اسرائیل کے ساتھ بھی ہے اور اس کے خلاف بھی۔

زبردست اہمیت کے حامل معاشی مسائل اور معاشرتی انقلاب...... اس خطے کی تعمیر ہی کچھ اس طور پر ہوئی ہے کہ اس میں ان دونوں کی بھرمار ہے...... یقینی طور پر مشرقِ وسطیٰ کے امن کے مستقبل پر اثر انداز ہوں گے مثلاً امریکا سرکاری طور پر یہ اعلان کر چکا ہے کہ اگر تیل کی رسد کو کوئی خطرہ لاحق ہوا تو وہ (امریکا) کسی تیل پیدا کرنے والے عرب ملک پر چڑھائی کر دے گا[1] اور شاہِ (ایران) کے زوال کے بعد یقیناً مصر اور اسرائیل دونوں ہی اپنے متعلق یہ اشتہار دے رہے ہیں کہ وہ اس علاقے میں پولیس مین کا کردار ادا کرنے کے لیے تیار ہیں۔ فیصلہ کن نکتہ جو ممکن ہے کہ غیر عقلی اور غیر منطقی نظر آئے، یہ ہے کہ کون سی طاقت سیاسی یا معاشی اشتعال کی کون سی سطح کو برداشت کرنے کے لیے تیار ہے؟ کیا کوئی احتجاجی تحریک باغیانہ روش اختیار کرلے گی؟ کیا کوئی حکومت اپنے ہمسائے کے خلاف چڑھ دوڑے گی؟ کیا لبنان کی سلگتی ہوئی طوائف الملوکی (مثلاً جنوبی لبنان کے باغی اور غدار عیسائی جنگجوؤں کے لیے مسلسل اسرائیلی امداد) یا انقلابِ ایران، جو ابھی

---

① امریکا نے ابھی تک کسی عرب ملک پر حملہ تو نہیں کیا لیکن تیل کی رسد کو یقینی بنائے رکھنے کے لیے وہ کافی تعداد میں جنگی بحری جہاز خلیج فارس میں بھیجتا رہتا ہے۔

جاری ہے، کسی خفیہ جاسوسی کے ادارے کو کسی نہ کسی قسم کی سازش کرنے کی ترغیب دے گا؟ کیا اسرائیل اپنی سرحدوں کو مشرقی سمت وسعت دے گا یا مغربی جانب؟ امریکا مختلف حکومتوں کی جو براہِ راست فوجی امداد دے رہا ہے، کیا وہ اس میں اضافہ کردے گا؟ سولات بے شمار ہیں اور فی الحال ان کے جوابات حاصل کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ میرا نکتہ صرف یہ ہے کہ مسئلۂ فلسطین ایک ایسا مسئلہ ہے کہ بے شمار لوگ سوچ سمجھے بغیر اضطراری طور پر اس کے حق میں یا اس کی مخالفت میں برسرِ پیکار ہونے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ یہ اضطراری افعال تعداد میں بھی بے شمار ہیں اور ان کے نتائج بھی بہت اہم ہوتے ہیں۔ لیکن ابھی تک کوئی ایسا منظرنامہ یا خاکہ تیار نہیں کیا جا سکا (اس بات سے قطع نظر کہ یہ منظرنامہ یا خاکہ کتنا ہی پیچیدہ، جامع اور صحیح کیوں نہ ہو) جو اتنا مکمل ہو کہ اس میں ان تمام مختلف النوع اضطراری افعال کی توضیح کی گنجائش نکل سکے۔

امریکا اپنے استعماری مفادات کا تحفظ بھی کرنا چاہتا ہے اور وہ ان کے متعلق تشویش میں بھی مبتلا رہتا ہے، چنانچہ وہ اپنی پالیسی کے ایک ایسے عنصر کی نشاندہی کرتا رہتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے فلسطین کے متعلق ایک خاکہ تیار کر لیا ہے۔ اس خاکے کے مطابق امریکا فلسطینیوں کو ''مقامی سطح کے اختیارات'' اور ''حکومت خوداختیاری'' دے کر ٹرخانا چاہتا ہے اور یہ دونوں چیزیں یقیناً حقِ خودارادیت اور آزادی سے کہیں کمتر ہیں۔ مفروضہ یہ ہے کہ اپنی طاقت اور مفادات کے بل بوتے پر امریکا کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ یہ فیصلہ کر سکے کہ فلسطینیوں کے مفاد میں بہترین چیز کیا ہو سکتی ہے۔ اپنی حالیہ تاریخ کے دوران میں امریکا نے لبرل نقطۂ نظر کے نام پر جب بھی اور جہاں بھی پرائے پھٹے میں ٹانگ اڑانے کی کوشش کی، اسے ہمیشہ منہ کی کھانا پڑی اور کوئی ایسی وجہ نظر نہیں آتی جس سے یہ معلوم ہو کہ فلسطینیوں کی سرپرستی کا جو منصوبہ بنایا گیا ہے وہ ناکام نہیں رہے گا۔ لیکن میں میکانکی طور پر عقیدہ جبریت کا اتنا حامی نہیں کہ فوراً یہ ایمان لے آؤں کہ اس قسم کی ناکامی واقعتاً امریکا کے مقدر میں لکھی جا چکی ہے یا یہ کہ اس ناکامی کے ظہور پذیر ہونے کی صورت میں فلسطینیوں کو لازماً حقِ خودارادیت مل جائے گا۔ میں اس بات کو ترجیح دوں گا کہ حقِ خودارادیت کے حصول میں فلسطینیوں کے عزم پر انحصار کروں۔ جس (فلسطینی عزم) کا میں نے ان صفحات پر ذکر کرنے کی کوشش کی ہے۔ پھر مجھے یہ بھی یقین ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب امریکا میں ایسے لوگوں کا ایک خاصا بڑا طبقہ وجود میں آجائے گا۔ جنھیں اس بات کا کماحقہٗ احساس ہوگا کہ وہ پالیسیاں، جو ویت نام میں تباہی و بربادی کا سبب بنیں، فلسطینی عوام کے خلاف استعمال نہیں کی جانا چاہییں۔

مجھے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ کیمپ ڈیوڈ کے معاہدوں کے نتیجے کے طور پر اب جو کچھ ہو رہا ہے، اس کے جواب میں فلسطینی بھی کافی کارروائیاں کریں گے۔ ہر لحظہ تنظیم آزادیٔ فلسطین کے حامیوں کی تعداد

میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور اسرائیل میں اس (تنظیم) کی جو حمایت اور مخالفت پائی جاتی ہے، کچھ عرصے کے بعد اس میں بھی اضافہ ہو جائے گا لیکن چونکہ موجودہ صورتِ حال تعطل کا شکار ہو چکی ہے اور چونکہ مروّجہ تصورات کا، جن کی رُو سے تنظیمِ آزادئ فلسطین کو خاطر میں نہیں لایا جاتا، دیوالیہ پن عیاں ہو چکا ہے اس لیے میں پُراعتماد لہجے سے یہ بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ایک دن آئے گا جب فلسطینی سیاسی طور پر پہل کریں گے اور سارے خطے کو ترقّی کی شاہراہ پر ڈال دیں گے۔ اگر انجام کار اس قسم کی کوئی صورتِ حال پیدا ہوئی تو وہ کئی لحاظ سے مصری اور اسرائیلی معاہدۂ امن کا مثبت نتیجہ ہوگی۔ لیکن ہمیں یہ بھی بھولنا نہیں چاہیے کہ فلسطین تشدد اور خون سے لبریز ہو چکا ہے اور ہمیں حقیقت پسندانہ انداز سے اس بات کی توقع رکھنا چاہیے کہ ایک مختصر عرصے کے لیے آئندہ بھی وہاں ہنگامے ہوتے رہیں گے اور کافی انسانی خون بہتا رہے گا۔ بدقسمتی سے فلسطینی مسئلہ اپنی جانی پہچانی صورتوں میں بار بار سامنے آتا رہے گا۔ لیکن ہمیں یہ امید بھی رکھنا چاہیے کہ فلسطین کے عوام...... جن میں یہودی اور عرب دونوں شامل ہیں اور جن کے ماضی اور مستقبل نے انھیں آپس میں اس طرح جکڑ رکھا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے...... بھی ایک بار پھر اپنا احیا کریں گے۔ ابھی تک کسی قابلِ ذکر حد تک ان کا آمنا سامنا نہیں ہوا لیکن مجھے علم ہے کہ یہ آمنا سامنا ہوگا اور ضرور ہوگا اور جب یہ آمنا سامنا ہوگا، تو دونوں ہی کا بھلا ہوگا۔

ضمیمہ نمبر

①

جس زمانے میں بالفور برطانیہ کا وزیرِ خارجہ تھا، ڈیوڈ لائڈ جارج وزارتِ عظمیٰ کے عہدے پر متمکن تھا۔ روپے پیسے کے معاملے میں لائڈ جارج اور بالفور دونوں ہی خاصے بے ضمیر واقع ہوئے تھے۔ برطانیہ میں خطابات و اعزازات کا جو سلسلہ مروّج ہے۔ وہ طبقاتی اونچ نیچ میں یقین رکھنے والے معاشرے کے مزاج کے عین مطابق ہے۔ ان خطابات و اعزازات کے حصول کے لیے انگریز سب کچھ کرنے کے لیے تیّار رہتے ہیں۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے وطن کے لیے سردھڑ کی بازی لگا دی اور یوں قوم نے تشکر کے طور پر انھیں اعلیٰ سے اعلیٰ اعزاز سے نوازا۔ دوسری طرف ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو روپے کے بل بوتے پر یہ اعزازات حاصل کرلیتے ہیں۔ یوں تو خطابات اور اعزازات کی خرید و فروخت کا سلسلہ شاہ جیمز اوّل (1603ء۔ 1625ء) کے زمانے میں ہی شروع ہوگیا تھا۔ شاہ جیمز کو آئرلینڈ کے خلاف جنگوں کے لیے روپے پیسے کی شدید ضرورت رہتی تھی۔ یہ روپیا اکٹھا کرنے کے لیے اس نے خطابات کی فروخت شروع کر دی۔ وہ لوگوں کو مجبور کرتا تھا کہ وہ یہ خطابات خریدیں اور جو لوگ لیت و لعل کرتے تھے، انھیں وہ بھاری جرمانے کرتا تھا۔ خطابات کی فروخت کا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اگرچہ اب لوگوں سے رقوم پارٹی کے لیے چندے کے نام پر بٹوری جاتی ہیں۔ اتفاق سے اس کی ابتدا بالفور نے اپنی وزارتِ عظمیٰ کے زمانے میں کی، لیکن کہا جاتا ہے کہ لائڈ جارج کے عہد میں خطابات و اعزازات کی فروخت کو جو عروج حاصل ہوا، اس کی مثال برطانیہ کی پوری تاریخ میں نہیں ملتی۔ لائڈ جارج نے جن لوگوں سے بڑی بڑی رقمیں بٹوریں اور ان کے معاوضے میں انھیں خطابات سے نوازا، ان میں بدنام زمانہ سمگلر، سٹے باز، ذخیرہ اندوز اور چور بازاری کا دھندا

کرنے والے بھی شامل تھے۔ موجودہ زمانے کے ایک مصنف اور صحافی جان واکر کی تصنیف The Queen Has Been Pleased (مطبوعہ سیکر اینڈ وار برگ، لندن، 1986ء) میں جو اعداد وشمار دیے گئے ہیں ان کے مطابق لائڈ جارج نے ان سودوں میں کم از کم پندرہ لاکھ پاؤنڈ کمائے۔ (یہ پندرہ لاکھ پاؤنڈ 1916ء اور 1921ء کے درمیانی برسوں کے دوران میں وصول کیے گئے۔ اب جبکہ اشیا کی قیمتیں کم از کم سو گنا بڑھ چکی ہیں، فی زمانہ یہ رقم کم زکم پندرہ کروڑ پاؤنڈ بنے گی۔ اس وقت ایک پاؤنڈ کی قیمت کم از کم تیس روپے ہے۔ چنانچہ پاکستانی کرنسی میں یہ رقم کم از کم ساڑھے چار ارب روپیا ہوگی۔) لائڈ جارج خطابات کی اس خرید وفروخت کا دھندا اپنے ایجنٹوں کے ذریعے کرتے تھے۔ جان واکر کے بیان کے مطابق اس کا ایک ایجنٹ مانڈی گریگوری دلالی کے اس دھندے میں کم از کم تیس ہزار پاؤنڈ سالانہ خود کما لیتا تھا۔ وہ شخص جو لارڈ (Baron) کا خطاب حاصل کرنے کا متمنی ہوتا تھا، اسے پچاس ہزار سے ایک لاکھ پاؤنڈ تک ادا کرنے پڑتے تھے۔ جن لوگوں کو "نائٹ (عرف عام میں "سر") کا موروثی خطاب Baronetcy ملتا تھا، وہ بیس سے چالیس ہزار پاؤنڈ اور خالی خولی "نائٹ" کا خطاب پانے والے دس ہزار پاؤنڈ ادا کرتے تھے۔

لائڈ جارج نے محض رقوم ہی اکٹھی نہیں کی تھیں بلکہ اخبارات کا منہ بند کرنے کے لیے اس نے مالکوں اور صحافیوں پر بھی خطابات والقابات کی بارش کردی۔ اس نے چار اخبارات (ٹائمز، ٹیلی گراف، آبزرور اور مرر) کے مالکوں کو وائی کاؤنٹ (برطانیہ میں نوابی خطابات کے پانچ درجے، بیرن، وائی کاؤنٹ ارل، مارکوئیس اور ڈیوک ہیں) پانچ اخبارات کے مالکوں کو لارڈ BARON گیارہ اخبارات کے مالکوں یا مدیروں کی موروثی نائٹ اور تینتیس (33) صحافیوں کو نائٹ ("سر") بنایا۔ جو چھوٹے موٹے خطابات دیے گئے، ان کا تو کوئی شمار ہی نہیں۔ تاہم سب سے زیادہ اخبارات کے مالک شخص لارڈ نارتھ کلف کو (Baron) بنانے کا اعزاز لارڈ بالفور اپنی وزارتِ عظمٰی کے دور میں حاصل کر چکا تھا۔ لارڈ جارج نے البتہ اسے ایک درجہ اوپر اٹھا کر وائی کاؤنٹ بنا دیا۔

اگر انگریز کشمیر پچھتر لاکھ روپے میں فروخت کر سکتے تھے، تو یہودیوں کو فلسطین میں آباد کرنے اور اسے ان کا وطن قرار دینے کے لیے بالفور اور لائڈ جارج جیسے لوگوں نے جو رقوم اینٹھی ہوں گی، ان کا ذکر کسی کتاب میں نہیں ملتا۔ لیکن قرائن سے اندازہ یہی ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے خوب ہاتھ رنگے ہوں گے۔ اگر یہ لوگ اپنی ہی قوم کے افراد کو سرمائے کے عوض خطابات والقابات فروخت کر سکتے تھے، تو بھلا فلسطین جیسا خطہ انھوں نے کیسے اللہ واسطے یہودیوں کے حوالے کرنے کی ہامی بھری ہوگی، کچھ سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔

(مترجم)

ضمیمہ نمبر

②

حاشیہ صفحہ نمبر 31: لوخ نیس سکاٹ لینڈ (برطانیہ) کے شمالی سلسلہ کوہ میں ایک صویل لیکن تنگ جھیل ہے، چونکہ یہ جھیل سنسان اور بے آباد علاقے میں واقع ہے، اس لیے یہاں تک رسائی آسان نہیں تھی۔ لیکن 1953ء میں جب اس جھیل کو سڑک کے ذریعے ملک کے باقی حصوں سے ملا دیا گیا تو یہاں پہنچنا آسان ہو گیا۔

کم از کم چھٹی صدی عیسوی سے یہ روایات چلی آ رہی ہے کہ اس جھیل میں ایک بہت خوفناک بلا رہتی ہے۔ بعض لوگوں کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے اپنی آنکھوں سے اس بلا کو دیکھا ہے، سڑک کی تعمیر کے بعد یہاں سیاحوں کا تانتا بندھ گیا اور اس بلا کے قصے دُنیا بھر کے اخبارات و جرائد میں شائع ہونے لگے، بعض منچلے تو فوٹو بھی اتار لاتے ہیں۔ ایسے ہی ایک فوٹو میں ایک نامعلوم جانور کے سر اور گردن جیسی چیز نظر آتی ہے۔

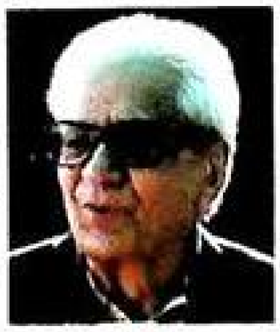
سائنس دان اس بلا کے وجود سے منکر ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ محض نظر کا دھوکا ہے یا انسانی تخیل کی کرشمہ سازی۔ اصل میں جھیل کی لہریں بعض اوقات اس انداز سے اوپر اٹھتی ہے، جیسے کوئی عظیم الجثہ اور مہیب جانور پانی میں تیر رہا ہو۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ برفانی دور سے قبل یہ جھیل سمندر کا حصہ تھی، برفانی دور میں یہ سمندر سے علیحدہ ہو گئی۔ ممکن ہے اس زمانے میں کوئی سمندری مخلوق اس میں پھنس گئی ہے۔ 1963ء کے بعد بے شمار سائنسی جماعتیں اس جھیل کا معائنہ کر چکی ہے۔ لیکن ابھی تک کوئی بھی حتمی طور پر اس نتیجے پر نہیں پہنچ سکا کہ یہ بلا (یا عفریت) واقعی موجود ہے یا محض واہمہ ہے۔

حاشیہ صفحہ:180۔ ① یہاں مصنف نے لفظ GENTILE استعمال کیا ہے ابتدأ یہودی فلسطین کے ہر اس شخص کو، جو یہودیت کا پیروکار نہیں تھا، حقارت سے Gentile کہتے تھے۔وہ اپنے آپ کو برتر مخلوق اور غیر یہودیوں کو کافر اور مردود قرار دیتے تھے۔ بعد میں یہ لفظ انھوں نے عیسائیوں پر بھی منطبق کر دیا۔اب اس لفظ میں حقارت کا پہلو نہیں پایا جاتا یہاں اس سے مراد یورپ کے عیسائی ہیں۔

حاشیہ صفحہ نمبر 471۔ ① ویسے تو امریکی صدر کی سرکاری رہائش واشنگٹن کی عمارت ''وائٹ ہاؤس'' ہے۔لیکن واشنگٹن سے قریب ریاست میری لینڈ میں ایک اور سرکاری رہائش گاہ بھی ہے۔ اس کا نام ''کیمپ ڈیوڈ'' ہے۔ یہاں اکثر اوقات صدر سیر وتفریح اور آرام کے لیے آتے ہیں۔

(مترجم)



شاہد حمید اُردو کے مایہ ناز ادیب، ماہرِ لسانیات اور مترجم ہیں۔ وہ 1928ء میں جالندھر کے ایک گاؤں بُرجیاں کلاں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اسلامیہ ہائی سکول تنگل انبیا میں حاصل کی۔ 1947ء میں فسادات کے دوران پاکستان ہجرت کی۔ لاہور آ کر پہلے اسلامیہ کالج لاہور سے بی اے کیا اور گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے انگریزی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے اساتذہ میں خواجہ منظور حسین اور ڈاکٹر محمد صادق قابلِ ذکر ہیں۔ مشہور نقاد مظفر علی سید فرسٹ ایئر سے سِکستھ ایئر تک شاہد حمید کے کلاس فیلو رہے۔ تعلیم کے دوران میں بطورِ صحافی ''روزنامہ آفاق'' میں کام کیا، پھر سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔ ایمرسن کالج ملتان، گورنمنٹ کالج ساہیوال اور گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی پڑھاتے رہے۔ 1988ء میں ریٹائر ہوئے۔ ادب سے دلچسپی بہت پُرانی ہے، لیکن انھوں نے فیصلہ کیا کہ تیسرے درجے کی طبع زاد تحریروں سے عالمی کلاسک کا ترجمہ زبان و ادب کی بدرجہا بہتر خدمت ہے۔ یہ سوچ کر زمانۂ طالب علمی میں ہی ڈیل کارنیگی کی ہردل عزیز کتاب ''پریشان ہونا چھوڑیئے، جینا سیکھیے'' کا اُردو ترجمہ کیا، پھر لیو طالسطائی کے عظیم ناول ''جنگ اور امن'' کا اُردو میں ترجمہ کرنے کا بیڑا اُٹھایا اور کئی سال کی محنت شاقہ کے بعد اس کام کو مکمل کیا۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ دستوئیفسکی کے ناول ''کرامازوف برادران'' کا اُردو ترجمہ ہے۔ اس ناول کو دنیا بھر میں دستوئیفسکی کی سب سے باکمال تصنیف سمجھا گیا ہے۔ اس کی اُردو میں دستیابی ہم سب کے لیے باعثِ فخر ہے۔ انہوں نے دنیا میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے ان ضخیم ناولوں کے تراجم پر نہ صرف عمرِ عزیز کا بڑا حصہ صرف کیا، بلکہ متن سے مخلص رہنے کے لیے شب و روز محنت کی۔ انھیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے معروف نقاد شمیم حنفی نے کہا تھا، ''یقین کرنا مشکل ہے کہ ہزاروں صفحوں پر پھیلا ہوا یہ غیر معمولی کام ایک اکیلی ذات کا کرشمہ ہے۔'' ممتاز فکشن نگار نیر مسعود نے محمد سلیم الرحمٰن کے نام خط میں شاہد حمید کو حیرت خیز آدمی قرار دیا۔ ان کا انتقال 29 جنوری 2018ء کو ہوا اور ڈیفنس لاہور کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہیں۔



ایڈورڈ سعید

مصنف نے اپنی کتاب میں جن بنیادی مباحث... صیہونیت کیا ہے؟ یہ کہاں سے آئی؟ یہودیوں نے اس کے فروغ کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلے؟ مغربی سیاست دانوں نے مکر وفریب کے کیا کیا جال بچھائے؟ نام نہاد لبرل دانشوروں، ناول نگاروں، شاعروں، مقالہ نویسوں، سفرناموں کے مصنّفوں اور صیہونیت کے دیگر ہمدردوں نے کیسے فضا ہموار کی؟ خود صیہونیوں نے فلسطین میں آباد ہونے کے لیے کن کن جتنوں سے کام لیا اور اپنے دعاوی کو سچا ثابت کرنے کے لیے کن کن تاویلوں کا سہارا لیا؟ جب اسرائیل قائم ہو گیا تو فلسطینیوں کو کیسے ملک بدر کیا گیا؟ اور تمام تر دعووں کے باوجود انھیں آج تک کیسے درجہ دوم کے شہری بنائے رکھا گیا؟ فلسطینیوں نے تحریکِ آزادی کیسے منظم کی اور فلسطینی شاعروں، کہانی نویسوں، دوسرے ادیبوں، مصنّفوں اور دانشوروں نے کیسے اس تحریک کے لیے زمین ہموار کی اور اس کی آبیاری کی؟ پی ایل او اور دوسری تحریکیں کیسے وجود میں آئیں؟ جنگ سڑسٹھ کے کیا نتائج مرتب ہوئے؟ کیمپ ڈیوڈ کے معاہدے نے کیا گُل کھلائے؟ فلسطینیوں کے نقطۂ نظر سے فلسطین کے مسئلے کا کیا حل ممکن ہے؟ وغیرہم... کو اپنی کتاب کا موضوع بنایا ہے اور ان پر جو سیر حاصل بحث کی ہے، وہ ہمیں اس مسئلے کو اس کے صحیح تناظر میں دیکھنے میں بہت مدد دیتی ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس مسئلے کو پہلی مرتبہ صحیح انداز سے پیش کیا گیا ہے، تو غلط نہ ہو گا۔ ایڈورڈ سعید نے اپنی یہ کتاب صیہونیت کے اصل چہرے سے نقاب سرکانے اور اس ضمن میں مغرب کے نام نہاد لبرل سیاست دانوں اور دانش وروں نے جو مکروہ کردار ادا کیا ہے، اس کا بھانڈا بیچ چوراہے پھوڑنے کی غرض سے لکھی تھی۔ وہ اپنے اس مقصد میں کہاں تک کامیاب رہے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ صیہونیوں نے یہ کتاب ہی بازار سے غائب کرا دی، اب تو کسی خوش نصیب کو ہی دستیاب ہوتی ہے۔

شاہد حمید

WWW.
BOOK CORNER
.COM.PK
Standard House of Publishing

Masla-e-Falasteen

ISBN: 978-969-662-347-2

Rs.1200.00

BookCornerJlm
bookcornershowroom
bookcornerjhelum
bookcorner
0314-4440882
Jhelum (Pakistan)

Title artwork by
David Roberts